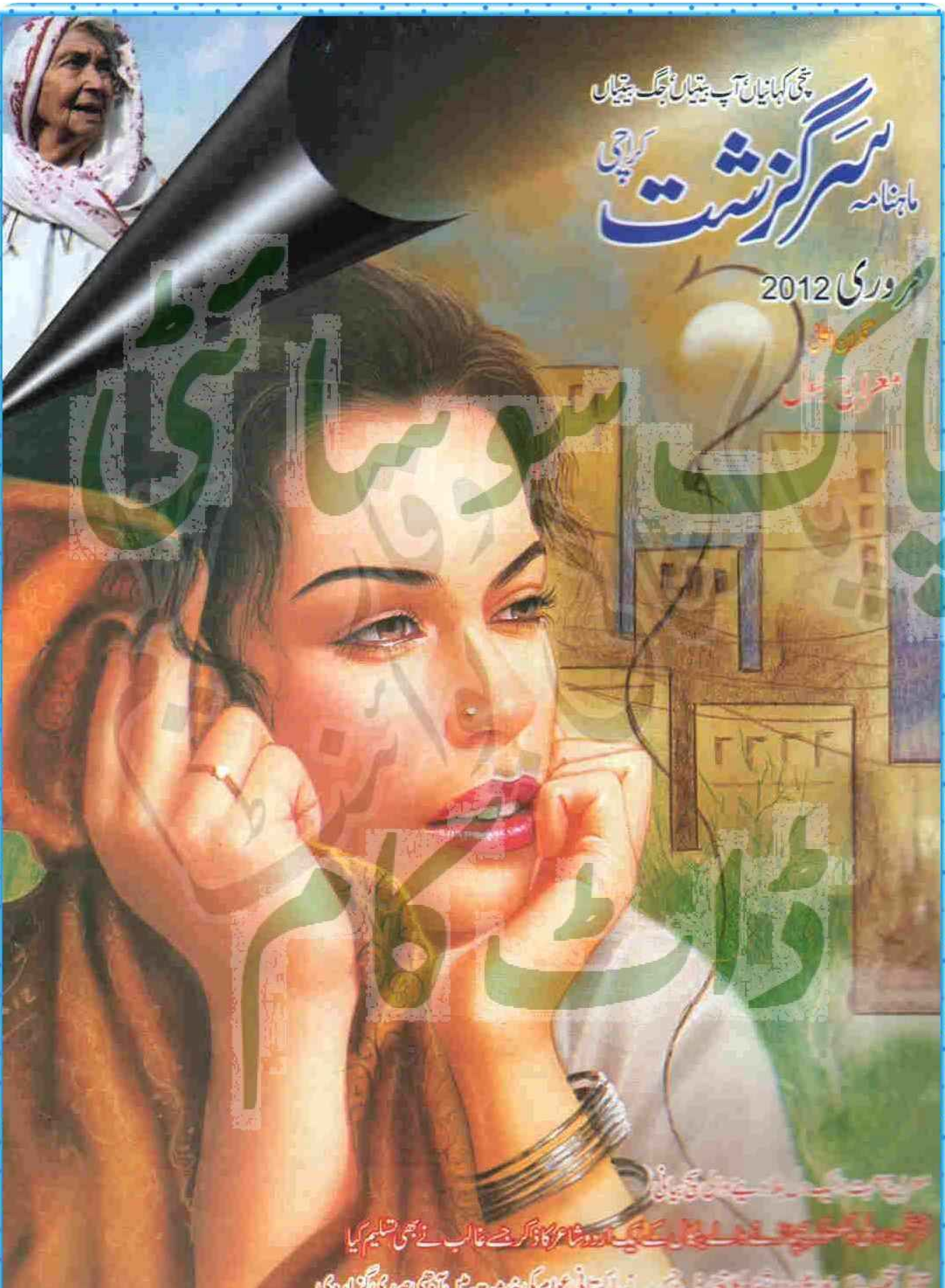
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ سرگزشت کراچی
فروری 2012
اردو شاعر کا ذکر جسے غالب نے بھی تسلیم کیا
نے پاکستانی عوام کی خدمت میں آدھی صدی گزار دی

سرگزشت 15
توتیِ پاکستان
ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارف خاص

گفت وشنید 16
شہرِ خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت 24
فخرِ سخن
ڈاکٹر ساجد امجد
بنگال میں اردو ادب کی آبیاری کرنے والے کا سوانح

معلومات 47
خلا کے شکاری
مریم کے خان
خلا میں آوارہ پھرتے شکاری سیاروں کا تذکرہ

خراج تحسین 63
قابلِ تقلید
ابن کبیر
اس نے پاکستانیوں کی خاطر جرمنی کو چھوڑ دیا

حادثات 85
موت بردار
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایٹمی میزائل کسی بھی وقت خطرہ بن سکتے ہیں

فلم وصحافت 95
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی
فلم وصحافت کی کہی ان کہی باتیں بھولی بسری یادیں

شکاریات 119
آدم خور
محمد مجید ارشد
ایک شکاری کی پرتجسس و سنسنی خیز روداد

تاریخ 123
سامری
ذوالفقار ارشد گیلانی
اس بدبخت کا ذکر جس نے احکامِ الٰہی سے منہ پھیرا تھا

سفرکتھا 137
ایب اور یجن
ایس جی یزدانی
آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کا بیان جو غلام ٹھہرے

حاصل مطالعہ 145
بھیڑ کھال
مختار آزاد
چرچ نے اس صنعت پر قبضہ کرکے آمدنی پوپ اور بشپ کے لیے مختص کی تھی

عزم وحوصلہ 167
چمپئن
صبا شفیق
ایک ایسے نوعمر کی داستان جس نے معذوری کو شکست دے دی

معاشرت 170
سراب
کاشف زبیر
بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان، ابھر کر گرنے والی تحریر

شعر و ادب 209
بیت بازی
قارئین
شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

انعامی مقابلہ 212
علمی آزمائش
ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی 214
معراجِ محبت
ریحانہ
اس نے محبت پائی مگر کس عجیب انداز سے

دوسری سچ بیانی 229
تعبیر
افسر حیات
شوبز کی زندگی کس قدر غلیظ کردیتی ہے

تیسری سچ بیانی 247
مشورے
محمد انصار
لوگ کس قدر مشورے دینے میں طاق ہیں

چوتھی سچ بیانی 251
بغلی گھونسا
رابعہ
عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے مگر وہ تو بہنیں تھیں

پانچویں سچ بیانی 263
نسخہ
خیرالدین
دل پھینک نوجوانوں کو دور رکھنے کا نادر نسخہ

چھٹی سچ بیانی 367
انتقام
مسز ردا زبیر
اس نے انتقام لینے کی دھن میں خود کو تباہ کرلیا

ساتویں سچ بیانی 274
دہاڑی
عمرانہ انور مقصود
دورِ حاضر کے سیاست کی ایک زندہ تصویر

آٹھویں سچ بیانی 277
ایثار
ارشد نیاز
ایک دوسرے کے لیے ایسا ایثار آپ نے بھی دیکھا ہوگا

نویں سچ بیانی 285
دعا جی بابا
کمال الدین
بدعاملی تھی دعا دینے کی، ایک عجیب سچ بیانی

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
✿ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 22 ❖ شمارہ 04 ❖ فروری 2012ء

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول
مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رضوان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی نازش	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ارفع کریم رندھاوا، فیصل آباد ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں رام دیوالی کی اس چھوٹی سی بچی نے دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ اس نے ایک ایسے ملک میں آنکھ کھولی تھی جہاں کی ایک تہائی آبادی یہ تک نہیں جانتی کہ سافٹ ویئر ہے کیا؟ مگر اس نے سافٹ ویئر انجینئرنگ میں 9 سال کی عمر میں کامیابی حاصل کر کے وطنِ عزیز کا نام روشن کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ بلاشبہ وہ اپنے نام کی طرح ارفع ہے۔ سب سے کم عمر مائیکروسوفٹ سرٹیفائڈ پروفیشنل کا اعزاز حاصل کر کے اس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا تھا مگر جب وہ ''فخرِ وطن'' بیمار ہوئی، اسپتال پہنچائی گئی، کوما میں چلی گئی تو اربابِ اختیار کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ کوئی عیادت کے لیے پہنچتا۔ سب این آر او، میموگیٹ میں اُلجھے رہے، اپنی کرسی اپنا وقار بچانے میں مصروف رہے۔ پاکستان سے کوسوں دور بیٹھا بِل گیٹس تڑپ اُٹھا، اس نے خود فون کیا، کہا ''اس بچی نے کمپیوٹنگ ورلڈ میں اپنا مقام بنایا ہے، اس کی بیماری کے تمام اخراجات ہماری کمپنی اُٹھائے گی۔'' جب وہ بچی سب سے روٹھ کر خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ گویا اس نے بہ زبان خاموشی بتا دیا کہ اس ملک میں قابلیت کی یہی قدر ہے، تو سب کے پیغامات آ رہے ہیں، یہ تک اعلان ہوا ہے کہ ایک آئی ٹی کمپلیکس اور ایک پارک کو اس کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ شاید اس لیے کہ ہم مردہ پرست جو ٹھہرے۔ کسی کی خدمت اور عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے بہت استقامت سے اس کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے سید ضمیر جعفری کا یہ شعر شدت سے یاد آ رہا ہے۔

بعد قتل، قاتلو زخم بھر گئے تو کیا
مسخ چہرگان میں تم سنور گئے تو کیا

معراج رسول

توتیِ پاکستان

سرگزشت

14 جنوری 1900ء کو سورج نکلنے سے ذرا پہلے اس نے عرش والے کی عطا کردہ صلاحیت کے ساتھ فرش پر اپنے آنے کا اعلان کیا، ہلکی سی چیخ کے ساتھ۔ یہی چیخ، کچھ بولنے کی للک، کچھ کہنے کی منشا زندگی بھر تعاقب میں رہی۔ کچھ نہ کچھ نیا کہنے کی فکر ہمہ وقت ستاتی رہی۔ جبکہ گھرانا بس عام سا تھا۔ نہ بہت زیادہ پڑھے لکھوں کا تھا، نہ نرے جاہلوں کا۔ اس لیے ذرا ہوش سنبھالتے ہی اسے پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ اب یہ بات اور ہے کہ اس دور میں پانچ چھ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد ہی پڑھائی کے بارے میں سوچا جاتا تھا۔ اسے بھی مسجد سے ملحقہ صحن میں بغدادی قاعدہ دے کر پڑھنے کی ''زحمت'' سے دوچار کیا گیا۔ قاعدہ ختم ہوا تو ناظرہ قرآن شریف کریما و مقیماں بھی رٹایا گیا۔ کنبے والوں نے اب اسے ذہین گردانتے ہوئے اسکول کے سپرد کر دیا۔ اسکول میں پڑھائی کم اور پٹائی زیادہ ہوتی تھی اس لیے یہ ماحول اسے زیادہ پسند نہیں آیا مگر کنبے والوں کا دباؤ تھا اس لیے وہ اسکول جاتا رہا۔ اسکول کی کتابوں میں نظمیں پڑھنا، انہیں دل لگا کر رٹنا تو اسے بہت اچھا لگتا پھر وہ شہر میں ہونے والے ایک مشاعرے میں گیا اور وہاں شاعروں کو دیکھا تو اسے شوق ہوا کہ وہ بھی ان کی طرح شعر کہے۔ عمر چھوٹی تھی، شوق بڑا تھا پھر بھی اس نے کوشش کی۔ قافیے سے قافیہ ملایا اور خوش ہو گیا۔ مگر شومئی قسمت پہلی ہی کوشش بھاری پڑی۔ 7 برس کا سن اور شاعری کا شوق۔ مولوی فتح دین نے دو تھپڑ جڑے، گریبان پکڑ کر جھنجوڑا اور بالوں کو مٹھی میں لے کر سر کو جھٹکے دیے کہ ''خناس'' سر سے نکل جائے مگر وہ خناس باہر تو نکلا نہیں، خوف سے اندر ہی دبک کر بیٹھ گیا۔ جب وہ گیارہ برس کا ہوا تو اس ''بھوت'' نے پھر سر ابھارا۔ ساتویں جماعت میں پہنچتے پہنچتے بہت ساری نظمیں غزلیں جمع ہو گئیں۔ پڑھائی پر پوری توجہ تو تھی نہیں، اس لیے امتحان میں فیل ہونا مقدر ٹھہرا۔ نتیجہ دیکھتے ہی والد کی سختی یاد آئی اور گھر سے فرار ہونا پسند کر لیا۔ بڑی مشکل سے پکڑ دھکڑ کر گھر لایا گیا اور کچھ ہی دنوں میں شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ شاعری کا چسکا تو پڑ ہی چکا تھا، اب پوری توجہ اسی جانب تھی۔ پہلی عالمگیر جنگ میں خلافتِ عثمانیہ پر صلیب والوں کے ہاتھوں زوال آ گیا تھا۔ وہ بھی دیگر مسلمانوں کے ساتھ آزردہ و افسردہ تھا۔ اس کی شاعری میں بھی اثر نظر آنے لگا۔ 19 برس کی عمر ہو چکی تھی، فکرِ معاش بھی تھی سو انہوں نے مولانا گرامی کے ماہنامہ اعجاز میں نوکری کر لی۔ 1922ء میں یہ نوکری شروع ہوئی جو کافی عرصے چلی، اب شاعری میں پختگی بھی آتی جا رہی تھی۔ برصغیر میں سیاسی کشمکش بھی بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر کچلو کے اشارے پر ایک نظم لکھی جس نے جیل یاترا کرا دی۔ اب تو شہرت سوا ہو گئی۔ پورے پنجاب سے بلاوا آنے لگا۔ دہلی کے مشاعروں میں بھی جانے لگے تھے۔ ہر جگہ عمیق شاعری اور خوبصورت لحن کا جادو سر چڑھ کر بولتا۔ دھیرے دھیرے شہرت اتنی بڑھی کہ ہر بڑے مشاعروں کی جان کہلانے لگے۔ مجموعے بھی آ چکے تھے کہ قیامِ پاکستان کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور وہ پاکستان آ گئے۔ اب اساتذہ کی قطار میں آ چکے تھے اور طوطیِ پاکستان کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ شاہنامہ اسلام آتے ہی دھوم مچ گئی تھی، اس وجہ سے بھی ان کی شہرت آسمان پر تھی پھر جب قومی ترانے کی بات آئی تو سیکڑوں شعرا کے کلام میں سے ان کا کلام زیادہ پسند کیا گیا۔ قومی ترانے کے خالق، صرف چھ جماعتیں پاس اس شاعر کو ہم حفیظ جالندھری کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں جن کی وفات 21 دسمبر 1982ء کو ہوئی۔ ہلالِ امتیاز، پرائڈ آف پرفارمنس کے علاوہ بھی بہت سے اعزازات کے حامل ٹھہرے۔

☆☆☆

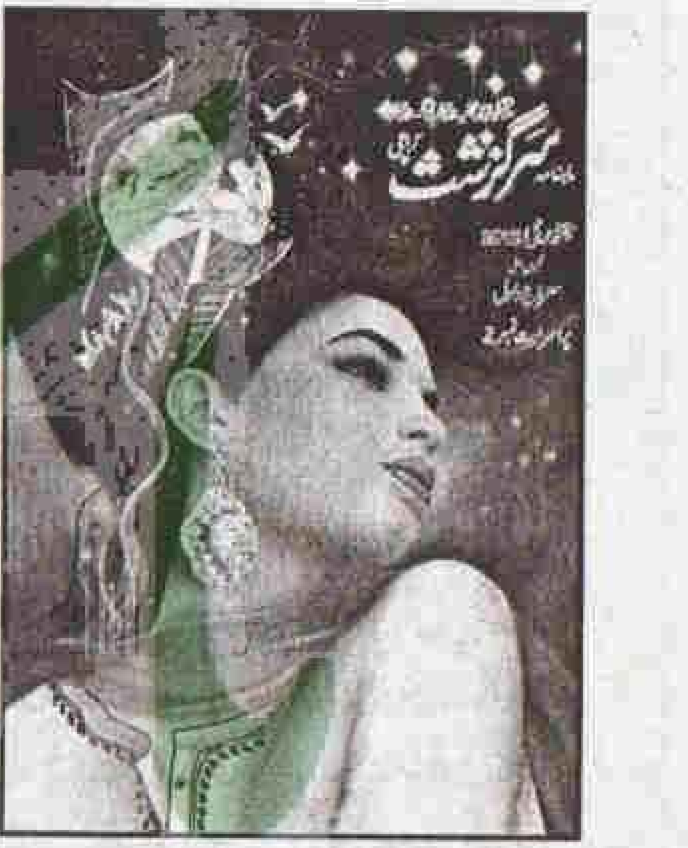

شہرِ خیال

✉ **اعجاز حسین ستھار، نور پور تھل سے لکھتے ہیں** ”ہم نے پڑھنے کی ابتدا آج سے پورے 37 سال پہلے کی تھی۔ چند سال بعد کہانیوں پر رائے دینی شروع کی تو مزہ آنے لگا پھر ہم نے سرگزشت میں تبصرے بھی لکھنا شروع کیے تو دوستوں نے سراہا، حوصلہ بڑھتا گیا۔ ایک آدھ غیر حاضری ہوئی، وہ بھی اس صورت میں کہ ہم عمرہ کی ادائیگی کے لیے گئے تھے۔ خالد کبیر صاحب نے اپنی رپورٹ میں پسندیدگی کی سند عطا کی، یہی ہمارا صلہ ہے۔ شکریہ قبول کیجیے۔ ملک محمد جاوید سرکانی درانی، میں نے تو محض وضاحت پیش کی تھی، ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ آزادی سے رائے دیا کیجیے۔ ”حیات بعد الموت“ میں جنت اور دوزخ کی حقیقت کو تسلیم کرنے والے واقعات پیش کیے گئے ہیں اور مسلمانوں کے عقیدے کی تائید کی گئی ہے۔ تمام واقعات دلچسپ ہیں۔ قلمی الف لیلہ میں لاہور کی پرانی تاریخ پڑھ کر حیران رہ گیا۔ آپس کی محبت، ملنساری اور دکھ سکھ میں شرکت سے کتنے مسائل خود بہ خود حل ہو جاتے تھے۔ یکے والی فلم کا خلاصہ دلچسپ اور پرتجسس ہے۔ گورکھ مل کی پراسراریت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے، سارے واقعات دعوے سے لکھے گئے ہیں البتہ یہ الگ بات ہے کہ مشاہدہ کرنا ہمارا حق ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایسا مقام اور مخلوق ہماری دھرتی پر موجود ہے جو جادو اور اسرار سے ہٹ کر کھلی حقیقت ہے۔ خلوصِ دل اور ٹھنڈے مزاج سے پڑھا جائے تو ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ بھی کسی جادو سے کم نہیں ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟ (درست فرمایا آپ نے۔ اگرچہ جادو نہیں مگر حیرت انگیز ایجادات میں سے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب فکشن لکھنے والے مصنفین مثلاً ابن صفی اپنی تحاریر میں بغیر تار کے ٹیلی فون، موبائل فون اور فیکس مشین کا ذکر کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے یہ صرف فکشن ہے، حقیقت سے دور لیکن آج کے دور نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ محض تخیل نہیں تھا۔ اسی طرح دو مختلف ملکوں میں بیٹھے لوگ ٹیلی فون پر تصویر کے ساتھ بات کرتے ہوئے بتایا گیا تھا اور آج انٹرنیٹ نے اس حقیقت کو بھی سچ ثابت کر دیا) سورج کا رقص انتہائی دلچسپ کہانی ہے جو بھی ہوا ہے ہمارے ایمان تازہ کرنے کو کافی ہے۔ مجھے تینوں بچوں کی خوش قسمتی پر خوشی ہوئی ہے جو اس معاملے میں شامل رہے۔ مسلمان محقق، عالم دین کی رائے لی جانی چاہیے، وہ ان واقعات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، جب بات صحیح واضح ہو جائے گی کیونکہ اتنی شہادتوں کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا (افسوس تو اسی کا ہے کہ مغربی میڈیا تو اتر سے ذکر کرتا ہے، ریڈرز ڈائجسٹ نے خصوصی نمبر نکالا، انٹرنیٹ پر ایک مکمل سائٹ ہے مگر ہمارے پاکستان میں اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے) سراب کی موجودہ قسط دلچسپ اور پرتجسس ہے اور واقعات میں تیزی اور نیا پن ہے۔ شہلا موقع ملتے ہی پینترا بدل لیتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ شہباز بریف کیس کا معاملہ موخر کر دیں اور اپنے ضروری مسائل پر توجہ دیں۔ کاشف زبیر صاحب جب تک نیا لائحہ عمل ترتیب دیں، ہم سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ”عامل“ واقعی کمال کی کہانی ہے۔ یوسف صاحب نے جتنی عبادت اور وظائف کیے، دنیاوی عیش و عشرت سے کنارہ کشی اختیار کی، مشکل وقت میں مجبور کے کام آئے، ضرورت مندوں کی حاجت پوری کی اور حتیٰ کہ اولاد نہ ہونے پر صبر کیا بلکہ اللہ کی رضا سمجھ کر شکر ادا کیا۔ اس کے صلے میں نوازا جانا زیادہ حیرانی کی بات نہیں ہے۔ ”جن گزیدہ“ جیسے واقعات دیہاتی علاقوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جسم کا بھاری پن، مردوں کی آواز میں بات کرنا اور بے خودی میں کھیلنا یعنی بالکل یہی علامات ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ اسے مکر کہتے ہیں یا من پسند لڑکے سے شادی کرنے کے لیے ڈھونگ گردانتے ہیں۔ کبھی واقعی فراڈ ظاہر ہو جاتا ہے تو نہ ماننے والوں کو موقع مل جاتا ہے۔ وہ خوب خبر لیتے ہیں لیکن شمیم والے حالات سے اللہ بچائے۔ یہ تو حقیقی صورت حال ہے جنہیں پروردگار نے سچا علم دیا ہے انہیں بے لوث دکھی انسانوں کی خدمت کر کے والدین کی دعائیں سمیٹنی چاہئیں اس سے بڑھ کر کوئی معاوضہ نہیں۔ ایمان فروش سے ملتے جلتے واقعات کئی ہفت روزہ میگزینز اور ماہوار رسائل میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ کئی بار پڑھے ہیں۔ بس کے سامنے سور آ جانے اور ڈرائیور کا سڑک چھوڑ کر بچا کرنا سب میں مشترک ہے، لیکن یہ بات طے ہے کہ دنیاوی معاملات میں کسی صورت بھی قرآن مجید کو درمیان میں نہیں لانا چاہیے۔ چاہے جتنی مجبوری ہو اس انتہا تک نہیں جانا چاہیے جو جلد اپنا قبلہ درست کر لیں گے وہی فلاح پائیں گے۔ عذاب کا گڑھا جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ محمد سلیم اختر پرانے حقائق نگار ہیں، ہم ایک ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں، انہیں سرگزشت نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے، وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ قبر گزیدہ اور بمبئی کے شاہ جی پراسرار کہانیاں ہیں اور ایسے اسرار قسمت والوں پر کھلتے ہیں، ایک خاص ادا سے نوازتے ہیں یہ اشارے ہر ایک کے سمجھنے والے کہاں ہوتے ہیں۔ اب تو اپنے دل میں ایک عجیب خواہش سر اٹھا رہی ہے، کبھی بنڈل شاہ جیسی ہستی چپکے سے ہم سے بھی ٹکرا جائے، سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔“

✉ **راجا ثاقب نواز ثاقب، رتی ٹبی ساہیوال سے رقم طراز ہیں** ”نئے سال کا پہلا شمارہ، پراسراریت نمبر 11 نئے سال کی ابتدا میں ملا۔ انشائیہ بھی پراسراریت کی دھند میں لپٹا نظر آیا۔ ”قاطع سحر“ نے تو جیسے ایمان ہی تازہ کر دیا۔ شہرِ خیال میں خالد کبیر بجا طور پر صدارت کا حق ادا کرتے ہوئے نظر آئے۔ ملک

محمد جاوید سرکانی درانی، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، علی مغل، رانا محمد سجاد اور مظفر گڑھ سے ہماری دیرینہ ساتھی جویریہ قاضی نے اپنے خیالات سے متاثر کیا۔ وہ کون ہیں ڈاکٹر ساجد امجد نے توریت سے بھی مدد لی ہے، یہ دیکھ کر اچھا لگا۔ لنگن کا بھوت اگر اب بھی نظر آتا ہے تو کون سی نرالی بات ہے۔ ہمارے بیشتر صدور جب ایوان صدارت سے نکلے تو انہیں بھی ایوانِ صدارت کی خوشگوار شامیں، رات کو سونے نہیں دیتی تھیں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس کی تحریر پہلی بار پڑھی، اچھی لگی۔ پڑوسی ملک کے آسیبی قلعہ کی سیر کی، یوں تو پورا بھارت ہی آسیبی ہے، ہمارے دریاؤں کا پانی پی گیا اور اب کشمیر کو بھی ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔ حیات بعد الموت مختصر مگر بہت سے روحانی اور جسمانی تجربات اور احساسات سموئے ہوئے تھی۔ پراسرار عمارتیں میں پراسرار مقامات ہمارے منتظر تھے۔ قلمی الف لیلہ میں ابتدائی حصے میں پراسراریت کی دھند غالب رہی البتہ بعد میں آفاقی صاحب کا مخصوص لہجہ لوٹ آیا، محو حیرت ہوں، قارئین قابض رہے۔ گورکھ مل متاثر کن رہی۔ سورج کا رقص قدرے طویل ثابت ہوئی مگر دلچسپی قائم رہی۔ جبکہ کرشل جادو مختصر ترین اور معلومات کا خزانہ لیے ہوئے تھی۔ بد روح کا خوشگوار اختتام ہوا۔ پراسرار مذہب کے ڈانڈے تو کہیں اور ہی جا ملتے ہیں۔ سراب کی ایک اور قسط کا اختتام شہلا کے دھوبی پٹکا سے ہوا ہے جو اس نے حسب توقع شہباز ملک کے ہی خلاف کھیلا ہے اور یوں ہم پہلے سچ بیانی، ٹائٹل کہانی، عامل تک جا پہنچے۔ بے شمار عبادات، مشکل اور کٹھن ریاضتوں کے بعد یوسف صاحب جس مقام تک جا پہنچے ہیں، اس کے لیے ان کی تعظیم بجا۔ جن گزیدہ میں شمیم کو بہت ہولناک اذیت سہ کر سکون ملا۔ ایمان فروش میں رضوان کا انجام پڑھ کر جھرجھری آ گئی۔ عذاب کا گڑھا میں اعجاز نے اپنے کالے کرتوتوں کی وجہ سے دنیا ہی میں جہنم کا گڑھا اپنا مقدر بنا لیا۔ قبر گزیدہ کی ابتدا میں درج خط میں مصنف اسلم انصاری کا اصرار ہے کہ یہ ایک سچ بیتی ہے اور خود ان پر بیتی ہے۔ بمبئی کے شاہ جی، بنڈل شاہ اللہ لوگ اور طلسماتی طاقتوں کے مالک تھے۔ آخری سچ بیانی دلدل، ناقابل یقین حد تک غیر مرئی لگی۔ دلدل پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ باطل قوت کی جیت ہو گئی۔ بزم بیت بازی پراسرار وجوہات کی بنا پر غائب تھی۔ کترنیں بھی موضوع کے اعتبار سے بہترین تھیں۔ مجموعی طور پر پراسراریت نمبر 2 اپنا خاص تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہا۔ جس کے لیے آپ خصوصی طور پر اور سرگزشت کی پوری ٹیم مجموعی طور پر مبارک باد کی مستحق ہے اور مجھے یہ مان لینے میں کوئی عار نہیں ہے کہ پراسراریت نمبر 11، پراسراریت نمبر 1 کی نسبت زیادہ بہتر اور زیادہ موثر لگا۔“

✉ **محمد طیب کا مجن آباد سے ای میل** ”سرگزشت ایک معیاری اور معلوماتی جریدہ ہے اور سرگزشت میں شائع ہونے والے مضامین معلوماتی ہونے کے ساتھ بامقصد بھی ہوتے ہیں۔ سرگزشت میں چولستان کے ریگزاروں کا اور بہاولپور کی تاریخ بھی بیان کی جائے، بہت نوازش ہوگی۔“

✉ **حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگہ میانوالی سے لکھتے ہیں** ”پراسراریت نمبر 2 ملا۔ شہرِ خیال میں اپنا خط تلاش کیا مگر ندارد۔ بہرحال پرچہ زیر مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی وہ کون پڑھی۔ ذوالقرنین کے بارے میں قرآن مجید گواہی دیتا ہے۔ ایک نیک اور اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے تھے۔ سکندر مقدونی ایک غیر مسلم شخص تھا جس نے دنیا کے حصول کے لیے قتل و غارت کو ہوا دی، وہ بھلا کیسے ذوالقرنین ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ انصاری کی لنگن کا بھوت ایک حیرت انگیز اور دلچسپ کہانی ہے۔ (جی ہاں، روبینہ چھپی رستم نکلیں) آسیبی قلعہ میں ابن کبیر نے مافوق الفطرت واقعات کا احاطہ کیا ہے۔ یقیناً اجاڑ جگہیں بھوت پریت کی رہائش گاہیں بن جاتی ہیں اور آنے جانے والوں کو تنگ کرتی ہیں۔ احسان قریشی کی حیات بعد الموت، نزہت قادری کی پراسرار عمارتیں، پراسرار تحریریں ہیں۔ اس کے بعد علی سفیان آفاقی کی قلمی الف لیلہ پڑھی، یہ ایک دلچسپ قلمی داستان ہے۔ ہم نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ جلال الدین خوارزم کا پیچھا کرتے ہوئے چنگیز خان ہندوستان پہنچا تو جلال الدین خوارزم نے دریائے سندھ میں گھوڑا ڈال کر اس کو عبور کیا نہ کہ دریائے جمنا کو۔ چنگیز خان کے سپاہیوں نے جلال الدین خوارزم کو تیروں کا نشانہ بنانا چاہا مگر روایت ہے کہ چنگیز خان نے انہیں روک دیا تھا۔ اس بات کی تصحیح فرما دیں۔ یکے والی ایک دلچسپ فلم تھی۔ آج کل ایسی فلم کہاں بنتی ہیں۔ محو حیرت قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر ہے۔ محمد امجد کی کرشل جادو ایک معلومات میں اضافہ کرتی تحریر ہے۔ الف کاف کی بد روح ایک مکمل پراسرار کہانی ہے۔ مریم کے خان کی پراسرار مذہب پڑھی، معلومات میں اضافہ ہوا۔ پروفیسر یوسف عطاری کی کہانی عامل نے بے حد متاثر کیا۔ یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دل سے بندگی کرتے ہیں اور اس کی مخلوق کو راحت پہنچاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی قدم قدم پر ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے جو واقعات بیان کیے ہیں یہ یقیناً مخلوق خدا کی خدمت کے لیے ہیں۔ جن گزیدہ اوسط درجے کی تحریر ہے۔ جن زدہ لوگوں سے واسطہ میرا بھی پڑا ہے، وہ کلام پاک سے متاثر ہو کر متاثرہ کو چھوڑ دیتے ہیں بشرطیکہ وہ اللہ والے لوگوں سے مربوط ہوں۔ ایمان فروش اچھی تحریر ہے۔ رضوان صاحب نے چند روپوں کے لیے اپنی آخرت خراب کر ڈالی۔ عذاب کا گڑھا عبرت انگیز تحریر ہے۔ بمبئی کے شاہ جی اللہ لوگ تھے جن کی دعائیں خلق خدا کو فائدہ پہنچاتی تھیں۔ دلدل میں شیطانی طاقتوں کی کارستانی بیان کی گئی ہے۔ کالا جادو اسلام میں حرام ہے اور اس کو کرنے والے کافر ہیں، ان کے لیے جہنم میں سخت سزا ہے۔ پراسراریت نمبر دو یقیناً ایک دلچسپ اور معلوماتی رسالہ ہے۔“

✉ **[illegible] مغل، چیچیاں عثمس، گجرات سے رقم طراز ہیں** ”سب سے پہلے تو آپ کو اور آپ کی ساری ٹیم کو پراسراریت نمبر دو نکالنے پر مبارک باد قبول [illegible] ہوئی ایک ہی موضوع پر اتنا مواد پڑھنے کو ملا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد یہ آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ویسے تو پچھلے ماہ شہرِ خیال میں حاضری [illegible] اس ماہ چھٹی کا پروگرام تھا لیکن پراسراریت نمبر دو پر تبصرہ نہ کرنا بھی زیادتی ہے اس لیے حاضر ہیں۔ ایک تو دس بارہ تک خط پہنچنے کی آپ کی شرط [illegible] 29 کو رسالہ ملے اور دس تک ختم کر کے تبصرہ لکھا جائے۔ ہمارا مسئلہ یہ کہ ہم اتنی جلدی سرگزشت ختم ہی نہیں کرنا چاہتے بلکہ کشمیری قہوہ کی طرح مزہ [illegible] سرگزشت میں ایک کامل ولی کی کرامت پڑھنے کو ملی۔ دوسری تحریر جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ عامل ہے یہ ایمان افروز کہانی تھی۔

میرے خیال میں انہی اللہ کے نیک بندوں کی وجہ سے ہم گناہ گار بھی عذاب الٰہی سے بچے ہوئے ہیں۔ عذاب کا گڑھا بھی متاثر کن تھی۔ جبکہ ایمان فروش میں بیان کی گئی بات ایک اٹل حقیقت ہے کہ اللہ کی جھوٹی قسم کھانے والے ہمیشہ دنیا میں بھگت کر جاتے ہیں۔ حیات بعد الموت مکمل طور پر اسلامی عقائد کے برعکس تھی۔ لنکن کا بھوت ایک دلچسپ تجربات پر مشتمل تحریر تھی۔ آسیبی قلعہ اتنی متاثر نہیں کر سکی۔ ویسے پراسراریت نمبر دو میرے خیال میں جن بھوتوں کے لیے ایک مخصوص نمبر معلوم ہوا۔ کیونکہ اس میں تقریباً تمام ہی کہانیاں جن بھوتوں کے حالات پر مشتمل تھیں۔ جتنا پڑھا ہے اتنا تبصرہ کر دیا۔ میں نے اس دفعہ میجر راجا عزیز بھٹی کے حالات زندگی پر مشتمل ایک کہانی بھیجی ہے اگر پسند آئے تو انہی صفحات میں بتا دیجیے گا۔ (ان پر مکمل مضمون شائع ہو چکا ہے) دوسری بات آپ سے یہ پوچھنی ہے کہ آپ سے فون پر بھی کوئی معلومات لی جا سکتی ہے؟" (بالکل)

☒ **پروین چوہدری** نے لاہور سے لکھا ہے "میں 35 سال سے آپ کی خاموش قاری ہوں۔ سسپنس، سرگزشت اور جاسوسی باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ پاکیزہ 7 ماہ سے چھوڑ دیا ہے کیونکہ اب نہ آنکھوں میں طاقت ہے نہ دماغ میں۔ آپ کی بیماری کے لیے میں نے بہت دعائیں کی ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی اور تندرستی جیسی نعمت سے مالا مال کرے، آمین ثم آمین۔ میں نے کسی بھی رسالے پر تبصرہ نہیں لکھا، یہ خط میں اپنی غرض کے لیے لکھ رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کسی بھی قاری یا رائٹر کا پتا یا ٹیلی فون نمبر نہیں دیتے اس لیے برائے کرم میرا یہ خط شیخ الطاف صاحب تک پہنچا دیں تو ڈھیر ساری دعائیں دوں گی۔ میں خط کے ساتھ سادہ لفافہ ڈال رہی ہوں۔ آپ ان کا پتا لکھ کر ڈال دیں اور سرگزشت میں صرف اتنا لکھ دیں کہ میرا خط آپ کو مل گیا ہے۔" (آپ کا خط الطاف شیخ کو ای میل کر دیا ہے کیونکہ وہ ان دنوں ملائیشیا میں رہ رہے ہیں)

☒ **جاوید محمد خان سرکانی درانی** کابرہ زئی، چھچھ سے تبصرہ "خط کا آغاز اس افسوس ناک خبر کے ساتھ کرتا ہوں کہ وطن عزیز کے مایہ ناز زرعی سائنس دان میاں عزیز احمد جھنڈیر سات دسمبر کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم ایک عظیم زرعی سائنس دان، ایک فلاحی کارکن تھے۔ اس ماہ شہر خیال میں سب سے بہترین تبصرہ سید محمد عظیم بخاری کا تھا۔ ان کے اس ایک ہی جملے نے پورا میلا لوٹ لیا کہ جب سرحدوں کے آر پار ایک ہی قسم کے لوگ ہوں تو پھر سرحد کی کیا ضرورت رہ جائے گی۔ (جی ہاں، یہ جملہ ایسا نشتر ہے کہ ہر محب وطن کا دل چھید جائے۔ ہمارے بزرگوں نے جس وجہ سے پاکستان بنایا تھا وہ مقصد ہی فوت ہو رہا ہے، نہ ہمارا معاشرہ اسلامی رہا ہے نہ زبان، یہی دشمنوں کی سازش ہے) ولی محمد جوہر کو خوش آمدید۔ یہ پُراسرار واقعات رند صاحب سے تفصیلاً لکھوائے جائیں۔ عبدالخالق بھٹی اور ستار صاحب اس ماہ بجھے بجھے لگے۔ جاوید احمد صدیقی، رانا سجاد اور راجا ثاقب نواز تبصرہ پسند کرنے پر شکریہ۔ اب آئیں پراسراریت نمبر 2 کے مضامین کی طرف تو مریم کے خان کی تحریر پراسرار مذہب بازی لے گئی۔ بہت سارے لوگ جانتے تھے کہ بائبل میں انبیا کے متعلق خرافات کیوں درج ہیں۔ سرگزشت کے صفحات کے ذریعے یہ بات عام لوگوں تک بھی پہنچ جائے گی کیونکہ ایسی کوششیں اسلام اور قرآن کریم کے خلاف بھی کی جاتی رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی فری میسن ہی ملوث ہو، کیونکہ شریعت محمدی شریعت موسوی ہی کا تسلسل اور کامل شکل ہے۔ بہرحال ایک حقیقت نما اور چشم کشا تحریر ہے۔ دوسرے درجے پر ابن کبیر کی آسیبی قلعہ رہی۔ لنکن کا بھوت پسند آئی۔ پراسرار عمارتیں، گور کھ مل اور کرشل جادو بھی اچھی تھیں۔ ساجد امجد تاثر نہ چھوڑ سکے۔ انہوں نے ایک کھلی ڈھلی شخصیت حضرت ذوالقرنین کو خواہ مخواہ پُراسرار ثابت کرنے کی کوشش کی بہتر ہوتا کہ ستیہ نرائن راجو پتا پرتھی کو موضوع بناتے، سچ بیانیاں بھی موضوع کے لحاظ سے بہترین تھیں۔"

☒ **اشفاق احمد سرکی** کا خلوص نامہ، خیر پور میرس سے "میں آپ کا سرگزشت بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، انتہائی معلوماتی اور دلکش میگزین نکالنے پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اس میں سائنس دانوں اور موجدوں کی سرگزشت شائع کیا کریں پلیز۔ (تواتر سے سائنسدانوں کی سرگزشت شائع ہوئی ہے۔ مزید بھی ہوگی) مزید گزارش ہے کہ میں ایک طالب علم ہوں۔ نیا سرگزشت افورڈ نہیں کر سکتا، بہت پس ماندہ علاقے سے تعلق رکھتا ہوں اور انتہائی غریب ہوں اور آپ کے میگزین میں لکھنا بھی چاہتا ہوں، میری گزارش ہے کہ مجھے پرانے سرگزشت پوسٹ کر دیں تو نوازش ہوگی۔" (پرانے شمارے تو اب ریکارڈ میں بھی نہیں رہے)

☒ **سعید احمد چاند** کی خیال آرائی، کراچی سے "اس ماہ کا پرچہ پُراسراریت نمبر 2 ملا مگر بہت لیٹ اس لیے جتنا بھی تبصرہ لکھ سکتا تھا، لکھ رہا ہوں۔ سرورق کوئی خاص نہ تھا۔ معراج رسول صاحب کا تبصرہ حالات حاضرہ کے عین مطابق تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا وقت کیا رنگ لے کر آئے گا۔ سیاست داں اپنے اقتدار کی رسہ کشی میں لگے ہوئے ہیں۔ حضرت معین الدین چشتی کے حالات سے ہم پہلے ہی باخبر تھے۔ قاطع سحر میں پڑھ کر ان کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ اس دفعہ شہر خیال میں تاخیر سے آنے والوں میں بھی ہمارا نام نہیں تھا (خط اگر پریس جانے تک موصول ہو جاتا تو ضرور شامل ہوتا) خالد کبیر کا تبصرہ طویل تھا مگر تھا دلچسپ۔ لگتا تھا کوزے کو دریا میں بند کر دیا ہے۔ ملک محمد جاوید سرکانی درانی، راجا ثاقب نواز ثاقب، رانا محمد سجاد، سیدہ بانو نا گوری، احتساب عباس، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، جی اے مغل، سید محمد عظیم شاہ بخاری، ناصر حسین رند، ایم اے خالق بھٹی، اعجاز حسین ستھار، ولی محمد جوہر، علی مغل پسند آئے۔ اس دفعہ ڈاکٹر روبی شہر خیال میں نہ تھیں مگر ان کا ایک مضمون "لنکن کا بھوت" موجود تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحبہ اتنی اثر انگیز کہانی بھی لکھ سکتی ہیں۔ میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ جویریہ قاضی صاحبہ ایک اچھی رائٹر کے آثار تو آپ میں نظر آ رہے ہیں۔ پھر آپ ڈاکٹر روبی کی طرح کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ سورج کا رقص ذوالفقار ارشد گیلانی کا، الف کاف کی بدروح، مریم کے خان کا پُراسرار مذہب، فلمی الف لیلہ اور سراب حسب معمول اچھی جا رہی ہیں۔ کہانی قریباً سب ہی اچھی،

[illegible] کچھ زیر مطالعہ ہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے اتنا ہی لکھ سکا۔" (آپ کے خط کی جو بات ہمیں سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ کہ آپ نے کاغذ کا دوبارہ استعمال کیا ورنہ عموماً لوگ کاغذ کی قدر نہیں کرتے)

☒ **ایم اے خالق بھٹی**، صدر پریس کلب، اللہ آباد، ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں "نئے سال کا پہلا شمارہ ملا ہے اور وہ بھی پُراسراریت سے لبریز۔ اس دفعہ بھی جہاں پُراسراریت تھی وہاں معلومات کے خزانے سے بھی پر تھا۔ اداریہ پاکستان کو خطرے کے حوالے سے گھنٹی بج رہی تھی حالانکہ ہمیں کسی سے خطرہ نہیں اگر ہے تو اپنے نااہل حکمرانوں سے ہے جن کی ناقص پالیسیوں اور سوچ کی بدولت ہم بُری طرح پاتال میں دھنستے جا رہے ہیں۔ بس اب ایک ہی ذات ہے جو ہماری حفاظت فرمائے گی (آمین) کرسی صدارت پر متمکن خالد کبیر صاحب، پورے سال کی نمبر شماری لکھنے پر مبارک باد لیکن میری بہن قرۃ العین زینب کا نام لکھنا بھول گئے ہیں، کیوں؟ راجا ثاقب نواز ثاقب، لڈو تو لڈو ہوتے ہیں آپ کھاتے جائیں اور ہم سے مبارک باد وصول کرتے جائیں۔ کیا آئیڈیا ہے رانا محمد سجاد، بھیا آواز حق کے نام سے ہماری حکومت سیخ پا ہو جاتی ہے۔ علی مغل، سرگزشت کی محبت میں اتنا سفر ویلڈن۔ اعجاز حسین ستھار، آپ کو سرگزشت سے رفاقت کے اکیس سال مبارک ہوں۔ سدرہ بانو نا گوری، مہنگائی اور میک اپ کے نرخ بڑھنے سے سرورق کی حسینہ مضطرب تو نظر آئے گی ہی۔ ابن مقبول جاوید صدیقی، آپ کے ماضی کا واقعہ پڑھ کر ہمیں اپنے بچپن کے بیتے کئی واقعات آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلنے لگے۔ ملک محمد جاوید سرکانی درانی یہ چھچھ کہاں واقع ہے، اس کی کوئی خاص تاریخی حیثیت ہے تو روشناس کرائیں۔ جی اے مغل چیچو کی ملیاں کا نام تو سنا تھا اب یہ شمس کے ساتھ چیچیاں کا کمبی نیشن کچھ عجیب و غریب لگتا ہے۔ جویریہ قاضی سسٹر، احتساب عباس، ہم بھی آپ کی ہم آواز ہو کر کہتے ہیں کہ اولیا نمبر ہی شائع کر دیں۔ ایک وقت تھا جب ہم سادگی میں بہت ہی خوش و خرم زندگی گزارتے تھے لیکن جب سے ٹی وی آیا ہے ہماری زندگی ہی غارت ہو چکی ہے۔ مجھے یاد ہے اس دور میں پورے سال میں دو یا تین کپڑوں کے جوڑے سلواتے تھے لیکن اب ٹی وی ڈراموں میں نت نئے فیشن دیکھ کر خواتین سے بھی زیادہ ہمارے سوٹ ہیں اسی طرح اپنے گھروں کو ڈیکوریٹ اور دیگر مصارف کے باعث ہم اپنی پریشانی میں خود اضافہ کر رہے ہیں (بالکل درست فرمایا) "وہ کون" میں ڈاکٹر ساجد امجد ایک پُراسرار ہستی کی تعمیر کردہ دیوار کو تلاش کرتے دکھائی دیے لیکن میری ناقص رائے ہے کہ خدا تعالیٰ نے کچھ راز ابھی تک انسانوں سے پوشیدہ رکھے ہیں جو قرب قیامت کی نشانیوں کے ساتھ ظاہر ہوں گے۔ دوسرا خیال ہے کہ شاید سائبیریا کے برف پوش علاقے میں برف کی تہ میں گم ہے۔ ابن کبیر نے آسیبی قلعہ کا تعارف کرایا۔ نزہت قادری کی پُراسرار عمارتیں ہمارے علاقوں میں بھی واقع ہیں۔ فلمی الف لیلہ میں بھی پُراسرار فلموں کا تذکرہ پڑھنے کو ملا۔ محو حیرت ہوں کہ واقعات متاثر کن تھے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی گور کھ مل، ذوالفقار ارشد گیلانی کی سورج کا رقص۔ چھٹی پراسرار سچ بیانی بمبئی کے شاہ جی جسے انور فرہاد نے لکھا ہے، نئی معلومات فراہم کی ہیں جو صرف سرگزشت کا خاصہ ہے۔ اس کے لیے پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ انکل پرویز بلگرامی کے بیٹے کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہر وقت دست دعا دراز رکھتا ہوں، انشاء اللہ جلد شفایاب ہوں گے۔"

☒ **سدرہ بانو نا گوری** کا افکاریہ، کراچی سے "شہر خیال میں خالد کبیر نے سالانہ رپورٹ بہت اچھے انداز میں پیش کی، آپ کو صدارت کی کرسی ملنے پر مبارک باد۔ احتساب عباس نے اپنے خط میں جس واقعے کی طرف توجہ دلائی ہے، اسے پڑھ کر یقیناً قارئین ہوشیار رہیں گے۔ وہ کون؟ ایک قرآنی شخصیت پر لکھی گئی تحریر ڈاکٹر ساجد امجد کے مخصوص انداز میں اچھی لگی۔ مریم کے خان نے نہایت عرق ریزی سے یہودیوں کے کرتوتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ فری میسن تنظیم پر گہری نظر ڈالی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ کی زبانی امریکا کے صدر ابراہم لنکن کی بھٹکتی روح اور ان کی موت کے بعد کا احوال پڑھ کر یہی سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ (کم سے کم پچاس کتابیں ابراہم لنکن کی روح کے حوالے سے لکھی گئیں۔ انٹرنیٹ پر بے شمار سائٹس اس موضوع پر موجود ہیں) حیات بعد الموت میں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملنے اور جنت اور جہنم کا منظر دیکھنے والوں کے واقعات نے حیرت زدہ کر دیا۔ نزہت قادری نے پُراسرار اور آسیبی عمارتوں کی سیر کرائی، سورج کا رقص اور آسیبی قلعہ فرصت سے پڑھنے کا تقاضا کرتی ہیں سو ان پر تبصرہ پھر کبھی۔ فلمی الف لیلہ میں انکل آفاقی موضوع کے لحاظ سے پُراسرار فلموں کی داستان عجب بیان کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کے والی داستان بھی سنا دی۔ چلیے اس طرح ہی سہی ہم ان صفحات پر ہی پرانی فلمیں دیکھ لیتے ہیں۔ [illegible] انکل آفاقی، سراب حسب معمول اپنی نادیدہ منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ عامل پروفیسر یوسف عطاری کی پہلی سچ بیانی میں ایک وضاحت ضروری ہے [illegible] صاحب نے دوران سفر نماز تہجد کو صلوٰۃ اللیل سے علیحدہ بتایا ہے جبکہ صلوٰۃ اللیل یا قیام اللیل اور تہجد ایک ہی نماز کے نام ہیں اور ان کے لیے نیند ضروری [illegible] اگر ایسا ہوتا تو اعتکاف میں جو لوگ رات بھر جاگتے ہیں وہ تہجد نہ پڑھ سکتے۔ دوسری سچ بیانی محترمہ شمیم صاحبہ کی پڑھی، سچ تو یہ ہے کہ جن گزیدہ پڑھ کر یہ [illegible] محترمہ ابھی تک صحت یاب نہیں ہوئی ہیں کیونکہ پوری کہانی ذہنی انتشار سے بھرپور تھی۔ آخری سچ بیانی پر کیا تبصرہ کیا جائے، آپ خود سمجھ دار ہیں، یہ [illegible] پورا نہیں اترتی۔ انکل پلیز، واصف علی واصف کی زندگی پر بھی ایک تحریر جلد از جلد سرگزشت کی زینت بنائی جائے اور آخر میں آپ سے [illegible] سرگزشت، سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ جو کہ نوجوان نسل میں بہت مقبول ہیں، ان کی ہسٹری کے بارے میں تفصیل سے ایک مضمون یا تحریر لکھوائی [illegible] پہلا شمارہ کب اور کس سن میں شائع کیا گیا، آپ کو کیسے خیال آیا کہ یہ رسالے نکالے جائیں اور ان کے نام کن لوگوں نے تجویز کیے جیسے کئی سوالات [illegible] جواب کا انتظار کریں گے تاکہ مجھ سمیت دوسری قارئین کی تشنگی دور ہو سکے۔" (ماہنامہ سسپنس کی نومبر 2010ء کی اشاعت میں ان [illegible] کی شکل میں شائع کیا جا چکا ہے)

✉ ناصر حسین رند کا مکتوب، بہاولپور سے "پہلے تو آپ سے یہ گلہ کہ یا تو ہمارے تبصرے کو صدارت پر جگہ دی جاتی تھی یا اب ہمارے تبصرے کو شائع ہی نہیں کیا جاتا۔ اگر کیا جاتا ہے تو کاٹ چھانٹ کر آخر میں شائع کیا جاتا ہے۔ (ہمارے لیے تمام قارئین برابر ہیں کہ یہ سرگزشت کا سرمایہ ہیں۔ جو خط سب سے بھرپور ہوتا ہے اسے ہی پہلے نمبر پر رکھا جاتا ہے۔ وقت پر پہنچنے والے ہر خط کو شامل کیا جاتا ہے۔ اگر نہ کیا جائے تو صفحات خالی نہ رہ جائیں؟ وہی سطریں کاٹی جاتی ہیں جو غیر اہم ہوتی ہیں) ویسے بھی ہر مہینے پہلے پورا سرگزشت پڑھنا اور بعد بھرپور تبصرہ لکھنا، ایک طویل اور تھکا دینے والا کام ہے اور ہم ایسے ہی تبصرہ نہیں لکھا کرتے، کافی حوالہ جات پڑھ کر پھر محفل میں شریک ہوتے ہیں۔ اب اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سال میں ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دو بار خط لکھا کریں گے۔ (آپ کا تبصرہ ہمارے لیے مشعل راہ ہوتا ہے۔ بس کوشش کریں کہ بے جا طوالت نہ ہو۔ ہاں ایک یاد دہانی ضروری ہے کہ خط ہر ماہ کی 10 تاریخ تک مل جائے) پُراسراریت نمبر کا جب سے اعلان ہوا تھا، مئی 2011ء تک تین بھرپور تبصرے پُراسراریت نمبر کے لیے لگاؤ کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ پُراسرار موضوع ہمارا پسندیدہ موضوع تھا اس لیے بھرپور تبصرے لکھے۔ جنوری 2012ء کا پراسراریت نمبر اس قدر پسند آیا نہ چاہتے ہوئے بھرپور تبصرہ لکھنے پر مجبور ہوگئے۔ کیا کریں۔ سرگزشت سے محبت بھی کچھ ایسی ہے کہ رہا بھی نہیں جاتا (آپ کے خلوص کا شکریہ) بہرحال آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ پُراسراریت نمبر 2 زیادہ پُراثر ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ جی کرتا ہے کہ سرگزشت کی تمام ٹیم کو اور شہر خیال کے ساتھیوں کو پُراسراریت نمبر 2 کی کامیابی پر عشائیہ دیا جائے۔ (نیکی پوچھ پوچھ) یہ نمبر اتنا زبردست تھا کہ اس کا اثر مدتوں رہے گا۔ تمام لکھاریوں نے کمال کر دیا۔ گویا سرگزشت کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ سب سے پہلے آپ کا اظہاریہ پڑھا۔ واقعی اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے۔ اس کے بعد قاطع تحریک کی سرگزشت حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی اس کرامات کا ذکر کہ آج بھی انڈیا کے شہر انا ساگر، میں وہ چٹان ہوا میں معلق ہے۔ ہمارے دل میں اس چٹان کو دیکھنے کا تجسس پیدا ہوگیا۔ (خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کرامات کی سی ڈی دکانوں پر عام ملتی ہیں اسی میں دیکھ لیں) شہر خیال میں آپ کے اس اعلان نے مزہ دوبالا کر دیا کہ عنقریب ایک اور منفرد خاص نمبر کا اعلان ہوگا۔ ہمیں لگتا ہے کہ پراسراریت نمبر میں سے کچھ مواد آپ کے ہاتھ چڑھ گیا ہے جو ایک اور نمبر کی شکل میں ظہور ہوگا۔ (پراسراریت پر مضامین شائع کرتے رہیں گے مگر آئندہ خاص نمبر کا موضوع الگ ہوگا) سب سے پہلے وہ کون ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی محبت کا منہ بولتا ثبوت۔ ذوالقرنین دو سینگوں والے کی سرگزشت نہایت ہی شاندار رہی۔ اس سے پہلے یہ داستان اختر حسین شیخ صاحب کچھ سالوں پہلے لکھ چکے ہیں لیکن ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی اس تحریر نے سائرس اعظم بانی ایران کو ذوالقرنین ثابت کر دیا۔ آج سے چند سال پہلے سائرس اعظم شائع ہوئی تھی، اس وقت ہماری اور ہماری سسٹر ثمینہ شاہد مرحومہ کی شہر خیال میں بحث ہوئی تھی۔ آج محترمہ زندہ ہوتیں تو ڈاکٹر صاحب کی تحریر پڑھ کر مطمئن ہو جاتیں۔ قرآن مجید کی ایک تفسیر میں ہم نے پڑھا تھا کہ ذوالقرنین حضرت خضر علیہ السلام کے کزن تھے اور حضرت خضر کے وزیر بھی تھے۔ لنکن کا بھوت ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی زبردست کاوش تھی۔ روبینہ نفیس انصاری صاحبہ کو رائٹر بننے کی مبارک باد۔ آسیبی قلعہ بھان گڑھ کے قلعے کی پراسراریت شروع سے لے کر آخر تک قائم رہی۔ ایسی کہانی پڑھ کر ہمیں محترم پرویز بلگرامی صاحب کی تاریک کھنڈر یاد آ گئی۔ شروع سے آخر تک کہانی سسپنس اور تجسس سے بھرپور تھی۔ ابن کبیر صاحب نے معلوماتی اور کہانی کی شکل میں تحریر خوب لکھی۔ اس قلعے کی کہانی پڑھ کر دل چاہا کہ ہم اپنے شہر خیال اور سرگزشت کی ٹیم کے ہمراہ قلعہ ڈیرہ اور کے وزٹ پر جائیں۔ شہر خیال کے دس عدد ساتھی بھی ہمراہ ہوں۔ پراسرار عمارتوں سے ہوتے ہوئے فلمی الف لیلہ پر پہنچے تو علی سفیان آفاقی صاحب نے چار صفحوں میں پُراسرار فلموں کو لپیٹ دیا۔ اگر مزید پراسرار فلموں کا ذکر کر دیتے تو کیا خوب ہوتا۔ بہرحال جتنا لکھا، خوب لکھا۔ محو حیرت ہوں میں پُراسرار پرچم اور عظیم اسرار پسند آئے۔ گورکھ مل تجسس سے بھرپور مووی لگ رہی تھی۔ سورج کا رقص ذوالفقار ارشد گیلانی صاحب نے معجزے، کرامتیں اور پیش گوئیوں کی پہلے ایک صفحے میں پوری ہسٹری بیان کر ڈالی۔ بعد میں پرتگال میں پیش آنے والے پُراسرار واقعے کو نہایت انوکھے انداز میں لکھا۔ روزری آور لیڈی آف فاطمہ (تسبیح والی خاتون، ہماری محترمہ فاطمہ) خاتون جنت حضرت بی بی فاطمہؓ کے ذکر پر ایک بات کا اضافہ کرتا چلوں کہ حضرت فاطمہؓ کو تسبیح والی خاتون اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی کو جو تسبیح عطا کی تھی، جو ہم مسلمان ہر نماز کے بعد 33 دفعہ سبحان اللہ، 33 دفعہ الحمد للہ اور 34 دفعہ اللہ اکبر پڑھتے ہیں، یہ تسبیح حضرت فاطمہؓ سے منسوب ہے۔ اور تیسری پیش گوئی غالباً وہی ہے۔ 112ویں پوپ جو آخری ہوگا جو انہوں نے چھپالی ہے۔ اب عیسائیوں کا 111واں پوپ ہے۔ پُراسرار مذہب، مریم کے خان پر اسرار تنظیم فری میسن کے شیطانی منصوبے سے پردہ اُٹھا رہی تھیں۔ ویسے یہ شیطانی تنظیم دجال کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کر رہی ہے اور فری میسن والے 2012ء سال کو انتہائی اہمیت کا حامل قرار دے رہے ہیں۔ ویسے بھی ان کا سرپرست اعظم امریکا بھی فرما رہا ہے کہ 2012ء کو ہونے والے واقعات تاریخ بدل دیں گے۔ قاطع سحر، وہ کون، لنکن کا بھوت، آسیبی قلعہ، حیات بعد الموت، گورکھ مل، سورج کا رقص، پراسرار مذہب، بدروح، دلدل، قبر گزیدہ، عامل یہ سب اتنی زبردست تحریریں لکھنے پر ان رائٹروں کو تعریفی اسناد جاری کی جائیں جو ان کے لیے ایک یادگار اعزاز ہو۔ پُراسراریت نمبر کی پوری ٹیم کو عشائیہ بھی دیا جائے۔ آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ یہ موضوع اتنا وسیع ہے تو ہم آخر میں آپ کو ایک مشورہ دیں گے کہ زندگی کے کسی بھی موقع پر کسی اور شکل میں اس سلسلے کو خوفناک نمبر، حیرت انگیز نمبر یا پھر ناقابلِ فراموش نمبر کے نام سے نکالا جائے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ آخر میں شہر خیال پر ایک نظر۔ سب سے پہلے خالد کبیر صاحب زبردست تبصرے کے ساتھ حق ادا کرتے نظر آئے۔ سالانہ رپورٹ بھی خوب تھی۔ ایسے میں ہمیں شہر خیال کے پرانے ساتھی علی حسنین بھٹی یاد آ گئے۔ ملک جاوید سرکانی درانی اور انتساب عباس صاحب کی اس فرمائش کی ہم بھرپور تائید کرتے ہیں کہ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی کی سوانح حیات شائع کی جائے۔ جس دن سے سمیرا تبسم سمیرا ساجد ہوئی اسرار کے پردے میں کھوگئی۔ سہیل احمد

عباسی اور ملک [illegible] ایڈووکیٹ صاحب، آپ کی غیر حاضری پریشان کیے ہوئے ہے۔"

✉ سلیم رشید کا تجزیہ، لاہور سے "سرگزشت کا ہر شمارہ ماشاء اللہ باکمال اور نئی نئی تحریروں سے مرصع ہوتا ہے۔ میں سرگزشت کا قاری اشاعتِ اوّل سے ہوں۔ (دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید) کیونکہ مجھے فلموں کی معلومات سے دلچسپی ہے۔ پہلے میں دیگر پاکستانی فلمی پرچوں سے معلومات حاصل کرتا تھا اور اب جناب آفاقی صاحب نے مزید فلمی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور جو مواد فلمی شخصیات کا سرگزشت نے مہیا کیا ہے، وہ کسی دوسرے رسالے سے حاصل نہیں ہوا۔ پچھلے دنوں ایک فلمسٹار شاہد کے بارے میں ان کے برخوردار جو کہ ایک ٹی وی چینل پر لوگوں کی کھنچائی کرتے نظر آتے ہیں، اپنے والد صاحب کی ایک بیوی کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ سرگزشت نے آشنا کے قلم سے میں فلمسٹار شاہد کی شادی زمرد، بابرہ شریف اور عشرت چوہدری وغیرہ سے ظاہر کی تھیں۔ اس سلسلے میں جناب آفاقی صاحب صحیح وضاحت فرما سکتے ہیں۔ اب رسالے میں مضامین کے سلسلے میں تحریر ہے کہ پُراسراریت نمبر 2 بہت خوب ہے اور ہر صفحہ اپنا تاثر چھوڑتا ہے۔ آسیبی قلعہ اور ابراہم لنکن کا بھوت حیران کرنے والی تحریریں ہیں۔ وہ کون، تحریر کے بارے میں معلومات موجود ہیں اور اس کا تجزیہ بہتر انداز میں کیا گیا ہے۔ حیات بعد الموت بھی انسان کو آئندہ زندگی سے آگاہی ہے۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کردہ واقعات کی سچائی کی شہادت غیر مسلموں نے کر دی ہے۔ فلمی الف لیلہ میں پُراسرار فلموں کا ذکر اچھا لگا لیکن انڈیا کی پرانی فلم "مینا زندہ" بھی ایسی فلموں میں شمار ہوتی ہیں۔ پاکستانی فلم گھونگٹ بھی محل کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ دسمبر میں انڈو پاک کے عظیم اداکار دلیپ کمار (یوسف خان) کی سالگرہ تھی لیکن ان کے بارے میں کچھ تحریر نہیں کیا گیا۔ (پہلے ہی بہت لکھا جا چکا تھا) اب فروری میں مدھو بالا ممتاز بیگم مرحومہ کا جنم دن اور وفات کا دن آ رہا ہے۔ امید ہے آفاقی صاحب ضرور ایک جاندار فیچر تحریر کریں گے اور دیو آنند کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ ان کا دور بھی بہت شاندار تھا۔ ان پر مضمون لکھا جانا چاہیے تھا (زیر نظر شمارے میں حاضر ہے) پاکستان میں آج کل جو بھارتی فلمیں چل رہی ہیں وہ عریانی اور فحاشی کا پرچار ہے۔ جس کو دیکھتے ہوئے پاکستانی ڈرامے بھی اس ڈگر پر چل رہے ہیں اور پرانے ہیرو اب بڑھاپے کی عمر میں ہونے کے باوجود ذاتی پروڈکشن میں نوخیز لڑکیوں کو کاسٹ کر کے ایسے سین کرتے ہیں جن کو گھروں میں فیملی کے ساتھ دیکھنا لوگ پسند نہیں کرتے۔ لیکن وہ لوگ اینکر بھی بنے ہوئے ہیں۔ عمر شریف صاحب جو کہ ساٹھ سال سے زیادہ ہیں، اپنے پروگرام کا افتتاح بھی دائیں بائیں نوجوان لڑکیوں کے ہاتھ پکڑ کر تشریف لاتے ہیں۔ اسی طرح کے پروگرام پاکستانی نوجوان نسل کی رگوں میں گندگی کا زہر بھر رہے ہیں۔ انڈین کلچر فلموں کے ذریعے پہلے ہی لوگوں کے گھروں میں داخل ہو چکا ہے۔ ان کے ڈراموں میں اپنے بھگوان کی پوجا ضرور موجود ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارے ڈراموں میں بڑی عمر کے اداکاروں کے ساتھ جوان لڑکیوں کے آمیز دکھائے جاتے ہیں یہی نہیں ہمارے ٹی وی کے سینئر اداکار بھی روپیہ کمانے کے لیے ایسے ایسے کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستانی فلموں کا تو پہلے ہی دور ختم ہو چکا ہے۔ اب ڈراموں کی یکسانیت سے لوگ پاکستانی ڈراموں سے بھی باغی ہو جائیں گے۔"

✉ محسن علی موسم کی بالاکوٹ سے حوصلہ افزائی "سال نو کا شمارہ 29 تاریخ کو ملا۔ ابتدا ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر سے کی۔ ذوالقرنین کے بارے میں کافی معلومات ملیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے یا کوئی ولی اللہ، اس کے بارے میں سلف میں اختلاف ہے اور کسی مستند حوالے کے بغیر انہیں نبی کہنا بھی ٹھیک نہیں۔ لنکن کا بھوت ایک دلچسپ تحریر تھی، امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں اس طرح کے واقعات اور اوپر سے وہ بھی وائٹ ہاؤس میں، حیرت انگیز۔ ویسے بھی اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لنکن کو ابھی تک صدارت کا شوق ہے جو وہ وائٹ ہاؤس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے اور امریکا دنیا کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ایسی تحریر پیش کرنے پر ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری مبارک باد کی مستحق ہیں۔ محو حیرت ہوں قارئین کی جانب سے لکھے گئے تمام واقعات ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ سورج کا رقص، پرتگال کے گاؤں میں جو "آور لیڈی آف فاطمہ" نظر آئیں، حقیقت میں نہ تو خاتون جنت ہو سکتی ہیں اور نہ ہی مریم۔ پرتگال کے گاؤں میں جو کچھ ہوا وہ نظر کا فریب تھا یا کچھ اور لیکن یہ ایک یقینی امر ہے کہ نظر آنے والا وجود نہ تو خاتون جنت تھیں اور نہ ہی کنواری مریم (لیکن اب بھی وہاں لوگوں کی مرادیں پوری ہوتی ہیں اور بہت بڑی تعداد میں لوگ وہاں پہنچتے ہیں مگر افسوس...... جانچنے پرکھنے ہمارا کوئی نہیں جاتا) سراب بھی خوب جارہی ہے۔"

✉ علی محمد وفا بروہی کی باہو کھوسہ سے سخن آرائی "پانچ چھ ماہ بعد شہر خیال کی بزم میں خط لکھ رہا ہوں۔ مہربانی کر کے سرگزشت کو وقت پر مارکیٹ میں لائیں (تاریخ تبدیل ہو گئی ہے اس لیے سرگزشت اب 27 کو ہی ملا کرے گا) نئے سال کا خوبصورت تحفہ پراسراریت نمبر 2 کی صورت میں ملا جو کہ ایک انمول اور خوبصورت تحفہ ثابت ہوا۔ موسم سردی کا ہو اور یخ بستہ رات اور سنسناتی ہوا کی سرسراہٹ اور خاموشی کے عالم میں لحاف میں لیٹ کر سرگزشت کا مطالعہ کرنے میں جو مزہ اور سرور ہے، اس کیفیت کو الفاظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ پُراسراریت نمبر 2 اسرار اور پرحیرت اور ششدر کرنے والے واقعات سے بھرپور تھا جس کو صرف دو راتوں کے مطالعے میں پورا کیا۔ وہ کون؟ بڑا ہی حیرت ناک مضمون تھا۔ لنکن کا بھوت مزہ دے گیا۔ آسیبی قلعہ، حیات بعد الموت، محو حیرت ہوں، گورکھ مل اور سورج کا رقص وہ کہانیاں ہیں جنہیں مدتوں تک یاد رکھا جائے گا۔ سچ بیانیوں میں ایمان فروش، عذاب کا گڑھا اور قبر گزیدہ دلوں کو چھو لینے والی کہانیاں تھیں۔ مجموعی طور پر سرگزشت پُراسراریت نمبر 2 بے مثال، لاجواب اور شاہکار معلومات اور واقعات کا مجموعہ تھا۔ جس کے لیے مبارک بادیں قبول ہوں۔"

✉ رانا محمد شاہد کا تبصرہ، بورے والا سے "جنوری 2012ء کا شمارہ پُراسرار کہانیاں لیے ہوئے تھا۔ اداریے میں ایک تلخ حقیقت کی طرف توجہ مبذول

کرائی گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں کسی سے کوئی خطرہ نہیں، ہمیں اگر خطرہ ہے تو صرف اپنے آپ سے۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے لیکن حوصلہ نہیں۔ حوصلہ ایمان داراور اپنے ملک سے وفادار ہونے کا۔ جس طرح خوف باہر نہیں انسان کے اندر ہوتا ہے، اسی طرح خطرہ بھی باہر نہیں ہمارے اندر موجود ہے۔ یک صفحی سرگزشت نے ایمان تازہ کیا۔ اللہ کے حقیقی اور سچے بندے کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا اس لیے کہ اس کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے۔ شہرِ خیال میں خالد کبیر نے بڑی تفصیل سے 2011ء کے 12 شماروں کا تجزیہ پیش کیا۔ محمد عظیم شاہ بخاری، آپ کی طرح میری تاریخ پیدائش بھی دسمبر کی ہے۔ کولمبس کے حوالے سے آپ نے بالکل صحیح کہا کہ قصور ایجاد یا دریافت کرنے والوں کا نہیں ہوتا بلکہ اس کے استعمال کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ رانا محمد سجاد، محمد عظیم شاہ بخاری، ایم اے خالق بھٹی، جاوید احمد صدیقی اور ناصر حسین رند صاحب کا مشکور ہوں، نکاح کی مبارک باد دینے پر۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق لائقِ تحسین ہے۔ سابق امریکی صدر ابراہام لنکن کے حوالے سے ڈاکٹر روبینہ نفیس کا مضمون لنکن کا بھوت ایک دلچسپ تحریر تھی۔ انشاء اللہ میں بھی جلد ابراہام لنکن کے حوالے سے ایک منفرد مضمون بھیجوں گا (یاد رہے کہ لنکن کے صرف مخفی گوشے ہی حوالہ جات کے ساتھ لکھیں گے) ابن کبیر کی تحریر آسیبی قلعہ بھی بھرپور دلچسپی لیے ہوئے تھی۔ حیات بعد الموت احسان قریشی کی اس تحریر نے سوچ کے بہت سے در وا کیے۔ پُراسرار عمارتیں بھی معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ محوِ حیرت ہوں میں لکھاریوں نے مختصر حیرت انگیز واقعات سے رنگ بھرے۔ ذوالفقار ارشد گیلانی اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ دونوں تحریریں اپنے اندر پُراسراریت سموئے ہوئے تھیں۔ سرگزشت کی یہی خوبی ہے کہ اس میں دنیا جہاں کی حیرت انگیز اور دلچسپ معلومات ہوتی ہیں۔"

☒ **محمد نثار بٹ** کی موضع حمید تحصیل جنڈ و اٹک سے خوش چینی "جنوری کا اداریہ فکر انگیز تھا۔ ان دنوں ہماری پوری قوم ذہنی، جسمانی اور روحانی اذیتوں کا شکار ہے۔ کیونکہ پورا ملک ایک نازک دور اہے پر کھڑا ہے۔ اس غیر یقینی صورت حال میں اگر ہم نے نظم وضبط رواداری فکر و تدبر سے کام نہ لیا تو حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ جناب ساجد امجد صاحب ذوالقرنین کا زندگی نامہ لائے جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ تمام روئے زمین پر چار بادشاہوں نے حکومت کی جن میں دو اہلِ ایمان حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ذوالقرنین تھے جبکہ دو کافر بخت نصر اور نمرود تھے۔ جبکہ پانچویں حضرت امام مہدی علیہ السلام اس امت میں آئیں گے جن کی حکومت پوری روئے زمین پر ہوگی۔ آپ نے طویل عمر پائی ایک روایت کے مطابق ذوالقرنین کی عمر سولہ سو برس تھی بیت المقدس کے قریب قریہ زور میں وفات پائی۔ سورج کے دونوں قرنوں یعنی مشرق ومغرب کی سیر کی وجہ سے ذوالقرنین کا لقب پایا۔ ذوالقرنین کے تین سفر قرآن مجید کی سورہ کہف میں موجود ہے۔ آسیبی قلعہ، پُراسرار عمارتیں، گورکھ ال بھی پسند آئیں۔ لنکن اور سورج کا رقص بہترین رہیں۔ ایمان فروش ایک بہت ہی عبرت انگیز اور پُراثر سچ بیانی تھی۔ دینی اصولوں کو بھلا کر دنیاوی کامیابی کو ہی اپنا مطمع نظر بنا لینے والے بے حمیت اور بے ضمیروں کا انجام ایسا ہی عبرتناک ہوتا ہے۔ عذاب کا گڑھا بھی سبق آموز کہانی تھی جبکہ عامل بھی پسند آئی۔ عطاری صاحب پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی کرم نوازی ہے اور انہیں دین ودنیا کی دولت وافر میسر ہے۔ ان سے طالب دعا ہیں۔ شہرِ خیال میں محترم خالد کبیر صاحب کی سالانہ رپورٹ دیکھ کر ہمایوں دین پوری صاحب یاد آگئے۔ ان کی خیریت مطلوب ہے۔ جبکہ یونس بلوچ صاحب اور عبدالرؤف عدم صاحب بھی کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں۔ محترم ملک محمد جاوید درانی صاحب کی تجویز "نابینائی نمبر" اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا صاحب کی سوانح عمری کی فرمائش ہم بھی احتساب عباس کی طرح کرتے ہیں اور سید محمد عظیم شاہ بخاری صاحب کے مطالبے کی حمایت کرتے ہیں کہ پڑوسی ملک سے روابط میں احتیاط ضروری ہے۔"

☒ **غلام یٰسین نوناری**، چوک سرور شہید سے لکھتے ہیں "پُراسراریت نمبر میں اس بار خوفناک اور ڈراؤنی کہانیاں پڑھ کر شدید خوف محسوس ہوا۔ سچ بیانی دلدل پڑھ کر تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل دہلا دینے والی کہانی تھی جس میں شمو کا کردار ہولناک اور کراہیت لیے ہوئے تھا۔ عامل ویسے تو اچھی تحریر تھی لیکن ایک بات نے اُلجھن میں ڈال دیا۔ اللہ کے سچے ولی اپنی ایسی باتیں مشہور نہیں کرتے لیکن پروفیسر صاحب نے آخر یہ تحریر کس مقصد کی خاطر تحریر کی؟ (اسی وجہ سے تو انہوں نے اپنا تعارف مخفی رکھا اور سختی سے منع کیا کہ نام اور مقامات تبدیل کر دیے جائیں۔ صرف عبرت کے لیے شائع کرائی ہے) ویسے یہ کہانی ایمان افروز اور عبرت لیے ہوئے تھی۔ دوسری کہانی بھی متاثر کن تھی۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو خدائے بزرگ و برتر نے اپنے احکامات مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں بھیجا۔ مگر آج ہم اسے پڑھنے اور سمجھ کر عمل کرنے کے بجائے اس کو اپنے مقدمات میں استعمال کرتے ہیں، جھوٹے قرآن اُٹھاتے ہیں جو کہ سراسر گناہ ہے۔ جن گزیدہ بھی پُراسرار اور عجیب واقعات پر مشتمل تھی۔ ایک جن کسی لڑکی پر عاشق ہوتا تو سن رکھا تھا مگر اس کی کیفیات کے متعلق اس سچ بیانی سے علم ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کسی انسان کو ایسی مصیبت میں نہ ڈالے۔ عذاب کا گڑھا عبرت آمیز کہانی تھی۔ قبر گزیدہ میں بے روزگار نوجوان انجانے میں مردوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔ اگر اسے بزرگ نہ ملتے تو وہ موت کی دلدل میں جا گرتا۔ بمبئی کے شاہ جی ایک انوکھے کردار کے مالک تھے جو ایک چیک لکھتے اور وہ کیش بھی ہو جاتا۔ ایسے عجیب غریب واقعات اکثر وبیشتر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ سراب بھی اچھی جا رہی ہے۔ کرشل جادو مختصر مگر معلوماتی تحریر تھی۔ بدروح پڑھ کر خوف نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گورکھ ال اور سورج کا رقص معلومات سے بھرپور تھیں۔ لنکن کا بھوت دلچسپ واقعات کا مجموعی تھی۔ امریکی صدر ابراہیم لنکن کے بھوت کو بار بار دیکھا گیا، یہ حیرت ناک انکشاف تھے، ڈاکٹر روبینہ نفیس نے کمال کر دیا۔ وہ کون میں ذوالقرنین کے متعلق تحقیق وجستجو کی گئی۔ نادر اور اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ حیات بعد الموت ناقابلِ یقین تحریر تھی۔ قاطع سحر میں حضرت معین الدین چشتیؒ کے متعلق مختصر معلومات پیش کی گئیں۔

الغرض پُراسراریت نمبر 2 منفرد اور اعلیٰ مضامین پر مشتمل تھا۔ بے حد پسند آیا۔"

☒ **رانا محمد سجاد** کا خط، نواں شہر مظفر گڑھ سے "سال 2011ء ادب وفن کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل رہا۔ خصوصاً ادب کے حوالے سے یہ سال کافی اہم سمجھا گیا۔ منشا یاد، حمید اختر، اے حمید، ہم سے بچھڑے فن کے حوالے سے لیجنڈ معین اختر، جمیل فخری کا ساتھ بھی ہم سے چھوٹ گیا۔ سرگزشت کے حوالے سے یہ سال کافی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ عرصہ دراز کے بعد کوئی خاص نمبر دیا "پُراسراریت نمبر" جس کی قارئین نے کافی پذیرائی کی۔ ذاتی طور پر میرے لیے سرگزشت کے حوالے سے یہ سال بہت یادگار سال رہا کیونکہ اس سال سرگزشت کے پُرانے شمارے پڑھنے کو ملے جن میں خصوصی شمارہ "جمیل نمبر" ہفتہ قبل ختم کیا ہے۔ بہت خوبصورت نمبر تھا۔ اور بابا بلھے شاہ کے حوالے سے شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ تھا کہ جنوری کا شمارہ مل گیا۔ اس لیے اس کو چھوڑ کر اس کا مطالعہ کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولوی عبدالحق، عثمانی خلیفہ عبدالحمید کی سرگزشت بھی پڑھنے کو ملی۔ وسیم اکرم کی سرگزشت بھی اسی سال پڑھنے کو ملی۔ اب آتے ہیں اگست کے شمارے کی طرف جو کہ پُراسراریت نمبر تھا۔ اور اس کا اگلا حصہ جنوری کو شائع ہونا تھا۔ بہت شدت سے انتظار تھا کیونکہ پچھلے پُراسراریت نمبر کی وجہ سے اس کا بہت بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ معراج صاحب موجودہ صورتِ حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ لیکن میں ان کی باتوں میں ایک اور بات کا اضافہ کروں گا کہ وطنِ عزیز کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے وطن کے لوگوں سے ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں حضرت معین الدین چشتی اجمیری کا تذکرہ تھا۔ شہرِ خیال میں حاضری دی، خالد کبیر سالانہ رپورٹ پیش کر رہے تھے۔ آپ کی محبت قابلِ تحسین ہے۔ بہترین خطوط لکھنے پر میری طرف سے اعجاز حسین سٹھار کو مبارک باد۔ خواتین کی شمولیت کا تذکرہ ہوا تو ایک بات ضرور کہوں گا کہ خواتین کی اکثریت تاریخی اور تحقیقی ماہنامے کم ہی پڑھتی ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں کہ خواتین کا تناسب 15 فی صد رہا۔ (تو یوں کہیے کہ خواتین کا ایسا حلقہ بھی موجود ہے جو تحقیقی، تاریخی اور ادبی مضامین کو پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اپنی صنف میں ایک اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں) انور اعجاز خان کی خیریت قارئین سرگزشت کو بھی مطلوب ہے۔ سید محمد عظیم شاہ بخاری رات کو کمبل اوڑھ کر سرگزشت پڑھنے کا ذکر کیا لیکن ایک بات بھول گئے کہ ساتھ ساتھ بجلی بھی ضروری ہے جو کہ حکومت کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے دن بہ دن کم ہو رہی ہے۔ ملک جاوید سرکانی صاحب، آپ کا مشورہ قابلِ غور ہے۔ بہت اچھا دیکھتے ہیں کب تک اس پر عمل ہوتا ہے۔ جویریہ قاضی، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ جی اے مغل صاحب، تبصرے پر آپ کے خیالات سر آنکھوں پر، کوشش کروں گا کہ بہتر سے بہتر تبصرہ کر سکوں۔"

☒ **سید قیصر علی** نے خط میں نیو کراچی کا پتا دیا ہے مگر لفافہ جاپان سے بذریعہ ڈاک آیا ہے "جناب رب کے کرم سے میں خیریت سے ہوں اور تمام مسلمانوں کی خیریت کے لیے دعا گو ہوں۔ آپ کے رسالے پڑھنے کا اتفاق ہوا بہت پسند آیا۔ اسی وجہ سے اپنی زندگی کی ایک چھوٹی سی کہانی لکھ کر ارسال کر رہا ہوں اگر موزوں لگے تو اپنے رسالے میں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔" (آپ کی کہانی میں کوئی نیا پن نہیں ہے، اس لیے معذرت)

☒ **محمد افضل اعوان** کی گوجرہ سے تشریف آوری "جناب عرض یہ ہے کہ میں عرصہ دراز سے آپ کے ماہناموں کا مستقل قاری ہوں۔ سسپنس، سرگزشت، جاسوسی ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک دوسرے رسالے میں میری مختلف تحریریں، غزلیں، نظمیں، لطیفے، کہانیاں وغیرہ شائع ہوتی رہتی ہیں مگر وہ ادبی سیاسی، اصلاحی کہانیوں کو شائع نہیں کرتے۔ جبکہ آپ کا سرگزشت ان تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ میرے پاس دو کہانیاں ہیں، ایک فروری کے مہینے کے لیے بہت اچھا موضوع ہے۔ جس کا نام میں نے ویلنٹائن ڈے رکھا ہے۔ جبکہ دوسری کہانی مارچ کے مہینے کے لیے اچھا موضوع ہے۔ جس کا نام میں نے اپریل فول رکھا ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یکم اپریل کو لوگ اپریل فول مناتے ہیں۔ اپنی طرف سے میں نے بہت اچھا لکھا ہے اگر آپ شائع کرنے کے لیے تیار ہیں تو میں بھیج دیتا ہوں۔" (اگر سچی اور عمدہ انداز میں لکھی گئی ہے تو بھیج دیں)

☒ **عاطف نعمان شاہ**، مخدوم عالی، لودھراں سے مرقوم ہیں "میں پہلے دن سے سرگزشت کا قاری ہوں لیکن پہلی بار خط لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ جس کی وجہ پُراسراریت نمبر کی پسندیدگی ہے۔ آپ کے اداریے سے لے کر آخری سچی کہانی دلدل تک کیا خوب اور اسرار سے بھرپور تحریریں تھیں، کس کس کی تعریف کی جائے۔ میں مہینے دو مہینے بعد سنگاپور آتا جاتا رہتا ہوں۔ اس بار موسم سرما اپنے گاؤں مخدوم عالی میں سرگزشت کے سنگ گزر رہی ہے۔ شدید ٹھنڈ اور دھند کے حسین امتزاج میں پُراسراریت نمبر پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ شہرِ خیال کی محفل کیا خوب ہوتی ہے۔ آپ کے شہرِ خیال کے بہترین لکھاری آج کل یا تو بہت کم نظر آتے ہیں جیسے کہ ناصر حسین رند، ایم اے خالق بھٹی، اعجاز حسین سٹھار وغیرہ۔ آخر میں آپ سے گزارش ہے کہ اگر اس سلسلے کو ایک اور شمارے پر محیط کر دیا جاتا تو مزہ و لطف رنگین ہو جاتا کیونکہ یہ شمارہ بہت زبردست تھا۔ یوں تو پُراسراریت نمبر ایڈونچر سے بھرپور تھا مگر سرورق پُراسراریت نمبر سے میل نہ کھا رہا تھا۔ اگر ان لوگوں کا ایک اور نمبر کا وعدہ کریں تو میں ایک مضمون "وادی جن" روانہ کر دوں گا۔"

الحمد سے موصول ہونے والے خطوط: محمد نذر الاسلام سرکانی، ڈی جی خان۔ ٹی گلزار، پشاور۔ نعمان خالد، حیدر آباد۔ نزہت پروین، فیصل آباد۔ ناہید اقبال، خان پور۔ عابد صالح، جہلم۔ فرحت قریشی، عباس احمد، فتح خان۔

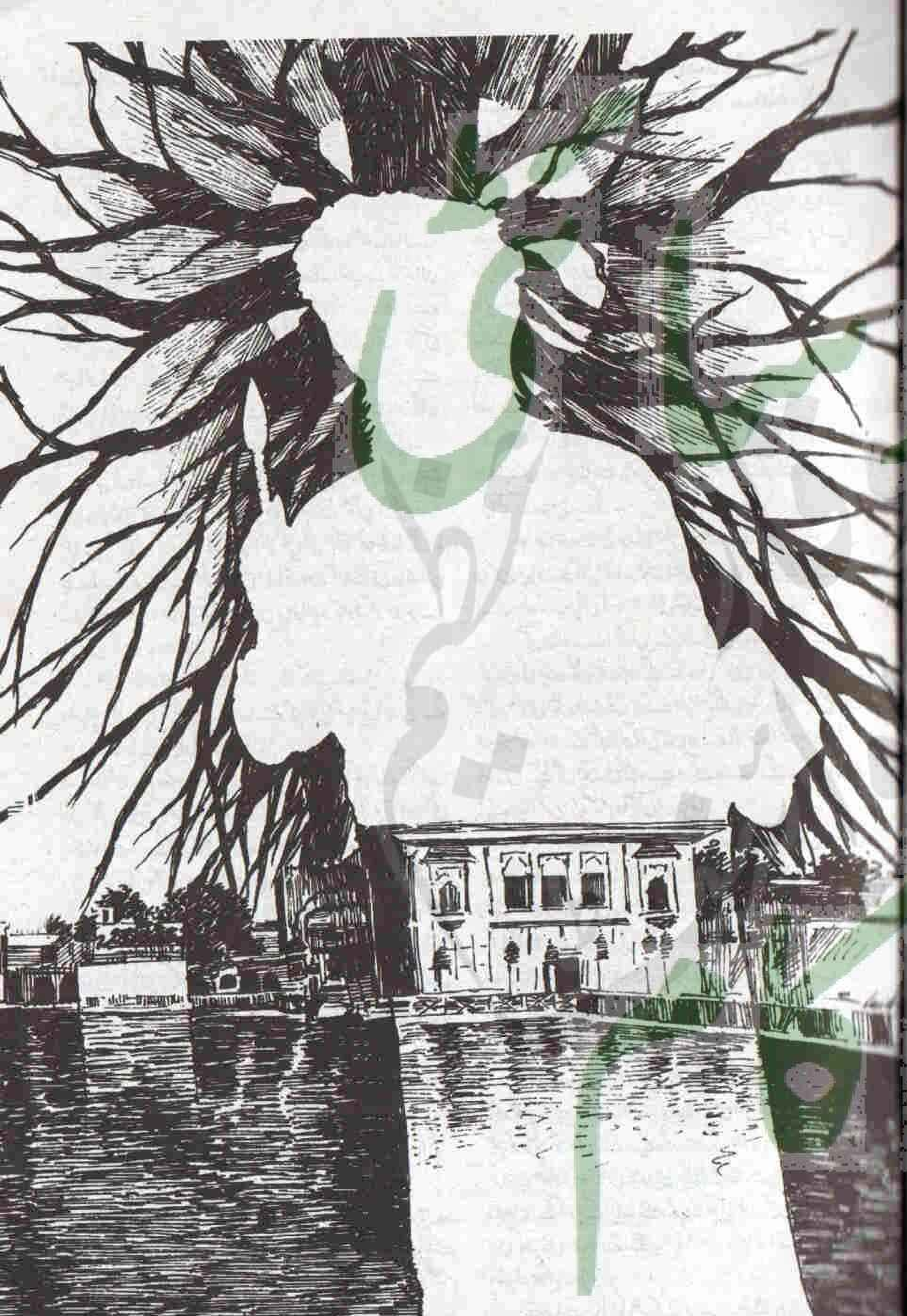

فخرِ سخن

ڈاکٹر ساجد امجد

ڈیڑھ صدی قبل کے ایک یگانہ روزگار، گراں مایہ شاعر کا احوال زیست جس کی مادری زبان بنگلہ تھی، جہاں وہ پیدا ہوا تھا وہاں دور دور تک کسی اردو داں کا وجود نہ تھا مگر جب وہ گیسوئے اردو سنوارنے پر آیا تو درجۂ کمال پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی خیال آفرینی کا سکہ اس طرح جاری کیا، ایسی شاعری کی کہ لکھنو اور دلی کے سکہ بند شعرا بھی اس کے معترف ہوگئے۔ مرزا غالب جیسے اساتذہ بھی قدرآفرینی میں رطب اللسان نظر آئے۔ اس نے لکھنو تا دہلی اک دھوم مچادی۔ نہ صرف شاعری بلکہ فنِ تنقید میں بھی مقام بنایا۔ تاریخِ ادب اردو ایسی لکھی کہ آج بھی اسے ایک مقام حاصل ہے۔

ایک باکمال شاعر کا بے مثال زندگی نامہ

کہاں بغداد کہاں دہلی۔

فاصلے کتنے ہی دراز ہوں، منزلت کے متلاشی ”ہانپتے جائیں اور چلتے جائیں“ کا کھیل کھیلتے ہی رہتے ہیں۔ اس قافلے میں بھی چند ایسے لوگ گھل مل گئے تھے جو نہ تاجر تھے، نہ تلوار باز اور نہ زمانہ ساز۔ بس انہیں علم وفضل پر ناز تھا اور انہوں نے ناز بردار کی تلاش میں ہی بغداد سے ہندوستان کی طرف کمر ہمت باندھی تھی۔

ہندوستان قریب آیا تو سنا دہلی پرستان ہے، دراصل یہی ہندوستان ہے تو ایک مسافر شاہ عین الدین نے اپنے عیال سمیت قافلہ چھوڑ دیا کہ گوہر مقصود ملے گا تو یہیں ملے گا۔

قران ثانی شہنشاہ شاہ جہاں کا زمانہ تھا۔ زمانہ کیا تھا، فارغ البالی کا خزانہ تھا۔ لوگ سونا اُچھالتے تھے، کوئی لوٹنے والا نہیں تھا۔ چوروں کا کال تھا۔ جو بھی تھا وہ مالا مال تھا۔ ہر طرف عمارتیں کھڑی مسکراتی تھیں۔ باغ تھے، سیرگاہیں تھیں، غرض جو سنا تھا اس سے سوا تھا۔

ابھی فاصلوں کی دھوپ ڈھلی نہیں تھی، سفر کی صعوبتوں نے تھکن اُتارنے کا حکم نہیں دیا تھا کہ شاہ عین الدین کا انتقال ہوگیا۔

ان کے صاحب زادے عبدالرسول نے دربارِ شاہی تک رسائی کی۔ قدر دانی کے پھولوں میں تلنے کے دن آگئے تھے۔ ذرا جو شہنشاہ کی نظروں میں چڑھے تو دہلی سے آگے بڑھے۔ بادشاہ نے عہدۂ قضائے سرکار پر متمکن کیا اور بنگال جانے کو کہا۔ ضلع فرید پور میں جاگیر عطا ہوئی۔

بنگال اس وقت صوفیہ کی سرزمین کہلاتا تھا۔ فاتحین بعد میں آئے، صوفیائے کرام ان سے پہلے آگئے تھے۔ ہر گاؤں، ہر قصبہ رشد وہدایت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مقامی زبان بنگالی تھی لیکن سرکاری کام فارسی سے نکل رہے تھے۔ ایک نئی زبان ریختہ یا اردو بھی رائج ہوگئی تھی۔ صوفیائے کرام کی تبلیغ اور فاتحین کی آمد نے مقامی زبان اور بیرونی زبانوں کے اشتراک سے ریختہ تیار کردیا تھا۔

عبدالرسول اہم عہدے پر فائز تھے۔ فارسی اور عربی سے آشنا تھے لہٰذا زبان کی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بنگالی بھی سیکھتے رہے اور اردو بھی بولتے رہے۔ یہ علاقہ شمالی ہندوستان سے دور تھا اس لیے ریختہ کی رفتار دھیمی تھی لیکن تھی ضرور۔

جب عبدالرسول نے اسی سرزمین کو مستقل سکونت کے لیے منتخب کرلیا تو شادی کی صورت پیش آئی۔ ایک مقامی صوفی قطب عبدالرحمٰن دانش مند ایک مقدمے کے سلسلے میں عبدالرسول کے پاس آئے اور آپ کی اہلیت وقابلیت سے

اتنے متاثر ہوئے کہ اکثر ملاقات کے لیے آنے لگے۔

بہت جلد یہ دوستی قرابت داری میں بدل گئی۔ صوفی صاحب نے بر بنائے نیک چلنی وراست بازی اپنی بیٹی کی شادی ان سے کردی۔ یہ لڑکی فتح آباد کے ایک زمیندار کی نواسی تھی۔

عبدالرسول کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے قاضی عبدالوہاب مسند قضا پر مقرر ہوئے۔ اب یہ خاندان بنگال کا معزز اور دولت مند خاندان تھا چنانچہ بڑے سے بڑے گھرانے میں رشتہ لے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ قاضی عبدالوہاب نے رئیس موضع راجا بنی کی دختر نیک اختر سے شادی کی اور راجا پور میں سکونت اختیار کرلی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی جانب سے انہیں یہاں کچھ زمین کی سند بھی مل گئی۔

یہ نسل آگے بڑھتی رہی۔ قاضی خاندان تعداد میں بڑھتا گیا۔ زمین اور جائداد کی تقسیم در تقسیم نے عیش وعشرت کو خواب وخیال کردیا۔ اب تو اتنا ہی مل سکتا تھا جتنا کمالیا جائے۔ خاندان کے افراد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس خاندان کے بیشتر افراد تلاش معاش میں راجا پور چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں آباد ہونے لگے۔

اس خاندان کے فقیر محمد نے جب شادی کرلی اور راجاپور ان کی امنگوں کے سامنے چھوٹا پڑ گیا تو انہوں نے بیوی کے سامنے اپنا دل رکھ دیا۔

"راجاپور چھوٹا سا قصبہ ہے۔ باپ دادا کی جائداد کب کی ختم ہوگئی۔ ہم گزار لیں گے، ہماری اولاد پر تو اور بھی کڑا وقت آئے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم کلکتہ چلے جائیں۔"

"وہاں کون سی دولت کی بارش ہو رہی ہوگی۔ جو خدا یہاں ہے وہاں بھی ہوگا۔ یہاں اپنے تو ہیں وہاں وہ بھی نہیں ہوں گے۔ غیر ملک، غیر لوگ۔"

"تم نہیں سمجھوگی۔ وہاں انگریزوں کا راج ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہے۔ روزگار کے ہزار مواقع ہیں۔ بڑے شہروں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔"

"وہ تو ہے مگر آپ وہاں جا کر کیا کریں گے، کیا سوچا ہے؟"

"کچھ سوچ کر ہی ارادہ باندھا ہے۔"

"پھر بھی معلوم تو ہو۔"

"تمہارے چچا منشی بقا اللہ کلکتہ میں وکالت کر رہے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ عدالت میں لگالیں گے۔ میری ان سے بات ہوگئی ہے۔ عبداللطیف ابھی چھوٹا ہے۔ کلکتہ میں اس کی تعلیم کے اچھے مواقع بھی میسر آئیں گے۔ بس تم تیاری کرو۔"

"راجا پور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"دل تو میرا بھی نہیں مانتا لیکن آب ودانہ کے لیے درخت بدلنا ہی پڑتا ہے۔"

فقیر محمد کی ضد کے سامنے وہ بھی مجبور ہوگئیں۔ فقیر محمد انہیں لے کر کلکتہ آگئے۔ منشی بقا اللہ نے داماد کو دیکھ کر مدد کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔ عدالت میں اپنے نائب کے طور پر اپنے ساتھ رکھ لیا۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے عبداللطیف کو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل کرادیا۔ ان دنوں نیا مضمون "انگریزی" مدرسے میں متعارف ہوا تھا۔ مسلمان لڑکوں نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا لیکن فقیر محمد کی روشن خیالی نے اپنے بیٹے کے نصاب میں اس مضمون کو شامل کیا۔ دوراندیشی نے دیکھ لیا تھا کہ یہی مضمون آئندہ کام آنے والا ہے۔ انگریزوں کی عمل داری بس نزدیک ہے۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے انگریزی کی ضرورت پڑے گی۔

جدید ہندوستان پوری حشر سامانیوں کے ساتھ کلکتہ میں دامن پسارے کھڑا تھا۔ کلکتہ انگریزوں کا مرکزِ تہذیب تھا، اسے دیکھ کر یہ خیال آجانا لازمی تھا۔

منشی بقا اللہ کے انتقال کے بعد ججوں کی وساطت سے فقیر محمد ان کی جگہ وکیل مقرر ہوگئے۔ آمدنی بھی بڑھ گئی اور کلکتہ کے اعلیٰ حلقوں میں متعارف ہوئے اور ہم نشیں ہونے کا موقع ملا۔ ان کا شمار کلکتہ کے مشہور لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ انگریزوں میں وہ اس لیے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے کہ ان کا ایک بیٹا انگریزی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

انہوں نے تین شادیاں کی تھیں۔ 1834ء میں تیسری بیوی کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ فقیر محمد نے اس بیٹے کا نام عبدالغفور رکھا۔ اس وقت کون جان سکتا تھا کہ یہ ذات گرامی کیا کارنامے انجام دیں گے۔ اس وقت تو بس یہی کہا جاسکتا تھا کہ بڑھاپے میں اللہ نے اولاد دی ہے یا پھر یہ کہ سب سے زیادہ محبت اسی کے حصے میں آئی کہ تمام بہن بھائیوں میں چھوٹا بھی تھا اور بڑھاپے کا پھل تھا۔

کلکتہ مدرسوں اور خانقاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دہلی کی شورشوں سے دور یہاں قدرے سکون بھی تھا۔ وہ پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو اس کے لیے مدرسے کی تلاش ہوئی۔ گھر کے قریب مولوی رمیض الدین چاٹگامی کا مکتب تھا۔ یہ مکتب انہوں نے گھر کے ایک حصے میں قائم کیا تھا۔ تیس چالیس بچے اسی گھر میں سما جاتے تھے۔ عبدالغفور پہنچا تو ایک بچے کا اور اضافہ ہوگیا۔

وہ سات سال کی عمر تک اس مدرسے میں ابتدائی کتابیں

پڑھتا رہا۔ اس کے بڑے بھائی بھی یہاں تعلیم حاصل کرچکے تھے۔ اور اب فرید پور میں اپنی والدہ کے ساتھ رہ رہے تھے (عبدالغفور تیسری بیوی سے تھے) عبدالغفور نے بھی دل لگا کر پڑھنا شروع کردیا تھا کہ تقدیر کو اس کی یہ ادا پسند نہ آئی۔ والد اور والدہ کا آگے پیچھے انتقال ہوگیا۔ اس وقت اس کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بڑے بھائی اس سے چھ سات سال بڑے تھے۔ تعلیم مکمل کرلی تھی اور اب نوکری کی تلاش میں تھے۔

والدین کے انتقال کے بعد وہ تنہا رہ گیا تو بڑے بھائی نے دستگیری کی۔ بڑے بھائی ابھی خود روزگار سے دور تھے۔ اس کی تعلیم کے اخراجات کیسے برداشت کرتے؟ اخراجات برداشت بھی کرلیتے تو وہ کلکتہ میں اکیلا کیسے رہتا؟ وہ اسے اپنے ساتھ فرید پور لے گئے کہ تعلیم کا وہیں کوئی بندوبست کردیا جائے گا۔

وہ یتیمی کا داغ اور تعلیم ادھوری چھوڑنے کا دکھ لے کر فرید پور پہنچ گیا۔ دو سال نہیں گزرے تھے کہ بڑے بھائی عبداللطیف کے ہاتھ ایک ملازمت آگئی۔ وہ جلاوطن اسیرانِ سندھ کے مترجم مقرر ہوئے۔ اس کے لیے انہیں کلکتہ آنا پڑا۔ وہ عبدالغفور کو بھی ساتھ لے آئے۔ وہ ایک مرتبہ پھر کلکتہ آگیا۔ وہ نہ صرف کلکتہ آگیا بلکہ ایک مرتبہ پھر اسی مدرسہ عالیہ میں داخل ہوگیا جسے چھوڑ کر وہ فرید پور گیا تھا۔ گھر پر پڑھانے کے لیے مولوی رضوان علی سلہٹی کا انتخاب کیا گیا۔

یہ مولوی صاحب یوں تو بہت اچھے آدمی تھے، پڑھانے کا طریقہ بھی بہت اچھا تھا لیکن غصے کے تیز تھے۔ بات بات پر بچوں کو بُری طرح پیٹتے تھے۔ ایک روز انہیں عبدالغفور پر بھی غصہ آگیا اور اسے حسبِ عادت مارنا شروع کردیا۔ وہ کچھ دیر تو خاموشی سے پٹتا رہا مگر پھر وہ ایک گستاخی کر بیٹھا۔ اس نے غالباً خود کو چھڑانے کے لیے مولوی صاحب کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ قریب رکھے ایک صندوق پر جاکر گرے۔ یہ حال دیکھ کر وہ بھاگ کھڑا ہوا اور سیدھا اپنی خالہ کے گھر پہنچ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ یہاں اسے تلاش کرلیا جائے گا۔ وہ رات کو تو وہاں رہا لیکن صبح ہوتے ہی ناشتے کے فوراً بعد وہاں سے نکل گیا۔ اسے بھائی کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ ضرور اسے تلاش کریں گے۔ دن بھر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ شام ہوئی تو پھر خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ اب خالہ اس سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ گھر پر کیا بات ہوئی ہے۔ ان کے اس پوچھنے ہی سے وہ سمجھ گیا کہ راز کھل گیا ہے؟ بھائی اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک ضرور پہنچے ہیں اور خالہ کے علم میں تمام بات آگئی ہے۔ اس نے بھی زیادہ دیر جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا اور خالہ کو پوری بات بتادی۔

"تمہیں معلوم ہے تم نے کیا حرکت کی ہے؟ اپنے استاد پر ہاتھ اُٹھایا ہے؟"

"انہوں نے مجھ پر خواہ مخواہ غصہ اُتارا تھا۔"

"پھر بھی تمہیں چپ رہنا چاہیے تھا۔ اگر تمہاری غلطی نہیں تھی تو چھپتے کیوں پھر رہے ہو؟"

"میں بھائی سے ڈرتا ہوں۔"

"معلوم ہے وہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اب اگر وہ یہاں آئیں گے تو میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔"

"خبردار! یہ حرکت مت کرنا۔ وہ رات میں پھر آئیں گے۔ تم ان کے ساتھ چلے جانا۔"

"وہ مجھے ماریں گے۔"

"نہیں ماریں گے۔ میں انہیں سمجھادوں گی۔ بس تم ان سے اتنا کہہ دینا کہ تم سے غلطی ہوگئی۔"

"کہہ دوں گا۔" اس نے بے دلی سے کہا اور بھائی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

عبداللطیف خاں واقعی رات میں یہ سوچ کر آئے کہ عبدالغفور کہیں بھی ہوگا رات میں سونے کے لیے تو خالہ کے گھر پہنچا ہوگا۔ آئے تو بہت غصے میں تھے لیکن خالہ نے سمجھایا تو بھائی کی محبت نے جوش مارا۔ یہ خیال دامن گیر ہوا کہ یتیم ہے، کمسن ہے۔ اگر خالہ کے گھر نہ آتا، کہیں اور نکل جاتا تو کیا ہوتا؟ انہوں نے آگے بڑھ کر خود بھائی کو گلے لگالیا۔ خالہ نے بھی عبدالغفور کی حمایت کی۔

"ان مولوی صاحب کو فوراً تبدیل کرو۔ کوئی بچوں کو ایسے مارتا ہے۔ بچہ اپنے شوق سے پڑھتا ہے مار باندھی سے نہیں پڑھتا۔"

عبداللطیف خاں نے بھائی کو ساتھ لیا اور گھر چلے آئے۔

وعدہ پہلے ہی ہوچکا تھا۔ مولوی رضوان سے پیچھا چھڑانے کے بعد اس کے لیے ایک اور مولوی کا بندوبست کردیا گیا۔ ان کا نام مولوی محمد فیض تھا۔

عبدالغفور ان سے بہت مطمئن تھا۔ ذرا اطمینان ہوا تو اس کی ذہانت کے جوہر کھلتے گئے۔ اس کے ذہن کا یہ عالم تھا کہ صبح کو بعد آموختہ وہ ایک بار سبق پڑھادیتے تھے اور دوسری بار وہ پھر اس سبق کو پڑھ کے سنا دیتا تھا۔ دوسرے دن

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in. just visit www.paksociety.com for complaints and issues send mail at admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

صبح کو ان کو اپنا سبق ازبر کر کے نیا سبق لیتا تھا یعنی تین بار کے پڑھنے میں اسے ازبر ہو جاتا تھا۔ ان مولوی صاحب سے اس نے ''میزان'' اور ''شرح ملا'' تک پڑھی۔

1847ء میں جب اس کی عمر تیرہ سال تھی، بزرگوں کی رائے سے اسے ہُگلی کالج میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کالج میں دو شعبے تھے۔ ایک انگریزی کا شعبہ دوسرا عربی کا۔ اس کے علاوہ اینگلو فارسی کا شعبہ بھی تھا۔ یہ شعبہ ابتدائی درجوں سے تھا۔ یہ ان طلبہ کے لیے تھا جو انگریزی اور فارسی سیکھنا چاہتے تھے۔ عبدالغفور کا داخلہ اسی اینگلو فارسی شعبے میں ہوا۔

وہ اس کالج میں کچھ دنوں تک تو اجنبیت محسوس کرتا رہا۔ پھر اسے اس کالج کے مدرس خواجہ مستقیم کی صحبت میسر آ گئی، خواجہ مستقیم فارسی ادب پڑھاتے تھے اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ عبدالغفور نے کلکتہ میں رہتے ہوئے شاعری کا چرچہ سنا تھا اور اب وہ کسی شاعر کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ شاید پہلی مرتبہ اس کے دل میں خیال آیا کہ اسے شاعر بننا چاہیے۔

یہ خیال اس وقت اور تقویت پکڑ گیا جب ایک روز خواجہ مستقیم نے اس کا امتحان لینے کے لیے کچھ فارسی کے اشعار سنائے اور اس سے ان اشعار کا مطلب پوچھا۔ اس نے مطلب بتایا کہ خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے اور بلا تامل فرمایا کہ تمہاری طبیعت کو شعریت سے فطری مناسبت ہے، اگر کوشش کرو تو خود بھی شعر کہہ سکتے ہو۔

عبدالغفور کا مکان ان کے مکان کے قریب ہی تھا، لہٰذا وہ پابندی سے ان کے گھر جانے لگا۔ وہ بھی اس کے ذوقِ شعریت کو دیکھتے ہوئے شاعری کے رموز و اسرار اسے سمجھانے لگے۔ بہت جلد اسے اصناف شاعری کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ ردیف و قواف سے آگاہی ہونے لگی۔ اوزانِ شاعری کے بارے میں بھی بہت کچھ آگاہی ہو گئی۔

ایک دن وہ اپنی تمام معلومات کو سمیٹ کر شعر کہنے بیٹھ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ شعر کہہ سکتا ہے۔ خواجہ مستقیم کی تقلید میں اس نے بھی یہ شعر فارسی میں کہے تھے اور اس کے نزدیک یہ بھرپور شعر تھے لیکن اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ اشعار استاد کو دکھاتا۔ بہت دنوں تک وہ فارسی میں غزلیں لکھ لکھ کر سنبھالتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے کچھ اشعار اردو میں کہے۔ اسے تعجب ہوا کہ وہ اردو میں بھی شعر کہہ سکتا ہے۔ اردو اس وقت تک بنگال میں متعارف ہو چکی تھی لیکن ادب کی زبان تھی۔ بول چال کی زبان بنگالی تھی۔ اردو ادبی اعتبار سے اتنی ترقی کر چکی تھی کہ لاتعداد شعرا سامنے آ گئے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو درجۂ استادی پر فائز تھے۔ بیرونی شعرا بھی شمالی ہندوستان کے خراب حالات کی وجہ سے بنگال کا رُخ کر رہے تھے۔ ان کی آمد سے ایک مقابلے کی فضا پیدا ہو گئی تھی جو مقامی شعرا کو اردو شاعری پر اُکسا رہی تھی۔

☆☆☆

یادش بخیر بنگال میں (اٹھارویں صدی کی ابتدا میں) نواب علی وردی خاں نے ایک آزاد ریاست قائم کر لی تھی جس کا دلی سے برائے نام تعلق تھا۔ ان کے تدبر اور سیاست دانی نے بنگال میں سکون و اطمینان اور فارغ البالی بھی پیدا کر دی تھی چنانچہ شعرائے جہان آباد (دلی) جب دلی چھوڑ کر معاشی تنگی کو دور کرنے نکلتے تو لکھنو اور عظیم آباد کے بعد ان کا آخری مستقر بنگال کا صدر مقام مرشد آباد ہی ہوتا چنانچہ دلی کے مہاجر شعرا کی جس قدر لکھنو کے نوابوں نے قدر کی اسی طرح نواب علی وردی خاں اور ان کے دامنِ فیض سے وابستہ امرا اور ان کے متعلقین نے بھی شعر و ادب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی قدر دانی سے مرشد آباد ادباء کا مرکز بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعر و شاعری کا ذوق عوام میں بھی پیدا ہو گیا۔ مرشد آباد میں شاعروں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ ان میں مقامی بھی تھے اور بیرونی بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اساتذۂ وقت نے لکھنو اور رام پور کا رُخ کیا۔ بہ سبب قریب ہونے کے انہیں وہاں پناہ مل گئی۔ دوسرے درجے کے شعرا اس طرف چلے آئے لیکن بنگال میں اردو شاعری کے فروغ میں ان شعرا کی اہمیت سے انکار ممکن نہ تھا۔

جب انگریز تاجر بلا شرکتِ غیرے صوبۂ بنگال کے حاکم بن گئے تو یہی شعرا مرشد آباد کی رونقیں ماند پڑتی دیکھ کر کلکتہ منتقل ہو گئے۔

فورٹ ولیم کالج کے مقام نے بنگال میں اردو کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے نصاب تیار کرنے کی غرض سے شمالی ہندوستان سے ادیب بلائے گئے۔ ان میں سب سے ممتاز میر امن دہلوی تھے ان کے علاوہ حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، میر شیر افسوس علی، مولوی امانت اللہ شیدا جیسے اہلِ زبان تھے۔ ان لوگوں کے کلکتہ کے قیام نے یہاں کی زبان پر نہایت صالح اثرات مرتب کیے۔

ان ادیبوں میں بیشتر شاعر بھی تھے۔ ان لوگوں کی موجودگی نے مجالس شعری کو خوب فروغ بخشا۔ اکثر وہ مقامی شعرا جو ابھی تک اردو کو منہ نہیں لگا رہے تھے، اردو میں شعر کہتے دکھائی دینے لگے۔

کلکتہ صنعت و تجارت کا مرکز بھی بننے لگا تھا۔ بیشتر لوگ معاشی تنگی دور کرنے بھی یہاں آرہے تھے۔ ان میں شعرا بھی تھے۔

شاعری کی اس گرم بازاری نے مقامی شعرا کو بھی جنم دیا۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔

انیسویں صدی کے آتے آتے دلی اور لکھنو کی طرح بنگال بھی ایک دبستان کی شکل اختیار کرگیا۔ اگر دلی میں ذوق، غالب اور ان کے تلامذہ محفل شعروادب کو رونق بخش رہے تھے اور لکھنو میں ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں کا طوطی بول رہا تھا تو کلکتہ میں وحشت، ضیغم، شاہ الفت حسین فریاد، ظہورالنبی مخزوں گیسوئے اردو سنوار رہے تھے۔ ڈھاکا میں فیض الدین شائق، عبدالرحیم صبا، مرزا غلام حسین آتش وغیرہ کی گرم بازاری تھی۔ اسی طرح طرحی مشاعرے ہو رہے تھے جو دلی اور لکھنو کا دستور تھا۔

دہلوی شعرا نے واردات قلبی کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا تھا جبکہ لکھنوی شعرا نے محبوب کے خارجی و ظاہری معاملات سے سروکار رکھا تھا۔ زنانہ ملبوسات اور معشوق کے خط و خال یہاں کی شاعری میں بیان ہو رہے تھے۔ نمود و نمائش کے شوق نے رعایت لفظی اور لفظی بازیگری کو شاعری کا کمال قرار دیا تھا۔ کلکتہ کے شعرا پر زیادہ اثر لکھنوی طرز کا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یہ طرزِ شاعری ان کے لیے نئی تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ لکھنو کی طرح یہاں بھی خوش حالی تھی۔

اس طرزِ شاعری کی لے اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب تاجدار اودھ واجد علی شاہ کو انگریزوں نے تخت سے اُتار کر مٹیا برج بھیج دیا۔ ان کے دسترخوان سے وابستہ شعرا بھی دامن سے بندھے مٹیا برج آگئے۔ یہ تمام کے تمام لکھنوی شاعری اور خصوصاً ناسخ و آتش کے فیض یافتہ تھے۔ ان شعرا کو اپنے لکھنوی ہونے پر ناز تھا۔ مقامی شعرا کو وہ کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ ان کی تعلیوں نے مقامی شعرا کو ان کے مدِمقابل ہونے پر مجبور کردیا اور انہوں نے بھی وہی مضامین، ویسی ہی زبان اختیار کی جس پر لکھنوی شعرا کو ناز تھا۔

اصناف سخن کا انتخاب بھی وہی کیا جن کو لکھنوی شعرا اپنی شاعری میں جگہ دے رہے تھے۔ یہی وہ طرزِ شاعری تھی جسے عبدالغفور، جس نے اب مہجور تخلص اختیار کرلیا تھا، اپنے اردگرد دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس نے بھی اپنی غزلوں کو انہی مضامین کا حصہ بنانا شروع کیا۔ اس نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہنے شروع کردیے تھے۔

جب اچھی خاصی مشق فراہم ہوگئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے یہ غزلیں اپنے استاد مدرس ہگلی کالج کو دکھائیں۔ دکھائیں کیا ایک روز ان کے گھر گیا تو چپکے سے یہ غزلیں ان کے تکیے کے نیچے رکھ کر آگیا کہ نظر پڑے گی تو خود ہی دیکھ لیں گے۔ نہ جانے کیسی کیسی غلطیاں ہوں گی۔ سامنے رہا تو خواہ مخواہ شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر ان کے گھر نہیں گیا تاکہ انہیں خوب اچھی طرح غزلیں دیکھنے کا موقع مل جائے۔ تیسرے دن وہ ان سے ملنے گیا تو وہ اس کی غزلیں پڑھ چکے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اسے ''شاعر صاحب'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''آیئے شاعر صاحب، آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔''

''میں نے کچھ ٹوٹی پھوٹی کاوشیں کی تھیں، سوچا آپ کو دکھالوں۔''

''بھئی مجھے دکھانے کا کیا فائدہ۔ مجھے تو تمہارا ہر لفظ اچھا لگے گا کیونکہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ پھر میں کوئی ایسا قابلِ قدر شاعر ہوں بھی نہیں کہ اصلاح کرسکوں۔ مجھے لگتا ہے تم بہت ترقی کروگے اس لیے تمہاری تربیت نہایت اچھے ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، مجھے کس کے پاس جانا چاہیے؟''

''میرے خیال میں تو تمہیں رشید النبی وحشت کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنا چاہیے۔ تمہارا رنگ طبیعت ان سے ملتا جلتا ہے۔''

خواجہ مستقیم نے ایک سفارشی خط بھی ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس خط میں اس کی تعریف کی گئی تھی اور ان سے سفارش کی گئی تھی کہ وہ اسے اپنی شاگردی میں قبول کرلیں۔

اس نے اس پرچے کو تعویذ کی طرح سنبھال لیا اور وحشت کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے انہیں کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن نام بہت سنا تھا۔ ہگلی میں جتنے مشاعرے ہوتے تھے، وہ ان سب میں شریک ہوا کرتے تھے۔ عبدالغفور کسی مشاعرے میں تو نہیں گیا تھا لیکن جو اشعار مشاعرے سے باہر نکلتے تھے ان میں کوئی نہ کوئی شعر وحشت کا ضرور ہوتا تھا۔

وہ وحشت کے مکان پر پہنچے تو دو تین شاگرد اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ عبدالغفور نے نہایت ادب سے سلام کیا اور خواجہ مستقیم کا دیا ہوا پرچہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے ایک نظر ڈالنے کے بعد پرچہ ایک طرف رکھ دیا اور اس سے مخاطب ہوئے۔

''صاحب زادے، آپ کا پورا نام کیا ہے؟''

''عبدالغفور۔''

''تخلص کیا فرماتے ہیں؟''

''مہجور۔''

''ہوں......'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے پھر پوچھا ''کس سے اصلاح لیتے رہے ہو؟''

''جی نہیں۔ اپنی طبیعت ہی کو رہنما بنایا ہے یا پھر اساتذہ کے دواوین ہیں جن سے رہنمائی ملتی ہے۔''

''کچھ سناؤ گے ہمیں؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا اور یہ اشعار سنائے۔

ہے رنج یہی مجھ کو کیوں رنج دیا تم کو
تھا خوب جو حال اپنا تم نے سنا ہوتا
ان کے تو نہ آنے پر ہم جان کو دے بیٹھے
بتلاؤ کوئی ہم کو وہ آتے تو کیا ہوتا
میں ہجر میں مدت سے تو صبر کا خوگر تھا
گر مجھ سے نہ ملتے تم کیوں رنج سوا ہوتا

''بات کچھ بنتی تو نظر آتی ہے۔'' وحشت نے یوں کہا جیسے خود سے کہہ رہے ہوں پھر اس سے مخاطب ہوئے ''کوئی غزل لائے ہو جس پر اصلاح مقصود ہے؟''

''جی ہاں، یہ کچھ غزلیں ہیں۔''

اس نے غزلیں وہاں چھوڑیں اور گھر چلا آیا۔

اب اس نے وہاں جانا شروع کردیا تھا۔ ایک روز جو وہ وہاں پہنچا تو استاد اپنے چند شاگردوں کے ساتھ مشاعرے میں جانے کے لیے تیار تھے۔ وہ اسے بھی لیتے گئے۔ یہ اس کا پہلا مشاعرہ تھا۔ اسے تو ابھی آدابِ مشاعرہ بھی اچھی طرح نہیں آتے تھے۔ آغاز مشاعرہ اسی کے نام سے ہوا۔ اسے چند اشعار زبانی یاد تھے وہی اس نے پڑھ دیے۔

ظاہراً موت ہے قضا ہے عشق
پر حقیقت میں جاں فزا ہے عشق
پوچھتے کیا ہیں بوالہوس سے وہ
مجھ سے پوچھے کوئی کہ کیا ہے عشق
تا دمِ مرگ ساتھ دیتا ہے
ایک محبوب باوفا ہے عشق

زبان اردو، اہلِ بنگال کی مادری زبان نہیں تھی۔ اودھ اور دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے جلد جلد تبدیلیاں بھی نہیں آتی تھیں۔ مضامین لیے جاسکتے تھے لیکن زبان تو آتے ہی آتی ہے۔ ایسے ماحول میں اس نے ایسے سادہ اشعار نکالے تو مشاعرے میں واہ واہ کا شور مچ گیا۔ کچھ لوگ اسے داد دے رہے تھے، کچھ لوگ وحشت صاحب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں واہ صاحب! کیا شعر کہہ کردیے ہیں۔

وہ ابھی مشاعرے میں کامیابی کے لطف سے واقف ہی نہیں تھا، اب جو واہ واہ کے تحن کانوں میں پڑے تو ہر مشاعرے میں نظر آنے لگا۔ ہگلی میں ہونے والا کوئی مشاعرہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ نظر نہ آتا ہو۔

1853ء میں درسی تعلیم سے فارغ ہوگیا۔ اب اس کی شاعری بھی ترقی کی طرف گامزن تھی۔

عربی میں اچھی خاصی استعداد حاصل کرلی تھی۔ فارسی میں دستگاہ کامل تھی۔ زبان اردو میں بڑی قدرت پیدا کی تھی۔ انگریزی بھی تھوڑی بہت آہی گئی تھی۔

بڑے بھائی کا خط آیا جس میں انہوں نے ملازمت کی نوید سنائی تھی۔

''مسٹر ہنری ونسنٹ بیلی صاحب ایڈیشنل جج مقرر ہوگئے ہیں۔ تم فوراً چلے آؤ۔ وہ تمہیں کوئی عہدہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے ان سے بات کرلی ہے۔''

بیلی صاحب ڈھاکا میں تھے لہٰذا وہ ڈھاکا پہنچ گیا۔ بھائی ڈپٹی مجسٹریٹ ہوچکے تھے، لہٰذا انگریزی اور ہندوستانی حلقوں میں ان کی دور تک رسائی تھی۔ بیلی صاحب سے سفارش بھی ان تعلقات ہی کا نتیجہ تھی۔ سیشن جج کے محرر منشی امین الدین بھی ان کے دوستوں میں تھے، لہٰذا عبدالغفور مہجور نے ان کے مکان پر قیام کیا۔ دوسرے دن وہ عدالت پہنچا اور بیلی صاحب سے ملاقات کی۔

سوانحی خاکہ

ابو محمد عبدالغفور خاں خالدی
تخلص: مہجور، نساخ
ولدیت: قاضی فقیر محمد
پیدائش: کلکتہ
سن پیدائش: 11 فروری 1834ء
بیٹا: ابوالقاسم مظہر الحق
ملازمت: ڈپٹی مجسٹریٹ، ڈپٹی کلکٹر
سفر: پٹنہ، الہ آباد، علی گڑھ، دہلی، کان پور، لکھنو
تعلیم: مدرسہ عالیہ کلکتہ، ہگلی کالج، ہگلی
وفات: 14 جون 1889ء
تدفین: تالباغ، کلکتہ

"بھائی صاحب عبداللطیف خاں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ سرشتہ میں کوئی عہدہ آپ میرے لیے نکالیں گے۔"

بیلی صاحب نہایت شفقت سے پیش آئے لیکن یہ بھی کہا۔ "سرشتہ کا کام آدمی سیکھ نہیں سکتا جب تک اس کے ذمے کوئی کام نہ ہو۔ چونکہ تم کام نہیں جانتے اس لیے تم کو بڑا عہدہ نہیں دیا جاسکتا۔ تم کو سردست دس روپے کی محرری میں مقرر کیا جاتا ہے اور دس روپے میں تمہاری گزر اوقات کسی صورت ہو نہیں سکتی لیکن تمہارے بھائی نواب عبداللطیف خاں بہادر نے کہا ہے کہ وہ تمہاری خرچ برداری کریں گے لیکن ان کا خرچ بھی بہت ہے اگر وہ تمہارا خرچ نہ دے سکیں تو ہم تمہارا خرچ دیں گے۔"

بیلی صاحب کی بات مناسب تھی۔ اس نے آئندہ ترقی کی آرزو میں دس روپے ماہوار کی محرری قبول کرلی۔ امید یہی تھی کہ کام سیکھتے ہی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔

ڈھاکا بڑا شہر تھا۔ نہ شعرا کی کمی تھی نہ مشاعروں کی قلت۔ مطالعے کے لیے وقت کی کمی نہیں تھی۔ غزلیں کہتا رہا۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے، وہ ان سب میں شریک ہونے لگا۔ باتیں کرنے، دوست بنانے کا ہنر خوب جانتا تھا۔ تھوڑے ہی دن میں پورے شہر سے دوستی ہوگئی۔

نیا نیا شوق تھا، تازہ صحبتیں تھیں۔ کثرت سے غزلیں ہونے لگیں۔ وہ یہ غزلیں وحشت صاحب کو بھیج دیا کرتا تھا لیکن ان کی مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ وقت پر اصلاح کرنے سے معذور تھے۔ یہ بات اسے کھٹک رہی تھی لیکن مجبور تھا۔ اکثر اصلاح کے بغیر ہی غزل پڑھ دیا کرتا تھا۔ خاص طور پر طرحی مشاعروں کے لیے جو غزلیں کہی جاتی تھیں ان کی اصلاح کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کچھ دنوں بعد عدالت میں چار مترجموں کی جگہ خالی ہوئی۔ اس نے بیلی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کی سفارش کردیں۔ بیلی صاحب نے اتنی مہربانی کی کہ اسے لے کر خود رجسٹرار کے پاس گئے اور اس کی پُرزور سفارش کی لیکن مسٹر رسل (رجسٹرار) نے صاف کہہ دیا کہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا ضروری ہے۔ امتحان پاس کیے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔

امیدواروں کی تعداد پچاس تھی۔ وہ بھی امتحان میں بیٹھ گیا۔ پچاس امیدواروں میں سے کل پانچ امیدوار کامیاب ہوئے۔ سب سے آخری نمبر اس کا تھا۔

مترجمی کی جگہ اسے نہیں مل سکی تو اس نے کلکتہ جانے کی ٹھان لی۔ کلکتہ جانے سے پہلے اس نے سوچا ہگلی چلا جائے۔ کالج کے اساتذہ سے بھی ملاقات ہوجائے گی اور استاد سخن سے بھی۔ بہت سی غزلیں ان کے پاس پڑی ہوئی تھیں، وہ بھی حاصل کرنی تھیں۔ یہاں آکر رنگ ہی دوسرا دیکھا۔ استاد کو سرکاری کاموں سے مطلق فرصت نہیں تھی۔ غزلیں یونہی پڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے عدیم الفرصتی کا عذر کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ ان کے استاد حافظ اکرام احمد ضیغم سے اصلاح لے لیا کریں۔

"تم کلکتہ جارہے ہو۔ حافظ صاحب بھی کلکتہ میں ہیں۔ تمہیں سہولت ہوگی۔ اپنا کلام انہیں دکھالیا کرو۔"

بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ کلکتہ آگیا۔

ضیغم صاحب کا وطن رام پور تھا، کلکتہ میں آباد تھے۔ کلکتہ اور بنگال کے دیگر شہروں میں ان کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ علم عروض میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ غزل کے علاوہ ریختی، ہزل اور مرثیہ بھی لکھتے تھے۔ ان تینوں اصناف میں "مہمان" تخلص کیا کرتے تھے۔ جہاندیدہ ایسے کہ بلادِ ایران، توران، کابل، پنجاب، ہند، دکن اور بنگالہ کی سیر کرچکے تھے۔ متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ طب یونانی، ہندی، ڈاکٹری اور کیمیا گری، فن شعبدہ میں کمال رکھتے تھے۔

اسے ایسا جامع کمالات استاد کامل جانا نعمت سے کم نہیں تھا۔ کلکتہ پہنچتے ہی اس نے ضیغم صاحب سے ملاقات کی۔ استاد نے بھی شاگرد کے تیور بھانپ لیے۔ تربیت کا آغاز کردیا۔

اس نے ان سے صرف غزلوں پر اصلاح نہیں لی بلکہ عروض بھی پڑھا۔ صنائع بدائع شعری سے بھی واقفیت حاصل کی۔ ان تعلیمات نے اسے محض شاعر نہیں رہنے دیا بلکہ شاعری کو پرکھنے کی صلاحیت بھی اس میں پیدا ہوگئی۔

بنگال کی سرزمین میں لکھنوی طرزِ شاعری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شعرائے وقت اس کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ خاص طور پر طرزِ شاعری ناسخ کی نقلیں کی جاتی تھیں۔ صنعتوں کی بازی گری، سنگلاخ زمینوں پر طبع آزمائی۔ دوغزلہ، سہ غزلہ کہنے کی دھن۔ مشکل سے مشکل ردیفوں میں کلام موزوں کرنے کی کوشش اور رعایت لفظی۔ یہی سب کچھ ناسخ کا سرمایہ تھا اور اسی کی نقل میں بنگال کے شعرا مگن تھے لیکن وہ اہلِ زبان نہیں تھے اور یہ کہ نقل پھر نقل ہوتی ہے، لہٰذا ہر قدم پر ٹھوکر کھاتے تھے۔ کوشش ضرور کرتے تھے لیکن یہ کہتے بھی سنائی دیتے تھے کہ ناسخ کے رنگ میں شعر کہنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے دوسرے ناسخ کی ضرورت ہے۔ اسی خیال عام نے اسے ناسخ کا مدِمقابل

بنادیا۔ مسلسل مشق نے اسے پختہ کار بنادیا تھا۔ از خود اسے یہ زعم ہوگیا کہ وہ ناسخ کی برابری کرسکتا ہے۔ اسے اردو زبان پر قدرت ہے۔ فارسی پر مکمل عبور رکھتا ہے۔ علم عروض سے واقف ہے۔ پھر وہ حریف ناسخ کیوں نہیں بن سکتا!

ایک روز وہ دوستوں کی محفل میں بیٹھا تھا۔ شاعری اور اس کی شرائط زیرِ بحث تھیں۔ بات بنگال سے چلی اور دہلی ہوتے ہوئے اودھ پہنچ گئی۔ بات لکھنو کی ہو اور ناسخ تک نہ پہنچے، یہ ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ دبستان لکھنو میں ناسخ کو امام کی حیثیت حاصل تھی۔

اس کے استاد رشید النبی وحشت سلسلہ جرأت سے منسلک تھے۔ لکھنوی شاعری کے قائل تھے لیکن جرأت کی حد تک اور جرأت خود طرزِ ناسخ کے خلاف تھے۔ عبدالغفور مجبور نے بھی یہی طرز اختیار کیا تھا لیکن کلکتہ میں طرزِ ناسخ کی گونج تھی۔ اس محفل میں تو ایک شاعر نے باقاعدہ دعویٰ کردیا کہ ناسخ کے انداز میں شعر کہے ہی نہیں جاسکتے۔ اس کے لیے ناسخ کا سا علم ضروری ہے اور اس کی شاعری کی نقل بھی ممکن نہیں۔

وہ صاحب یہ کہہ کر اُٹھ گئے "ناسخ پہلوانِ سخن ہے۔ اسے پچھاڑنا ممکن ہی نہیں۔"

وہ صاحب تو اُٹھ کر چلے گئے لیکن اس کے سامنے ایک چراغ جلا چھوڑ گئے۔ اس نے گھر پہنچ کر اسی چراغ کو سامنے رکھا اور ناسخ کا دیوان لے کر بیٹھ گیا۔ کئی دن تک ان غزلوں پر غور کرتا رہا۔ مضامین پر نگاہ دوڑاتا رہا، لفظیات دیکھتا رہا۔ کبھی مرعوب ہوجاتا، کبھی حوصلہ بڑھالیتا۔ پھر ایک غزل کو اس نے طبع آزمائی کے لیے منتخب کرلیا۔

ناسخ کا مطلع تھا۔

مرگیا ہوں دیکھ کر جلوہ رخِ پُر نور کا
میری لوحِ قبر کو زیبا ہے پتھر طور کا

اس نے مطلع نکالا۔

ہاتھ آجائے جو خامہ شاخِ نخلِ طور کا
تب رقم ہو وصف اس کے عارضِ پُرنور کا

اس کے بعد وہ ناسخ کے ایک ایک قافیے کو اٹھاتا رہا اور نکالتا رہا۔

ہو زمینِ شعر میں وصف اس سراپا نور کا
ہے کتابِ آسمانی میں بھی مضموں حور کا
موذیوں کے ہاتھ میں دولت رہے یہ ہے محال
لوٹتی ہے خلق بہرِ شہد گھر زنبور کا
صاحبِ گفتارِ حق کیونکر نہ ہو مشہورِ خلق
حرفِ حق باعث ہوا ہے شہرۂ منصور کا

تصانیف

دفترِ بے مثال، اشعار ناسخ، ارمغان، ارمغانی چشمہ، فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل، گنج تواریخ، کنیز تواریخ، مظہر معما، ترانہ خامہ، نصرۃ المسلمین، مقطعات نساخ، سخن شعرا، قطعہ منتخب، تذکرہ المعاصرین، قند فارسی، زبان ریختہ، انتخابِ نقص، خودنوشت۔

ایک اور مشکل زمین اس کے سامنے آئی۔ اس نے اس غزل کے مشکل قوافی کو بھی اپنی غزل میں ڈھال دیا۔

ناسخ کا مطلع تھا۔

کھل گیا ہے پیرہن میں جسم مجھ مایوس کا
ایک عالم کو گماں ہے شمع اور فانوس کا

اس نے غزل کہی۔

حال سوزِ ہجر میں پوچھو نہ مجھ مایوس کا
جسم عریاں پر ہے عالم شمع بے فانوس کا
میرے ترکِ نوجوانی تیغ زن کے عہد میں
سونے کی قیمت سے پر بکنے لگا طاؤس کا
موج آغوش اور دہن اے بحرِ خوبی ہے حباب
شوق دریا کو بھی ہے تیرے کنار و بوس کا
بات وہ کرتے نہیں اور نالے کرتا ہے یہ دل
بت کی خاموشی کے باعث شور ہے ناقوس کا

اس نے تلاشِ مضمون، مبالغہ آرائی، استعارات اور تشبیہوں کی پُرکشش چمن آرائی میں مکمل طور پر ناسخ کی پیروی کی اور اپنی غزلوں کو ناسخ کا ہم رنگ بنادیا۔

اب جو یہ غزلیں لے کر وہ مشاعروں میں پہنچا تو لوگوں کو دھوکا ہونے لگا جیسے ناسخ خود لکھنو آگئے ہوں۔ کہیں کہیں تو اس کا سمندرِ خیال ناسخ سے بھی آگے دوڑتا دکھائی دے رہا تھا۔

سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کی روایت بنگال میں اسی نے ڈالی۔ اسے خود بھی اپنی اس خوبی کا ادراک تھا چنانچہ اس نے خود کہا۔

کھود ڈالی کیسی ہی ہووے زمین سنگلاخ
کلک میں اپنی ہے عالم تیشہ فرہاد کا

جب اس کے کلام میں ایسی پختگی آگئی اور وہ بجا طور پر خود کو ناسخ کا ہم سر سمجھنے لگا تو مجبور تخلص اسے ہلکا معلوم ہونے لگا۔ ناسخ کا حریف ہونے کی وجہ سے اس نے اپنا تخلص نساخ رکھ لیا جو ناسخ کا صیغۂ مبالغہ ہے۔

اس نے ناسخ کی پیروی ضرور کی مگر ناسخ سے آگے نہیں

بڑھ سکا۔ کامیاب نقل کے باوجود اسے اس کی انفرادیت نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن یہ یاد رہے کہ نساخ کا وطن لکھنو نہیں بنگال تھا جہاں اردو لوگوں کی گھٹی میں نہیں پڑی تھی۔ وہ بنگالی تھا، اہلِ زبان نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے ناسخ جیسے مشکل شاعر سے ٹکر لی اور ناسخ سے کسی طرح کم دکھائی نہیں دیا۔

وہ اپنے مقطعوں میں اپنا مقابلہ ناسخ سے کرتا نہیں تھکتا۔

شعلہ رو کے وصف میں نساخ ناسخ کی طرح
کام کرتا ہے ہمارا خامہ آتش گیر کا

نہیں نساخ کو شاہی کی خواہش صورت ناسخ
یہ تاج وتخت ہے رہ کردہ ابراہیم ادہم کا

کانپتا ہے مہر اے نساخ ناسخ کی طرح
کھینچتا ہوں جب میرے دل سے آہ آتش بار کو

اس رنگ کی پیروی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناسخ کی غزلوں کی طرح نساخ کی غزلیں بھی صنائع لفظی اور الفاظ کی بازیگری کا نمونہ پیش کرنے لگیں اور اس کا کلام روحانی کوائف اور قلبی اثرات سے خالی ہوگیا لیکن بنگال میں ناسخ کی شاعری مقبول بھی تھی، نئی بھی اور اس کی پیروی کو مشکل سمجھا جاتا تھا لہٰذا نساخ کی شہرت ہوا میں اُڑنے لگی اور یہ کمال بھی تھا کہ ایک بنگالی ایسی گاڑھی اردو میں بات کررہا تھا۔ اس کی انفرادیت کم ازکم بنگالی شعرا میں تو تسلیم کرلی گئی۔

☆☆☆

اب اس کی شہرت خوشبو کی طرح پھیل رہی تھی۔ اس کی اردو دانی کا چرچہ مقامی انگریز حکام میں بھی ہونے لگا تھا۔ وہ ردیف اور قافیے جوڑ رہا تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے کپتان سینٹ جارج نے اس کا شہرہ سن کر اسے اپنے پاس بلایا اور یہ بھی تاکید کی کہ وہ اسی وقت چلا آئے۔ اس نے سواری کی اور اسی وقت سینٹ جارج کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ دل میں ضرور سوچتا جاتا ہوگا کہ نہ جانے کیوں بلایا ہے۔ یہ عقدہ وہاں جانے کے بعد ہی کھل سکا۔

''آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟''

''سوچنے کی تو بات ہے۔ سچ پوچھیے تو میں یہی سوچتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔''

''بات یہ ہے کہ مسٹر کاول چندروز ہوئے ولایت سے آئے ہیں اور وہ فارسی پڑھنا چاہتے ہیں۔''

بات نساخ کی سمجھ میں آگئی تھی اس نے ازراہِ انکسار کہا ''کلکتہ اہلِ کمال سے خالی نہیں۔ خود فورٹ ولیم کالج میں منشی حضرات موجود ہیں۔''

''کالج کے جتنے منشی حضرات تھے، سب ان کے پاس جاچکے ہیں اور سب کو انہوں نے واپس کردیا۔ شاید کوئی بھی پسند نہیں آیا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں، یہ کام آپ اپنے سر لیں شاید آپ کا طرزِ تدریس انہیں پسند آجائے۔ آپ یہ کوشش کرکے دیکھ لیں۔''

''مسٹر جارج، یہ کوشش بے کار ہی جائے گی۔ جب کوئی بھی ان کے معیار پر نہیں اترا تو میری کیا بساط ہے؟''

''نہیں ینگ مین! آپ ضرور کامیاب ہوں گے، کوشش کرکے تو دیکھیں۔''

نساخ نے یہ سفارشی چٹھی ان سے لے لی اور کاول صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ انگریز کی میم بھی اس وقت تشریف فرما تھی۔ دونوں نے انگلستان کی روایت کے مطابق اس کا استقبال کیا۔ وہ دونوں سے مصافحہ کرنے کے بعد بیٹھ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ میم اسے بہ غور دیکھ رہی ہے۔ کسی نوجوان کی طرح وہ بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہونے لگا تھا کہ میم نے اس کی غلط فہمی دور کردی۔

''مسٹر نساخ، آپ تو بہت ینگ ہیں، سینٹ جارج نے آپ کو کیوں بھیجا ہے؟''

''مجھ سے تو یہی کہا گیا تھا کہ آنریبل کاول کو فارسی کے معلم کی ضرورت ہے۔''

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔'' مسٹر کاول نے دونوں کو اُلجھتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنی بیگم سے کہا کہ میرے سرہانے جو خمسہ خسرو رکھا ہوا ہے وہ اُٹھا کر لے آئیں اسے بھی شاید نساخ کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے اس کی قابلیت پر شک تھا۔ وہ ان کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

خمسہ خسرو کا نام سن کر نساخ پر کچھ گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اس خمسہ میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پانچ مثنویاں تھیں۔ نساخ نے صرف تین مثنویوں کو غور سے پڑھا تھا۔ باقی دو مثنویاں تو اس نے دیکھی ہی نہیں تھیں۔ اگر مسٹر کاول نے ان مثنویوں میں سے کچھ پوچھ لیا جو اس کی نظر سے نہیں گزری تھیں تو بڑی بے عزتی ہوجائے گی۔

وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا اور اتنی دیر میں خمسہ آگیا۔ کاول نے اتفاق سے اسی ایک مثنوی کے کچھ اشعار کا مطلب پوچھ لیا جو اس نے نہیں پڑھی تھی۔ اس نے اپنی ذاتی قابلیت سے ان اشعار کی تشریح کردی۔ اسے یہ اطمینان ہورہا تھا کہ کاول کے چہرے پر خوشی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تشریح سے وہ خوش ہے۔ سودا کا ایک شعر ہے

اس کا مطلب بھی بتاؤ۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

اس نے معنی بتلائے وہ کچھ مطمئن تو ہوئے لیکن کچھ پریشان سے نظر آرہے تھے۔

''کیا میں نے ٹھیک معنی نہیں بتائے؟''

''بعض شخصیتوں نے دوسرے معنی بتائے ہیں۔'' مسٹر کاول نے کہا۔

''ایک شعر کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ آپ خود بہ نظر انصاف دیکھیں اور خود سے سوال کریں کہ میرے بتائے ہوئے معنی زیادہ درست ہیں یا دوسروں کے بتائے ہوئے معنی۔'' اس پر انہوں نے دونوں معنوں کا ترجمہ انگریزی میں کرلیا اور کچھ دیر تک دونوں کو دیکھتے رہے اور پھر میز پر زور سے ہاتھ مارا۔

''آپ کے بتائے ہوئے معنی اچھے ہیں۔''

وہ امتحان پر پورا اُترا تھا۔ مسٹر کاول نے اسے اپنا معلم مقرر کرلیا۔ تیس روپے ماہوار اس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ایک اور کام بھی اس کے سپرد ہوگیا۔ وہ مسٹر کاول کے لیے نادر کتابیں اکٹھی کرے گا اور ایشیاٹک سوسائٹی سے مسٹر کاول کی لائی ہوئی کتابوں کی نقل کا کام بھی اس کے سپرد ہوا۔

اس کام سے اس کو دُہرا فائدہ ہوا۔ ایک طرف نادر کتابیں پڑھنے کا موقع ملا جو عام حالات میں اس کے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھیں، دوسری طرف آمدنی میں بھی نوے روپے کی ماہانہ آمدنی کا سامان مہیا ہوگیا۔

ایک اچھی آمدنی کا سہارا تو ضرور ہوگیا تھا لیکن ظاہر ہے اسے مستقل آمدنی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کاول صاحب کا شوق کسی وقت بھی پورا ہوسکتا تھا یا وہ ولایت واپس جاسکتے تھے۔ مسٹر کاول کے ساتھ اسے چھ مہینے ہوچکے تھے کہ اسے دیوانی عدالت میں مترجم کی جگہ مل گئی۔ یہ کوئی ملازمت نہیں تھی بلکہ اجرت کا کام تھا۔ جتنے مقدمے ترجمہ کرلیتا اتنا معاوضہ مل جاتا۔ بیس روپے چالیس روپے روز کا کام ہوجاتا تھا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے شعلوں نے سب کچھ جلادیا۔ جب بغاوت ہوئی اور پہلے مرحلے میں انگریزوں کو شکست ہوئی تو بنگال بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ انگریزوں کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ بغاوت کا مرکز شمالی ہند تھا لیکن کلکتہ میں بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ایسے میں اس کی ملازمت بھی جاتی رہی۔

اس بے کاری کا فائدہ اسے یہ پہنچا کہ اس نے دروازے بند کیے اور اپنا پہلا دیوان مرتب کرنے بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کی عمر چھبیس ستائیس سال تھی اور وہ غزل کے چودہ ہزار اشعار کہہ چکا تھا۔ اس نے بڑی بے دردی سے انتخاب کیا اور دس ہزار اشعار قلم زد کردیے۔ صرف چار ہزار اشعار کو اس قابل سمجھا کہ دیوان میں شامل کرے۔

یہ نہایت مشکل فیصلہ ہوتا ہے جو اس نے کیا۔ اشعار تو اولاد کی طرح ہوتے ہیں۔ کسی کو پسند کسی کو ناپسند نہیں کیا جاسکتا لیکن اس نے اتنی بڑی تعداد کو خود سے الگ کردیا۔

جنگِ آزادی میں بالآخر انگریزوں کو فتح ہوئی۔ کلکتہ کے حالات بھی آہستہ آہستہ اعتدال پر آنے لگے۔ وہ انتظار میں تھا کہ حالات کچھ اور ٹھیک ہوں کہیں ملازمت کا بندوبست ہو تو وہ اس دیوان کی اِشاعت کا بندوبست کرے۔

1860ء میں کپتان سینٹ جارج نے نساخ کو بلایا اور فارسی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن پڑھانے کے لیے اسے قریبی ضلع چندرنگر جانا تھا۔

یہ ملازمت صرف چالیس روپے ماہوار کی تھی اور کلکتہ سے دور بھی لیکن اس کے باوجود یہ ملازمت اس نے قبول کرلی۔ یہ دن بڑے نازک تھے۔ مسلمانوں کے لیے ملازمت تھی ہی کہاں انگریزوں سے تعلق رکھنے ہی میں عافیت تھی۔ وہ اس تعلق اور اس موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے طریقہ یہ نکالا تھا کہ سنیچر کے دن کلکتہ آجاتا اور پیر کی صبح چندرنگر روانہ ہوجاتا۔ عبداللطیف خاں اپنے بھائی کی اس معمولی ملازمت سے قطعی خوش نہیں تھے اور یہ برابر اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اس کے لیے کسی سرکاری نوکری کا بندوبست ہوجائے۔ نساخ نے بھائی کے مشورے سے

غزل

نساخ بہ طرز مومن

ویسی ہی کجروی پہ ہے یہ آسماں ہنوز
آتی نہیں ہے لب پہ ہمارے فغاں ہنوز
عشق وہوس کا راز رہا ہے نہاں ہنوز
ان کو نہیں ہے ہائے سرِ امتحاں ہنوز
لالے کے بدلے داغ ہے اپنے مزار پر
ہم مٹ گئے ہیں پر ہے ہمارا نشاں ہنوز
مہندی لگا کے پاؤں میں وہ کب کے سوگئے
آنے کا ان کے ہے مرے دل کو گماں ہنوز
نساخ کعبے کو بھی گئے پر بقول درؔد
دل سے نہیں گیا ہے خیال بتاں ہنوز

ڈپٹی مجسٹریٹی کے لیے درخواست دے دی۔ عبداللطیف خاں کے انگریزی حلقوں میں تعلقات تھے۔ انہوں نے سفارش کی اور نساخ ڈپٹی مجسٹریٹی و ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مقرر ہوگیا۔

اس عہدے پر وہ عارضی طور پر فائز ہوا تھا۔ مستقل ملازمت کے لیے امتحان پاس کرنے کی شرط ضروری تھی۔ وہ امتحان میں بیٹھا ضرور تھا لیکن عدیم الفرصتی نے اسے تیاری کا موقع نہیں دیا۔ سرکاری کاموں کے جھنجٹ الگ تھے۔ شاعری کے بکھیڑے الگ۔ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہ اس امتحان میں پاس نہ ہوسکا۔ اس کے افسران اس سے خوش بھی تھے اور اس کی مجبوریوں کو بھی جانتے تھے اور انہوں نے سفارش کی اور اسے ایک موقع اور دے دیا گیا۔

اس مرتبہ بھی وہ اچھی طرح تیاری نہیں کرسکا تھا۔ ایک مرتبہ کی ناکامی نے اس کی خود اعتمادی کو بھی کھو دیا تھا۔ اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو کمزور اعتماد کے لوگ کرتے ہیں۔ اس نے ایک دوست کو ساتھ لیا اور ایک بزرگ اکالی شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ان بزرگ کی شہرت سن رکھی تھی اور اب اس کی ضرورت اسے ان کے دروازے پر لے آئی تھی۔ اس نے اپنی ضرورت شاہ صاحب کے سامنے رکھ دی۔

''امتحان کب ہوگا؟'' اکالی شاہ نے پوچھا۔

''کل۔''

''کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ میرے پاس سے ہوتے ہوئے امتحان دینے جاؤ؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ میں امتحان کے لیے جانے سے قبل آپ کے پاس ملاقات کو حاضر ہوجاؤں گا۔''

دوسرے دن وہ امتحان دینے کے لیے نکلا تو سواری کو کچھ دیر کے لیے شاہ صاحب کے آستانے کے سامنے رکوالیا۔ شاہ صاحب نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''جائیے آپ امتحان میں پاس ہوجائیں گے۔''

اسے ہنسی آگئی کہ صرف یہ کہنے کو بلوایا تھا۔ یہ بات تو کل بھی کہی جاسکتی تھی بہرحال وہ کچہری گیا اور امتحان کے کمرے میں پہنچ گیا۔

پرچہ سامنے آیا وہ خاموشی سے پرچہ حل کرنے بیٹھ گیا لیکن دو سوال ایسے تھے جن کے جواب اسے نہیں آتے تھے جبکہ پرچے کی پیشانی پر درج تھا کہ ان سوالوں کے جواب دیے بغیر کامیابی کی توقع نہ کی جائے۔ اس نے دیکھا کہ دوسرے امیدوار بھی اسی سوال پر اٹکے ہوئے ہیں۔ اسے اکالی شاہ کی یاد آگئی۔ واہ شاہ صاحب خوب مدد کی۔ یہ سال بھی ضائع ہوا بلکہ اب تو چانس ملنا بھی مشکل ہے۔

کلکٹر صاحب جو نگرانی پر مقرر تھے گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے۔ کئی مرتبہ اس کے پاس آئے اور اسے خالی بیٹھا دیکھ کر آگے بڑھ گئے۔ انگریز کلکٹر، انگریز کی حکومت یہ توقع ان سے ہو ہی نہیں سکتی تھی جو انہوں نے کیا۔ وہ اس کے قریب آکے کھڑے ہوگئے اور اس کے کان میں ان دونوں سوالوں کے جواب لکھواتے رہے۔

وہ متعجب تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ کلکٹر صاحب سے اس کی جان پہچان بھی نہیں تھی پھر یہ کرم انہوں نے دوسروں پر کیوں نہیں کیا؟ یہ شاہ صاحب کا تصرف نہیں تو اور کیا تھا؟

وہ اب سرکارِ انگلش کا مستقل ڈپٹی مجسٹریٹ تھا۔ شان و شوکت ہی دوسری تھی۔ اس عہدہ جلیلہ سے اس کی شاعرانہ حیثیت بھی بحال ہورہی تھی۔ اب لوگ اسے مشاعروں میں بلانا اپنے لیے افتخار کا باعث سمجھتے تھے۔ کچھ خوشامدانہ تعریفیں بھی اس کے حصے میں آرہی تھیں حالانکہ وہ ان تعریفوں کا محتاج نہیں تھا۔ وہ باشندہ بنگال ہونے کے باوجود ناسخ و آتش کی اردو میں شعر کہہ رہا تھا۔ وہ بنگال میں اردو کے فروغ کی تاریخ رقم کررہا تھا۔ تعریف کے قابل تو تھا ہی۔

اس کی پہلی پوسٹنگ باریسال میں ہوئی۔ یہاں پہنچتے ہی اسے کئی مشکل اور پیچیدہ مقدمات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہاں جعلسازوں کی کثرت تھی۔ اتنی صفائی سے جعلسازی کرتے تھے کہ نشان تک نہ چھوڑتے تھے۔ رشوت کی بھی خوب گرم بازاری تھی۔ نساخ نے چونکہ تہیہ کرلیا تھا کہ وہ رشوت نہیں لے گا اور اپنے ماتحتوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ اگر کسی نے رشوت لی اور اسے معلوم ہوگیا تو وہ کمشنر صاحب کو رپورٹ کردے گا۔ اس لیے کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بس یہی ایک نسخہ تھا جسے استعمال کرکے اس نے جعلسازی کی کمر توڑ دی۔ طرح طرح کے حربے استعمال کیے گئے لیکن اس نے سب کو ناکام کردیا۔

وہ یہاں آکر بہت مصروف ہوگیا تھا لیکن اپنی شاعری کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ دیوان 1860ء ہی میں مرتب کرچکا تھا۔ اب صرف طباعت کا مرحلہ باقی تھا۔ اس نے ایک نظر اس پر اور ڈالی اور دیوان پریس کے حوالے کردیا۔ اس نے اس دیوان کا نام ''دفترِ بے مثال'' رکھا۔

اس وقت تک شہرت اتنی ہوچکی تھی کہ دیوان شائع ہوتے ہی لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ اس کا پہلا مجموعۂ کلام تھا لیکن نہایت استادانہ تھا۔ اس کی غزلوں میں دبستان لکھنو کا اثر نمایاں تھا۔ صنعت کی بازیگری دکھلانے، سنگلاخ زمینوں پر طبع آزمائی

کرنے، دوغزلہ سہ غزلہ کہنے کی خوبی بہ درجہ اتم موجود تھی لیکن یہی خوبی اہلِ بنگال کے لیے نئی بھی تھی اور مرعوب کن بھی تھی۔ ناسخ کی غزلوں پر غزلیں لکھ کر اس نے ایک دلچسپ تماشا مہیا کردیا تھا۔ لوگ یہ توقع ہی نہیں کرسکتے تھے کہ ایک ایسا آدمی جس کی مادری زبان اردو نہیں اودھ اور دہلی سے دور بیٹھ کر اتنی مشکل زمینوں میں شاعری کرسکتا ہے چنانچہ جب اس نے اس دیوان کا ایک نسخہ مرزا غالب کی خدمت میں دہلی روانہ کیا اور اس کی رسید میں غالب کا خط آیا تو اس خط میں اس کی شاعری کی نہایت مبالغہ آمیز تعریف کی گئی تھی۔ غالب جیسا شاعر کسی کی ایسی تعریف کرے کمال ہی تو تھا چنانچہ جب اس نے اس دیوان کے دوسرے ایڈیشن میں اس خط کو شامل کیا تو سب نے اسے استاد تسلیم کرلیا۔ اس نوجوانی میں شعرائے کرام اس کے پاس اصلاح کے لیے آنے لگے۔ ان میں نوجوان بھی تھے اور وہ بھی تھے جو عرصہ دراز سے شاعری کررہے تھے یا وہ جو اپنے اساتذہ کو چھوڑ کر اس کے پاس آگئے۔ اس کے تلامذہ کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس کا رنگِ شاعری اس کے تلامذہ کے ہاتھوں عام ہونے لگا۔ وہ واحد شاعر تھا جس کے ذریعے بنگال کا نام بنگال سے باہر متعارف ہورہا تھا۔ شمالی ہندوستان کے بیشتر شعرا سے اس کی مراسلت ہورہی تھی۔ ان میں مرزا غالب کا نام سرفہرست ہے۔

بنگال جیسے دور افتادہ خطے میں اردو کی جتنی بھی گرم بازاری تھی اس میں نساخ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آج کا بنگال جس کی زبان بنگالی ہے کسی کو یقین نہیں آسکتا کہ ڈیڑھ سو سال پہلے وہاں اردو کے ہزاروں شاعر تھے اور نہایت شائستہ اردو میں شاعری کی جارہی تھی۔ نساخ نے اسے دوسرا لکھنو بنادیا تھا۔

1864ء میں اس کا تبادلہ راجشاہی ہوگیا۔ وہ جہاں جاتا تھا اسے مرکزِ شاعری بنادیتا تھا۔ وہ راجشاہی پہنچا تو یہاں بھی مشاعروں کی بہار آگئی۔

یہاں اس کی زندگی میں ایک تبدیلی اور آئی۔ یہاں اس کے نہایت اعلیٰ خاندان سے مراسم ہوئے اس کا نہایت مبارک نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی شادی اس خاندان کی ایک دختر نیک اختر سے ہوگئی۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن اسی دن اللہ کو پیاری ہوگئی۔

1866ء میں یعنی راجشاہی میں دو سال قیام کرنے کے بعد وہ بھاگل پور کمشنری ضلع بانکا میں تبدیل ہوکر آگیا۔ یہاں اس کے بیٹے مظہر الحق کی پیدائش ہوئی۔ پہلی اولاد کا پیدا ہوتے ہی انتقال ہوچکا تھا۔ اس لیے اس بیٹے کی پیدائش کی خوشی الگ ہی تھی۔ بیٹے کی پیدائش کا جشن خوب دھوم دھام سے منایا۔ مسلمانوں اور قرب و جوار کے سات آٹھ سو ہندوؤں کو کھانا کھلایا۔ بہترین گانے والیوں کو بلایا گیا اور رات بھر رقص و سرور کا جلسہ بپا رہا۔

مظہر الحق دو سال کا ہوچکا تھا۔ نساخ ابھی تک ضلع بانکا میں تعینات تھا کہ ایک روز اس کے گلے سے خون آیا وہ اس مرض میں سولہ برس کے سن سے گرفتار تھا مگر اس مرتبہ خون کی مقدار خاصی تھی۔ اس لیے اس کا گھبرانا لازمی تھا۔ اس نے پہلے اس مرض کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب دینی پڑی۔ اس نے دو ماہ کی رخصت طلب کی اور دہلی جاکر حکیم محمود خاں سے علاج کرانے کی ٹھانی۔

پٹنہ، الہ آباد، علی گڑھ وغیرہ ٹھہرتے ہوئے وہ دہلی پہنچ گیا۔ علاج تو خیر ضروری تھا ہی لیکن نساخ جیسا شاعر دہلی آئے اور شعرا سے ملاقاتیں نہ ہوں اور پھر اس کا ممدوح مرزا غالب اس دہلی میں شاعری کا فرش بچھائے بیٹھے تھے۔

اس نے دہلی پہنچتے ہی گلی قاسم جان کا رُخ کیا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ غالب نے اس کے دیوان پر بڑی مرصع تقریظ لکھی تھی۔ گلی قاسم جان میں پہنچ کر غالب کا مکان تلاش کرنا کون سا مشکل تھا۔ مکان بھی مل گیا اور غالب کا ملازم اجازتِ باریابی بھی لے آیا۔ اس نے غالب کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صاحب سلامت صرف مراسلت تک تھی۔ اس نے ملازم کے ساتھ ساتھ چلتے صحن پار کیا بالا خانے کی سیڑھیاں سامنے تھیں۔ جب تک وہ قدم رکھتا غالب اس کے استقبال کے لیے آدھی سیڑھیاں اُتر چکے تھے۔ غالب کے بد دماغی کے کئی افسانے اس تک پہنچے تھے مگر یہ تو کوئی دوسرا غالب تھا۔

''آیئے عبدالغفور نساخ چلے آیئے۔'' وہ اوپر پہنچا تو کھلے دالان میں چاندی کی طرح چاندنی بچھی دیکھی۔ غالب بڑے تپاک سے گلے ملے اور دیر تک اس سے زیادہ بنگال کی خیریت دریافت کرتے رہے۔

''میاں خوش قسمت ہو کہ اس طرف ہو اُدھر ہوتے تو دیوان بغل میں داب کر نکلنا پڑتا۔ خود میرا یہ حال تھا دروازے بند کیے بیٹھا رہا تھا۔ اس کے بعد آج تک دروازے کھولنا بھول گیا ہوں۔ کوئی آتا ہے تو بلا لیتا ہوں خود تو کہیں آتا جاتا نہیں۔'' ملازم نے حقہ تازہ کرکے رکھ دیا۔ باتیں پھر نکل آئیں۔ نساخ دیکھ رہا تھا کہ وہ اسے بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ ضد کرکے کئی غزلیں سنیں اور ان پر ویسی ہی رائے دی جیسی وہ لکھ چکے تھے۔

''میاں سچ تو یہ ہے کہ آپ کی سی آورد کی شاعری کرنے کے لیے بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں

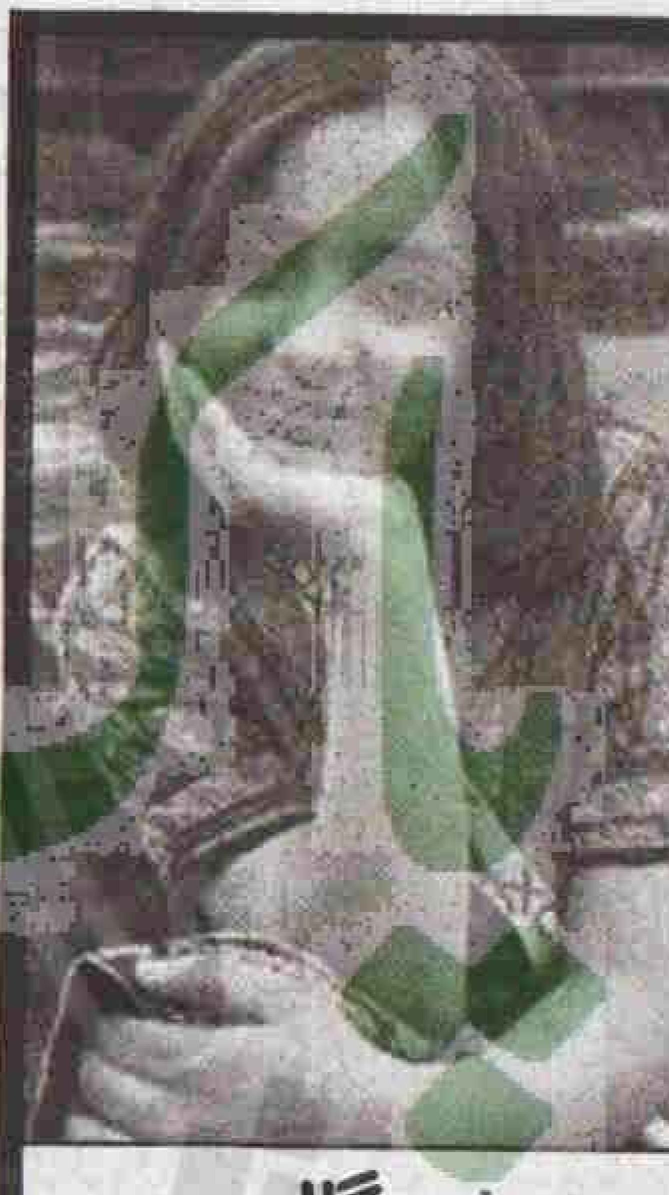

سفید گلاب

"جب میں چھ سال کی تھی، میں نے پہلی بار کمپیوٹر دیکھا۔ جب آپ کوئی نئی چیز دیکھتے ہیں تو اس کے بارے میں تجسس سوار رہتا ہے کہ یہ ہے کیا؟ کیسے کام کرتا ہے؟ میں نے بھی یہی کیا، تجسس رفع کرتی رہی۔ اپنی کارکردگی والد اور والدہ کو دکھاتی تو وہ کہتے کہ یہ کمپیوٹر کی دنیا میں بھی ارفع ثابت ہوگی اور واقعی ایسا ہی ہوا۔" یہ وہ الفاظ ہیں جو ارفع کریم نے انٹرویو میں کہے تھے۔ ارفع کریم جو فخر پاکستان تھی۔ کمپیوٹر کی دنیا میں اس کا ایک نام تھا۔ وہ ابھی کم سن تھی کہ کمپیوٹر میں اس کی گہری دلچسپی دیکھتے ہوئے اس کے والد نے اسے نزدیکی کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرادیا مگر جو اسے پڑھا رہے تھے، وہ بھی اس سے پیچھے رہ گئے۔ وہ مسلسل تجربات کرتی رہی۔ اس کم عمری میں، صرف 9 سال کی عمر میں وہ مائیکروسافٹ کمپنی کی جانب سے منعقدہ امتحان میں شرکت کے لیے خصوصی دعوت نامے پر اس کے مرکز "ریڈمونڈ" واشنگٹن پہنچ گئی جہاں بل گیٹس نے خصوصی طور پر اس سے ملاقات کی۔ اسے کمپنی کے دیگر عہدہ داروں سے ملوایا گیا۔ تمام شعبے دکھائے گئے۔ جس وقت اپنے والد کے ساتھ ریڈمونڈ کے دورے پر تھی، اس کی والدہ اور تین وسات سال کے دو بھائی گھر میں بیٹھے اس کے روشن

اس صحرا کی خاک چھان چکا ہوں اس لیے کہہ رہا ہوں۔ یہ تعجب الگ ہوتا ہے کہ بنگال میں رہ کر ایسی اردو آپ نے کیسے سیکھ لی۔ اگر کسی وقت بنگال کی شاعری کا جائزہ لیا گیا تو آپ کی یہ خدمات سرفہرست ہوں گی۔" غالب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر نہیں پڑھے تھے۔ بس پڑھوائے تھے۔ زعم شعر گوئی تھا لیکن یہ بھی کوئی ادائے مہمان داری تھی کہ اپنی مثنوی ابر گہربار کے اشعار اس کے سامنے پڑھنے شروع کیے تو تین سو شعر پڑھ گئے۔ یہ خبر کہیں ٹھہرنے والی تھی دہلی میں یہ قصہ عام ہوگیا کہ بنگال سے آئے ہوئے ایک شاعر کے سامنے غالب نے تین سو شعر پڑھے۔ اس سے یہ تاثر ہونا لازمی تھا کہ نساخ اس پائے کے شاعر ضرور ہیں کہ غالب ان کی سخن فہمی کے قائل ہیں۔ اس تاثر نے دوسرے شعرا کو بھی اس کی طرف راغب کیا چنانچہ آئندہ ملاقاتیں آزردہ، شیفتہ، حالی، داغ وغیرہ سے بھی ہوئیں۔

ایک شب ان ملاقاتوں نے مشاعرے کا رنگ اختیار کرلیا۔ اس کے لیے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لٹی پٹی دلی میں اس وقت جتنے شعرا موجود تھے سب جمع تھے۔ ستارے تھے لیکن ماند پڑ چکے تھے۔ ہنگامہ غدر کے جس حادثے سے گزر کر آرہے تھے اس کے بعد وہی دل سوز لہجہ ہونا چاہیے تھا جو ان شعرا کا تھا۔ زبان میں سادگی تھی متانت تھی ایسے میں نساخ کی آواز گونجی تو دہلی والوں کو وہ کسی اور ہی دنیا کا آدمی معلوم ہوا۔ دہلی والوں کو لکھنؤ کی یاد آگئی۔ نساخ غزل پڑھ رہا تھا اور دہلی والے اس کا منہ تک رہے تھے۔

پنجہ رنگیں سے ہے توقیر پشت آئینہ
ہوید بیضا سے اب تنویر پشت آئینہ
وقت تزئیں میرے اس کے آئینہ پردہ ہوگر
کیوں نہ ہوں میں صورت تصویر پشت آئینہ

دہلوی شعرا نے غالب کے مشکل اشعار بھی سنے تھے لیکن ان میں مضمون آفرینی ہوتی تھی یہاں تو صرف الفاظ ہی الفاظ تھے۔ انہوں نے اسے مہمان سمجھ کر سراہا ضرور لیکن یہ بھی سوچتے رہے کہ غالب نے اس میں کیا دیکھا۔ جو دیکھا شاید بعد میں سامنے آنے والا تھا۔

نساخ یہاں علاج کرانے آیا تھا۔ حکیم محمود خاں حاذق حکیم تھے۔ ان کے علاج سے افاقہ ہوا۔ اُدھر چھٹیاں بھی ختم ہورہی تھیں۔ اس نے دہلی کو خیرباد کہا۔ آگرہ، کان پور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا۔ یہاں کی بہار بھی دیکھی لوگوں سے ملاقاتیں بھی کیں اور پھر ضلع بانکا اپنی ملازمت پر لوٹ آیا۔

بانکا سے اس کا تبادلہ چھپرہ ضلع سارن ہوگیا لیکن چھپرہ

میں وہ جتنے دن رہا پریشان رہا۔ گنگا کے سیلاب نے پریشان کیا پھر اپنے استاد ضیغم کے انتقال کی خبر ملی اور سال کے آخر میں خود بھی بیمار پڑ گیا۔ علاج کی خاطر ایک مرتبہ پھر دہلی جانا پڑا۔ اس سفر دہلی میں بھی اس نے علاج کے ساتھ ساتھ دہلوی طرز مشاعروں کا بہ غور مشاہدہ کیا، دہلی کی سادہ گوئی اور لفظی بازیگری سے اجتناب نے اسے اس مرتبہ بھی متاثر کیا۔

دہلی سے واپسی میں وہ راستے بھر دہلی کے رنگِ شاعری پر غور کرتا رہا تھا۔ وہ اب تک دبستان لکھنؤ کی پیروی کرتا تھا لیکن اب اسے دہلی کا رنگِ شاعری متاثر کررہا تھا۔ دہلی کا یہ سفر اس کی شاعری کے لیے ایک نئے موڑ کی حیثیت اختیار کرتا جارہا تھا۔

اس نے غالب، مومن، شیفتہ اور حالی وغیرہ کی غزلوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اب اس کے قلم کی نوک پر دبستان دہلی کی ترجمانی کرتے ہوئے کچھ اس قسم کے اشعار تھے۔

خفا کیوں ہوگئے تم یہ ہوا کیا
مری تقصیر کیا مری خطا کیا
ہے تیری چال کا انداز ہی اور
کوئی پیغام لائی ہے صبا کیا
دشمن کا اگر میں نے کیا ذکر ہوا کیا
ہے بات تو کچھ ورنہ بگڑنا ہے بھلا کیا

☆☆☆

ہم سے دیوانے کو کرتا ہے نصیحت ناصح
تجھ سے بڑھ کے کوئی دنیا میں بھی ناداں ہوگا

☆☆☆

شکوہ کیا وصل میں کرتے اس سے
یاد آیا بھی تو کم یاد آیا

☆☆☆

وہ کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
نساخ وہ زمیں ہے نہ آسماں ہے اب

☆☆☆

کہوں کس سے اگر میں تو کون مانے گا
کہ اپنے دل پہ نہیں ہائے اختیار مجھے

☆☆☆

کیا ناصح نے بھی افسوس مجھ پر
جو نام ان کا سنا میری زباں سے

☆☆☆

اتباع دہلی میں ہلکی پھلکی بحروں کا استعمال صاف اور سادہ مضامین میں داخلی کیفیت اور جذبات کی لطیف عکاسی

مستقبل کی دعا کررہے تھے۔ اپنے دو ہفتے کے اس دورے میں اس نے بل گیٹس اور کمپنی کے دیگر عہدے داروں کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا جس میں مائیکروسافٹ کے کارپوریٹ وائس پریذیڈنٹ ایس سوم ساگر بھی شامل ہیں جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک بلاگ میں تفصیل سے کیا ہے۔ رام دیوالی ضلع فیصل آباد کی وہ ننھی بچی لاہور کے لاہور گرامر اسکول کی طالبہ تھی۔ امریکا سے واپسی کے بعد اگست 2005ء میں وزیراعظم کے دستِ مبارک سے اسے فاطمہ جناح گولڈ میڈل دیا گیا۔ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی فیلڈ میں اتنی کم عمر بچی کو پہلی بار ایوارڈ دیا گیا تھا۔ بہ دست صدر پاکستان اسے سلام پاکستان کا یوتھ ایوارڈ بھی ملا۔ اسے پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی کی 3G براڈ بینڈ سروس EVO کا برانڈ ایمبسڈر، جنوری 2010ء میں مقرر کیا گیا۔ اس نے کئی عالمی فورم میں پاکستان کی جانب سے شرکت کی تھی۔ جب اسے آئی ٹی پروفیشنل دبئی کی جانب سے دعوت دی گئی تو اس نے دو ہفتے کے قیام میں ایک اور کارنامہ انجام دیا۔ صرف دس سال کی عمر میں اس نے جہاز اُڑانے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر دکھایا۔ اس نے بہت ساری نظمیں بھی لکھیں جس میں ایک نظم جو اس نے بل گیٹس سے ملنے جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں لکھی تھی بہت مشہور ہوئی تھی۔ اس کی حمد و نعت بھی کافی مشہور ہوئی۔ جب وہ اے لیول کے سیکنڈ ایئر میں تھی، 22 دسمبر 2012ء کو اس پر مرگی جیسی کسی بیماری کا حملہ ہوا اور وہ کوما میں چلی گئی۔ اسے کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں داخل کردیا گیا مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عارفہ کریم کے انتقال پر بل گیٹس نے یہ پیغام ارسال کیا۔

"Today is the black day of my life and same for Pakistan because I lost my princess colleague and Pakistan lost her Pakistani."

حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں اس کی شاعری میں نظر آنے لگیں جو اس سے پہلے نہیں تھیں۔ یہ ایک بالکل ہی الگ دنیا تھی جس کی سیر کو وہ نکلا ہوا تھا۔

لکھنو سے دہلی پہنچ جانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس نے ناسخ کی پیروی میں آنکھ کھولی تھی۔ دہلی کی سادگی کو اختیار کرتے کرتے اچانک لکھنو کی سنگلاخ زمینوں کی طرف جا نکلتا تھا چنانچہ اس کا دوسرا دیوان ''اشعارِ نساخ'' شائع ہوا تو اس میں دبستان لکھنو کا رنگ شاعری نمایاں نظر آیا البتہ ناسخ کا اتباع اس دیوان میں کم ہو گیا۔ صرف چند غزلیں ایسی تھیں ناسخ کی زمین میں تھیں لیکن فنِ شاعری کے ظاہری لوازم کا خوب اہتمام کیا۔ آرائش الفاظ پر اتنی توجہ دی کہ کلام معنی کی گہرائی اور بلندی سے خالی ہو گیا۔ یہی لکھنو کا طرزِ شاعری تھا۔

تبدیلی کی ایک صورت یہ نظر آئی کہ چند غزلیں ایسی نظر آئیں جو مومن کی زمین اور بحر و قوافی میں تھیں۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دہلی کی طرف مراجعت کا آغاز ہو گیا ہے۔

مومن کی غزل کا مطلع تھا۔

ہوئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

نساخ نے غزل لکھی

ہمیں سے کرتا ہے بل تیرا گیسوئے پیچاں
بلائے جان عدو وہ بلائے جاں نہ ہوا
ہوں پاس تو بھی گمان ہے کہ ہے کسی کا خیال
ترا گمان کبھی دردِ بدگماں نہ ہوا
لگایا دل کو تو گو حوریان جنت سے
یہ آرزو رہی حسرت کش بتاں نہ ہوا
مری غزل کی بھلا کون داد دے نساخ
ہزار حیف کہ مومن سا نکتہ داں نہ ہوا

☆☆☆

وہ مومن کی پیروی کر سکتا تھا لیکن وہ ''بات'' کہاں سے لاتا جو مومن کو نصیب تھی لیکن اتنا ظاہر ہو جاتا تھا کہ اب وہ لکھنوی رنگ سے اُکتا چکا ہے۔ اس کی منزل لکھنو یا طرزِ لکھنو نہیں بلکہ دلی اور طرزِ دلی ہے۔

اس کا اگلا پڑاؤ اس کا تیسرا دیوان ''ارمغان'' تھا جس میں اس نے شعوری طور پر طرزِ دہلی کی سادگی کو اختیار کیا تھا۔

اس دیوان میں غزلیں طویل نہیں ہیں۔ صنائع بدائع کی بازیگری نہیں دکھائی گئی۔ زبان نرم اور الفاظ بھی سیدھے سادے استعمال کیے۔ لکھنوی طرزِ شاعری سے احتراز کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ جو کہتے ہیں چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔ نساخ بھی مڑ مڑ کر لکھنو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو ناسخ کے انداز سے جی اُکتا گیا تھا لیکن لکھنو ہی کے ایک شاعر جرأت کی طرح معاملہ بندی اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے تیسرے دیوان میں کتنے ہی اشعار ایسے تھے جن میں وہ جرأت کی طرح جنسی معاملات کے پہلو کو نمایاں کرتا نظر آتا تھا۔ یہ جرأت کے اثر کا نتیجہ تھا اور جرأت لکھنو ہی کا ایک شاعر تھا۔

لینے لگے جو وصل میں بوسے وہ بول اُٹھے
اللہ کیا کروں وہ مری جان کھا گیا

☆☆☆

وصل کی شب کم رہی مستی لگانا چھوڑ دو
چھوڑنے کے ہم نہیں تم کو بہانا چھوڑ دو

☆☆☆

ہم سامنے دشمن کے لپٹ جائیں گے ان سے
کچھ کام کریں گے بھی تو مردانہ کریں گے

☆☆☆

دے کے بوسے غیر کو صاحب مکرتے ہو عبث
چپ رہو بس منہ نہ کھلواؤ خدا کے واسطے

☆☆☆

نساخ ابھی تک چھپرہ میں تھا لیکن بہت جلد اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اب وہ بھاگل پور آ گیا لیکن یہاں اس کا قیام مختصر رہا اسے مونگیر بھیج دیا گیا۔

اس کے یہ جلد جلد تبادلے اس کی شاعری کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہے تھے۔ طرح طرح کے لوگوں سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ شاعری کے لیے جہاں مطالعہ ضروری ہے وہیں مشاہدے کی بھی اہمیت ہے۔ مشاہدہ کے لیے سفر بہترین صورت ہے اور وہ مسلسل سفر میں تھا۔ اس میں اخذ و قبول کی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ وہ جہاں بیٹھتا کچھ نہ کچھ لے کر اٹھتا۔ اس کی شخصیت نہایت دل آویز تھی۔ جو اس سے ایک مرتبہ ملتا اس کا اسیر ہو جاتا۔ اسی لیے اس کے احباب کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ مختلف جگہوں پر تبادلے ہوتے رہے، لہٰذا حلقہ احباب میں اضافہ ہوتا رہا۔ احباب کا یہ دائرہ صرف شعرا، علما، شعبدہ گر، نجومی پیر فقیر، شطرنجی سب اس کے ملنے والوں میں شامل تھے۔ کبھی کبھی تو تعجب ہوتا تھا کہ اتنا وقت کیسے نکال لیتا ہے۔ سرکاری مصروفیات ایسی تھیں کہ سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی اور وہ ہر محفل میں دیکھا جاتا تھا۔

مونگیر میں گرمیوں کے دن تھے۔ وہ اپنی عدالت میں بیٹھا ایک مقدمے کی سماعت کر رہا تھا۔ اسی وقت ایک صاحب داخل ہوئے اور مختاروں کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ اس نے ان صاحب کو دیکھ لیا تھا لیکن پہچاننے سے قاصر رہا تھا۔ وہ صاحب انگریز تھے لیکن کون ہیں یہ معلوم نہیں تھا؟ یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جج بہادر ہائی کورٹ مسٹر لوئیس جیکسن تھے۔ یہ خبر اسے اس وقت ملی جب مسٹر جیکسن نے اسے اپنی قیام گاہ پر طلب کیا۔

''آپ نے مجھے پہچان لینے کے باوجود التفات نہیں کیا اور مجھے جان بوجھ کر شرمندہ کیا۔'' مسٹر جیکسن نے شکایت کی۔

''میں نے آپ کو قطعی نہیں پہچانا تھا ورنہ نہایت تکریم سے پیش آتا اور جس وقت مجھے معلوم ہوا آپ میری کچہری سے نکل چکے تھے۔''

''آپ نے مجھے نہ پہچانا ہو لیکن آپ کے پیش کار نے ضرور پہچان لیا ہو گا۔ اس نے آپ کو بتایا بھی ہو گا۔''

''میرا پیش کار کچھ روز ہوئے مونگیر آیا ہے۔ اس سے پہلے وہ بھاگلپور میں تھا۔ اس لیے پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' انگریز کو اپنے انگریز ہونے کا غرور تھا۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ اسے پہچانا نہیں گیا بلکہ بضد تھا کہ اس کی بے عزتی کی گئی ہے۔

انہوں نے نساخ کو سزا دینے کا طریقہ یہ نکالا کہ اس کے چھ مہینے کے مقدمات نکلوائے جن کا فیصلہ ہو چکا تھا اور ان میں سیکڑوں غلطیاں نکال کر حکومت کو رپورٹ کر دی۔ ایک یورپین کے سامنے ایک ہندوستانی کی حیثیت ہی کیا۔ گورنمنٹ نے نساخ کو صفائی کا موقع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا اور تبادلے کے احکام جاری کر دیے گئے۔ اس کا تبادلہ سلہٹ کر دیا گیا تھا۔ اس نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اسے سلہٹ اور اس کے بعد ڈھاکا جانا پڑا۔

ڈھاکا کی ادبی فضا نے اس کے ذوقِ شاعری کو خوب ابھارا۔ یہاں رہ کر اس نے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے اپنا چوتھا دیوان پیش کیا۔ اب وہ دہلی کے تین چار سفر کر چکا تھا اور پوری طرح دہلوی رنگ میں ڈوب چکا تھا۔ اتنی مشق ہو گئی کہ صاف اور سادہ زبان میں ادائے مطلب بیان کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس دیوان کی تمام غزلیں نہایت سہل زبان میں ہیں۔ بعض غزلیں تو ایسی ہیں جیسے کوئی باتیں کر رہا ہے۔

وہ کبھی میرے گھر نہیں آتا
وہ کبھی راہ پر نہیں آتا
گر مرا نالہ نارسا ہوگا
عرش کے پار تو گیا ہوگا

کیا دیا ہے نیا خطاب ہمیں
کہتے ہیں خانماں خراب ہمیں

☆☆☆

ان کے آنے کا احتمال نہیں
میری تقدیر میں وصال نہیں
وہ مرا حالِ زار کیا جانیں
وہ غمِ روزگار کیا جانیں

☆☆☆

اب اس کی شاعری سادگی، متانت، وقار اور پختگی کے نمونے پیش کر رہی تھی۔ اس کا جھکاؤ ناسخ سے ہٹ کر غالب اور مومن کی طرف ہو گیا تھا۔ غالب کی مضمون آفرینی تک تو وہ نہیں پہنچ سکا لیکن مومن کی خوب پیروی کی۔

پہنچا نہیں ہے وہ تو ابھی میرے حال کو
دشمن کے حال پر وہ نہیں مہرباں ہنوز
ہے بے خودی میں بھی مجھے کیا ضبط دیکھیے
رسوا ہوا نہیں مرا رازِ نہاں ہنوز

☆☆☆

اس آخری دیوان ''ارمغان'' میں فارسی تراکیب کی اچھی تراش خراش بھی موجود تھی۔ زبان نہایت سلیس تھی مشکل قوافی سے اجتناب کیا تھا۔ دہلوی طرز کے اتباع کے باوجود تصوف کے اشعار بہت کم تھے البتہ حرماں نصیبی کے گلے شکوے ضرور ملتے تھے حالانکہ وہ نہایت خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔

نساخ نہایت پرگو شاعر تھا۔ چار دواوین کے علاوہ اس نے رباعیات کے دو مجموعے بھی شائع کرائے تاریخی قطعات کا مجموعہ بھی پڑھنے والوں کو دیا۔

☆☆☆

اس کی رسائی بنگال سے دہلی تک کے شعرا تک تھی۔ اکثر سے خط کتابت تھی، بیشتر کے حالات سے واقف تھا۔ اس کے ارد گرد شعرا کے بہت سے تذکرے بھی تھے۔ اس نے بھی سوچا کہ ایک تذکرہ شعرا مرتب کیا جائے جس میں ایجاز و اختصار سے کام لیا جائے۔ حالات سے زیادہ کلام درج کیا جائے اور شعرا کی تعداد زیادہ سے زیادہ رکھی جائے تاکہ سب کے نام محفوظ رہیں۔ جو تذکرے اس کی نظر سے گزرے تھے ان میں منتخب شعرا کے حالات ملے تھے۔ اس نے طے کیا کہ وہ اپنے تذکرے میں ہر چھوٹے بڑے شاعر کے حالات فراہم کرے گا۔ بنگال کے شعرائے اردو کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی گئی تھی کہ ان تذکروں کی زینت بنتے۔ حالانکہ اس انتخاب میں اسے بنگال کے شعرا کا بھی تذکرہ کرنا چاہیے تھا۔

وہ شعرا کے حالات جمع کرنے میں مشغول ہوگیا۔ اس کے لیے اس نے اپنے دور کے مروجہ تذکروں سے بھی مدد لی، خطوط لکھ کر شعرا سے ان کے حالات بھی طلب کیے۔ جن سے مل چکا تھا ان کے لیے اپنی یادداشت پر بھروسا کیا۔ ایک جدت یہ بھی کی کہ آخری دس صفحات شاعرات کے لیے مختص کیے۔

اس تذکرے کا نام اس نے سخن شعرا رکھا اور یہ بہ زبان اردو تھا۔ سخن شعرا کی اہمیت شعرا کے حالاتِ زندگی، کلام پر رائے سے نہیں بلکہ اس کی اہمیت صرف اس لیے ہے کہ اس میں کثیر التعداد شعرا کا ذکر ہے اور بنگال کے شعرا کے متعلق جو تھوڑا بہت مواد ملتا ہے وہ اسی میں ملتا ہے۔ آج اگر ''سخن شعرا'' کا وجود نہ ہوتا تو ہم شاید بنگال کے اردو شعرا کے ناموں تک سے واقف نہ ہوتے۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ ڈیڑھ سو سال پہلے لکھنو اور دہلی سے دور بنگال اور بہار میں کتنی بڑی تعداد ان شعرا کی تھی جو اردو میں دادِ سخن دے رہے تھے۔

یہ تذکرہ آج بھی بنگال کے شعرا کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔

اسی تذکرے کی بدولت ان شعرا کا مجموعۂ کلام بھی محفوظ رہ گیا ورنہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے تو ان شعرا کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ وہ سرکاری مصروفیات کے باوجود اتنا بڑا کام کرگیا جسے اردو تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔

☆☆☆

نواب مرزا داغ دہلوی رام پور میں مقیم تھے۔ نواب کلب علی خاں کا زمانہ تھا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی بے نظیر باغ میں میلہ منعقد ہوا۔

میلہ ہر سال ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ یہ ہوا کہ کلکتہ کی مشہور ڈیرہ دار نیز بیگم عرف منی بائی حجاب بھی سروں کی برسات کرنے حاضر ہوئی۔ طوائف کیا تھی زمیں کا منہ چومتا ہوا ستارہ تھی۔ داغ کی جمال پرست آنکھوں نے دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔ غضب یہ بھی ہوا کہ رقص کرنے کھڑی ہوئی تو غزل داغ کی چھیڑ دی۔ داغ تو باغ باغ ہوگیا۔ اس نے دل آنکھوں میں رکھا اور منی بائی کے قدموں میں رکھ دیا۔ حجاب ایک زمانہ شناس داغ جیسا باکمال شاعر اس پر عاشق ہو رہا تھا۔ ایسی بے حجابی سے ملی کہ پہلی ملاقات برسوں کی شناسائی بن گئی۔ جب تک وہ رام پور میں رہی داغ اس کے قدموں میں لوٹتے رہے۔ کئی غزلیں تھیں جو اس قلیل عرصے میں حجاب کا سراپا بن کر ڈھل گئیں۔ جب روانہ ہونے لگی تو داغ نے اصرار کیا کہ یہیں رہ جائیے۔ کلکتہ کی رہنے والی بھلا رام پور میں کیا رہتی۔ اس نے پھر ملیں گے کا وعدہ کیا اور رام پور چھوڑ گئی۔ کلکتہ دور تھا آہ و زاری کا شور تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن خط تو جاسکتا تھا۔ خط جاتے رہے، خط آتے رہے، ان خطوں میں بھی داغ نے کتنی ہی غزلیں نذر حجاب کردیں۔

ایک خط میں اس مہ پارہ نے لکھ دیا۔ اگر سچے ہو تو کلکتہ آکر دکھاؤ۔ یہ اس نے اس بھروسے پر لکھا تھا کہ نواب رام پور کو اس کی مفارقت کہاں گوارا ہوگی۔ وہ کہاں اسے چھوڑنے والے۔ وہ ضد کا پکا نکلا نواب سے اجازت مل گئی، بیوی سے بھی کوئی نہ کوئی بہانہ کردیا۔ پہلے دلی گیا پھر لکھنو اور پھر عظیم آباد پہنچ گیا۔ کچھ دن یہاں ٹھہرا مشاعرے لوٹے میزبانوں، قدردانوں نے کچھ نہ کچھ جیب میں بھی ڈال دیا۔ وہ کلکتہ پہنچ گیا۔

تانگے چلتے تھے اس نے بھی ایک تانگے پر قبضہ کرلیا۔ ''کولوٹولہ اسٹریٹ چلو۔''

مصفا سڑکوں پر گھوڑا تیزی سے دوڑنے لگا۔ موٹر گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے بے حجاب انگریزی جوڑے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں رام پور اور کلکتہ کا موازنہ کرتا رہا اور بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ حجاب رام پور میں کیوں رکنے کو تیار نہیں تھی۔

کولوٹولہ اسٹریٹ آگیا۔ منی بائی حجاب کا مکان ایسا تھا کہ مسافروں کو ڈھونڈتا تھا، مسافر اسے کیا ڈھونڈتا۔ دستک کے جواب میں خود حجاب نمودار ہوگئی۔ چاند خود حیران تھا کہ چاند کا شیدائی کلکتہ تک چلا آیا۔ آج حجاب کو اپنی قسمت پر ناز ہو رہا تھا کہ کوئی حسین ہو تو میری طرح ہو۔

وہ صرف اتنا کہہ سکی ''اللہ قسم تم نے میری لاج رکھ لی۔ یہاں دو چار شاعر ایسے ضرور ہیں جنہوں نے مجھ سے شرط رکھی تھی کہ داغ میرے بلاوے پر کلکتہ نہیں آسکتے۔ سب سے بڑھ کر تو عصمت اللہ انسخ ہیں جو میرے استاد ہیں۔ اب میں ان کے سامنے سرخرو ہوگئی۔

اس وقت تو داغ نے کوئی توجہ نہیں دی اور توجہ دینے والی بات تھی بھی نہیں لیکن جب چند روز گزر گئے اور وہ ایک مشاعرے سے واپس آیا تو حجاب کو خوش کرنے کے لیے اس نے اس کے استاد کا ذکر چھیڑ دیا۔

''آج آپ کے استاد مولوی عصمت اللہ انسخ کا دیدار بھی ہوگیا۔''

''جی ہاں مجھے معلوم تھا وہ وہاں ہوں گے۔''

''بھئی کمال کے شاعر ہیں؟''

''کیوں نہ ہوں۔ عبدالغفور نساخ کے شاگرد ہیں۔ نساخ کوئی معمولی استاد نہیں ہیں۔ غالب تک سے خط کتابت ... ان کی۔''

وہ اس وقت بھی پہلے تو چپ ہوگیا لیکن پھر اس کی ... دداشت نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

''کیا نام بتایا تم نے نساخ؟ یہ وہی تو نہیں ہیں جن کا ... ذکرہ سخن شعرا مشہور ہے۔''

''ہاں وہی تو ہیں۔''

''تم مجھے ان سے ملوا سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں آج کل کلکتہ ہی میں ہیں۔''

''تو پھر کسی روز بلوا لو۔''

''وہ شاعر ہیں رقص و سرور کی محفلیں بھی سجاتے ہیں ... کن ایسی جگہوں پر خود نہیں آتے۔ آپ کو جانا پڑے گا۔''

''تم انتظام تو کرو ہم چلے جائیں گے۔ بھئی وہ اتنے ... ے شاعر ہیں۔ انگریزوں کے مجسٹریٹ ہیں ہم تو ان کی ... عایا میں ہوئے۔''

''اب تو آپ طنز پر اُتر آئے۔''

''ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا یہ بات تو ہم ان کے ... سامنے بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''تو پھر آمنا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیے۔ کل ہم ... ان کے در دولت پر چلیں گے۔ آپ کی شہرت آپ سے پہلے ... ان تک پہنچ گئی ہوگی۔''

بات یہ تھی کہ داغ مجہول النسب تھے۔ ان کی والدہ ... چھوٹی بیگم پر والیٔ فیروز پور نواب شمس الدین ایسے فریفتہ ... ہوئے تھے کہ ان سے تعلق کرلیا تھا۔

ایک انگریز ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں نواب ... صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ داغ پیدا ہو چکا تھا لیکن نواب ... صاحب نکاح کرنے سے پہلے ہی پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ ... ولدیت کا خانہ خالی رہ گیا۔

امیر مینائی... جب اپنا تذکرہ ''انتخاب یادگار'' مرتب ... کرنے لگے تو داغ رام پور میں تھے۔ انہوں نے امیر سے کہہ ... کر اپنی ولدیت میں نواب شمس الدین والیٔ فیروز پور کا نام ... لکھوا دیا تھا۔ کچھ دن بعد نساخ کا ''سخن شعرا'' سامنے آگیا۔ ... اس تذکرے میں لکھا گیا تھا۔

''نواب مرزائے دہلوی ولد چھوٹی بیگم شاگرد شیخ محمد ... ابراہیم ذوق ملازم نواب پور۔ راقم نے اس شخص کو دہلی میں ... دیکھا ہے۔''

داغ کی نظر سے یہ تحریر گزری تو سہی لیکن وہ رام پور ... اس تھا نساخ کلکتہ میں پھر ان سے صاحب سلامت بھی نہیں

نساخ کے منتخب اشعار

ہجر کی رات کو دم بھر بھی نہ آرام کیا
بات کچھ دل نے اگر کی تو ترا نام لیا

..........☆☆..........

رات جو آئے گی کس طرح کٹے گی یارب
فکر رہتی ہے اسی کی تو سحر سے کیا کیا

..........☆☆..........

طلب وصل پر اِک ناز و ادا سے آخر
لب پہ اقرار بھی آیا تو تبسم ہوکر

..........☆☆..........

گریباں پر ہے اپنے آزمایا
ہمارا زور تھا ہم دم جہاں تک

..........☆☆..........

کر نہ عشق اے دلِ ناکام بُرا ہوتا ہے
کہ بدآغاز کا انجام بُرا ہوتا ہے

..........☆☆..........

نساخ اگلی صحبتوں کو ڈھونڈتی ہے آنکھ
وہ اہلِ بزم کیا ہوئے وہ انجمن کہاں

..........☆☆..........

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
اس میں ذلت ہے تو ذلت ہی سہی

..........☆☆..........

کیا ناصح نے بھی افسوس مجھ پر
جو نام ان کا سنا میری زبان سے

..........☆☆..........

نہ ہو کیوں ٹکڑے ٹکڑے پردۂ چشم تماشائی
مصفا صورت الماس ہے ہر عضو جاناں کا

..........☆☆..........

اے سلیماں خط جو لکھا میں نے اس بلقیس کو
ہدہد شہر سبا اپنا کبوتر ہوگیا

..........☆☆..........

روزِ محشر سے فزوں روزِ فراق
نارِ دوزخ سے سوا سوزِ فراق

..........☆☆..........

تھی۔ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

نساخ کا نام حافظے سے محو بھی ہو چلا تھا کہ حجاب سے ملنے کلکتہ آنا ہوا اور پھر سب کچھ تازہ ہو گیا۔

دوسرے دن وہ نساخ سے ملنے گیا۔ گفتگو کا تو بادشاہ تھا ہی ملتے ہی دل میں اتر گیا۔ ایسے تعلقات قائم کیے کہ آئندہ کے لیے منہ بند کر دیا۔ نساخ نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کا ازالہ کر دیں گے۔ نساخ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

نساخ نے ارادہ کیا تھا کہ جس طرح اردو شعرا کا تذکرہ ''سخن شعرا'' مرتب کیا ہے اسی طرح ایک تذکرہ فارسی گو شعرا کا مرتب کیا جائے۔ داغ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا جا سکتا تھا۔ داغ فارسی گو شاعر نہیں تھے لیکن نساخ نے ان سے فارسی میں شعر خاص طور پر لکھوائے تا کہ تذکرے میں ان کا نام شامل کیا جا سکے۔

یہ تذکرہ ''تذکرۃ المعاصرین'' کے نام سے شائع ہوا تو داغ کا ذکر اس طرح درج تھا۔

''داغ تخلص، نواب مرزا خاں دہلوی از متوسطین ریاست رام پور ابن نواب شمس الدین خاں مرحوم ابن نواب احمد بخش مغفور رئیس فیروز پور جھرکا و لوہارو......''

رام پور سے طلبی کے بعد مرزا داغ کلکتہ سے رام پور جا چکا تھا۔

☆☆☆

اہلِ لکھنو کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا۔ یہ ناز غرور کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ کسی اور علاقے کی زبان کو وہ اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ ان کے نزدیک بس وہ اہلِ زبان تھے۔ نساخ تو بنگال کا تھا۔ اس کی دال کسی لکھنو والے کے سامنے کیا گلتی۔ ادھر نساخ کو اپنی زبان دانی اور شاعرانہ صلاحیت پر بڑا ناز تھا۔ یہ احساس ابتدا ہی سے تھا چنانچہ ناسخ کی غزلوں پر غزلیں کہنا اور اپنا تخلص ''مجبور'' سے بدل کر ''نساخ'' کرنا اسی احساس برتری کا نتیجہ تھا۔ جیسے جیسے اس کی عمر اور مشق شاعری بڑھتی گئی اس احساس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اہلِ لکھنو کی بے جالفاظی نے ان کو لکھنو کے مقابل لا کھڑا کیا۔ اس کا اظہار ''سخن شعرا'' ہی سے ہو گیا تھا جب انہوں نے میر انیس اور مرزا دبیر کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کچھ زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

آتش و ناسخ کے سلسلے میں بھی یہی جذبات تھے۔ غرض وہ اہلِ لکھنو اور بالخصوص ان کے مسلم اساتذہ کی برتری کا قائل نہ تھا۔

اس کا یہی جذبہ جب تحریری شکل میں سامنے آیا تو لکھنو کے ایوانِ شاعری میں تہلکہ مچ گیا۔ اس نے ایک مختصر رسال ''انتخابِ نقص'' کے عنوان سے شائع کرایا۔

وہ شاعر اور تذکرہ نگار تو تھا ہی اس رسالے کے بع نقادوں کی صف میں بھی شامل ہو گیا۔ اس رسالے کی اشاعت ایک بڑے ادبی معرکے کا سبب بھی بن گئی۔ اہلِ لکھن نے ان اعتراضات کے جواب دیے جو نساخ نے اُٹھائے تھے پھر بعض لوگ ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے نساخ کے کلام پر اعتراضات کی بارش کر دی۔

''انتخابِ نقص'' کے جواب میں ''دلخراش'' اونسا اور گستاخی معاف جیسی کتابیں سامنے آ گئیں۔ نساخ کے دواوین موجود تھے۔ آغا علی ساکن لکھنو نے ان دواوین کو سامنے رکھ کر انہوں نے نساخ کے اشعار سے غلطیاں نکال کر سامنے رکھ دیں۔

نساخ پر حملہ ہو اور اس کے شاگرد چپ رہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس جھگڑے میں نساخ کے شاگرد بھی شامل ہو گئے۔ سب سے پہلے عصمت اللہ انخ نے ''طومار اغلاط'' لکھا جس میں چھ نامی گرامی لکھنوی شعرا کی غلطیاں طشت از بام کی گئی تھیں۔ اس کے جواب میں آغا علی نے کتاب لکھی۔

جواب در جواب کا یہ سلسلہ عرصہ دراز تک چلتا رہا۔ بہر کیف ''انتخابِ نقص'' کے طفیل ایک اچھا خاصا تنقیدی موا ادب اردو میں داخل ہوا جو مستقبل کے تنقیدی ارتقا کی اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے ادب کے عہد بہ عہد تنقیدی ارتقا کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

☆☆☆

جیکسن صاحب کی شکایت کے بعد نساخ تقریباً عتاب میں آ گیا تھا۔ اس کا تبادلہ مختلف جگہوں پر کیا جا رہا تھا۔ کبھی ڈھاکا کبھی مالک گنج، سب جگہ گھوم پھر کر پھر ڈھاکا آ گیا۔ مسلسل سفر میں رہنے کے باعث اس کا ادبی کام متاثر ہو رہا تھا لیکن اس کی ہمہ گیریت پر لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مصروفیت کے بعد وہ وقت کیسے نکال لیتا ہے۔ شاعری تو چلتے پھرتے بھی ہو سکتی تھی لیکن نثری کام جو تذکروں وغیرہ کی صورت میں کر رہا تھا اس کے لیے ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا ضروری تھا۔ حوالے کی کتابیں ساتھ لیے پھرتا تھا۔ ادبی معرکوں نے اسے الگ زچ کیا ہوا تھا۔ جو اعتراض اُٹھتا تھا اسے اس کا جواب دینا پڑتا تھا۔

ڈھاکا کے طویل قیام کے بعد اسے بیر بھوم جا کر چارج لینا پڑا۔ یہاں سولہ مہینے گزارنے کے بعد ہگلی میں چارج لیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس نے تعلیم حاصل کی تھی

طویل یادیں وابستہ تھیں شناسا لوگ اب بھی موجود تھے۔

وہ ابھی ان یادوں کو پوری طرح سمیٹ بھی نہیں سکا تھا کہ صرف ایک مہینے بعد وبائی تپ کا شکار ہو گیا۔ وہ زبردست قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ اس بیماری کو پس پشت رکھ کر معمول کے کام انجام دیتا رہا۔ کسی نے کہا مٹر کے دانے کے برابر افیون کھا لیا کرو مرض جاتا رہے گا۔ اس سے بھی فائدہ نہ ہوا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اس تپ کے دور ہونے میں چار مہینے لگ جائیں گے تو چھ ماہ کی رخصت لے کر دہلی چلا گیا، غلام نبی خاں کا علاج کرایا۔

دن علاج میں راتیں مشاعروں میں گزار کر وہ واپس آیا اور اس مرتبہ ڈھاکا جا کر چارج سنبھالا۔ ذرا فرصت ملی تو اپنی خود نوشت لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ ایک دو دن کا کام نہیں تھا جبکہ گردشِ زمانہ ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس کا تبادلہ میدنی پور ہو گیا۔

میدنی پور ہی میں وہ ایک بار پھر تپ کا شکار ہو گیا۔ اس مرتبہ حملہ کچھ زیادہ ہی شدید تھا۔ اس نے تین ماہ کی رخصت لی اور دہلی چلا گیا یہ اس کا چوتھا سفر دہلی تھا۔ اس کا بار بار دہلی جانا علاج کے لیے تو خیر تھا ہی لیکن یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہر سے اسے خاص محبت تھی۔ دہلی جا کر صرف علاج ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے نفسیاتی تسکین بھی ملتی تھی۔

اس سفر میں اس نے دہلی میں ایک تبدیلی نمودار ہوتے ہوئے دیکھی۔ مسلمانوں کے بعض افراد نے انگریزی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ اس نے زیرِ تحریر خود نوشت میں لکھا۔

''ماہ اکتوبر 1885ء کو تین مہینے کی رخصت لے کر دہلی کو گیا......اس دفعہ جو گیا تو دیکھا بعض بعض ہندو مسلمان انگریزی کپڑے پہننے لگے ہیں۔''

اس نے اپنی خود نوشت میں جہاں موقع ملا اردگرد کے سماجی ماحول کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا تھا۔ لکھنو کے اشخاص کے بارے میں اس کی رائے تھی۔

''یہاں کے اکثر لوگ زبانی محبت بہت دکھلاتے ہیں لیکن دل میں کچھ نہیں ہے۔ لکھنو کے لوگ باتیں خوب بناتے ہیں۔''

ڈھاکا، سلہٹ، باریسال کے لوگوں کے متعلق لکھا۔

''ڈھاکا، سلہٹ، باریسال وغیرہ پورب کے ضلع کے لوگوں کو نہ خدا کا خوف ہے نہ رسول کا، نہ آدمیوں کا خوف ہے اور نہ محبت نہ مروت۔ زن، شوہر، باپ بیٹی میں۔ بھائی بھائی میں، بہن بہن میں جو محبت ہونا چاہیے نہیں ہے، سب کو فقط روپے کی فکر ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ جو کچھ ہو میرے ہاتھوں میں آوے اور دوسرے عزیز و اقربا میرے دستِ نگر ہوں۔''

غزل

(بہ طرز لکھنو)

حالِ سوز ہجر میں پوچھو نہ مجھ مایوس کا
جسم عریاں پر ہے عالم شمع بے فانوس کا
میرے ترک نوجوانی تیغ زن کے عہد میں
سونے کی قیمت سے پر بکنے لگا طاؤس کا
موج آغوش اور دہن اے بحر خولی ہے حباب
شوق دریا کو بھی ہے تیرے کنارو بوس کا
بات وہ کرتے نہیں اور نالے کرتا ہے یہ دل
بت کی خاموشی کے باعث شور ہے ناقوس کا

☆☆☆

اس مست حسن کی جو پڑی آنکھ نشہ میں
لبریز کیوں نہ مے سے ہوئے ساغر حباب کا
مژگاں سے کچھ ضرور نہیں چشمِ پر آب کو
بے خوف خار سے ہے پھپولا حباب کا
خط نے گھٹا دیا رُخ پُرنور کا فروغ
ہوتا ہے وقت شام غروب آفتاب کا
شیطاں کی طرح غیر گریزندہ سن کے ہو
نالوں میں میرے طور ہے تیرِ شہاب کا

خاص باریسال کے لیے لکھا۔

''باریسال میں جتنے پیچیدہ اور مشکل مقدمات میں نے دیکھے آج تک ایسا مقدمہ دیکھا نہیں۔ وہاں جعل سازی کی بڑی کثرت ہے۔''

ایک اچھی خود نوشت کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ معلوماتی ہو اور صرف اپنے گرد نہ گھومتی رہے دیگر معلومات بھی پڑھنے والے تک پہنچ جائیں۔ نساخ نے اس کا پورا خیال رکھا تھا۔ اس نے مشہور شخصیتوں کے علاوہ بعض علاقوں کے مشہور پھلوں تک کا ذکر کیا ہے مثلاً الہ آباد کے امرود، لکھنو کے خربوزے، سلہٹ کے اناس اور چائے وغیرہ۔

وہ خامی اس میں بھی ہے جو اکثر خود نوشتوں میں ہوتی ہے۔ اپنی بُرائی کون کرتا ہے جبکہ خود نوشت تحریر کرنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ اسے لوگ پڑھیں گے پھر مصنف اپنے گناہوں کی فہرست کیسے پیش کر سکتا ہے، پھر اس دور کے

اخلاقی تقاضوں کو بھی دیکھیے جب دوسرے کی سوانح عمری لکھنے والے بھی صاحب سوانح کی کمزوریاں بیان کرنے سے گریزاں تھے۔ حالی کی سوانح عمریاں اس کی مثال ہیں۔

نساخ کا بھی یہی حال ہے۔ اس کا اندازِ تحریر تعلّی آمیز ہے جتنی باتیں اپنے بارے میں بیان کی ہیں ان سے اس کا بڑا پن ہی ظاہر ہوتا ہے۔ ان نقائص کے باوجود اگر یہ خودنوشت مکمل ہوجاتی تو معلومات افزا ہوتی، لیکن اس میں 1886ء تک کے حالات ملتے ہیں اس کے بعد کے حالاتِ زندگی کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ شاید بیماری یا دوسری تصنیفات وتالیفات میں مشغولیت نے اس طرف توجہ نہ کرنے دی۔

☆☆☆

وہ صحت یاب ہوکر دہلی سے واپس آیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس کا تبادلہ ڈھاکا کردیا گیا ہے۔ اس نے ڈھاکا پہنچ کر چارج سنبھال لیا۔

اس کے بڑے بھائی نواب عبداللطیف انگریزوں کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے۔ مسلسل ترقی کرتے جارہے تھے۔ نساخ ڈھاکا پہنچا تو بذریعہ تار معلوم ہوا عبداللطیف خان وزیراعظم ریاست بھوپال مقرر ہوگئے ہیں۔ اس خبر کے صرف پندرہ دن بعد نساخ کو ڈپٹی کلکٹر بنا کر تین ہفتوں کے لیے منشی گنج بھیج دیا گیا۔ تین ہفتے بعد وہ یہی دونوں عہدے لیے ڈھاکا آگیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی کا سفر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اس کی خودنوشت بھی 1886ء تک کے واقعات دکھا کر خاموش ہوگئی تھی یعنی نامکمل کہیں رکھی تھی۔ وہ اس میں کوئی اور واقعہ درج نہ کرسکا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈھاکا ہی میں تھا کہ بیمار پڑا اسی بیماری کی حالت میں وہ اپنے پسندیدہ شہر کلکتہ روانہ ہوا۔ اس شہر کے بارے میں اس نے کہہ رکھا تھا۔

یہ شہر نہیں ہے یک جہاں کلکتہ
ہر شہر زمیں ہے آسماں کلکتہ
جنت میں بھلا کہاں ہیں ایسی حوریں
فردوس کہاں اور کہاں کلکتہ

بیماری طول پکڑتی چلی گئی اور جمعہ 4 شوال 1306ھ مطابق 1889ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ اسے تالباغ کلکتہ میں دفن کیا گیا۔ لوحِ مرقد کے کتبے کے لیے اس کے ایک معاصر عبدالرؤف وحید نے یہ قطعہ لکھا تھا۔

حضرت نساخ بعد از ارتحال
چو بدیں آرام گاہ پاک خفت
باسنِ رحلت وحید ایں جائے را
مرقدِ نساخ دل بیدار گفت

نساخ نے نہ تو اردو شاعری میں کوئی انقلاب برپا کیا نہ کوئی جدّت طرازی دکھائی۔ وہ تو محض مقلد تھا طرزِ لکھنو کا بھی اور طرزِ دہلی کا بھی۔ قادر الکلامی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب تقلیدِ لکھنو سے اُکتا گیا تو ذہنی مشق کو دہلی کی طرزِ شاعری کی طرف موڑ دیا۔ ایک طرز کو چھوڑ کو دوسری راہ یکلخت اپنا لینا آسان کام نہیں ہوتا۔ نساخ نے اس کو ممکن کر دکھایا۔

مقلد ہونے کے باوجود اس کی خدمات ادبی سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے کہ وہ قادر الکلام شاعر تاریخ گو، تذکرہ نویس، ناقد اور کثیرالتصانیف ادیب تھا۔ اس نے اپنی تصانیف سے ادب اردو کے دامن کو وسعت دی۔ یہ خدمت اس نے اس طرح بھی انجام دی کہ بنگال میں اس کے تلامذہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان تلامذہ نے اردو شاعری کا علم بلند کیے رکھا۔ نساخ نے وہ شمع روشن کی جس کی روشنی سے بنگال اور اس کے چپے چپے میں اردو زبان جگمگاتی رہی۔ یہ نساخ ہی کی بدولت ہوا۔ اس نے بنگال میں رہ کر وہی کام کیا جو دلی میں ذوق اور لکھنو میں ناسخ نے سرانجام دیا۔

نساخ نے جہاں اردو شاعری کو زندہ رکھا وہیں اس کا یہ احسان بھی ہے کہ اس نے بنگال کے شعرا کو بھی زندہ کردیا۔ اس نے انہیں اپنے تذکرے ”سخن شعرا“ کے ذریعے متعارف کرایا ورنہ کون جانتا کہ دہلی اور لکھنو سے دور اردو ادب کے شیدائی چاٹگام اور سلہٹ میں بھی موجود ہیں۔ نساخ کے تذکرے ہی نے بتایا کہ اردو زبان نوابین ڈھاکا تک محدود نہیں رہی تھی۔

نساخ جس وقت مصروف شاعری تھا اس کے معاصرین کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی لیکن نساخ اپنی تخلیقات کی مقدار اور معیار کی بدولت سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں سچ کہا تھا۔

سچ سچ جو مجھ سے پوچھیے تو فنِ شعر میں
نساخ اپنے وقت کے تم بھی امام ہو

نساخ اپنی ذات میں انجمن تھا۔ ایک سرپرست تھا جو بنگال کے شعرا کو ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ میر کارواں تھا جس کی رہنمائی میں قافلہ اردو رواں دواں تھا۔ اس نے اردو شاعری کو بنگال کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا اور وہ بھی صرف ستاون سال کی مختصر سی عمر میں۔

”مولوی عبدالغفور نساخ نہ دہلوی تھے نہ لکھنوی، نہ دکنی نہ لاہوری، وہ مستند اور خاندانی بنگالی تھے مگر اردو کے اہم ستونوں میں شمار ہوتا ہے۔“ (جمیل الدین عالی)

خلا کے شکاری

مریم کے خان

سورج، چاند، زحل، مریخ کے علاوہ بھی بے حساب سیارے زمین کے گرد تیر رہے ہیں۔ ان کے گرد ایسے بے شمار ستارے وسیارے بھی ہیں جو بڑے چھوٹے سیاروں کو ہڑپنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ ایسے ہی نقصان کے درپہ رہنے والی قوتوں کا ذکر۔

سائنسی معلومات پر مبنی ایک دلچسپ تحریر

اگر خلا سے دیکھیں تو زمین ایک بہت خوب صورت اور نیلگوں رنگ کا سیارہ دکھائی دیتی ہے جس میں کہیں کہیں سبز، زرد اور سفید رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سبز رنگ سبزے اور جنگلوں کا ہے۔ زرد رنگ صحراؤں کا اور سفید رنگ بادلوں اور برف کا ہوتا ہے۔ زمین کو چاروں طرف سے حیات بخش کرہ ہوائی نے گھیر رکھا ہے۔ یہ کرہ ہوائی زمین پر زندگی کا ضامن ہے۔ یہ زمین کے باسیوں کو آکسیجن فراہم کرتا ہے اور ساتھ ہی انہیں سورج اور کائنات سے آنے والی قاتل تابکاری سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور زمین کو ان شہابیوں سے بھی بچاتا ہے جو ہمہ وقت چاروں طرف سے زمین پر برستے رہتے ہیں اور یہ جان کر آپ شاید ڈر جائیں کہ ان کی تعداد چوبیس گھنٹے میں ایک لاکھ تک بھی چلی جاتی ہے۔ گویا زمین کو مسلسل سنگ باری کا سامنا ہے۔

ریت کے ذرّے سے ذرا بڑے سے لے کر کئی سو کلو گرام تک وزنی شہابیے جب زمین کی کشش سے اس کی طرف لپکتے ہیں تو ان کی رفتار کئی ہزار میل فی گھنٹا تک ہوجاتی ہے اور اس بے پناہ رفتار پر یہ کرہ ہوائی میں داخل ہوتے ہی رگڑ سے جل کر خاکستر ہوجاتے ہیں اور زمین پر صرف راکھ

گرتی ہے۔ اگر زمین کے گرد یہ کرہ ہوائی نہ ہوتو گرنے والا ریت جتنا بڑا شہابیہ بھی دس ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے کسی رائفل گولی کی جیسی طاقت سے زمین سے ٹکراتا اور چھوٹا سا گڑھا کر دیتا۔ یہی ذرہ کسی انسان سے ٹکراتا تو اسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔ اگر کرہ ہوائی نہ ہوتا تو یقیناً زمین چاند کی طرح بے جان، داغ دار اور ویران ہوتی۔ زمین کا کرہ ہوائی اللہ کی ایک ایسی نعمت ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں یہ ہماری ننھی سی زمین کو بہت ساری آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

لیکن اس کائنات میں بعض آفتیں ایسی بھی جن سے یہ کرہ ہوائی بھی ہمیں محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے۔ ہمارا موضوع بھی آفتیں ہیں جنہیں سائنسی زبان میں metreo (شہابیے) کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ نظامِ شمسی میں دوسرے آوارہ اجسام پائے جاتے ہیں جنہیں comets (دمدار ستارے اور straids (سیارچے) کہتے ہیں۔ ان تینوں آفتوں کی وضاحت سے پہلے اللہ کی بنائی اس کائنات کے بارے میں کچھ مختصر تعارف کرا دیں۔

خداتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ زمین و آسمان اور کائنات دھوئیں سے وجود میں آئی۔ آج سے ایک صدی پہلے تک کا انسان سمجھتا تھا کہ کائنات شروع سے ایسی تھی اور آخر تک ایسی ہی رہے گی یعنی نہ اس کا آغاز ہے اور نہ انجام ہے۔ لیکن آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کائنات کا آغاز بھی اور انجام بھی ہے۔ یہ آغاز ایک دھند نما روشنی سے ہوا یعنی جب کائنات میں سوائے خلا کے کچھ نہیں تھا تو دھند نما روشنی تھی یقیناً قرآن کریم نے اسے ہی دھواں قرار دیا ہے۔ ایک نامعلوم زمانے پہلے اس دھوئیں میں کہیں ارتکاز پیدا ہوا تھا اور پھر یہ بڑھتا چلا گیا۔ اس نے آس پاس کا سارا دھواں یا روشنی نما مادہ کھینچ کر ایک ایسے نقطے میں جمع کر دیا جس کا حجم صفر تھا اور مادے کی کثافت لامحدود تھی۔ پھر اللہ نے اس نقطے کو پھاڑا اور یہ کائنات وجود میں آئی۔ سائنس اسے بگ بینگ کا عظیم ترین دھماکا کہتی ہے۔ اس دھماکے کے پہلے سیکنڈ کے تین لاکھویں حصے میں کائنات اپنی سادہ حالت میں وجود میں آگئی تھی۔ مادہ اور اس کے قوانین تشکیل پا چکے تھے۔ جیسے کسی مکان کی تعمیر کے لیے بنیادی سامان بجری سیمنٹ اور بلاک وغیرہ مہیا کر دیئے جائیں۔ ایسے ہی کائنات کی تعمیر کا مسالہ سیکنڈ کے تین لاکھویں حصے میں تیار ہو کر پوری کائنات میں پھیل چکا تھا۔ ہے نا ہماری عقل سے بعید بات۔ اس وسیع و عریض کائنات میں سب سے تیز رفتار چیز روشنی ہے اور وہ اب تک کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پہنچ سکی .... لیکن کائنات کی تشکیل کا مادہ سیکنڈ کے بہت چھوٹے سے حصے میں ساری کائنات میں پھیل چکا تھا۔ یہی اللہ کی قدرت ہے جس تک ہمارا ذہن رسائی نہیں رکھتا ہے۔

کائنات کی وسعت کتنی ہے اس کا کوئی درست تخمینہ موجود نہیں ہے لیکن ایک اندازہ ہے۔ آج تک فلکیات دانوں نے کائنات کا جو سب سے بعید جسم دیکھا ہے وہ زمین سے اتنا دور ہے کہ جب اس کی روشنی زمین کی طرف چلی تو اسے یہاں پہنچنے میں پندرہ ارب سال لگ گئے۔ اس قسم کے اجسام اب ہماری آس پاس کی کہکشاؤں میں نہیں پائے جاتے ہیں یعنی یہ وہ ابتدائی اجسام تھے جو کائنات کی تشکیل کے بعد وجود میں آئے۔ ابتدائی ستارے جن کی صورت عجیب وغریب تھی اور وہ بہت بڑے تھے۔ مگر بعض ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ یہ سب سے پرانے اجسام نہیں تھے بلکہ کائنات میں ان سے بھی پرانے ستارے موجود ہیں لیکن ان کی روشنی اب تک زمین تک پہنچی ہی نہیں ہے یا راستے میں کسی بلیک ہول نے اس روشنی کو جذب کر لیا ہے اس لیے ہم ان اجسام سے بے خبر ہیں۔

ابتدائی مادہ کس نوعیت کا تھا ہم اس سے بھی بے خبر ہیں۔ ہم جس اولین عنصر کو جانتے ہیں وہ ہائیڈروجن ہے۔ اس کا ایٹم بالکل سادہ ہوتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں ہائیڈروجن اولین عنصر نہیں ہے اور نہ ہی ایٹم کائنات کے مادے کی اینٹ ہے بلکہ اس سے چھوٹے ذرات ہیں جو ایٹم تشکیل دیتے ہیں۔ اب تک ایسے بے شمار ذرات دریافت ہو چکے ہیں۔ جن کے سائز کے بارے میں ہم سوچیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایٹم کتنے چھوٹے ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہائیڈروجن کے ایک کھرب ایٹم اگر ایک سیدھ میں رکھے جائیں تو یہ لائن ایک میٹر سے زیادہ لمبی نہیں ہوگی۔ ایٹموں کے ذیلی ذرات تو ان سے بھی کہیں مختصر ہوتے ہیں۔

کائنات اور اس کے عناصر کے بارے میں یہ تعارف اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ مضمون کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ موجودہ شکل میں کائنات کم سے کم پندرہ ارب سال پرانی ہے۔ لیکن ہمارا نظامِ شمسی صرف پانچ ارب سال پُرانا ہے۔ تو اس سے پہلے یہاں کیا تھا؟ ماہرین اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہمارا نظامِ شمسی کم سے کم تین بار بن چکا ہے۔ نظامِ شمسی کس طرح بنتا ہے۔ اس کی وضاحت فلکیاتی سائنس یوں کرتی ہے۔ کائنات میں ہر طرف دھول مٹی کے عظیم الجثہ

بادل ہیں جنہیں نیبولا کہتے ہیں۔ اپنی ہی کشش کی وجہ سے یہ نیبولا سکڑنے لگتے ہیں اور مادہ اس کے وسط میں جمع ہونے لگتا ہے۔ جیسے جیسے مادہ جمع ہوتا ہے مرکز میں دباؤ کی وجہ سے حرارت بڑھنے لگتی ہے اور پھر ایسا وقت آتا ہے کہ حرارت اتنی بڑھتی ہے کہ مادے میں مرکزائی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ آسان زبان میں اسے ہائیڈروجن پھٹنے کا عمل کہتے ہیں۔ اس میں دو سادہ ایٹم آپس میں مل کر ایک بڑا اور پیچیدہ ایٹم بناتے ہیں اور اس دوران میں کچھ مادہ توانائی میں بدل جاتا ہے۔ یہی توانائی کسی ستارے کو روشن کرتی ہے۔ یوں ایک نیا ستارہ وجود میں آجاتا ہے۔

نیبولا جو کسی کہکشاں میں ہوتے ہیں جب وہ سکڑتے ہیں تو ایک چکر دار ساخت میں سکڑتے ہیں جیسے آپ کسی سینک میں پانی بہائیں تو وہ دائرے میں گھومتا ہوا نالی میں جاتا ہے بالکل اسی طرح مادہ دائرے میں گھومتا ہوا مرکز میں جمع ہوتا ہے اور اس سے ستارہ وجود میں آتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس مادے کا کچھ حصہ ستارے سے فاصلے پر مختصر شکل میں جمع ہو جاتا ہے اور یہ ستارے کے گرد گردش کرنے لگتا ہے۔ یہ سیارہ کہلاتا ہے۔ اگر ایسے کئی سیارے ہوں تو ایک نظامِ شمسی وجود میں آجاتا ہے۔ اس نظام کا سارا انحصار اس ستارے پر ہوتا ہے جس کے گرد یہ قائم ہوتا ہے۔ ستارہ اپنے بھاری وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا مادہ تیزی سے توانائی میں بدلتا ہے۔ اور جب اس کا ایندھن ختم ہونے والا ہوتا ہے تو ستارہ انجام کی طرف بڑھتا ہے۔

ستارے کا انجام اس کے حجم کے حساب سے ہوتا ہے۔ بہت بڑے ستارے جنہیں سپر جائنٹ کہتے ہیں وہ سب سے کم عمر ہوتے ہیں کیونکہ اپنے حجم کے لحاظ سے اپنا ایندھن بہت تیزی سے خرچ کر دیتے ہیں اور جلدی انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ اپنی آخری عمر میں یہ پھٹتے ہیں اور بے پناہ روشنی اور توانائی خارج کرتے ہیں۔ اس تباہی سے ان کا اندرونی خول سکڑ جاتا ہے اور اس میں مادے کی کثافت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ کروڑوں میل قطر رکھنے والے ستارے کا سارا ہی مادہ چند کلومیٹر کے نیوٹرون ستارے میں سما جاتا ہے کیونکہ اب اس میں نیوٹرون کی بہتات ہے اس لیے یہ نیوٹرون ستارہ کہلاتا ہے۔ آخر میں مادہ مزید سکڑنے سے کششِ ثقل مزید بڑھتی ہے اور ستارہ بلیک ہول کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ کائنات کی وہ عجیب وغریب چیز ہے جس کے بارے میں سائنس دان کچھ نہیں جانتے ہیں۔ بعض ماہرین بلیک ہولز کو اس کائنات کو برقرار رکھنے والی قوت قرار دیتے ہیں جو کہکشاؤں اور ستاروں کو اپنی بے پناہ کشش سے ایک مدار میں رکھتے ہیں اور انہیں منتشر ہونے نہیں دیتے۔

ہر کہکشاں کے وسط میں ایک بلیک ہول ہوتا ہے اور کہکشاں اس کے گرد گھومتی ہے جیسے زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ گھومنے کے دوران.... جو ستارے اور اجسام بلیک ہول کے قریب چلے جاتے ہیں وہ اس میں سما جاتے ہیں اور اس کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ بہت ہی بڑے بلیک ہول جن کی وسعت اور طاقت کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے وہ کائنات کے وسط میں ہیں اور ایک وقت آئے گا جب یہ ساری کہکشاؤں اور کائنات کے مادے کو اپنے اندر کھینچ لیں گے اور کائنات اسی حالت میں لوٹ جائے گی جس میں یہ آغاز میں تھی اور شاید وہی وقت قیامت کا ہوگا۔ فی الحال کائنات پھیل رہی ہے۔ اس میں توسیع ہو رہی ہے اور ہمہ وقت نئے ستاروں کا اور ان کے سیاروں کا جنم جاری رہتا ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے مخمصے میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پُرانے بچھڑ گئے اور پھر "وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا"۔ انجمن کے پرخچے اُڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اُٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جا سکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔

فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیباکی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیے جو چھپر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

عصمت چغتائی کی خودنوشت سے اقتباس

مرسلہ: راحیلہ تنویر، حیات آباد

سپر جائنٹ کے بعد جائنٹ یعنی دیو قامت ستاروں کا نمبر آتا ہے، یہ بھی کم عمر ہوتے ہیں اور جلدی نیوٹرون تارے میں بدل جاتے ہیں۔ تیسری قسم میں متوسط درجے کے ستارے آتے ہیں۔ یہ زیادہ بڑے نہیں ہوتے.... اس لیے اپنا ایندھن بہت طویل عرصے میں جا کر خرچ کرتے ہیں اور ان کی عمر اربوں سال ہوتی ہے، آخر میں یہ سفید بونے بن کر منتشر ہو جاتے ہیں۔ ہمارا سورج اسی قسم کے ستاروں میں سے ہے۔ ماہرینِ فلکیات کا کہنا ہے کہ سورج اپنی نصف زندگی گزار چکا ہے۔

ہمارے کہکشاں ملکی وے ایک اوسط درجے کی کہکشاں ہے جس میں ستاروں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک کھرب سے زیادہ ہے۔ ان میں سے کم سے کم دس فیصد ستارے اپنا نظامِ شمسی یعنی ذیلی سیارے رکھتے ہیں۔ ان میں ایک ہمارا سورج بھی ہے۔ باقی نوّے فیصد ایک نظام میں ہوتے ہیں جس میں بیک وقت دو ستارے ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے ہیں اور ظاہر ہے اس میں کسی ذیلی سیارے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کیونکہ دو ستاروں کی وجہ سے کششِ ثقل متوازن نہیں ہوگی اور ستارے خود سیاروں کو تباہ کر دیں گے۔ لیکن بعض دوہرے ستاروں کے گرد سیارے دیکھے گئے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر بعض اوقات تو تین یا چار ستارے بھی ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ان میں جو بڑا ہوتا ہے وہ دوسرے ستاروں کا مادہ چرانا شروع کر دیتا ہے اور بالآخر ایسا وقت آتا ہے جب دیگر ستارے اپنی حیثیت کھو کر اس بڑے ستارے میں ضم ہو جاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہم ایک ستارے والے نظامِ شمسی میں ہیں۔ اس لیے یہ مستحکم ہے اور ہماری زمین کسی حادثے سے بچی ہوئی ہے۔ ماہرین کہتے ہیں ہمارے نظامِ شمسی تیسری بار زندگی گزار رہا ہے۔ یعنی اس کا مادہ ایک بار ستارے کی صورت میں جمع ہوا اور پھر ستارہ مر کر منتشر ہو گیا۔ مادہ دوبارہ جمع ہوا اور پھر ستارے کی تشکیل کی اور اب یہ تیسرا موقع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نظامِ شمسی میں عناصر کی بہتات ہے، اگرچہ ننانوے اعشاریہ نو نو فیصد ہائیڈروجن اور ہیلیم ہی ہیں لیکن دوسرے عناصر کی بھی کمی نہیں ہے، خاص طور سے سیاروں میں۔

نظامِ شمسی میں نو سیاروں کے علاوہ متعدد ذیلی سیارے (جن کو چاند کہتے ہیں) اور لاتعداد سیارچے ہیں۔ سیارچے اصطلاح میں ان پتھریلے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو زحل اور نیپچون کے درمیان میں ایک بیلٹ کی صورت میں سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بڑے سیارچے کا حجم ہزار کلومیٹرز کے قریب ہے اس کے علاوہ بڑے سیارچوں کی تعداد لاکھوں میں ہے لیکن خوش قسمتی سے یہ سب زمین سے بہت دور ہیں۔ یہ اسٹرائیڈ بیلٹ کروڑوں میل پر پھیلی ہوئی ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ یہ کسی زمانے میں سیارہ ہوتا تھا اور ممکنہ طور پر اس کا حجم زمین سے بڑا تھا لیکن کسی حادثے کی وجہ سے یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا اور یہ سیارچے اب اسی سیارے کی باقیات ہیں۔ اسٹرائیڈ بیلٹ میں گردش کرتے یہ سیارچے آپس میں ٹکرا کر مزید چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ رہے ہیں اور آپس کے تصادم سے بعض اوقات یہ بیلٹ سے نکل کر سورج کی طرف سفر کرنے لگے ہیں اور ان میں سے بعض تو زمین پر آ گرتے ہیں۔ زمین کو ایسے آوارہ سیارچوں سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ماضی میں کئی بار زمین ان سیارچوں کی وجہ سے حیاتیاتی تباہی دیکھ چکی ہے۔ سیارچوں کا سائز چند میٹرز سے لے کر کئی سو کلومیٹرز تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ایک اور خطرہ وہ دمدار ستارے ہیں جو طویل مداروں میں سورج کے گرد سفر کرتے ہیں۔ یہ مخصوص عرصے میں سورج کا چکر مکمل کرتے ہیں جیسے ہیلے کومٹ چھیاسی سال میں سورج کے گرد ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ اپنے مدار میں یہ اتنا دور نکل جاتا ہے کہ نظامِ شمسی کے آخری سیارے پلوٹو سے بھی پرے چلا جاتا ہے۔ پھر اپنے وقت پر واپس آتا ہے اور سورج کے بالکل پاس سے ہو کر دوبارہ بعید خلا میں گم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بے شمار دم دار ستارے ہیں جو سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ان کی تعداد لاکھوں میں ہے ان میں سے بعض ہر سال باقاعدگی سے نظامِ شمسی کا سفر کرتے ہیں اور بعض ایک بار آتے ہیں تو ہزاروں سال تک وہ پلٹ کر نہیں آتے ہیں۔

ماہرین حیران ہیں کہ ان دمداروں کا مدار کتنا بڑا ہے اور یہ سورج سے کتنا دور نکل جاتے ہیں۔ دمدار ستارے نظامِ شمسی کی دھول، خشک برف اور منجمد کاربن ڈائی آکسائیڈ سے تشکیل پاتے ہیں۔ مریخ سے لے کر پلوٹو تک کا علاقہ ان دمدار ستاروں کی جائے پیدائش ہے، جب ایک دمدار ستارہ مادہ جمع کر کے اس قابل ہو جاتا ہے کہ سورج کے گرد مدار قائم کر سکے تو کسی قریبی سیارے کا ثقلی جھٹکا اسے حرکت میں لے آتا ہے اور اگر یہ درست سمت اختیار کرتا ہے تو جلد سورج کے گرد مناسب مدار قائم کر لیتا ہے۔ ورنہ یہ سورج یا کسی دوسرے سیارے میں جا گرتا ہے۔ وہ سیارہ زمین بھی ہو سکتا

ہے۔ ماضی میں کئی دمدار ستارے زمین پر گر چکے ہیں۔ دمدار ستارے جب نظامِ شمسی میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی خشک برف سورج کی گرمی سے پگھل جاتی ہے اور یہ بھاپ کی صورت میں گرد کے ذرّوں کے ساتھ مل کر دمدار ستارے کی جھاڑو نما دم تشکیل دیتی ہے۔ اسی دم کی وجہ سے یہ دمدار ستارے کہلاتے ہیں۔ کسی بھی دمدار ستارے کا قطر کم سے کم ایک کلومیٹر ہوتا ہے لیکن یہ کئی کلومیٹرز کے بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ ان کی دم کم سے کم بھی کروڑ میل لمبی ہوتی ہے اور اسی بنا پر بعض دمدار ستارے عین دن میں بھی آسمان پر واضح دکھائی دیتے ہیں۔ بہ ظاہر بڑی اور ہیبت ناک نظر آنے والی دم اصل میں بالکل بے ضرر اور اتنی معمولی سے مادے سے بنی ہوتی ہے جس کا وزن چند سو کلوگرام سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ 1910ء میں مشہور ہیلے کومیٹ زمین کے بہت پاس سے گزرا تھا اور تب زمین اس کی دم سے گزر گئی تھی لیکن اس کا زمین پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ لوگ اس وقت بہت خوف زدہ تھے کہ نہ جانے زمین پر کیا گزرتی ہے۔

ان کے علاوہ نظامِ شمسی میں ایسے آوارہ اجسام کی کمی نہیں ہے جو گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نظامِ شمسی کی تشکیل کے وقت اس کے بیرونی حلقے میں پانی باقی رہ گیا تھا یہی پانی جم کر، مٹی اور پتھر اپنے اندر جذب کر کے شہابیے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شہابیوں میں نوّے فیصد تک پانی ہوتا ہے۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں روس کے ویران علاقے میں سائبریا میں ایک ایسا ہی شہابیہ گرا تھا کیونکہ اس کا بڑا حصہ برف اور پانی پر مشتمل تھا اس لیے اس کا وہاں کوئی سراغ نہیں ملا خوش قسمتی سے یہ علاقہ ویران تھا اور نقصان صرف دس ہزار مربع کلومیٹرز پر پھیلے جنگل اور اس میں پائی جانے والی جنگلی حیات کا ہوا تھا۔ ماہرین کا ایک نظریہ یہ بھی ہے زمین پر پایا جانے والا پانی ابتدائی دور میں گرنے والے شہابیے لائے تھے جب زمین کا کرہ ہوائی نہیں تھا اور شہابیے صحیح سلامت زمین سے آ ٹکراتے تھے اور ان کی مسلسل آمد سے زمین پر پانی کی کثیر مقدار آئی اور سمندر تشکیل پائے۔ مگر اب سائنس دان متفق ہیں کہ پانی زمین سے نکلنے والی آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں کے بہت بلندی پر ملاپ سے وجود میں آیا اور بارش کی صورت میں زمین پر برسا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ یہی فرماتے ہیں کہ انھوں نے آسمان سے ایک معین مقدار میں پانی زمین پر اُتارا۔

کرہ ہوائی ہمیں سیارچوں اور دمدار ستاروں سے تحفظ

تو دیتا ہے۔ مگر یہ تحفظ ایک حد تک ہوتا ہے۔ اگر زمین کی طرف آنے والے جسم کا سائز اور وزن ایک حد سے زیادہ ہو تو وہ ہوا کی رگڑ سے پوری طرح جل نہیں پاتا ہے اور بالآخر زمین پر آگرتا ہے۔ لیکن جسم کس حد تک خطرناک ہوسکتا ہے اس کا انحصار اس پر ہے کہ جسم کیا ہے۔ اگر وہ شہابیہ ہے تو چند سو میٹرز کا شہابیہ زیادہ خطرناک نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس میں زیادہ تر پانی ہوتا ہے اور زمین کی سطح تک رسائی سے پہلے یہ پانی شدید گرمی کی وجہ سے بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے اس لیے شہابیہ گرتے ہوئے خوف ناک دھماکا تو کرتا ہے لیکن اس کا تصادم اتنا خطرناک نہیں ہوتا...... ہاں اگر شہابیے کا سائز ایک کلومیٹرز سے زیادہ ہو تو یہ پھر خطرناک ہوسکتا ہے اور اس کے گرنے سے ساری دنیا پر اثر ممکن ہوسکتا ہے۔

شہابیوں کے مقابلے میں دمدار ستارے خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ ان کا بڑا حصہ ٹھوس ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے سطح زمین تک رسائی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ الگ الگ چٹانوں اور گرد سے مل کر بنے ہوتے ہیں اس لیے یہ گرتے ہوئے ٹکڑوں میں بٹ کر زیادہ تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ سائبریا میں گرنے والا جسم ایک دمدار ستارہ تھا کیونکہ وہاں گڑھے کے آثار نہیں ملتے ہیں۔ دھماکے کے بعد وہاں موجود جنگل جل گئے تھے اور درختوں کے تنے یوں مڑ گئے جیسے انہیں شدید ترین آندھی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس کا مطلب ہے دمدار ستارہ ہوا کی اوپری تہوں میں دھماکے سے بکھر گیا تھا اور جنگل کو اس دھماکے کی شاک ویو نے تباہ کیا تھا۔ پھر فضائی درجہ حرارت بڑھنے سے جنگل میں آگ لگ گئی۔

تیسری قسم کے اجسام جنہیں سیارچے کہتے ہیں سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ مکمل طور پر پتھریلے اور ایک ہی چٹان پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نیز ان کا کم سے کم سائز بھی کئی سو میٹرز ہوتا ہے۔ امریکا میں ایریزونا کے صحرا میں آج سے کوئی تین لاکھ سال پہلے ایک سو سے دو سو میٹرز قطر کا سیارچہ پچاس ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے آکر گرا تھا اور اس نے زمین میں تین کلومیٹرز قطر کا بالکل گول گڑھا بنا دیا۔ آج تک زمین پر اجسام کے ٹکرانے سے بننے والے کوئی ڈیڑھ سو گڑھے دریافت ہوچکے ہیں۔ ان میں سب سے بہتر حالت میں یہی ایریزونا کا گڑھا ہے۔ صحرا ہونے کی وجہ سے اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے ورنہ بیشتر گڑھے موسمی تبدیلیوں کا شکار ہوکر معدوم ہوچکے ہیں اور ماہرین صرف زمین کے اندر چٹانوں کی دھنسی ساخت سے ان گڑھوں کا سراغ لگا سکے ہیں۔ اس قسم کا سب سے بڑا گڑھا کینیڈا کے صوبے کیوبک میں ہے جس کا قطر حیرت انگیز طور پر ڈیڑھ سو کلومیٹرز ہے اور یہ کسی آٹھ سے دس میل قطر کے پتھریلے سیارچے کے ٹکراؤ سے وجود میں آیا تھا۔ ماہرین اس کی قدامت سولہ کروڑ سال پہلے کی بتاتے ہیں۔ یقیناً اس ٹکراؤ نے دنیا کو تہہ و بالا کردیا ہوگا۔ ممکن ہے اس وقت زمین پر موجود بیشتر حیات فنا ہوگئی ہو۔

ماہرین جس تصادم کو زمین کے لیے سب سے زیادہ اثر انگیز قرار دیتے ہیں وہ موجودہ میکسیکو کے مقام یوٹا کان کے مقام پر آج سے کوئی چھ کروڑ سال پہلے ہوا تھا جب ایک چھ میل قطر کا پتھریلا جسم دو لاکھ میل فی گھنٹے کی زبردست رفتار سے آکر یہاں ٹکرایا تھا اور اس نے یوٹاکان کی وادی کو جنم دیا۔ اس ناقابلِ یقین طاقت رکھنے والے تصادم نے چار ہزار کلومیٹرز کے دائرے میں ہر ذی روح کو جلا کر راکھ کردیا تھا۔ رگڑ اور دھماکے سے فضا کا درجہ حرارت آٹھ سو ڈگری فارن ہائیٹ تک جا پہنچا اور اتنے درجہ حرارت میں کسی جاندار کے زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تصادم نے شدید ترین زلزلے اور ممکنہ طور پر خوف ناک سونامی کو جنم دیا ہوگا کیونکہ تصادم کے مقام سے سمندر زیادہ دور نہیں تھا۔ میکسیکو کے ایک طرف بحر اوقیانوس ہے اور دوسری طرف بحر الکاہل ہے۔

تصادم کے بعد زمین سے کھربوں ٹن مٹی اور گرد اُڑ کر کرہ ہوائی کے بالائی طبق تک جا پہنچی اور اس نے پوری زمین کو ایک کمبل کی طرح ڈھک لیا ہوگا۔ سورج کی روشنی زمین تک رسائی سے رک گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں زمین کا درجہ حرارت گرنے لگا تھا۔ جنوبی اور شمالی امریکا اس تصادم سے تقریباً تباہ ہوگیا تھا اور یہاں رہنے والی بیشتر مخلوق اس حادثے میں ہلاک ہوچکی تھی لیکن ایشیا، افریقا اور یورپ محفوظ رہے تھے۔ مگر جب موسم سرد ہوا۔ سورج کی روشنی نہ ہونے سے پودے مرنے لگے۔ اس وقت زمین پر رینگنے والے جانوروں کی حکمرانی تھی۔ ان میں معمولی چھپکلی سے دیو قامت اور سو ٹن تک وزنی ڈائنا سور بھی شامل تھے۔ بہت سے جاندار سردی برداشت نہ کرسکے اور ختم ہوگئے۔ باقی پودے ختم ہونے سے بھوک کے ہاتھوں مرنے لگے۔ خاص طور سے بڑے ڈائنا سور جلد دم توڑ گئے کیونکہ وہ کھاتے بھی بہت تھے۔ سبزی خوروں کے بعد گوشت خوروں کی باری آئی اور وہ بھی ختم ہونے لگے۔

اندازہ ہے کہ زمین کا درجہ حرارت گر کر منفی ہوگیا ہوگا

اور زمین کے باسیوں نے پہلی بار سردیاں دیکھی تھیں کیونکہ اس وقت تک زمین پر ایک ہی موسم تھا جو بہت گرم اور مرطوب تھا۔ اس وقت اوسط درجہ حرارت آج سے کہیں زیادہ تھا۔ قطبین پر برف کا نام و نشان نہیں تھا اور زمین سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سبزے کی بہتات کی وجہ سے جانوروں کی بے شمار نسلیں پھلی پھولی تھیں اور حیات کے لحاظ سے یہ زمین کا سنہری دور تھا۔ لیکن ایک پتھریلے سیارچے نے آن واحد میں اس دور کو ختم کردیا۔ کئی مہینے بعد جب مٹی بیٹھی اور سورج نے دوبارہ زمین کا چہرہ دیکھا تو اس میں حیرت انگیز تبدیلیاں آچکی تھیں۔ جانداروں کی بیشتر نسلیں فنا ہوچکی تھیں۔ زمین کے قطبین برف کی بھاری تہوں سے ڈھک گئے تھے اور سردیوں کا موسم بھی اسے دور میں شروع ہوا۔ شمالی امریکا کا بیشتر حصہ برف تک آچکا تھا۔ موسم بدلا تو جاندار بھی بدل گئے اور یہاں سے میملز کا آغاز ہوا جو گرم خون والے جانور تھے۔ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتے تھے اور رینگنے والے جانور پس منظر میں چلے گئے۔

ارضی سائنس کے ماہر ناسا کے ڈاکٹر ایبٹ کارڈ کہتے ہیں۔ ”صرف ایک اسٹرائیڈ نے زمین پر حیات کا چکر بدل کر رکھ دیا۔ یوں سمجھ لیں سب نئے سرے سے شروع ہوا اور اس بار سب کچھ نیا تھا۔ پُرانی حیات اور جانور فنا ہوگئے۔ نئی حیات اور نئے جانور نمودار ہوئے۔ سوال یہ ہے اگر آئندہ ایسا ہی کوئی سیارچہ آکر زمین سے ٹکرایا تو کیا ہمیں ایک بار پھر نئے حیاتیاتی دور کو دیکھنا پڑے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کیا ہم اسے دیکھنے کے لیے موجود ہوں گے۔“

تصادم کے ماہرین کا ردِعمل اس بارے میں حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے اس قسم کے کسی حادثے کی صورت میں انسانی تہذیب کا بچنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اتنے بڑے تصادم کے نتیجے میں تمام انسانی تہذیب تباہ ہوجائے گی۔ یعنی ہم نے ہزاروں سال میں جاکر جو بنایا ہے وہ آن واحد میں ختم ہوجائے گا۔ شدید زلزلے، سونامی اور پھر مصنوعی سردیاں سب تباہ کردیں گی۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ انسان اس تصادم میں بچ جائے۔ یقیناً کچھ نہ کچھ لوگ بچ جائیں گے۔ لیکن اس کا امکان بہت کم ہے کہ وہ پہلے جیسے رہ جائیں۔ وہ یقیناً ذرائع کے لحاظ سے پتھر کے دور میں پہنچ جائیں گے۔ انسانوں کو سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنا پڑے گا۔

اتنے بڑے تصادم کے امکانات کیا ہیں؟ اس کا جواب ڈاکٹر ایبٹ دیتے ہیں۔ ”خوش قسمتی سے اتنے بڑے تصادم کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں دس کروڑ سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ تین سو میٹر قطر کا شہابیہ یا سیارچہ ہر پچاس ہزار سال میں ایک بار زمین سے ٹکراتا ہے۔ جب کہ ایک کلومیٹر قطر کا جسم ہر تین لاکھ سال میں ایک بار زمین تک پہنچ پاتا ہے۔ ماضی میں ایسے کئی تصادم ہوچکے ہیں۔ جن کی بنیاد پر ہم نے یہ خاکہ تیار کیا ہے۔ اس لیے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسا امکان بہت کم ہے کہ ایسا پتھر خلا سے آکر زمین سے ٹکرائے جو انسانی تہذیب کو فنا کردے۔ ہاں ایسے تصادم کا خطرہ ہمہ وقت ہے جو زمین کے کسی ایک حصے کو متاثر کرے۔“

ستّر کے عشرے میں بحر ہند میں ایک شہابیہ آکر گرا۔ اس وقت سیٹلائیٹ اور دوسرے ذرائع نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ حادثے کے مقام کا فوری اور درست تعین کیا جاتا۔ دھماکے کے بعد کئی میٹرز اونچی لہروں نے آس پاس سفر کرنے والے بحری جہازوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کیونکہ تصادم والی جگہ سمندر بہت گہرا تھا اس لیے شہابیہ سطح سمندر کی تہ تک رسائی حاصل نہ کرسکا اور اس کا زور پانی میں ہی ختم ہوگیا اسی بنا پر زلزلہ پیما کا سمک سینٹرز اس تصادم کی شدت نہ ناپ سکے۔ اس وقت بڑی طاقتوں کو خدشہ ہوا تھا کہ شاید جنوبی افریقا کی نسل پرست حکومت نے چوری چھپے زیرآب ایٹمی تجربہ کیا تھا لیکن جب اس مقام کا معائنہ ہوا تو وہاں شہابیے کے تصادم کے آثار پائے گئے۔ یہ کم سے کم پچاس میٹر لمبا چوڑا شہابیہ تھا جو دس ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے آکر سمندر سے ٹکرایا تھا۔ ڈاکٹر ایبٹ کہتے ہیں۔

”اگر یہ شہابیہ زمین سے ٹکراتا تو ہیروشیما پر گرنے والے ایٹم بم جتنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اس کی طاقت پچاس ہزار ٹی این ٹی سے زیادہ ہوتی اور یہ بہت آسانی سے کوئی چھوٹا شہر تباہ کرسکتا تھا۔ اگر یہ نیویارک میں گرتا تو مین ہٹن کا علاقہ بالکل صاف ہوجاتا اور ایک کروڑ لوگ فی الفور موت کے گھاٹ اُتر جاتے۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ سیارچوں سے بچاؤ کے لیے قدرت نے ہمیں دو ہتھیار دیے ہیں ایک ہمارا کرہ ہوائی جو بیشتر چھوٹے شہابیوں کو زمین تک رسائی سے پہلے ہی جلا کر راکھ کردیتا ہے دوسرا ہمارے سمندر ہیں یہ کسی بھی تصادم کو شاک ابزرور کی طرح جذب کرکے زمین کو بڑی تباہی سے بچا سکتے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب ایک نقطہ فراموش کرگئے کہ اگر کوئی بڑا شہابیہ سمندر میں گرے گا تو یہ بہت بڑی طوفانی لہر پیدا کرکے کہیں زیادہ نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ آج یہ حال ہے کہ دنیا کی چالیس فیصد آبادی سمندر سے بیس کلومیٹرز کے اندر

بوڑھا احمد کام پا کر خوش ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ بجھتے ہوئے دیے میں ایک بوند تیل کی بھی دیئے کی زندگی کو بڑھا دیتی ہے۔ اور بوڑھا احمد اپنی زندگی کو بڑھانا چاہتا تھا۔ یہ پانچ آنے نہیں، پانچ روپے ہیں۔ وہ چھ پیسے سے بیل کے لیے گھاس خریدے گا۔ دو پیسے کا بچے کے لیے دودھ، دو آنے کے چنے اور ایک آنے کا گڑ۔ لو اس کا کھانا تیار ہو گیا۔ لیکن لوگ یہ کھانا بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ غریب ہوا میں رہے، ہوا کھائے اور ہوا پیے۔ بوڑھے احمد نے بیل کی رسی کھینچی اور بیل دوڑنے لگا۔ بوڑھا احمد سردی کی وجہ سے سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹانگوں کو اکٹھا کر کے وہ سر کو ٹانگوں سے ملاتے ہوئے ایک عجیب انداز میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی کی آواز آئی ”ٹھہراؤ چھکڑے والے......“

آواز بھاری تھی اور ہوا میں گونجتی ہوئی۔ آواز میں ایک قسم کا رعب تھا۔ جو یکلخت بڈھے کے جسم پر طاری ہو گیا۔ اس نے بائیں طرف دیکھا تو ایک لحیم شحیم سپاہی کھڑا تھا۔ سپاہی نے عقابی نظروں سے بوڑھے کو تاکا اور پھر بیل پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ یکایک سپاہی کی نظریں بیل کی ٹانگوں پر جم گئیں اور پھر اس کی آنکھوں معنی خیز شرارت ٹپکی۔ اب وہ اس جرنیل کی طرح تھا جس نے ایک عظیم الشان مہم سر کی ہو۔ اس نے بوٹوں کی ایڑیوں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ”کیوں رے بڈھے، تجھے شرم نہیں آتی کہ اس غریب جانور پر اتنا ظلم ڈھاتا ہے؟“

”حجور کیا بات ہے؟“

”حجور کا بچہ!“ سپاہی نے کڑک کر کہا۔ اس کی کڑک میں حکومت کی طاقت پنہاں تھی ”خود کھا کھا کر موٹا ہوتا جا رہا ہے اور دیکھتا نہیں بیل کی طرف، کتنا دبلا پتلا ہے۔ بے زبان جانور پر تشدد کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ دیکھ اس کے پاؤں کی طرف، خون بہے جا رہا ہے۔ کیا آنکھوں سے اندھا ہے؟ بینائی ختم ہو چکی ہے۔“

سپاہی نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اور کسی کو نہ پا کر بوڑھے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہ نگاہیں کچھ مانگ رہی تھیں۔

بوڑھا اس بے زبان انسان کی بات سمجھ گیا۔ لیکن بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ”حجور، آج کچھ نہیں ہے، کل آپ کی نجر کروں گا۔“

سپاہی کی آنکھوں میں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے بوڑھے کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور زمین پر تھوکتے ہوئے کہا ”بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہو۔ حرامی، بوڑھا، کھوسٹ، میں ابھی بتاتا ہوں کہ جانوروں پر ظلم کرنے سے کیا سزا ملتی ہے۔“ سپاہی نے بوڑھے کو چھکڑے سے نیچے اتر آنے کو کہا اور بیل کو چھکڑے سے علیحدہ کر کے آگے ہانکنے لگا ”رہنے دو، چھکڑے کو یہیں رکھو۔ تم لوگ جانوروں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آؤ گے، جب تک تمہیں پوری سزا نہ ملے۔“

اقتباس: چاندی کے تار از مہندر ناتھ
مرسلہ: نوروز خان، کوئٹہ

آباد ہے۔ یعنی تین ارب سے زیادہ افراد سمندر کے بالکل پاس رہ رہے ہیں اور کسی بھی بڑی لہر سے ان لوگوں کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ ایک کمپیوٹر گرافکس سیمولیشن میں ماہرین نے ایسے کسی تصادم کے اثرات کا جائزہ لیا۔ اگر ایک شہابیہ جس کا قطر تین کلومیٹرز ہو اور وہ بحرالکاہل میں ماریا ٹرنچ کے مقام پر آ کر گرے۔ واضح رہے ماریا ٹرنچ سمندر میں سب سے گہری جگہ ہے جو زمین پر پائی جاتی ہے۔ اس کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ماؤنٹ ایورسٹ کو اس میں ڈال دیا جائے تو وہ بھی ڈوب جائے گا۔

جدید کمپیوٹرائزڈ سیمولیشن نے بتایا کہ ایسے کسی تصادم کی طاقت دنیا میں موجود تمام ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کی مشترکہ طاقت سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اس قسم کا شہابیہ اگر بالکل سیدھا گرنے کے بجائے ترچھا راستہ بناتے ہوئے گرے تب بھی اس کی رفتار ایک لاکھ کلومیٹرز فی گھنٹا ہوگی۔ اس رفتار سے جب یہ سمندر سے ٹکرائے گا تو پانی کی تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر اونچی لہر پیدا ہوگی جو ایک ہزار کلومیٹرز فی گھنٹے کی رفتار سے چاروں طرف پھیل جائے گی۔ چین، جاپان، کوریا، فلپائن، ویت نام اور مشرق بعید کے دوسری ساحلی ممالک اس کا براہِ راست نشانہ بنیں گے۔ انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش، بھارت اور مشرق وسطیٰ کے ممالک اس کا براہِ راست نشانہ نہیں بنیں گے۔ لیکن پانی کی یہ طاقت ور ترین لہر ملکوں کو روندتی ہوئی یہاں تک پہنچ جائے۔ برصغیر اور عرب ممالک سے ٹکراتے ہوئے بھی اس کی اونچائی دو سو میٹرز سے زیادہ ہوگی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ممالک بھی نہیں بچ سکیں گے صرف ان ملکوں کے اونچے حصے ہی لہر کی تباہ کاری سے محفوظ رہیں گے۔

دوسری طرف یہ لہر جنوبی اور شمالی امریکا کے مغربی ساحلوں تک پہنچے گی اور کم سے کم ساحلی آبادیوں کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ اس میں اتنی طاقت ہوگی کہ یہ پانچ ہزار میٹرز اونچے پہاڑوں کو سر کرتی ہوئی دونوں براعظموں کے مشرقی ساحلوں تک رسائی حاصل کر لے گی۔ اوشیانا سے ہوتی اور یہاں موجود تمام جزیروں کو تباہ کرتی یہ لہر ایک طرف آسٹریلیا پر چڑھ دوڑے گی اور اس کا کم سے کم جنوبی اور مغربی ساحل صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ پھر یہ لہر افریقا کے ساحل تک رسائی حاصل کرے گی اور یہاں اس کی اونچائی اس وقت بھی تین سو میٹرز تک ہوگی۔ بدقسمتی سے افریقا میں زمین اونچی نہیں ہے اور لہر کم سے کم کانگو تک رسائی حاصل کرے گی۔ وسطِ افریقا میں یہ صحرائے صحارا تک جا پہنچے گی۔ جنوبی افریقا سے لے کر سوڈان تک تمام ممالک اس کا شکار ہو جائیں گے۔ بحیرہ قلزم کے راستے اس کا اثر مصر اور شام تک پہنچے گا۔ البتہ بحیرہ روم کے ساتھ بسنے والے ممالک کسی قدر محفوظ رہیں گے۔ لیکن ان کو بھی کئی میٹرز اونچی لہروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یورپ اس کے براہِ راست اثر سے تو بچ جائے گا لیکن یہ روس کے مشرق میں آبنائے بیرنگ کو عبور کرتی بحر منجمد شمالی سے گزرے گی اور یورپ اور کینیڈا پر چڑھ دوڑے گی۔ روس اور اسکینڈے نیوین ممالک اس سے متاثر ہوں گے لیکن مشرقی اور مغربی یورپ اس سے محفوظ رہیں گے۔ ایشیا میں بھارت مشرقی اور پاکستان کا ساحلی علاقہ اس لہر کی براہِ راست تباہ کاری سے محفوظ رہے گا لیکن یہاں کم سے کم ساحلی آبادیاں ضرور مٹ جائیں گی۔ درحقیقت پانی کی اس بڑی لہر سے دنیا کے کسی ساحل کی کوئی آبادی محفوظ نہیں ہوگی چاہے وہ کسی محفوظ ترین خلیج میں کیوں نہ ہو۔ اس طرح صرف ایک تصادم دنیا کی چالیس فیصد آبادی کو ختم کر دے گا۔

یہ صورتِ حال بہ ظاہر بڑی ہولناک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ارضی ماہرین اور ناسا والے اسے ضرورت سے زیادہ افسانوی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر ایبٹ کا کہنا ہے۔ ”یہ بڑی عجیب بات ہے کہ گرنے والا شہابیہ لازمی ماریا ٹرنچ کے مقام پر گرے تاکہ پانی کی اتنی بڑی لہر پیدا ہو سکے۔ ایسا ہونا بہت ہی مشکل ہے۔ زمین کا کل رقبہ کروڑوں مربع کلومیٹرز سے زیادہ ہے اس لیے ماریانا ٹرنچ میں ٹکراؤ کا امکان بھی کروڑوں میں ایک ہے اور تین کلومیٹرز قطر کا جسم اوسطاً دس لاکھ سال میں ایک بار زمین سے ٹکراتا ہے۔ پھر اتنے بڑے جسم کو دیکھنا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم زمین کے آس پاس سے گزرنے والے نوے فیصد ایسے اجسام کو تلاش کر چکے ہیں جن کا قطر ایک کلومیٹر یا اس سے زیادہ ہے اور ہم ان سب پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔“

ڈاکٹر ایبٹ کی بات درست ہے کہ تصادم کا امکان بہت کم ہے لیکن امکان تو ہے۔ اب تک فلکیات دان ایسے کئی سو خلائی جسم تلاش کر چکے ہیں جن کا مدار زمین کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے اور انہیں NES,s کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے نیئر دی ارتھ اسٹرائیڈز۔ طاقت ور دوربینوں سے یہ کام ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ دریافت ہونے والے اجسام پر مستقل نظر رکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ کام صرف ان اجسام کے لیے ممکن ہے جن کا سورج کے گرد باقاعدہ مدار ہو اور فلکیات دان جانتے ہوں کہ کس وقت وہ آسمان کے کس حصے میں موجود ہیں۔ ایسے آوارہ فلکی اجسام جن کا کوئی باقاعدہ مدار نہیں ہوتا ہے اور وہ بعض اوقات سورج یا کسی اور سیارے کی کشش کے زیرِ اثر کھنچ کر اس طرف چلے آتے ہیں، ان کا پتا چلانا بہت دشوار ہے۔ یہ دشواری اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب آوارہ جسم ایک خاص حد سے چھوٹا ہو اور اسے دوربینوں یا ریڈیائی دوربین سے تلاش کرنا مشکل ہو۔ عام طور سے چند سو میٹرز بڑے اجسام کو تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اتنا مشکل جتنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ ایسے اجسام اکثر مریخ کی کشش سے اسٹرائیڈ بیلٹ سے نکل کر سورج کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں۔ اس سفر کے دوران یہ زمین کے پاس سے بھی گزرتے ہیں اور بعض اوقات اتنے پاس سے گزرتے ہیں کہ زمین انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ 1988ء میں ایک ایسا ہی سیارچہ جس کا قطر چار سو میٹرز تھا زمین سے صرف دس ہزار میل کی دوری سے گزر گیا اور اس کا پتا اس وقت چلا جب یہ گزر کر آگے جا چکا تھا۔ ماہرین کے مطابق اس کے مدار میں صرف ایک ڈگری کا

فرق اسے زمین کی طرف لاسکتا تھا اور ہمیں اس وقت پتا چلتا جب یہ زمین سے ٹکرا چکا ہوتا۔ اس کی ٹکر سب سے طاقت ور ہائیڈروجن بم کے برابر دھماکا کرتی۔ کسی آبادی پر گرنے کی صورت میں دس میل قطر میں کوئی ذی روح بچ نہیں سکتا تھا اور تیس میل کے دائرے میں ہر تنصیب تباہ ہو جاتی۔ اس تصادم کی ہولناک آواز پچاس میل کی دوری تک سننے والوں کی سماعت چھین لیتی اور اس کی شاک ویو برین ہیمرج کا باعث بن جاتی۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا اس لیے ماہرین اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے جو گزر گیا اس کی فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جو ہو سکتا ہے ہمیں اس کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دریافت ہونے والے تمام اجسام سورج کے گرد مدار رکھتے ہیں۔ پھر وہ دمدار ستارے ہیں جو سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور چند سال سے لے کر ہزاروں سال میں سورج کے گرد چکر لگاتے ہوئے نظامِ شمسی میں داخل ہوتے ہیں۔ خلائی اجسام میں یہ سب سے آسانی سے نظر میں آجانے والے ہیں کیونکہ یہ جیسے ہی زحل سے آگے آتے ہیں سورج کی ہواؤں سے اس کی دم نمودار ہو جاتی ہے۔ سورج کی ہوائیں اصل میں وہ باردار ریڈیائی شعاعیں ہیں جو ہمہ وقت اس سے خارج ہوتی رہتی ہیں۔ ان ہواؤں کی وجہ سے دمدار ستارے کی دم ہمیشہ سورج سے مخالف سمت میں ہوتی ہے۔ سورج کی طرف آتے ہوئے تو یہ زاویہ ٹھیک لگتا ہے لیکن جب دمدار ستارہ سورج کے گرد چکر لگا کر واپسی کا سفر شروع کرتا ہے تو اس کی دم آگے کی سمت ہوتی ہے اور یہ زاویہ خاصا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ لیکن پہلے بھی بتایا ہے کہ دم اصل میں گرد کے باریک ذروں اور خشک برف کی بھاپ سے بنتی ہے اور یہ دمدار ستارے کے اصل وزن کا اربواں حصہ بھی نہیں ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ دم فریب نظر ہے جیسے لیزر سے بنائے جانے والے ہولوگرام فریبِ نظر ہوتے ہیں۔

دمدار ستارے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی کمیت کھو کر بالکل ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ ہر چکر میں ان کا کچھ مادہ منتشر ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات نظامِ شمسی کے کسی بڑے سیارے کی کشش ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی جیسا کہ پچھلی صدی میں لیوی شومیکر نامی دمدار ستارے کے ساتھ ہوا۔ تقریباً دس کلومیٹرز قطر رکھنے والے اس ستارے نے کئی ہزار سال بعد نظامِ شمسی میں قدم رکھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ اس کا سامنا یہاں دیو قامت سیارے مشتری سے ہو گیا اور مشتری نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس کے گیارہ ٹکڑے کر دیے اور یہ گیارہ ٹکڑے یکے بعد دیگرے مشتری سے جا ٹکرائے۔ واضح رہے کہ مشتری زمین کے مقابلے میں سو گنا بڑا سیارہ ہے اور اس میں ہماری زمین جیسے ایک ہزار سیارے سما سکتے ہیں۔ اس گیسی سیارے میں کوئی ذی روح بھی آباد نہیں ہے اس لیے اس تصادم میں کسی کا کچھ نہیں بگڑا لیکن اگر یہی دمدار ستارہ زمین پر آ گرتا تو خدا جانے کیا ہوتا لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ آج آپ یہ داستان نہ پڑھ رہے ہوتے۔

زمین کے پاس آنے سے مہینوں پہلے دمداروں کی دم ان کی خبر دے دیتی ہے اور انسان ان سے ہوشیار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ہوشیاری فی الحال کسی کام کی نہیں ہے کیونکہ ابھی تک ایسا کوئی قابلِ اعتماد نظام تشکیل نہیں دیا جا سکا ہے جو زمین کی طرف آنے والے کسی خلائی جسم کو روک سکے یا اسے تباہ کر سکے۔ ہاں کاغذوں پر درجنوں تجاویز اور منصوبے موجود ہیں۔ لیکن بڑی طاقتوں کو ان پر کام کرنے کی فرصت نہیں ہے کیونکہ وہ دہشت گردی کے کائناتی مسئلے سے نمٹنے میں کھربوں ڈالرز خرچ کر رہے ہیں۔ امریکا کے نابالغ سیاست دانوں کے لیے امریکا کا تحفظ زیادہ ضروری ہے بہ نسبت زمین کے تحفظ کے۔ ان ممکنہ حفاظتی منصوبوں کا ذکر بعد میں کریں گے۔

دوسرے نمبر پر شہابیے ہیں۔ یہ بھی نظامِ شمسی سے باہر سے یا اس کی سرحدوں کے آس پاس سے آتے ہیں جہاں اس نیبولہ کا بچا کھچا حصہ موجود ہے جس سے ہمارا نظامِ شمسی تشکیل پایا ہے۔ نیبولہ میں موجود برف اور گرد کے ذرات مل کر شہابیہ بناتے ہیں۔ بناوٹ کے لحاظ سے دمدار ستارے اور شہابیے میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دمدار میں خشک برف ہوتی ہے اور شہابیے میں پانی والی برف ہوتی ہے۔ تشکیل کے بعد سورج یا کسی قریبی ستارے کا ثقلی جھٹکا اسے نظامِ شمسی کی سیر پر روانہ کر دیتا ہے۔ عام طور سے بیشتر شہابیے شروع کے بڑے سیاروں کی کشش کے زیرِ اثر آ کر اس میں جا گرتے ہیں یا اس کے گرد مدار بنا کر ہمیشہ کے لیے اس کے قیدی بن جاتے ہیں۔ کچھ ان سے آگے مریخ پر آ گرتے ہیں۔ یا اس کے گرد مدار بنا لیتے ہیں۔ لیکن مریخ سے آگے خلا بہت زیادہ ہے اور اس میں سورج کی کشش کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔

یہ اس کی کشش کی وجہ سے سورج کے گرد زمین اور مریخ کے درمیانی علاقے میں ایک بہت بڑا بیضوی مدار بنا لیتے ہیں۔ اس مدار میں یہ کبھی سورج کے بالکل پاس چلے جاتے ہیں اور کبھی یہ مریخ سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ اس بے تکے مدار میں یہ کبھی کبھی زمین کے پاس سے بھی گزرتے

ہیں۔

سیارچے جیسا کہ بتایا کہ اسٹرائیڈ بیلٹ سے نکل کر آتے ہیں۔ مریخ اور سورج کی کشش انہیں بیلٹ سے باہر کھینچ لیتی ہے اور یہ بھی سورج کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں اس سفر میں ان کا انجام تین طرح سے ہوتا ہے۔ یا تو یہ مریخ، سورج یا زمین پر آ گرتے ہیں یا مریخ کے گرد مدار بنا کر باقی عمر اس کا طواف کرتے رہتے ہیں یا پھر شہابیوں کی طرح سورج کے گرد بیضوی مدار بنا کر زمین والوں کے لیے ایک مستقل پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں کیونکہ زمین پر گرنے والے اکثر سیارچے، شہابیے اور دمدار ستارے اسی بیضوی مدار میں گردش کرتے ہیں۔ اپنے مداروں میں جب یہ زمین کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے ایک حد سے زیادہ قریب آ جاتے ہیں تو زمین کی کشش انہیں کھینچ لیتی ہے اور یہ اس سے آ ٹکراتے ہیں۔

یعنی زمین کے لیے دو طرح کے خلائی اجسام خطرے کا باعث ہیں۔ ایک وہ جن کا باقاعدہ مدار ہوتا ہے اور یہ سورج کے گرد مخصوص وقفے سے... چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر خطرے کا باعث بننے والے اجسام کا پتا چلایا جا چکا ہے۔ یہ اجسام ایک کلومیٹر سے بڑا سائز رکھتے ہیں۔ لیکن اکثر خاصے بڑے بھی ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا سیارچہ ایس ایکس فور بی ہے جو سورج کے گرد ایک طویل بیضوی مدار میں چکر لگاتا ہے۔ یہ سورج کے بالکل پاس سے ہو کر پھر اتنا دور چلا جاتا ہے کہ پلوٹو کی حد سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ لمبوترے پتھر کی شکل کا یہ سیارچہ بائیس کلومیٹرز طویل ہے اور اس کا حجم دس سے بارہ کلومیٹرز ہے۔ یہ کسی زمانے میں اسٹرائیڈ بیلٹ کا حصہ رہا تھا لیکن اب سورج کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ مگر خوش قسمتی سے یہ زمین کے مدار کی ڈسک کے مخالف سمت سے آتا ہے یوں سمجھ لیں کی ایک پلیٹ کے وسط میں دوسری پلیٹ کھڑی کر دیں تو یہ زمین اور ایس ایکس فور بی کے مدار ہوں گے۔ اس لیے زمین سے اس کے تصادم کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن ایسے بے شمار سیارچے، دم دار ستارے اور شہابیے ہیں جن کے زمین سے ٹکراؤ کا امکان موجود ہے۔

ایسے ہی ایک دمدار فوبیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگلی صدی میں کسی چکر میں اس کا زمین سے ممکنہ طور پر ٹکراؤ ممکن ہے۔ فوبیس چار کلومیٹرز قطر کا ایک بڑا دمدار ستارہ ہے اور یہ ہر چار سال بعد نظامِ شمسی کا چکر لگاتا ہے۔ مریخ اور زمین کے درمیان سے گزرتے ہوئے بعض اوقات یہ زمین کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ ماہرینِ فلکیات فوبیس کے مدار پر نظر رکھے ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہر بار نظامِ شمسی میں داخل ہوتے ہوئے یا باہر جاتے ہوئے مشتری، زحل اور نیپچون کی کشش اسے راستے سے بھٹکاتی ہے اور ہر بار اس کا مدار مختلف ہو جاتا ہے اس لیے ماہرین کے لیے یہ پیش گوئی کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کہ اگلی بار یہ کس زاویے سے نظامِ شمسی میں داخل ہوگا اور زمین سے کتنے فاصلے سے گزرے گا۔ گزشتہ دو صدیوں میں یہ کئی بار زمین کے بہت پاس سے گزرا ہے۔

اسی طرح کئی اور سیارچے اور شہابیے بھی اپنے مداروں میں زمین کے پاس سے گزرتے ہیں اور مستقبل میں امکان ہے کہ یہ زمین سے جا ٹکرائیں، لیکن فی الحال اس کا امکان بہت کم ہے۔ ماہرین کے نزدیک زمین کے لیے وہ اجسام زیادہ خطرناک ہیں جن کا کوئی باقاعدہ مدار نہیں ہے۔ یہ آوارہ اسٹرائیڈ بیلٹ، نظامِ شمسی سے باہر سے آتے ہیں اور سورج کی کشش کی وجہ سے اس میں جا گرتے ہیں۔ سورج کی طرف سفر کرتے ہوئے یہ زمین کے پاس سے بھی گزرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مدار نہیں ہوتا اور یہ سیدھے سفر کر رہے ہوتے ہیں اس لیے یہ مدار والے اجسام کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ اوّل ان کی رفتار بے پناہ ہوتی ہے۔ یہ چار لاکھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی سفر کرتے دیکھے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ سیدھے آتے ہیں اس لیے ان کا پتا چلانا

پیر صاحب ہتھوڑا شریف کا وصیت نامہ

”خصوصاً مریدوں کا خاص خیال رکھو کہ ہماری شان ان کے دم قدم سے ہے؟ اگر وہ تمہارے ہاتھ چومنا چاہیں تو بخل سے کام نہ لو۔ اگر تم اس وقت دوستوں سے مصروفِ گفتگو ہو تو انہیں مایوس نہ کرو بلکہ اپنا دایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دو، وہ ہاتھ چومتے رہیں۔ تم باتیں کرتے رہو۔ ایسے مواقع پر تم انہیں لائن بنانے کے لیے کہو۔ وہ لائن میں آئیں تو ایک ایک کرکے ہاتھ چومتے جائیں، ان کے جانے کے بعد جیب سے ٹشو پیپر نکال کر اچھی طرح صاف کر لیا کرو اور گھر پہنچتے ہی ڈیٹول سے ہاتھ دھونا بھی نہ بھولو۔ مریدوں کے اظہارِ عقیدت اپنی جگہ اور حفظانِ صحت کے اصول اپنی جگہ، دونوں کو کبھی گڈمڈ نہ کرو۔“

(عطاء الحق قاسمی کی کتاب وصیت نامے سے اقتباس)

مرسلہ: جی اے مغل، چیچیاں شمس، گجرات

اور قبل از پتا چلانا بہت مشکل کام ہے۔ دوسرے اگر زمین یا سورج ....ان کے درمیان میں آجائے تو یہ اس سے براہِ راست ٹکراتے ہیں۔ یعنی یہ اوپر سے سیدھے آکر زمین پر گرتے ہیں اور ان کی ٹکر بہت طاقت ور ہوتی ہے۔ اس قسم کا چھوٹا سیارچہ بھی بہت بڑی تباہی لاسکتا ہے۔ جو اجسام بیضوی مدار میں زمین کے کرہ ہوائی میں داخل ہوتے ہیں وہ گرنے سے بیشتر ہوائی رگڑ سے اپنی تباہ کن رفتار کھو چکے ہوتے ہیں اور جل کر ان کا اکثر حصہ راکھ ہوجاتا ہے۔ ترچھا گرنے کی وجہ سے ان کی ٹکر بھی بہت قوت والی نہیں رہ جاتی ہے۔ چھ کروڑ سال پہلے یوٹا کان میں گرنے والے چھ میل قطر کے شہابیے نے اسی وجہ سے اتنی تباہی پھیلائی تھی کہ وہ خلا سے بالکل سیدھا آکر زمین سے ٹکرایا تھا۔ اس نے زمین کے اوپری خول کو اندر تک تباہ کردیا تھا۔

اس کے مقابلے میں کینیڈا میں کیوبک میں گرنے والے سیارچے نے زیادہ بڑے ہونے کے باوجود اتنی تباہی نہیں پھیلائی تھی کیونکہ وہ ترچھے بیضوی مدار میں زمین پر گرا تھا۔ البتہ اس نے گڑھا بہت بڑا بنایا تھا۔ وہ زمین کا ابتدائی دور تھا اور ابھی چٹانیں تشکیل پارہی تھیں اس لیے نرم مٹی نے اس تصادم کو آسانی سے سہہ لیا تھا اور جاندار بڑی تباہی سے بچ گئے تھے۔ ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ اس تصادم کے نتیجے میں زمین پر مصنوعی سردی شروع ہوگئی تھی اور جاندار ہلاک ہوئے تھے۔

ماہرینِ فلکیات زمین کے پاس سے گزرنے والے خلائی اجسام کی تلاش دوربینوں اور ریڈیائی دوربینوں کی مدد سے کرتے ہیں۔ یہ تمام دوربینیں سوائے چند ایک کو چھوڑ کر زمین پر نصب ہیں اور اس وجہ سے ان کی کارکردگی محدود ہو جاتی ہے۔ مثلاً بادل آجائیں یا سورج بالکل سر پر آجائے تو ان سے کام نہیں لیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک تباہ کن خلائی اجسام کی دس فیصد تعداد ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا مدار کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ زمین کے پاس آنے کی صورت میں دوربینوں کی زد میں نہیں آتے ہیں۔ یا وہ سورج کے ساتھ کچھ اس طرح آتے ہیں کہ دوربین انہیں نہیں دیکھ پاتی ہے۔ اسی طرح صرف بڑے خلائی اجسام اتنی طاقت ور ریڈیائی لہریں خارج کرتے ہیں کہ ہماری ریڈیائی دوربینیں ان کے سگنل پکڑ سکیں۔ اگر خلائی اجسام چھوٹے ہوں یا ان کی ساخت میں پانی اور برف کا عنصر زیادہ ہوتو وہ ریڈیائی لہریں کمزور خارج کرتے ہیں اور ان کا پتا نہیں چلتا ہے۔

حیران کن طور پر پچھلے چند سالوں میں کچھ خلائی اجسام دریافت ہوئے ہیں جو خاصے بڑے ہیں اور ان کا مدار زمین کے مدار کو کاٹتا ہے یعنی مستقبل میں ان سے تصادم کا خطرہ موجود ہے اور یہ گزشتہ تین دہائیوں سے تحقیق کرنے والے ماہرینِ فلکیات کی نظروں سے اوجھل تھے۔ ان دریافتوں نے خدشات بڑھا دیے ہیں کہ مستقبل قریب میں شاید ہمیں کسی حیران کن خلائی جسم سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ماہرین زور دے رہے ہیں کہ مزید تباہ کن خلائی اجسام کی یقینی دریافت کے لیے خلا میں دوربینوں کی تنصیب کا کام تیز کیا جائے۔ کیونکہ خلائی دوربین زمین پر نصب دوربین کے مقابلے کہیں بہتر اور ہمہ وقت کام کرتی ہے اور اسے دن رات یا بادلوں جیسی رکاوٹوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ نیز خلا میں گرد وغبار نہیں ہوتا ہے اس لیے دوربین کا نتیجہ بہت شاندار ہوجاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہبل ٹیلی اسکوپ ہے جس نے خود سے کئی گنا طاقت ور زمینی دوربینوں کے مقابلے میں کہیں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اس سے ماہرینِ فلکیات نے وہ کچھ دیکھ لیا جو وہ اس سے پہلے نہیں دیکھ پائے تھے۔

ماہرینِ فلکیات کا ایک چھوٹا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ ہم جتنا زور ایک کلومیٹر یا اس سے بڑے خلائی اجسام کی تلاش پر دے رہے ہیں اتنا ہی زور ہمیں اس سے چھوٹے اجسام پر بھی دینا چاہیے۔ ایک خلائی جسم جو دو سو میٹرز سے آٹھ سو میٹر حجم کا ہو تو اس کا تصادم زمین پر پورا اثر نہیں ڈال سکتا ہے۔ سمندر میں گرنے کی صورت میں یہ اونچے درجے کا سونامی پیدا کر سکتا ہے۔ اسی طرح زمین پر گرنے کی صورت میں تقریباً سو مربع کلومیٹرز کا علاقہ تباہ کرسکتا ہے۔ اس کا اثر کائناتی نہیں ہوگا۔ لیکن ماہرین کے اس گروہ کا کہنا ہے کہ ان خلائی اجسام سے تصادم کا خطرہ بڑے خلائی اجسام کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ یہ خطرہ دس گنا زیادہ ہے۔ اس گروہ کے ایک ماہرِ فلکیات ایلن ہوورڈ یونیورسٹی آف پنسلوانیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ”چھوٹے اجسام کا خطرہ بہت زیادہ ہے، درحقیقت یہ بڑے اجسام کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ صرف دس گنا کہہ دینے سے بات ختم نہیں ہوجاتی ہے۔ بڑے خلائی اجسام کے مقابلے ان کا خطرہ وقت سے آزاد ہے۔ یہ تصادم کسی وقت بھی ہوسکتا ہے۔ آج کل یا آنے والے سال یا صدی میں کسی وقت بھی۔ ایک چھوٹا جسم دنیا کو تباہ نہیں کرسکتا ہے لیکن وہ کسی خطے کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے اثرات معاشی لحاظ سے دنیا پر مرتب ہوں گے جیسے جاپان میں آنے والے زلزلے اور سونامی نے

جاپان کے ساتھ دنیا کی معیشت کو بھی متاثر کیا ہے۔ اگر نشانہ نیویارک بنے تو معاشی ابتری کا خدشہ اور بھی بڑھ جائے گا۔ اس طرح تیل پیدا کرنے والے خاص علاقے جیسے سعودی عرب کی آئل فیلڈ یا عراق اور باکو کی آئل فیلڈ یہاں کنویں بہت پاس پاس ہیں اور اگر تصادم ہوا تو تیل کی بہت بڑی سپلائی رک جائے گی۔ اگر یہ تصادم کیلیفورنیا کی سلیکون ویلی میں ہوا تو آئی ٹی کی دنیا کو شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔ لندن، برلن، ٹوکیو، شنگھائی اور تائے پے دنیا کے معاشی حب ہیں ان میں سے کسی کی تباہی دنیا کی معاشی حالت پر لازمی اثر انداز ہوگی۔ اگر یہ تصادم ایمزون کے علاقے میں ہو تو آگ بھڑکنے سے دنیا کا یہ سب سے بڑا جنگل خاکستر ہو جائے گا اور یہ دنیا کی آکسیجن کی رسد کا چالیس فیصد مہیا کرتا ہے۔ اگر یہ تصادم ہمالیہ میں کہیں ہوا تو یہ اس کی برف پگھلا کر نیچے کے ممالک کو تباہ کن سیلاب سے دوچار کردے گا۔ غرض کہ چھوٹا تصادم بھی کم خطرناک نہیں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ پوری دنیا کو تباہ نہیں کرسکتا لیکن انسانی معمولات کو متاثر کر سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ چھوٹے خلائی اجسام کی تلاش پر بھی اتنی ہی توجہ دی جائے۔“

ماہرینِ فلکیات اس خدشے کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے ایک دہشت گرد کے مقابلے میں ایک معمولی چور اچکا جو کسی تاریک گلی میں اچانک آپ پر ٹوٹ پڑے اور آپ کا پرس اور موبائل چھین کر آپ کو زخمی کرجائے۔ اس کی تلافی ممکن ہے۔ ڈاکٹر ایبٹ کا کہنا ہے۔ ”موجودہ معاشی صورتِ حال میں حکومتوں اور اداروں کے لیے ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ خطرناک فلکیاتی اجسام کی تلاش کے لیے ایک حد سے زیادہ وسائل مہیا کریں۔ اس لیے ہمیں اپنی توجہ اور توانائی ان خلائی اجسام کی دریافت پر لگانی چاہیے جو زمین پر انسانی تہذیب کو مکمل طور پر تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہم یہی کام کررہے ہیں۔ مجھے امید ہے مستقبل میں بہتر آلات اور خلائی دوربینوں کی مدد سے ہم ایسے تمام خلائی اجسام کو کھوج نکالیں گے جو زمین کے لیے کبھی بھی خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔“

ایک طرف تو ناسا اور دوسرے خلائی اداروں کے ماہرینِ فلکیات اپنے کام میں مصروف ہیں اور زمین کے خلاف خطرہ بنے خلائی اجسام کو تلاش کررہے ہیں تو دوسری طرف ماہرین کا ایک گروہ ایک اور نظریہ پیش کررہا ہے۔ اکثر قدیم مذاہب اور قوموں میں سورج کو دیوتا جیسی حیثیت حاصل تھی بلکہ شاید اب بھی ہے۔ جاپانی خود کو سورج کی اولاد بتاتے ہیں۔ یہی دعویٰ جنوبی امریکا کی قدیم تہذیبوں انکا اور مایا کے افراد بھی کرتے تھے۔ آریا بھی خود کو سورج کی اولاد بتاتے ہیں۔ سورج ونشی راجپوت آج بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ قدیم مصری سورج کی پوجا کرتے تھے اور اس کے خفیہ اور تاریک رُخ کے پرستار تھے۔ قدیم میری بھی سورج کو پوجتے تھے اسی طرح یمن کے باشندے بھی سورج کے پجاری تھے جن کا ذکر ملکہ سبا کی قوم کے طور پر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم تہذیبوں میں سورج کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

مایا تہذیب نے پتھروں پر بنائی تصویروں کی مدد سے اپنی جو تاریخ چھوڑی ہے۔ اس میں ایک عجیب کہانی ملتی ہے۔ اس کہانی کے مطابق سورج کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا لیکن وہ سورج کے برعکس برے کردار کا حامل تھا۔ اس نے سورج سے جھگڑا کیا اور ناراض ہوکر دور ستاروں کی طرف چلا گیا۔ یہ برا بھائی بہت عرصے بعد سورج سے ملنے آتا ہے لیکن کیونکہ اس سے ناراض ہے اس لیے کچھ دیر ٹھہر کر دوبارہ واپس چلا جاتا ہے۔ جس پتھر پر تصویروں سے یہ کہانی بیان کی گئی ہے اس میں سورج کا بھائی بھی دکھایا گیا ہے جو سورج کے برعکس سیاہ اور بجھا ہوا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس تصویر میں نظامِ شمسی کے دوسرے اہم ارکان یعنی نو سیارے اور چاند کو بھی دکھایا گیا ہے۔ جب جدید مغربی سائنس نے 1930ء آخری سیارہ پلوٹو دریافت کیا یہ پتھر پر کندہ تصویری کہانی اس سے بھی کوئی ہزار سال پرانی ہے۔ تب انسان صرف تین سیاروں یعنی مریخ، زہرہ اور مشتری سے واقف تھا۔ اس وقت ان لوگوں کو بھلا کیسے پتا چلا کہ نظامِ شمسی میں کتنے سیارے ہیں۔ اگر ان کو یہ بات معلوم تھی تو ممکن ہے سورج کے بھائی والی بات بھی درست ہو۔

ماہرین کا یہ گروہ جو کلاسک فلکیات پر یقین رکھتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اکثر ستارے جڑواں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ ستاروں کی پیدائش والا نیبولہ گھوم رہا ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کا مادہ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اور یہ دو حصے دو ستاروں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ بعض اوقات دو سے زیادہ ستارے پیدا ہوتے ہیں یہ نیبولہ کے سائز پر منحصر ہوتا ہے اور بعض اوقات مادے کی کمی سے صرف ایک ہی ستارہ بنتا ہے۔ بہ ظاہر ہمارا سورج بھی ایک ایسا ہی ستارہ ہے جو اکیلا پیدا ہوا ہے۔ مگر ماہرین کا یہ گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ سورج کا ایک ساتھی یعنی جڑواں ستارہ بھی تھا۔ لیکن پیدائش کے دوران سورج نے بڑے ہونے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے زیادہ مادہ خود حاصل کرلیا اور اس کے ساتھی کو اتنا مادہ نہیں مل

سکا اس لیے وہ پوری طرح ستارہ نہیں بن سکا تھا اور شاید سفید بونا بن کر رہ گیا تھا کیونکہ اس کے مرکز میں دباؤ اور درجہ حرارت اتنا نہیں ہوا تھا کہ فیوژن کا عمل شروع ہو سکے۔ چھوٹا ہونا اور کم کششِ ثقل کے باعث یہ سورج کے گرد گھومنے لگا۔

عام طور سے جڑواں ستارے ایک دوسرے کے گرد گھومتے ہیں کیونکہ ان کا سائز اور کمیت تقریباً برابر ہوتی ہے۔ یا کمیت برابر ہوتی ہے۔ بہت سارے دیو قامت ستارے مرنے کے بعد سفید بونے کا روپ دھار لیتے ہیں اور ان کا قطر صرف دس ہزار میل رہ جاتا ہے یعنی زمین سے کچھ ہی بڑا ہوتا ہے مگر اس میں مادہ بہت زیادہ کثیف ہو جاتا ہے یوں سمجھ لیں کہ ایک ماچس کے ڈبے کے برابر مادے کا وزن ہزاروں ٹن میں ہو سکتا ہے۔ سورج کا قطر تیرہ لاکھ میل ہے۔ ہماری کہکشاں ایک جڑواں ستاروں کے نظام میں ہے، اس میں ایک بڑا نیلگوں ستارہ ہے یہ پچیس لاکھ میل قطر کا ہے اور دیو قامت کے زمرے میں آتا ہے۔ دوسرا سفید بونا ہے اور اتنی دور سے نظر بھی نہیں آتا اس کا پتا بھی نہیں چلتا، اگر یہ نیلگوں ستارے کو اپنے گرد گردش کرنے پر نہ مجبور کر رہا ہوتا۔ یعنی اس سفید بونے میں مادہ اور کشش بڑے ستارے جتنی ہے جس کی وجہ سے یہ اسے بھی اپنے گرد گردش کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

مگر سورج کا جڑواں بھائی اس کی چالاکی کی وجہ سے ستارہ نہ بن سکا کیونکہ بیشتر مادہ سورج نے ہڑپ کر لیا تھا۔ وہ بجھ کر رہ گیا اور پھر سورج کا طفیلی سیارہ بن گیا۔ کیونکہ اس کی پیدائش نیبولہ کے دوسرے سرے پر نظام شمسی سے باہر ہوئی تھی اس لیے اس کا مدار بھی نظام شمسی سے باہر ہے۔ کلاسک ماہرینِ فلکیات کا کہنا ہے کہ سورج کا یہ جڑواں ساتھی جسے انہوں نے نیمو کا نام دیا ہے۔ ایک بہت طویل مدار میں سورج کے گرد ہر چھ کروڑ سال بعد ایک چکر لگاتا ہے۔ ناکام ستارہ ہونے کے باوجود یہ بہت بڑا ہے۔ کم سے کم نظام شمسی کے سیارے مشتری سے بڑا ہے۔ پھر اس میں مادے کی کثافت بھی زیادہ ہے اس لیے یہ زبردست کشش رکھتا ہے اور اسی کشش سے ہر چھ کروڑ سال بعد نظام شمسی میں داخل ہو کر تباہی مچاتا ہے۔ اس کی کشش سے سیاروں پر سیارچوں کی بارش ہو جاتی ہے۔ دوسرے سیاروں کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا .... کیونکہ وہ ویسے ہی ویران اور زندگی سے خالی ہیں۔ شامت زمین کی آتی ہے اور اس کی حیات کو بہت مشکل وقت سے گزرنا پڑتا ہے۔

ماہرین نے نیمو کے بارے میں اندازہ لگایا ہے کہ یہ کم سے کم ایک لاکھ میل قطر رکھتا ہے اور اس کی کشش سورج کی کشش کا پانچواں حصہ ہے۔ جب یہ نظام شمسی میں داخل ہوتا ہے تو اس کی کشش سے سیاروں کے مدار میں خلل آتا ہے اور یہ خلل اس کے جانے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ ماہرین کے اس دعوٰی کی تصدیق جدید فلکیات کرتی ہے کہ نظام شمسی کے تین بڑے سیارے یعنی مشتری، زحل اور یورینس اپنے مدار میں غیر مستحکم ہیں۔ ان میں سب سے عجیب وغریب انداز یورینس کا ہے یہ اپنے مدار پر تقریباً لیٹا ہوا ہے جب کہ دوسرے سیارے زمین کی طرح اپنے مدار پر پچیس کے آس پاس کے زاویے پر جھکے ہوئے ہیں صرف یورینس لیٹا ہوا ہے۔ آخر اس کا مدار اتنا عجیب کیوں ہے؟ واضح رہے کہ جب سیارے بنتے ہیں تو وہ اپنے مدار پر مستحکم رہنے کے لیے ذرا جھک کر گردش کرتے ہیں اور اگر وہ بلکہ سیدھی لٹو جیسی گردش کریں تو ان کا مدار غیر مستحکم ہو جائے گا۔

لہٰذا نظام شمسی کے تمام سیارے اسی فطری پوزیشن میں جھکے ہوئے ہیں سوائے یورینس کے اور اس کے اس مدار کی وجہ ماہرینِ فلکیات اس نامعلوم سیارے کو قرار دیتے ہیں جو طویل عرصے بعد نظام شمسی کا چکر لگاتا ہے اور اس دوران میں یہاں تباہی پھیلاتا ہے۔ اس کے کسی چکر کے دوران اس کا ٹکراؤ یورینس سے ہوا اس کی زبردست کشش ثقل نے یورینس کو اس کے مدار پر لٹا دیا۔ تب سے یہ اسی مدار پر ہے۔ کیونکہ یہ گیسی سیارہ ہے اس لیے اس پر سے تصادم کے آثار مٹ چکے ہیں۔

ماہرینِ فلکیات جو نیمو کے وجود کے قائل ہیں وہ اس سلسلے میں ایک دلیل اور دیتے ہیں۔ مشتری اور زحل کے درمیان لاتعداد سیارچوں سے بنی جو اسٹرائیڈ بیلٹ ہے یہاں کسی زمانے میں ایک بڑا سیارہ ہوتا تھا جو کسی وجہ سے تباہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہ ماہرین اس سیارے کی تباہی کی وجہ بھی نیمو کو قرار دیتے ہیں۔ اس کی کشش نے سیارے پر سورج کی کشش کے خلاف عمل کیا اور دونوں طرف سے کھینچا تانی نے اس بے چارے سیارے کے ٹکڑے کر دیے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سورج کا برادر واقعی ایک مجرا بھائی ہے یہ جب آتا ہے تباہی و بربادی پھیلاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہی کوئی سیارہ نما ستارہ ہے تو اب تک ماہرینِ فلکیات کی نظروں سے اوجھل کیسے رہا؟ اس سوال کا جواب نیمو کے حامی ماہرین یوں دیتے ہیں کہ اس جڑواں ستارے کا مدار سورج کے گرد بہت زیادہ بیضوی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ چھ کروڑ سال بعد نظام شمسی کا رُخ کرتا ہے۔ دوسرے یہ بالکل بجھا ہوا کسی

تاریک سیارے کی طرح ہے اس لیے اب تک کسی دوربین نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ پھر ہمارے نظام شمسی کے چاروں طرف نیبولہ کی بچی کھچی دھول کے بادل موجود ہیں، یہ بادل نظام شمسی سے باہر دیکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور ان کی وجہ سے ماہرینِ فلکیات بہت سارے نزدیکی ستاروں کا بھی درست طریقے سے مشاہدہ نہیں کر پاتے ہیں اور مجبوراً انہیں صرف ریڈیائی دوربینوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ یہ دھول کے بادل نیمو کو چھپائے ہوئے ہیں اور وہ اسی وقت نظر آئے گا جب ان بادلوں کو عبور کرتے ہوئے نظام شمسی میں داخل ... ہوگا۔

اس کے باوجود ماہرینِ فلکیات اپنی دوربینوں سے آسمان کو کھنگال رہے ہیں۔ نوے کے عشرے میں ناسا سے منسلک بعض ماہرینِ فلکیات نے دعوٰی کیا کہ انہوں نظام شمسی کے دسویں سیارے کا پتا چلا لیا ہے۔ یہ سیارہ پلوٹو سے کہیں آگے نیبولہ کی دھول میں چھپا ہوا ہے۔ اس لیے اسے کسی دوربین سے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن نیبولہ میں موجود کسی بڑے جسم کی زبردست کشش اس کا پتا دے رہی ہے۔ یہ کشش اتنی زیادہ ہے کہ بڑے سیاروں اور ان کے چاندوں کو اپنے محور پر غیر مستحکم کر رہی ہے۔ کیا یہی دسواں سیارہ سورج کا جڑواں بھائی ہے۔ ماہرین نے چھ کروڑ سال کے عرصے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے مدار کا جو گراف بنایا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس کے مطابق نیمو اپنی انتہائی دوری پر سورج سے ایک نوری سال کی مسافت پر چلا جاتا ہے۔ روشنی ایک سال میں جو فاصلہ طے کرتی ہے اسے نوری سال کہتے ہیں۔ ایک نوری سال کتنا طویل ہوتا ہے اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ سورج کی روشنی صرف ساڑھے نو منٹ میں زمین تک پہنچ جاتی ہے اور اسے پلوٹو تک پہنچنے میں چند گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتے .... جو اربوں میل کی دوری پر ہے۔ اس لحاظ سے نیمو سورج سے بعید ترین فاصلے تک پہنچ جاتا ہے۔ ماہرین حیران ہیں کہ سورج کی کشش اتنے فاصلے تک اثر انداز ہو سکتی ہے۔

جب نیمو سورج کے پاس آتا ہے تب بھی یہ بالکل قریب نہیں آتا بلکہ اندازہ ہے کہ نظام شمسی کے بیرونی حلقے کے پاس سے ہوتا ہوا عملاً پورے نظام شمسی کے گرد چکر لگا کر واپس چلا جاتا ہے۔ اتنی دوری سے بھی یہ سیاروں اور ان کے ذیلی ستاروں کے مدار میں خلل ڈال دیتا ہے۔ اس کی کشش سے اسٹرائیڈ بیلٹ سے سیارچے نکل کر سیاروں پر برس پڑتے ہیں اور ان سیاروں میں زمین بھی شامل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے زمین پر ہر چھ کروڑ سال کے بعد حیاتیاتی چکر بدل جاتا ہے، پرانی نسلیں سیارچوں کی تباہی کا شکار ہو کر فنا ہو جاتی ہیں اور جب تباہی کے آثار ختم ہو جاتے ہیں تو زمین پر زندگی نئے انداز میں جنم لیتی ہے۔ اگر نیمو والی تھیوری درست ہے تو یہی سیارہ زمین پر حیاتیاتی سائیکل کا ذمے دار ہے۔ ممکن ہے آنے والے کسی وقت میں ہم اپنے سورج کے اس جڑواں بھائی کو دیکھ سکیں اور وہی وقت شاید قیامت کا ہو۔

تقریباً تمام ماہرینِ فلکیات متفق ہیں کہ زمین کو خلا سے آنے والے اجسام سے خطرہ لاحق ہے البتہ وہ اس خطرے کی شدت اور نوعیت کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اسی طرح اس خطرے سے نمٹنے کے بارے میں ان کی تجاویز بھی مختلف ہیں۔ عام طور سے ہم سائنس فکشن فلموں میں دیکھتے ہیں کہ اہلِ زمین نے ایٹمی میزائل یا لیزر شعاع مار کر زمین کی طرف آنے والے سیارچے کو تباہ کر دیا۔ فلم میں یہ دکھانا بہت آسان ہے۔ اگرچہ ایٹم یا ہائیڈروجن کا استعمال ایک اچھا ہتھیار ہے کیونکہ اس کی زبردست توانائی کسی بھی سیارچے یا مدار ستارے کو توڑ کر اسے اتنا چھوٹا کر سکتی ہے کہ اگر وہ زمین کی طرف آئے تو بھی کرہ ہوائی کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو سکتے ہیں۔

مگر اس میں نشانے کی درستی آلات کا بالکل ٹھیک ہونا اور اس توانائی کا ہونا لازمی ہے جو سیارچے کو تباہ کرنے کے لیے درکار ہو۔ اندازے کی غلطی سے سیارچہ متعدد چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا اور پھر اسے روکنا ناممکن ہوگا۔ .... یہ زیادہ بڑے علاقے پر گر کر زیادہ تباہی مچا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے ترقی یافتہ ممالک کے پاس یہ ٹیکنالوجی ہے۔ وہ زمین سے ایک مخصوص فاصلے تک کسی بھی چھوٹے سیارچے کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ حربہ بڑے سیارچوں پر کارآمد نہیں..... خاص طور سے وہ سیارچے یا مدار ستارے جن کا قطر پانچ کلومیٹرز سے زیادہ ہو۔ ان کی سطح پر کیا جانے والا دھماکا چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ان کو چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سیارچے میں سوراخ کر کے ایٹم بم اس کے اندر تک پہنچایا جائے۔ لیکن ایک سفر کرتے سیارے پر یہ کام تقریباً ناممکن ہے۔ اس میں خطرات بہت زیادہ ہیں۔

ماہرین نے اس کے بجائے ایک اور تجویز پیش کی ہے۔ اس میں ایٹم بم کو سیارچے پر رکھ کر دھماکا کرنے کی بجائے سیارچے کے پاس اس طرح سے دھماکا کیا جائے کہ اس کی شاک ویو سیارچے کے مدار میں تبدیلی کر کے اسے

زمین سے دور جانے پر مجبور کردے۔ یہ تجویز آسان بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔ لیکن اس کے لیے بھی بالکل درست ٹائمنگ اور طاقت کا استعمال لازمی ہے۔ دھماکے میں ذرا سی غلطی سیارچے کی سمت تبدیل کرنے کے بجائے اسے مزید تیز رفتاری سے زمین کی طرف بھی دھکیل سکتی ہے۔

ایٹم بم کے علاوہ متبادل ہتھیاروں میں لیزر سب سے اہم ہے۔ لیزر خلا میں زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہے اور اسے سیارچے کے مرکز پر مار کر اسے ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ لیزر بار بار استعمال ہونے والا ہتھیار ہے اس لیے اسے سیارچے کے ٹکڑوں کو مزید چھوٹا کرنے اور انہیں بے ضرر سائز تک لانے میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر لیزر کے استعمال میں دو قباحتیں ہیں۔ اوّل طاقت ور لیزر بنانے کے لیے بہت زیادہ طاقت کی ضرورت ہوگی اور خلا میں فی الحال اتنی توانائی کے حصول کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ طاقت ور لیزر شعاع کے لیے میگاواٹس میں بجلی کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ خلا میں مصنوعی سیاروں میں سورج کی روشنی اور کیمیائی عمل سے چند کلوواٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ وہاں کسی قسم کا جنریٹر لے جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے فی الحال خلا میں طاقت ور لیزر ایک خواب ہے۔

خلائی ٹیکنالوجی کے ماہر ڈاکٹر اے کے جے اسپنسر نے آج سے تین دہائی پہلے ایک نئی طرز کے خلائی ہتھیار کا خیال پیش کیا۔ اس میں خلا میں بہت بڑی ڈش نصب کی جائے اور اس ڈش سے سورج کی حرارتی توانائی جمع کر کے ایک نقطے پر مرکوز کی جائے تو اس نقطے پر بہت زیادہ درجہ حرارت جمع کیا... جاسکتا ہے۔ خلا میں سورج کی شعاعیں بے پناہ حرارت لیے ہوتی ہیں کیونکہ وہاں ہوا نہیں ہوتی جو روشنی کو منتشر کرکے حرارت کو کم کردے۔ اگر خلا میں کوئی چیز سورج کی شعاعوں میں رکھ دی جائے تو وہ جل جائے گی کیونکہ وہاں ان کا درجہ حرارت ڈھائی سو ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسپنسر نے خیال پیش کیا کہ ایک ڈھائی سو فٹ قطر کی ڈش خلا میں نصب کی جائے تو یہ کسی ایک نقطے پر پانچ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا درجہ حرارت پیدا کرسکتی ہے۔ اس میں زیادہ خرچ بھی نہیں آئے گا کیونکہ یہ ڈش بہت ہی ہلکی چاندی کی پالش کی ہوئی ہوگی اور اس کا کل وزن ایک ٹن سے زیادہ نہیں ہوگا اسے تہ حالت میں خلا میں پہنچایا جائے گا جہاں یہ ایک مخصوص میکنزم کے تحت کھل جائے گی۔ اسے ایک مصنوعی سیارے پر نصب کیا جائے گا اور برقی موٹروں کی مدد سے اسے کنٹرول کیا جائے گا۔

پانچ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا درجہ حرارت کسی چھوٹے موٹے سیارچے کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوگا لیکن یہ درجہ حرارت کسی بڑے سیارچے پر بے اثر ہوگا۔ دوسرے اس ہتھیار کی حد بہت کم ہوگی۔ شاید ایک کلومیٹر سے بھی کم اور اتنے کم فاصلے پر آجانے والے ایک برق رفتار شہابیے کو تباہ کرنے کے لیے بھلا کتنا وقت رہ جائے گا؟ یہی وجہ ہے کسی سیارچے کو تباہ کرنے کے لیے اس قسم کا ہتھیار کارآمد نہیں ہو سکتا۔ لیکن بڑی طاقتوں نے یقیناً اس کے دوسرے مفید استعمال تلاش کرلیے ہوں گے جیسے دشمن کے مصنوعی سیاروں کو تباہ کرنا یا زمین پر اس کے اڈوں اور شہروں پر اس ہتھیار سے حملہ کرنا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے پاس خلا سے زمین کی طرف آنے والے سیارچوں اور شہابیوں کو روکنے کا کوئی بھی قابلِ بھروسا سسٹم نہیں ہے۔ یعنی ہمارے پاس آپشن بہت کم ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے پاس سوائے قدرت پر بھروسا کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہی اب تک زمین کو خلا سے آنے والے خطرناک اجسام سے بچاتی رہی ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ زمین نظامِ شمسی میں سب سے محفوظ جگہ ہے۔ یہ سورج سے نہ تو مریخ جتنی دور ہے کہ اس کا درجہ حرارت صفر سے نیچے چلا جائے اور نہ زہرہ جتنی قریب ہے جس کا درجہ حرارت ایک اوون جتنا ہے۔ پھر یہ دونوں سیارے چھوٹے اور اس سے محفوظ فاصلے پر ہیں۔ یہ کسی طرح زمین کے لیے خطرہ نہیں بن سکتے ہیں بلکہ یہ اس طرح سے زمین کے محافظ ہیں کہ یہ خلا سے آنے والے بیشتر اجسام کو اپنی کششِ ثقل سے کھینچ لیتے ہیں یا ان کا راستہ بدل دیتے ہیں۔ مزید حفاظت کے لیے قدرت نے ہمیں چاند کی صورت میں ایک ڈھال فراہم کی ہوئی ہے۔ یہ بھی زمین کی حفاظت کرتا ہے۔ چاند کی داغ دار سطح بتاتی ہے کہ اس پر سیارچوں کی بہت زیادہ بارش ہوتی رہی ہے۔

پھر ہمارا کرہ ہوائی ہے جو چھوٹے موٹے اجسام کو زمین تک رسائی سے پہلے جلا کر خاکستر کر دیتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال ایسے جلے سیارچوں کی ایک ارب ٹن راکھ زمین پر گرتی ہے اور ہمیں اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔

...... پھر سب محافظوں سے بڑھ کر اللہ محافظ ہے۔ جس نے یہ زمین اور اس کے آس پاس کی ساری کائنات تخلیق کی۔ وہی ہمارا اصل خالق، مالک اور محافظ ہے۔

قابلِ تقلید

ابن کبیر

اس نے جرمنی میں جنم لیا، وہیں پلی بڑھی، تعلیم کے مدارج طے کیے مگر اسے مطلق علم نہ تھا کہ پاکستان نام کا بھی کوئی ملک ہے۔ لیکن جب یہاں آئی تو یہیں کی ہوکر رہ گئی۔ آدھی صدی سے وہ کراچی کے عوام کی خدمت کررہی ہے۔ اس کے جذبۂ خدمت کو دیکھتے ہوئے اسے کئی تمغے دیے گئے مگر وہ ہر قسم کے تمغوں اور اعزازات سے دور رہ کر صرف خدمتِ عوام کرنا چاہتی ہے۔

ایک قابلِ تقلید ہستی کی رودادِ حیات

پہلا منظر:

8 اکتوبر 2005ء کی سرد صبح زمین اچانک پوری شدت سے لرز اٹھی۔ ان خوفناک جھٹکوں کے نتیجے میں زندگی اتھل پتھل ہوگئی اور تباہی، بربادی کے سونامی نے جنم لیا!

اس روز پاکستان کی تاریخ کا بھیانک ترین زلزلہ آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور خیبر پختونخواہ میں آیا تھا جس کے نتیجے میں رنج والم کی ایک ایسی تصویر سامنے آئی، جس نے پتھر سے پتھر دل انسان کو بھی پگھلا دیا۔ اندازوں کے مطابق اس سانحے میں 80 ہزار سے زائد افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، جن میں اکثریت کے جسموں میں زلزلے والی صبح ہی موت نے اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔

اس زلزلے میں جو افراد بچ گئے، وہ خود کو کسی طور خوش قسمت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، کیونکہ انہیں زخمی حالت میں سخت سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے، افلاس اور دکھ کے سائے تلے موت سے زیادہ بدتر کیفیت کا سامنا تھا۔

جونہی اس زلزلے کی خبر پھیلی، حکومتی اہل کاروں کے ساتھ ساتھ ملکی و بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والی فلاحی تنظیمیں متاثرہ علاقوں میں پہنچنا شروع ہوگئیں۔ مذہبی وسیاسی جماعتیں بھی متحرک ہوگئیں۔

رضا کاروں نے زلزلے سے متاثر ہونے والوں کی حتیٰ الامکان مدد کی، اُن کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی، لیکن کرب کے جن زخموں نے اُن مظلوموں کی روح کو گھائل کیا تھا، انہیں بھرنا، ان کا علاج کرنا تقریباً ناممکن تھا، تاہم وہاں کوئی ایسا بھی تھا، جو امید کا مرہم لیے، محبت کی دوا لیے، یقین کی

طاقت لیے متاثرین کے درمیان موجود تھا۔
یہ سفید بالوں، گوری رنگت نیلی آنکھوں والی ایک ضعیف العمر عورت تھی، وہ چہرے مہرے سے غیر ملکی لگتی تھی۔ جس وقت آزاد کشمیر کی زمین پر زلزلے کا قہر نازل ہوا تھا، وہ اتفاقاً وہیں تھی اور اب اپنی ٹیم کے ساتھ امدادی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

وہ متاثرین سے ملتی، ان کی بپتا سنتی، جو اُس کے جھریوں زدہ لیکن روشن چہرے پر اداسی کی طرح پھیل جاتی لیکن وہ امید کا دامن تھامے رکھتی، ٹوٹی پھوٹی اردو میں متاثرین کو تسلی دیتی اور زیرِ لب دعائیں پڑھتی جاتی۔ اس نے جسے چھوا، اُسے زندہ ہونے کا احساس دلایا، جسے گلے لگایا اس کے زخموں کو بھر دیا، جس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، اُسے محبت کی گھنی چھاؤں میسر آئی۔

اُس نیک فطرت غیر ملکی عورت کو یوں بے لوث خدمت کرتا دیکھ کر وہاں موجود افراد کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اُنھوں نے اس کے عظیم جذبے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، جو لوگ اسے نہیں جانتے تھے وہ حیران تھے کہ ہڈیوں میں اترتی اس سردی میں ایک بوڑھی، غیر مقامی عورت یہاں کیا کر رہی ہے... اس عمر میں تو اسے اپنے بستر پر ہونا چاہیے تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ آرام کر سکے۔

تجسس کے زیرِ اثر پوچھنے والے نے پوچھا "یہ نیک فطرت عورت کون ہے؟"

"یہ..." جواب دینے والے نے چند ساعت توقف کیا، اُس ضعیف عورت کی جانب دیکھا جو پہاڑ سا حوصلہ رکھتی تھی "یہ... ڈاکٹر روتھ فاؤ ہیں!"

"ڈاکٹر روتھ فاؤ؟" سوال کرنے والے کے لہجے میں مزید سوالات پوشیدہ تھے، شاید اس نے یہ نام پہلی بار سنا تھا۔

"ہاں... یہ سماجی کارکن ہیں... جذام کے مریضوں کے لیے کام کرتی ہیں... اور..." جواب دینے والا اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک زخمی کراہا، بات ادھوری رہ گئی اور اُسے مریض کو طبّی امداد دینے کے لیے آگے بڑھنا پڑا۔

اب سوال کرنے والا آنکھوں میں احترام اور عقیدت لیے اُس نیک فطرت عورت کو تک رہا تھا!

دوسرا منظر:

یہ 2010ء کا ذکر ہے!

پنجاب، خیبر پختونخوا، سندھ اور بلوچستان میں مون سون کی بھاری بارشوں کے نتیجے میں دریائے سندھ میں سیلاب آیا جس سے پاکستان کا تقریباً سات لاکھ مربع کلومیٹر کا علاقہ زیرِ آب آ گیا اور دو کروڑ افراد براہِ راست متاثر ہوئے۔

ہزاروں ہلاکتیں ہوئی، مکانات ڈھے گئے، فصلیں تباہ ہو گئیں اور وبائی امراض پھوٹ پڑے۔

ایک بار پھر سرکاری و غیر سرکاری تنظیموں کے اہل کار سندھ کے زیرِ آب علاقوں میں، بے بسی کی تصویر بنے متاثرین سیلاب کی مدد کرنے میں مصروف تھے۔ اور ایک بار پھر وہاں بوڑھی عورت نظر آئی جو تباہ حال انسانوں کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہوئے یقین اور خلوص کے ساتھ اُن کی مدد کرنے میں مصروف تھی۔

تیسرا منظر:

وہی بوڑھی عورت کراچی کے مرکزی پُر ہجوم علاقے صدر میں واقع ایک عمارت کی کھڑکی میں کھڑی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں اداسی ہے۔

وہ خاصی مضمحل معلوم ہوتی ہے، چہرے پر تھکان کے بھی آثار ہیں، لیکن اس تھکن کا سبب وہ مقصد نہیں، جس کے لیے وہ گزشتہ پچاس برس سے مصروفِ عمل ہے، بلکہ بم دھماکوں سے مُجوی وہ خبریں ہیں، جو سیکڑوں انسانوں کی موت کی کہانی سناتی ہیں، جو گھروں کے اُجڑنے اور افراتفری کی داستان بیان کرتی ہیں۔

اس عورت نے اب سے پچاس سال قبل پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ اس نے خود کو جذام کے مریضوں فلاح و بہبود کے لیے تج دیا اور سماجی خدمت کے میدان میں وہ کارنامہ انجام دیا کہ سُننے والا انگشت بدنداں رہ جائے۔ وہ کون ہے اس بارے میں جاننے کے لیے اس کے ماضی میں جھانکتے ہیں۔

☆☆☆

9 ستمبر 1929ء کو جب سورج سنہری کرنیں بکھیرتا ہوا مشرقی جرمنی کے شہر لائپ زش (Leipzig) پر طلوع ہوا، تو ایک حسین صبح نے انگڑائی لی۔

شہر کے باسیوں نے مناجات کی ادائیگی کے بعد روایتی ناشتا کیا اور موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، گنگناتے ہوئے اپنے اپنے کاموں کے لیے گھر سے نکل گئے۔

گوکہ شہر کی سڑکوں پر چہل پہل تھی، گہما گہمی تھی، لیکن اگر منظر پر غائرانہ نظر ڈالی جائے تو ایک پُرسکون ترتیب نظر آتی تھی۔ گوکہ ملکی حالات بگڑ رہے تھے اور بُری خبروں کا انبار لگا تھا، لیکن اُس وقت ہر شخص خوش رہنے کے فن سے واقف تھا۔

اُس روز والتھر فاؤ بھی خوشی کا منتظر تھا۔ اس کی خوب صورت بیوی مارتھا حاملہ تھی اور آج بچے کی پیدائش متوقع تھی۔

متوسط طبقے میں آنکھ کھولنے والے والتھر کا تعلق ایک معروف پبلشنگ ہاؤس سے تھا۔ وہ ایک محنتی اور بااخلاق شخص تھا۔ لائپ زش کا شہر مشرقی جرمنی میں پبلشنگ کے کاروبار کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں ہر سال مارچ کے مہینے میں سالانہ کُتب میلہ منعقد ہوتا تھا جس کا پورے یورپ میں چرچا تھا۔ یہاں کی یونیورسٹی کا شمار خطے کی مستند ترین درس گاہوں میں کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی لائپ زش کی مرکزی لائبریری میں جرمن ادب کو ایک چھت تلے اکٹھا کر دیا گیا تھا، الغرض یہ شہر علم و ادب کا گہوارہ تھا۔

نوجوانی میں اپنے خوابوں کا تعاقب کرتے ہوئے والتھر نے بھی پبلشنگ کے شعبے کا چناؤ کیا۔ قسمت نے ساتھ دیا، اس نے جلد ہی خود کو منوا لیا اور ترقی کے مراحل طے کرتا رہا۔ آنے والے چند برسوں میں اپنے دوستانہ رویّے اور مثبت سوچ کے سہارے وہ کاروباری دنیا کی جانی مانی شخصیت بن گیا۔

خدا اس پر واقعی مہربان تھا کہ اُسے مارتھا جیسی حسین بیوی ملی جس نے ہر موڑ پر اس کا ساتھ دیا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں جن سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ تینوں بیٹیوں کو ماں کا حسن اور باپ کی وجاہت وراثت میں ملی تھی۔

اس وقت وہ خوشخبری کے انتظار میں ٹہل رہا تھا......

بےشک وہ مضطرب تھا، گوکہ تین بار پہلے بھی اس تجربے سے گزر چکا تھا لیکن بچے کی پیدائش ایک حساس معاملہ ہوتا ہے، جو ماں باپ کو بیک وقت خوشی اور پریشانی سے بھر دیتا ہے۔

انتظار ختم ہوا۔ نئی روح دنیا میں آ چکی تھی۔

والتھر کی گود میں ایک بچی تھی، ایک اور بیٹی!

شاید دل کے کسی گوشے میں اس شکایت نے سر اُٹھایا ہو کہ خدا نے اُس کی دعا قبول نہیں کی لیکن جونہی اُس نے اپنی بیٹی کی نیلی آنکھوں میں جھانکا جہاں معصومیت کا حسن تیر رہا تھا، اندرون میں جاری کشمکش ختم ہو گئی اور وہ مسرت سے بھر اُٹھا۔

چند ساعت بعد وہ اپنی حسین بیوی کے سامنے بیٹھا تھا جس کے چہرے سے نقاہت عیاں تھی لیکن وہ مسکرا رہی تھی۔

والتھر اور مارتھا نے ایک دوسرا کا ہاتھ تھام رکھا تھا، دل ہی دل میں وہ اس بچی کے لیے دعائیں کر رہے تھے، وہ خواہش مند تھے کہ خدا اسے اچھا مستقبل دے اور وہ خاندان کا نام روشن کرے... تاہم اُنھیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ قدرت نے اس بچی کو ایک خاص کام کے لیے چُن لیا ہے!

اورنگزیب عالمگیر اپنے بیٹے اعظم کو لکھتا ہے

"فرزند عالی جاہ! یہ واقعہ ایک معتبر شیخ کی زبانی ہم تک پہنچا ہے جسے ہم نے قلمبند کیا ہے تاکہ آپ بھی پڑھ لیں۔

ایک روز اعلیٰ حضرت (یعنی شاہجہاں) نے علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں کو خلوت خاص میں طلب کیا اور فرمایا کہ ملک اور مال کا بندوبست عقل اور انصاف پر مبنی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی "بے جوہر" بادشاہ سلطنت کا مالک ہو جائے۔ نااہل کو وزیر امیر اور مصاحب بنالے تو شہروں کا بندوبست بالکل خراب ہو جائے۔ رعایا پریشان ہوگی۔ پیداوار نابود ہو جائے گی۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آئے گی۔ تم اللہ کے بندوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے درخواست کرو کہ وہ پانچوں نمازوں کے بعد دعا کیا کریں کہ اس سلطنت کی رونق کم نہ ہو۔ کوئی شخص بُرا کلمہ زبان پر نہ لائے اور ہمارے بعد ہمارا جو بیٹا بادشاہ ہو، اسے خدا نیک توفیق دے۔

اقتباس: عالمگیری از فتح محمد
مرسلہ: توفیق اسلم، لاہور

اگر اُس وقت والتھر کو اندازہ ہوتا کہ اُس کی بیٹی کے کارنامے مستقبل میں اساطیری داستانوں کی شکل اختیار کر لیں گے، اُسے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے گیت گائے جائیں گے، دنیا بھر میں اُس کی خدمات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے گا اور وہ "فاؤ" خاندان کے نام کو امر کر دے گی، تو وہ ضرور فرحت و انبساطی جذبات کی رو میں سجدے میں گر جاتا۔

بچی کا نام روتھ کیتھرین مارتھا فاؤ رکھا گیا!

☆☆☆

وہ سیاسی طور پر انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ ہٹلر جرمن قوم کی عالمگیر حکمرانی کا خواب لیے نازی پارٹی تشکیل دے چکا تھا جس کے سخت گیر رویّے نے عوام میں سراسیمگی پھیلا دی تھی۔

جلد ہی ہٹلر نے جرمنی میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی اور اُس کی پالیسیوں کی وجہ سے ریاست انتہا پسندانہ سیاسی سوچ اور بے روزگاری کی لپیٹ میں آ گئی۔ لیکن بے چینی فقط جرمن قوم تک محدود نہیں تھی، سچ تو یہ ہے کہ اُس کے سخت گیر نظریات اور اقدامات نے پوری دنیا کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا اور خونی تصادم قریب آتا جا رہا تھا!

روتھ کی پیدائش کے ٹھیک سات ہفتوں بعد دنیا بدترین مالیاتی بحران کی زد میں آگئی جسے آج بیسویں صدی کا سب سے بڑا مالیاتی بحران تصور کیا جاتا ہے۔ 29 اکتوبر 1929ء کو نیویارک اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ کریش ہوگئی۔ اس واقعے نے پوری دنیا کو بُری طرح متاثر کیا۔ اس کا اثر لائپ زش پر بھی پڑا۔

شہر کے دیگر باسیوں کی طرح والتھر بھی مشکلات میں گھر گیا۔ تاہم ننھی روتھ جو ایک حسین اور پُرسکون ماحول میں پروان چڑھ رہی تھی، اس بحران اور اس کے بداثرات سے کلی طور پر لاعلم رہی۔ اِس ضمن میں اُس کے ماں باپ کا کردار قابلِ ستائش تھا جنھوں نے اپنی اولاد کو تنگدستی کے باوجود معاشی مسائل کے سائے سے محفوظ رکھا۔

روتھ کا ابتدائی بچپن حسین یادوں کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ باغات میں گھومتی، سیب کے درختوں پر چڑھتی۔ معصوم شرارتیں کرتی۔

دیگر ماؤں کی طرح مارتھا بھی اس بابت فکر مند تھی کہ اس کی بیٹیاں مٹی میں کھیلنے کے دوران اپنا حلیہ بگاڑ لیتی ہیں لیکن وہ کبھی انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ نیا سیکھنے کے دوران انسان لڑکھڑاتا ہے، گرتا ہے، اسے چوٹ بھی لگتی ہے، پر یہی تجربہ آنے..... والی زندگی میں کام آتا ہے۔

مارتھا کو اپنے بچپن کا وہ واقعہ یاد تھا جس سے حاصل ہونے والا اَن مول سبق آج بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اس وقت وہ خاصی کم عمر تھی۔ ایک روز باغ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ ایک گڑھے میں گر گئی جہاں تاریکی اور خوف کا راج تھا۔ وہ پَل کم سن مارتھا کے لیے انتہائی اذیت ناک تھے۔ وہ لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا چاہتی تھی لیکن خوف کے زیرِ اثر اُس کی آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔

جلد ہی اس کے والد وہاں پہنچ گئے جنھوں نے اسے گڑھے سے باہر نکلا۔ اس وقت وہ خاصی ڈری ہوئی تھی۔ تاہم اس کے شفیق والد نے اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھرتے ہوئے کہا "تمھیں ڈرنا نہیں چاہیے مارتھا، ہم اِسی لیے تو گرتے ہیں، تاکہ پھر کھڑے ہوسکیں!"

جب مارتھا باورچی خانے کی کھڑکی سے اپنی بیٹیوں کو باغ میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے، کھیلتے کودتے دیکھتی، تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

والتھر نے گھر میں چھوٹا سا سوئمنگ پول بنا رکھا تھا جس میں اُتر کر ننھی روتھ مسرت سے بھر جاتی۔ اس کے لیے چیریوں اور دیگر پھلوں سے کھٹی میٹھی جام کی تیاری بھی انوکھا عمل تھا، جسے وہ بڑی یکسوئی سے دیکھا کرتی!

☆☆☆

روتھ کو پیار ہوگیا!

لیکن اُسے کسی آدمی سے پیار نہیں ہوا تھا، ایسے معاملات کے لیے وہ ابھی بہت کم عمر تھی، دراصل اسے جانوروں سے محبت ہوگئی تھی۔

ایک روز اُس نے پڑوس میں رہنے والی ایک لڑکی ارسلا کو سبزہ زار میں ننھے خرگوشوں کو روٹی کھلاتے دیکھا تو سحر زدہ رہ گئی۔ یہ منظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اُس کے شعور میں داخل ہوا اور نہ مٹنے والے نقش چھوڑ گیا۔

ارسلا نے لمبے کانوں اور چمکیلی آنکھوں والے خرگوشوں سے دوستی کرلی تھی جو باڑ پار کرکے اس کے باغ میں آجاتے جہاں وہ اُن کی خاطر مدارت کرتی۔ یہ جانوروں سے اس کی محبت کی ابتدا تھی۔ وہ اکثر اپنی سہیلی کے گھر چلی جاتی اور اِس سحر انگیز عمل سے لطف اندوز ہوتی۔ روتھ کے دل میں بھی اِس عمل کی تقلید کرنے کی خواہش جاگی اور پھر جانور پالنے اور ان کی دیکھ ریکھ کا شوق ہر سرگرمی پر حاوی آگیا۔

مارتھا جب بھی اپنی بیٹی کو ایسا کرتے دیکھتی تو ممتا سے بھر جاتی۔ یہ عمل کبھی کبھار والتھر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دیتا جسے معاشی مسائل نے پریشان کر رکھا تھا۔

قدرت روتھ کو مستقبل کے لیے تیار کرنا چاہتی تھی کیونکہ آنے والے وقت میں اُسے سانحات کا مقابلہ کرتے ہوئے مشکلات میں گھرے انسانوں کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا، ان کی دادرسی کرنی تھی، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود بھی کرب کے عمل سے گزرے، صدمے برداشت کرے۔

ایک اداس دن، اس کے پیارے طوطے نے اچانک پر پھیلا کر اُڑان بھری اور کھڑکی سے باہر نکل کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگیا اور اپنے پیچھے روتی ہوئی، اُسے پکارتی ہوئی روتھ کو چھوڑ گیا۔ اپنے پیارے طوطے کی جدائی اُس کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ وہ گھنٹوں کھلی کھڑکی میں بیٹھی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی، لیکن وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ فکرمند تھی کہ اب اُس کا طوطا رات کے وقت کہاں سوئے گا؟ کون اُسے وقت پر چوری کھلائے گا؟ پر دھیرے دھیرے زخم مندمل ہوگیا۔ اس تجربے سے گزرنے کے بعد اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ ہر جان دار آزادی کا خواہاں ہوتا ہے، اُسے پُرآسائش زندگی کے بدلے قید میں نہیں رکھا جاسکتا، ایک دن وہ پر پھیلا کر اُڑان بھرے گا اور آسمان کی وسعتوں میں گم ہوجائے گا۔

اُس وقت اُسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی ایک روز، اپنے طوطا کے مانند نئی زمینوں کی جانب پرواز کرجائے گی۔

☆☆☆

"بے روزگاری اور سیاسی انتشار بڑھتا جارہا ہے۔" ایک روز والتھر نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ہٹلر کی قوت بڑھ رہی ہے۔" مارتھا کی آنکھوں میں اندیشے تیر رہے تھے۔ "کچھ بُرا ہونے والا ہے!"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ شہر بھر میں ہٹلر کی تصاویر اور پوسٹرز آویزاں کردیے گئے تھے۔ والتھر کو یہ شخص قطعی پسند نہیں تھا، بالکل ویسے ہی جیسے اس کی بیٹی روتھ کو ریاضی کا مضمون ناپسند تھا۔

1933ء تک نازی پارٹی جرمنی میں قوت حاصل کرچکی تھی، ہٹلر چانسلر کے عہدے پر فائز ہوگیا تھا اور خود کو آئین سے ماوراء تصور کرنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے انتہاپسندانہ نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے ظالمانہ ہتھکنڈے اپنانے کے لیے تیار تھا۔

ہٹلر کی ہدایت پر حکومت کے دشمنوں کی فہرست مرتب کی گئی جس میں یہودی، کمیونسٹ اور مخالف سیاسی راہنما سرِ فہرست تھے۔ کچھ ہی عرصے میں بزورِ طاقت ہٹلر کو جرمن قوم اور جرمن ریاست کے باپ کے درجے پر فائز کردیا گیا۔

اب جرمنی میں خوف رقص کرنے لگا۔ ننھی روتھ اپنی بالکونی میں بیٹھ کر آنکھوں میں تحیر لیے خاکی یونیفارم میں ملبوس ان سخت گیر سپاہیوں کو سڑکوں پر مارچ کرتا دیکھتی جن کے بازوؤں پر نازی پارٹی کا مخصوص نشان ہوتا اور ہٹلر سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔

اسکولوں میں ہٹلر کے نظریات کا پرچار ہونے لگا۔ بچوں کو یہ سکھایا جاتا کہ اپنی قومی شناخت پر فخر کریں اور دنیا پر چھا جانے کے لیے خود کو مضبوط بنائیں۔

دوسری جانب نوجوان نسل کی جانب سے بغاوت کے خطرے کو ٹالنے کے لیے حکومت نے کئی سخت اقدامات کیے۔ طلبا سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی۔ اور پھر نوجوانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور اختلاف کو کچلنے کی غرض سے "ہٹلر یوتھ موومنٹ" تشکیل دی گئی۔ دیگر شریف النفس پُرامن شہریوں کی طرح والتھر بھی مجبور تھا کہ اپنی بیٹیوں کا نام اُس تحریک کے رضاکاروں میں شامل کروائے۔

اب ننھے بچے سڑکوں پر ہٹلر کے نام کے گیت گاتے ہوئے مارچ کرتے، اس بات سے یکسر لاعلم کہ جنگ اُن کی جانب بڑھ رہی ہے۔

☆☆☆

جس زمانے میں ادب کا موضوع روتھ کی دلچسپی کا محور بنا ہوا تھا، دنیا کے دیگر ممالک کی طرح جرمنی میں بھی معاشی بہتری کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ جابر حکومت نے ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کی کوششوں کا آغاز کردیا تھا۔ کاروباری استحکام کے لیے بھی اقدامات کیے گئے لیکن جبر کا ماحول عوام کے لیے اذیت ناک تھا، پھر کئی پابندیاں بھی تھیں جس کی وجہ سے عوام کو اپنے ہر سانس کا حساب دینا پڑتا۔

اسے "بوٹنی" کا مضمون بھی بہت پسند تھا۔ اس کا زیادہ وقت باغات میں گزرتا جہاں وہ بیج بوتی، پودوں کی دیکھ ریکھ کرتی، انہیں پانی دیتی اور زندگی کو سبزے کی صورت پھلتا پھولتا دیکھتی۔ اُسے اپنی موسیقی کی ٹیچر بھی بہت پسند تھی جس کی آواز انتہائی سُریلی تھی۔

روتھ اپنے اساتذہ کی پسندیدہ طالبہ تھی۔ سب اس کا بہت خیال رکھتے، اس کی کاوشوں کو سراہتے، تاہم وہ خوش ہونے کے بجائے اکثر پریشان ہوجاتی۔

"کیا یہ دُرست ہے کہ مجھے اتنی توجہ دی جائے اور باقی طلبا و طالبات کو نظرانداز کردیا جائے؟" وہ اکثر خود سے سوال کرتی۔

اُس وقت تک یہودیوں کے خلاف نازی پارٹی کی ظالمانہ کارروائیوں کا آغاز ہوگیا تھا۔ لوٹ، قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور ملک کے کونے کونے میں ایسے نازی حراستی کیمپس قائم کردیے گئے تھے جہاں حکومت کے ناپسندیدہ افراد کو رکھا جاتا، اُن پر مظالم کے پہاڑ توڑے جاتے۔

روتھ کو شاید کبھی اس کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن جب اُس کی سنہری بالوں اور لال گالوں والی ایک کلاس فیلو کیٹی اچانک غائب ہوگئی تو وہ چونک اُٹھی۔ وہ کئی روز تک اپنی پیاری دوست کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔ وہ اکثر اپنے اساتذہ اور والدین سے پوچھتی "کیٹی کہاں چلی گئی؟" لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ اِس واقعے نے اسے اداس کردیا۔

ایک بار جب اُس کی بڑی بہن والتوریڈ نے ظہرانے کے دوران ایک ایسے حراستی کیمپ کی بابت بات کرنے کی کوشش کی جو لائپ زش کے نزدیک قائم کیا تھا، روتھ نے پہلی بار اپنی والدہ کی آنکھوں میں غصہ دیکھا۔

"خاموش ہوجاؤ، میں نہیں چاہتی کہ تم اس بارے میں بات کرو!" مارتھا نے اپنی بڑی بیٹی کو ڈانٹا۔

وہ سمجھ گئی کہ یہ انتہائی حساس معاملہ ہے۔ حالات کے تجزیے نے اسے یہ بھی باور کرادیا کہ اب اُس کی دوست کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ البتہ وہ ہر سال اس کی سالگرہ پر شمعیں ضرور روشن کرتی۔

اس نے نازی حکومت کے قائم کردہ کیمپس کی کہانیاں بھی سنیں جہاں سیکڑوں افراد کو قتل کیا گیا۔ اُن تلخ کہانیوں کے سائے تلے جن کی وجہ سے وہ کبھی کبھار بے خوابی کا شکار ہو جاتی، روتھ پروان چڑھتی رہی۔

☆☆☆

جانوروں سے محبت رکھنے والی پُر اعتماد روتھ کو جنگ کے عفریت نے خوشیوں سے بغل گیر ہونے کا زیادہ موقع فراہم نہیں کیا۔ جب وہ اپنی دسویں سالگرہ منانے کے منصوبے ترتیب دے رہی تھی، جنگِ عظیم دوئم انسانیت کو نگلنے کی تیاری مکمل کر چکی تھی۔ ستمبر 1939ء میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور ایک ایسی جنگ کا آغاز ہو گیا جو بہت جلد پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔

پولینڈ پر حملے کے دو روز بعد برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے اس انتہائی اقدامات کو بنیاد بناتے ہوئے اُس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

جنگ پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ دنیا کی بڑی قوتیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ ایک طرف جرمنی، جاپان، اٹلی، ہنگری، رومانیہ، بلغاریا اور تھائی لینڈ تھے۔ دوسری جانب روس، امریکا، برطانیہ، چین اور فرانس جیسی قوتیں کھڑی تھیں۔ الغرض ہٹلر کی مطلق العنان سوچ نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

گھمسان کا رن پڑا جس کا بھیانک نتیجہ انسانی اموات کے صورت سامنے آیا۔ جس طرح نازی فوج نے دیگر ممالک کے بے گناہ شہریوں کا قتلِ عام کیا اسی طرح اتحادی فوج نے بھی جرمنی کے شہری علاقوں کو نشانہ بنایا۔

4 دسمبر 1943ء کو اتحادی فوج نے شہری آبادیوں پر فضائی حملہ کر دیا۔

اُس تاریک سرد رات کو لائپ زش میں کوئی سو نہیں سکا کیونکہ فضا میں جنگی جہازوں کی گرج منجمد ہو گئی تھی جس نے شہریوں کو خوف کی کھائی میں دھکیل دیا۔ اُس رات شہر پر بھاری بمباری ہوئی۔

قریبی مکانات سے بلند ہوتی چیخیں اور دھماکوں کی کریہہ آوازیں روتھ کی سماعتوں کو زخمی کر رہی تھیں۔

''کیا یہ میری زندگی کا آخری دن ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

اس کا خاندان گھر میں بنے تہ خانے میں محصور تھا۔ روتھ اپنی ماں کی آغوش میں تھی جو زیرِ لب دعائیں پڑھ رہی تھی، جبکہ اُس کی چھوٹی بہن باربرا کو باپ نے گود میں لے رکھا تھا جو خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن اضطراب اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت کے معاملے میں خود کو بے بس پاتا تھا۔ اس وقت روتھ کی دو بڑی بہنیں ملازمت کے سلسلے میں شہر سے دُور تھیں اور انہیں اس افتاد کا قطعی علم نہیں تھا۔

اس حملے میں کئی معصوم شہری اپنی زندگی کی بازی ہار گئے۔ روتھ کا خاندان معجزانہ طور پر محفوظ رہا۔ البتہ اس کے گھر کو شدید نقصان پہنچا۔ چھت اُڑ گئی تھی اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

صبح جب سورج لائپ زش پر طلوع ہوا، وہاں زندگی معطل تھی۔ کئی گھر تباہ ہو چکے تھے، جگہ جگہ سے دھواں اُٹھ رہا تھا، لاشیں بکھری پڑی تھیں، ہر کونے سے گریہ کرنے والوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بجلی کی فراہمی کا نظام جواب دے چکا تھا، یہی معاملہ نکاسی و فراہمی آب کے نظام کا بھی تھا۔

والتھر نے فیصلہ کیا کہ بیٹیوں کو گاؤں میں مقیم دادی کے گھر چھوڑ دینا چاہیے، جو نسبتاً محفوظ علاقے میں تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو ساتھ لیا اور گھر سے نکل گیا۔ وہ تباہ حال سڑکوں کو عبور کرتا ہوا۔

رات روتھ نے موت کو انتہائی قریب سے دیکھا تھا اور صبح، سورج کی روشنی میں وہ زندگی کو سسکتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ بڑی اذیت اُٹھا کر بالآخر شام ڈھلے تھکا ہارا والتھر اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ اپنی بیٹیوں کو دادی کی تحویل میں چھوڑ کر ماں تھا اور والتھر واپس لائپ زش چلے گئے کہ ان پر ایک گھر کی ذمے داری بھی تھی۔

روتھ ایک برس اپنی دادی کے پاس رہی، اس عرصے میں لائپ زش پر ہونے والے فضائی حملوں کی خبروں نے اُسے مضطرب رکھا۔ ہر خبر یہ اندیشہ ساتھ لاتی کہ شاید وہ اپنے ماں باپ کو کھو چکی ہے۔ وہ وقت اس کے لیے انتہائی اذیت ناک تھا، لیکن وہ بے بس تھی۔ ایک برس بعد وہ دوبارہ اپنے والدین سے آن ملی۔

☆☆☆

8 مئی 1945ء کو جب جرمنی کی فوج نے ہتھیار ڈالے، روتھ سولہ برس کی ہو چکی تھیں۔ ظالمانہ آمریت سے آزادی حاصل کرنے والے اُس کے ملک پر اب اتحادی فوج کا قبضہ تھا۔ گو کہ ہٹلر کے دورِ حکومت میں بھی جبر کا ماحول تھا لیکن اب باغات میں، جہاں کبھی روتھ تتلیوں کا تعاقب کیا کرتی تھی، اس سڑکوں پر جس سے گزر کر وہ اسکول جاتی تھی، ان سبزہ زاروں میں جہاں وہ خرگوشوں کو دوڑتا دیکھتی تھی... الغرض ہر طرف گہری یاسیت تھی۔

اب اُنہیں اپنے دشمنوں کو اپنی سانسوں کا حساب دینا تھا اور یہ صورتِ حال اپنوں کی مطلق العنان حکومت میں گھٹ گھٹ کر جینے سے زیادہ کٹھن تھی۔

وہ گھنٹوں اداس بیٹھی جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کی بابت سوچتی رہتی۔ اسے زندگی بے معنی لگنے لگی تھی، تاہم وہ نہیں جانتی تھی کہ قدرت نے اُسے عظیم خدمت کے لیے چُن رکھا ہے، جسے انجام دینے کے لیے اُسے ایک ایسی ریاست کا رُخ کرنا تھا، جو ٹھیک دو برس بعد دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی تھی!

☆☆☆

''ابتداً ہم نے اپنی شہر کی سڑکوں پر امریکی فوج کے دستوں کو گشت کرتے دیکھا جن کا رویّہ خاصا دوستانہ تھا لیکن جلد ہی اُن کی جگہ سخت گیر روسی فوجیوں نے لے لی جو ہر جرمن کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں۔''

یہ جملے اپنی ڈائری میں لکھنے کے بعد روتھ کھلی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی، جہاں یاسیت گہری ہو رہی تھی۔ اب اس کی حسین یادوں پر دشمن قابض تھے۔

1946ء کے موسم سرما تک ملک کے دیگر شہروں کی طرح لائپ زش بھی غذائی بحران کی لپیٹ میں آ گیا۔ ان ہی سخت دنوں میں والتھر کے گھر بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ وہ خوش تھا کہ بالآخر خدا نے اس کی دعا سن لی لیکن وہ اپنے بیٹے کے مستقبل کی بابت زیادہ پُر امید نہیں تھا۔ غذائی قلت کے اُس زمانے میں اس کے خاندان کو تھوڑے بہت آلو اور چقندر ہی مل پاتے جنہیں کبھی ابال کر اور کبھی تل کر وہ پیٹ کی آگ بجھاتے۔

جو غذا اُن کے حصے میں آتی تھی، وہ ہر لحاظ سے ناکافی تھی، جس کی وجہ سے اکثر اُنہیں فاقے کرنے پڑتے۔ ماں تھا ان دنوں سخت بیمار تھی، اُس کے لیے اپنے نوزائیدہ بچے کو دودھ پلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ روتھ اکثر غذا اور کوئلوں کی تلاش میں گھر سے نکل جاتی اور اکثر ناکام لوٹتی۔

دوسری جنگ کا اختتام دراصل سوویت یونین اور امریکا کے درمیان سرد جنگ کا آغاز تھا، جس نے ایک بار پھر دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ دونوں سپر پاورز کی اس جنگ کا پہلا اثر جرمنی ہی پر پڑا اور یہ ریاست دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔

سرحد پر آہنی پردہ تان دیا۔ روس کے زیرِ تسلط مشرقی جرمنی میں سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر سخت قوانین کا اطلاق کیا گیا۔ معاشی مسائل عروج پر تھے، غذائی اجناس کا شدید بحران تھا، جو موت کی صورت بدحال انسانوں کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس بحران نے روتھ کا اکلوتا بھائی اُس سے چھین لیا۔ اس سانحے نے پورے خاندان کو کرب کی سیاہی میں دھکیل دیا، جہاں اداسی ہی اداسی تھی!

☆☆☆

''اس اذیت سے فرار حاصل کرنے کے لیے مجھے خود کو کسی عظیم مقصد کے لیے وقف کرنا ہوگا!'' ایک روز روتھ نے سوچا اور گھر سے نکل گئی۔ اُس نے سماجی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور زخمیوں کی تیمارداری میں وقت صَرف کرنے لگی۔

''نیشنلائزیشن'' کا وار سہنے کے بعد اس کے باپ والتھر فاؤ کو اب کمیونسٹ نظریات کا سامنا تھا جنہیں مطلق العنانیت کی جھلک نے ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔

والتھر کے لیے دوسرا بڑا صدمہ یہ تھا کہ اس کی بیٹی روتھ کے میڈیکل کالج میں داخلے کی درخواست مسترد کر دی گئی ہے۔

والتھر کی ابتدا ہی سے خواہش تھی کہ روتھ طب کا پیشہ اختیار کرے اور انسانیت کی خدمت کرے۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی لیکن نئی انتظامیہ کے سامنے جس کے اقدامات کئی معنوں میں ہٹلر کے نظریات کی توسیع ہی تھے، سوال اُٹھانا، احتجاج کرنا ممکن نہیں تھا۔

دل برداشتہ ہو کر والتھر نے مغربی جرمنی کا رُخ کرنے کا مشکل فیصلہ کیا جہاں امریکی تعاون اور برطانوی معاونت کے طفیل معاشی حالات خاصے سنبھل چکے تھے۔

بہ حفاظت ''ویس بیڈن'' پہنچ کر خوش قسمت والتھر کی اُن کاروباری افراد سے ملاقات ہو گئی جو اُسے جانتے تھے اور اس کی خدمات سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ اُس نے پھر پبلشنگ کا کاروبار اختیار کیا۔ دھیرے دھیرے حالات بہتر ہوتے گئے، جن کے پیشِ نظر اُس نے اپنی پیاری بیٹی کو مغربی جرمنی بلانے کا فیصلہ کر لیا۔

سرحد پر روسی فوج کا کڑا پہرا تھا جسے عبور کرنا، کسی دشوار گزار گھاٹی کو پار کرنے سے زیادہ مشکل تھا، تاہم روتھ اب جبر کی فضا میں سانس لینے کی مزید متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ باپ کا خط موصول ہوتے ہی وہ مختصر سے سامان کے ساتھ ذہن میں ہزاروں خدشات لیے ٹرین میں سوار ہو گئی، جو سرحد کی جانب بڑھ رہی تھی۔

روتھ کے مختصر سے سامان میں ایک ٹیڈی بیر بھی تھا جو اُس کے دل کے بہت قریب تھا۔ جُوں جُوں وہ اُس آہنی دیوار کی جانب بڑھتی جا رہی تھی، جسے دنیا آنے والے برسوں میں ''دیوار برلن'' کے نام سے پکارنے والی تھی، اس کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔

پیدل جنگلات، کھیت اور دشوار گزار راستے عبور کرتے

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in.
just visit
www.paksociety.com for complaints and issues send mail at
admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

ہوئے جب وہ سرحد پر پہنچی، دو ہتھیار بند فوجیوں نے اُسے روک لیا، جن میں سے ایک روسی تھا، دوسرا جرمن!

روسی فوجی بے ضرر لڑکی کے خلاف انتہائی اور فوری کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ روتھ کو موت سامنے نظر آرہی تھی۔ اور یہیں قدرت نے مداخلت کی!

جرمن فوجی نے ''مجرم'' کے خلاف کارروائی کرنے کی ذمّے داری اپنے کاندھوں پر لیتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ چلنے کی دُرشت ہدایت کی۔ اب وہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنے ہم وطن کے قدموں کا تعاقب کر رہی تھی۔ پشت پر اُسے روسی فوجی کی انگارے اُچھالتی آنکھوں کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔

اور تھوڑی دُور جانے کے بعد جرمن فوجی نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی ''مغرب اُس طرف ہے!''

روتھ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا ''کیا خدا نے میری مدد کے لیے فرشتہ بھیجا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

آہنی سرحد عبور کرنے کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا، اُس کا محسن ہونٹوں پر مسکان لیے دوستانہ انداز میں الوادع کہہ رہا تھا۔

مغربی جرمنی کے علاقے ''گوسلر'' پہنچ کر یہ تھکا دینے والا سفر تمام ہوا۔ چند دنوں بعد روتھ کی اپنے والد سے ملاقات ہوئی، دونوں مسرور تھے کہ اب باپ بیٹی کو سانس لینے کو آزاد فضا میسر تھی۔

☆☆☆

23 مارچ 1949ء کو ''فیڈرل ری پبلک آف جرمنی'' کے لیے بنیادی قانون پاس ہوا جس میں انسانی حقوق کا احترام کرتے ہوئے ملک کے لیے آئین سازی کی کوششوں کا آغاز کر دیا گیا۔

قانون کے پاس ہوتے ہی مغربی جرمنی کے باسیوں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ خوش تھے کہ اب انہیں بھی دنیا کے دیگر تہذیب یافتہ اقوام کے مانند انسانی حقوق میسر ہیں۔ اس روز فیڈرل ری پبلک آف جرمنی کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔

اُسی برس 7 اکتوبر کو مشرقی جرمنی ''جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک'' کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا اور تقسیم واضح ہوگئی۔

بے شک وہ روتھ کے لیے ایک دکھ بھرا لمحہ تھا، کیونکہ اب وہ کبھی اپنی دادی اور قریبی رشتے داروں سے نہیں مل سکتی تھی جو سرحد کے دوسری طرف آباد تھے۔ جرمنی کے دیگر باسیوں کی طرح وہ بھی اس تقسیم کو غیر منصفانہ سمجھتی تھی، لیکن اس وقت ماسوائے صبر کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

5 ستمبر 1949ء کے روز Konrad Adenauer کو فیڈرل ری پبلک آف جرمنی کے فیڈرل چانسلر کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا جس کے بعد معاشی ترقی کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا۔

کچھ عرصے بعد باقی خاندان بھی ''ویس بیڈن'' پہنچ گیا، اپنے ماں اور بہنوں کے گلے لگتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ خوشی کے آنسو تھے، دوسری طرف اس کی ماں کی آنکھیں بھی پُرنم تھیں۔

''اب ہمیں دکھوں کو بھول کر آگے بڑھنا ہوگا!'' والتھر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے خاندان کو بانہوں میں بھر لیا۔

گو کہ اب والتھر کا خاندان نسبتاً آزاد فضا میں سانس لے سکتا تھا، مسائل میں واضح کمی واقع ہوئی تھی، تاہم معاشی مشکلات ہنوز تعاقب میں تھیں۔ والتھر کو روتھ سے بہت امیدیں تھیں، وہ جانتا تھا کہ اس کی بیٹی انتہائی محنتی اور جفاکش ہے۔ ایک روز اس نے کہا ''تم بہت بہادر اور قابل ہوں، میری خواہش ہے کہ تم پبلشنگ کے کاروبار میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

روتھ نے ہامی بھر لی۔ کچھ عرصے اِس حوالے سے وہ مصروف بھی رہی، لیکن مثبت نتائج سامنے نہیں آئے۔

دراصل کاروبار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کا مزاج یک سر مختلف تھا۔ وہ شاذ شاذ ہی "Beyer" نامی اس میگزین کی جھلک دیکھتی جس کے تقسیم کار کی حیثیت سے اس کا باپ دن رات محنت کر رہا تھا۔

مشرقی جرمنی میں بدحال، جنگ کے مارے، ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے تجربے نے اسے ایک بار پھر طب کے مضمون کی جانب متوجہ کیا۔ خوش قسمتی سے اسے ''مائنز'' یونیورسٹی کی فیکلٹی آف میڈیسن میں داخلہ مل گیا۔

''مائنز'' شہر یورپ کے قدیم ثقافتی ورثے کا امین تھا۔ اسے یوں بھی خصوصی اہمیت حاصل تھی کہ پرنٹنگ پریس کے کام کو دنیا میں متعارف کروانے والے جوہانس گٹن برگ نے پندرہویں صدی میں اِسی شہر میں آنکھ کھولی تھی، یہیں اُس کی ملاقات ہرمین سے ہوئی!

ہرمین ایک خوبرو نوجوان تھا۔ روتھ اور اس کی پہلی ملاقات طلبا و طالبات کے لیے منعقد کی جانے والی رقص کی محفل میں ہوئی۔ ہرمین غضب کا رقاص تھا۔ اس رات روتھ اُس کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے، موسیقی کے سُروں پر رقصاں

رہی۔

جلد ہی اُن کے تعلق میں اُنسیت در آئی، جس کی تازہ خوشبو پوری یونیورسٹی میں پھیل گئی۔ صبح کے وقت وہ ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے، اپنی سائیکلوں پر سبزہ زار کا چکر لگاتے یا گھنے درختوں کی چھاؤں میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے رہتے۔

ہرمین سے ملنے کے بعد پہلی بار روتھ کو احساس ہوا کہ کسی اور کے لیے جینا، دوسروں سے محبت کرنا کتنا پُرقوت عمل ہے۔ اس سے قبل وہ، دیگر انسانوں کے مانند فقط اپنے بارے میں سوچا کرتی تھی لیکن ہرمین کے ساتھ نے اسے دیگر انسانوں کے لیے اپنی خوشیوں کی قربانی دینے کے سحر انگیز عمل سے متعارف کروایا۔

وہ محبت کے سائے تلے اپنا سفر طے کر رہی تھی، اس بات سے لاعلم کہ اس کی بے چین روح کو جلد نئے راستوں سے متعارف ہونا ہے!

☆☆☆

ایک سنہری صبح روتھ نے فرینکفرٹ میں ہونے والی طلبا و طالبات کی ایک تقریب میں شرکت کی جس میں ایک ڈچ خاتون کو خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

اس باہمت خاتون نے نازی حکومت کے قائم کردہ تاریک، ہولناک حراستی کیمپس میں بے شمار مظالم برداشت کیے تھے لیکن اُس لمحے جب خدا پر کامل یقین رکھنے والی وہ مسیحی خاتون طلبا و طالبات کے سامنے موجود تھی، اُس کی خواہش فقط محبت اور امن کا پیغام دینا تھا۔

روتھ کے لیے اس عورت سے ملاقات کا تجربہ ناقابلِ یقین رہا۔ اس کی تکالیف کے سامنے اسے اپنی مشکلات ہیچ معلوم ہونے لگیں۔ اس نے سوچا ''اتنے عذاب سہنے کے باوجود یہ باہمت عورت، خدا پر یقین کے سہارے محبت کی تبلیغ کر سکتی ہے، کیا یہ معجزہ نہیں!''

پہلی بار اس کے دل میں خدا کو جاننے، اس کے قریب ہونے کی خواہش جاگی۔ حالانکہ ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کی وجہ سے وہ خدا پر یقین کھو چکی تھی۔ اور پھر اس نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی، جہاں الحاد کا چرچہ تھا۔

اس نے ہمت مجتمع کر کے اس عورت سے دریافت کیا ''میں خدا کے قریب کیسے ہو سکتی ہوں؟''

''دعا کے ذریعے میری بیٹی!'' یہ اُس کا محبت بھرا جواب تھا، مختصر اور جامع!

☆☆☆

''میں اب تک زندہ کیوں ہوں؟'' یہ سوال روتھ کا ہر گھڑی تعاقب کیا کرتا تھا، لیکن وہ اسے نظر انداز کر دیتی، البتہ اس نیک فطرت ڈچ خاتون سے ملاقات کے بعد بالآخر اُس نے اس بابت سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اُسے یاد آیا کہ کس طرح وہ بچپن میں ایک کار حادثے میں بال بال بچی تھی۔ اس رات جب لائپ زش پر بمباری ہو رہی تھی، وہ کس طرح محفوظ رہی اور کس قدر مشکل حالات میں، گو کہ ناممکن معلوم ہوتا تھا، اُس نے سرحد عبور کی۔

غور و فکر کی یہ دنیا اسے ہرمین سے دور لے گئی۔ دھیرے دھیرے دونوں کے راستے جدا ہونے لگے۔

اس معاملے کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے اس نے فلسفے اور ادب کی کلاسیں لینا شروع کر دیں۔ یہاں اس کی ملاقات رونلڈ سے ہوئی، جس کا تعلق ایک کیتھولک خاندان سے تھا۔ اس نوجوان نے اُسے بہت متاثر کیا۔ جس طرح وہ اپنی خامیوں کو تسلیم کرتا، ان پر قابو پانے کے جتن کرتا، وہ روتھ کی نظر میں قابلِ تعریف تھا۔

اکثر صبح کی سیر کے دوران روتھ اُس کے ساتھ چرچ کے دروازے تک جاتی، وہ اندر جا کر دعا کرتا، روتھ باہر کھڑی قدرت کے حسن کو نظروں میں محفوظ کرتی رہتی۔

ملحدانہ خیالات اب روتھ کو بے مقصد لگنے لگے تھے کیونکہ ان کے سبب زندگی کو سمت دینے کا عمل پیچیدگی کا شکار ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے مذہب میں اُس کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ وہ مسیحی نوجوانوں کے مختلف گروپس میں شرکت کرنے لگی جہاں کبھی کبھار زندگی اور موت کی بابت وہ انتہائی پیچیدہ سوالات اُٹھاتی۔

یہی سوالات ایک حلیم پادری فادر کوچ سے اس کی ملاقات کا سبب بنے جو ہر سوال کو تحمل سے سنتے اور جامع جواب دیتے۔

جب کبھی خیالات روتھ کو پریشان کرتے، وہ سائیکل پر سوار ہوتی اور فادر کوچ کے دروازے پر پہنچ جاتی۔

☆☆☆

طب کی تعلیم اب روتھ کو ماربوگ یونیورسٹی لے آئی تھی۔ اس دوران اسے ایسے افراد سے ملنے کا موقع ملا، جنہوں نے اسے زندگی کے نئے معنی سمجھائے اور دوسروں کے لیے جینے کی خواہش کو مہمیز کیا۔ دھیرے دھیرے مذہب کی جانب رجحان بڑھنے لگا۔

یہیں روتھ کا سامنا فلسفے اور کلاسیکی ادب کے طالب علم گیون تھر سے ہوا۔ ابتدا میں تو دونوں میں سلام دعا ہی ہوئی،

لیکن دھیرے دھیرے اُن کا تعلق گہرا ہوتا گیا۔ جلد ہی وہ دوست بن گئے۔

دونوں اب اکثر ساتھ نظر آتے، لان میں، لائبریری میں، راہ داری میں، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ اور ایک روز، جب وہ ماربوگ کے مشہورِ زمانہ قلعہ لینڈ گریو کی دیوار پر بیٹھے نیچے وادی میں پھیلی تاریکی کو تک رہے تھے، گیون تھر نے خاموشی توڑنے کا فیصلہ کیا ''دو ہی راستے ہیں روتھ۔ یا تو ہم دونوں خودکشی کر لیں یا خود کو خدا کے سُپرد کر دیں!''

اُس نے روتھ کی آنکھوں میں دیکھا، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اُس کے فیصلے کی حمایت کرے گی لیکن اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل روتھ کبھی کسی سفر کو آدھے راستے میں چھوڑنے پر یقین نہیں رکھتی تھی، اگر وہ واقعی خود کو خدا کی رحمت کے سُپرد کر دیتی، تو اُسے راہبہ بننا ہوتا۔ یہی نکتہ تھا۔

بے شک یہ انتہائی مشکل فیصلہ تھا۔ بہ طور شریکِ حیات گیون تھر بہترین انتخاب تھا لیکن راہبہ بننے کے بعد اُن کی راہیں جدا ہو جاتیں۔ ساتھ ہی اسے اپنے خاندان سے بھی دُور ہونا پڑتا۔

''ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد واپسی کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے۔'' اُس نے خود سے کہا۔ ''مجھے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا!''

☆☆☆

بون یونیورسٹی سے گائناکولوجی میں اسپیشلائزیشن کرنے کے بعد اُس نے وینٹربرگ کے ایک اسپتال میں ''انٹرنی'' کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔

اس عرصے میں گیون تھر اور روتھ کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ساتھ ہی وہ تنہائی میں اپنے فیصلے کی بابت غور و فکر کرتی رہی۔

اور ایک روز جب ماربوگ اسٹیشن پر اُتری، گیون تھر آنکھوں میں مسرت لیے اس کے روبرو تھا۔

وہ دونوں گھنٹوں باغ میں گھنے درختوں تلے بیٹھے پُرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔

''کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہو گی؟'' بالآخر وہ لمحہ آ ہی گیا جب گیون تھر نے اس کا ہاتھ تھام کر شادی کی پیشکش کر دی۔

روتھ کے احساسات عجیب تھے۔ وہ کئی ماہ سے اِس لمحے کا انتظار کر رہی تھی اور ''ہاں'' کہنا چاہتی تھی لیکن... اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ یکسر مختلف تھے۔

''نہیں!'' اندرون میں جاری جنگ یکدم ختم ہو گئی۔ تذبذب دم توڑ گیا اور اس کی روح نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ اب وہ مطمئن تھی اور دوسری جانب گیون تھر تھا جس کے چہرے پر حیرت تیر رہی تھی۔

چند لمحات خاموشی چھائی رہی۔ پھر گیون تھر کی آواز فضا میں تھرائی۔ ''میں ابتدا ہی سے جانتا تھا کہ تمہاری روح کہیں اور ہے۔ اکثر جب ہم ساتھ ہوتے، مجھے اپنے اور تمہارے درمیان شیشے کی دبیز دیوار کی موجودگی کا احساس ہوتا۔'' اس نے ہچکی لی۔ ''خیر، میں پوچھ سکتا ہوں، تمہارے انکار کا سبب کیا ہے؟''

روتھ نے وجہ بیان کر دی۔

''چونکہ تم نے میری محبت پر خدا کی محبت کو ترجیح دی، اس لیے میں بے بس ہوں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں!'' اُس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اپنا دکھ چھپاتے ہوئے کہا۔

روتھ واپس وینٹربرگ لوٹ آئی جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں نبھاتی رہی۔

وہ مطمئن تھی، اُس کی تینوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ گو کہ چھوٹی بہن بار بار ابیمار تھی لیکن روتھ جانتی تھی کہ اس کے اہلِ خانہ بار برا کا اچھی طرح خیال رکھیں گے، یعنی قدرت نے اُس کے لیے زمین تیار کر دی ہے۔

جب اُس نے اپنے باپ کو مطلع کیا کہ وہ نن بننا چاہتی ہے تو وہ ششدر رہ گیا۔ مارتھا نے فقط اتنا کہا کہ روتھ کو اپنے دل کی آواز پر توجہ دینی چاہیے۔ ''اگر یہی خدا کی مرضی ہے، تو ایسا ہی سہی!''

''ہاں، یہی خدا کی مرضی ہے!'' روتھ نے دھیرے سے کہا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

بالآخر وہ مقدس لمحہ آ ہی گیا، جب اُس نے خود کو کلی طور پر انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کرتے ہوئے راہبہ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ 56ء میں وہ پیرس پہنچی اور Daughters of the Heart of Mary نامی ''آرڈر'' کا حصہ بن گئی، جس کی بنیاد فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں ''میری ایڈیلیڈ'' نے رکھی تھی۔

اب روتھ پیرس میں تھی۔ ایک ایسے شہر میں جو جدید اور قدیم ثقافت کا انوکھا امتزاج تھا جسے خوشبوؤں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ جس کی زمین اور سازگار ماحول نے سیکڑوں نابغۂ روزگار شخصیات کی پرورش کی۔

نئے ماحول سے خود کو ہم آہنگ کرنا کسی طور سہل نہیں تھا لیکن اب اپنی بابت سوچنے کی ممانعت تھی، اب وہ ایک راہبہ تھی جس کا مقصدِ زیست خداوند کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

تربیت کے دو برسوں میں اسے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی خواتین سے ملنے کا موقع ملا۔ کسی کا تعلق جاپان سے تھا، کسی کا ہندوستان سے، کوئی ایتھوپیا سے آئی تھی، کوئی ملائشیا سے!

کانونٹ کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ خود کو اِس کے مطابق ڈھال لو۔ اور روتھ نے ایسا ہی کیا۔

وہ جرمنی سے آئی تھی جہاں خاصا آزاد ماحول تھا، جب کہ کانونٹ میں کئی ایسی راہبائیں بھی ٹھہری ہوئی تھیں جن کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے تھا، جہاں آزادی کا مطلب یکسر مختلف تھا سو اُن کے لیے روتھ کے آزاد اطوار کو قبول کرنا آسان نہیں تھا لیکن اس نیک فطرت لڑکی نے جلد ہی اپنی جگہ بنالی۔ اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہر ملک، ہر کلچر کا اپنا مزاج ہے۔

چونکہ وہ ڈاکٹر تھی، اس لیے جلد ہی اپنی پیشہ ورانہ قابلیت کے طفیل پورے کانونٹ میں مقبول ہوگئی۔ سب اس سے محبت کرنے لگے۔ وہ بھی خوش تھی کہ خدا نے اسے ایسے لوگوں کے درمیان لا کھڑا کیا ہے، جو فقط محبت اور امن پر یقین رکھتے ہیں۔

☆☆☆

روتھ کی نئے دوستوں میں سے بیشتر کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ گائناکولوجسٹ ہونے کے سبب ہندوستان میں سرگرم "آرڈر" کی شاخ نے روتھ کو وہاں بھیجنے کی درخواست کی، تاہم انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار روتھ اپنے آبائی وطن مشرقی جرمنی، یعنی "جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک" جانے کی خواہش مند تھی۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" یہ بیلجیئم سے تعلق رکھنے والے روتھ کی سپروائزر کے الفاظ تھے۔

روتھ نے ایک نظر اُس پختہ عمر عورت کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ماسوائے محبت کے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ "میری بیٹی، تمہارے آبائی وطن میں حالات کٹھن ہیں، تمہیں آزادی سے کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ہندوستان جانے کی بابت غور کرو!"

مشورہ روتھ کے دل کو لگا۔ اس دوران اس نے ایشیا، خصوصاً ہندوستان اور اس کے قریبی ممالک کی بابت کئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان ممالک سے تعلق رکھنے والی راہباؤں سے بھی گفتگو کی جس کے نتیجے میں غربت اور افلاس کی جو تصویر اُس کے سامنے آئی، اُسے دیکھ کر روتھ کا دل پسیج گیا۔ بالآخر سوچ بچار کے بعد اُس نے ہندوستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔

روتھ کو ہندوستان میں طبی خدمات انجام دینی تھیں جس کے پیشِ نظر اُس نے تمام پیشہ ورانہ مراحل طے کیے، نصابی کُتب کو دُہرایا اور اُس لمحے کا انتظار کرنے لگی جب وہ ہندوستان جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوگی، تاہم اُسے علم نہیں تھا کہ ایک صدمہ اُس کا منتظر ہے۔

☆☆☆

"روتھ، تمہارے والد کا انتقال ہوگیا ہے!"

یہ اطلاع ملتے ہی روتھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بے شک والتھر فاؤ ایک طویل عرصے سے امراض کی لپیٹ میں تھا اور روتھ نے باپ کی تیمارداری کے ارادے سے چھٹی کی درخواست بھی جمع کروادی تھی لیکن اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑنے والے ہیں۔

جب اُسے باپ کے انتقال کی خبر ملی، اُسے لگا جیسے اس کی روح ٹوٹ گئی ہو، جیسے زندگی نے یکبارگی معنویت کھو دی ہو۔

وہ کئی ساعتوں تک سکتے میں رہی لیکن پھر دھیرے دھیرے اپنے ایمان کے سہارے اُس نے غم کو سہنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر یہی خدا کی مرضی ہے، تو یہی سہی!"

اپنے والد کی تدفین میں شرکت کے بعد روتھ فوراً پیرس لوٹ آئی۔ خود کو انسانیت کے لیے تج دینے کا فیصلہ اب انتہائی پختہ ہوگیا تھا، وہ جلد از جلد ہندوستان پہنچنا چاہتی تھی، یہی اس کی خواہش تھی پر قدرت کی خواہش، قدرت کا ارادہ کچھ اور تھا۔

"ہندوستان کا ویزا ملنے کے امکانات انتہائی معدوم ہیں۔" روتھ کی سپروائزر نے جب اسے مطلع کیا، وہ سکتے میں آگئی۔

وہ شدید مایوسی کا دن تھے۔ پھر کسی نیک بخت نے کراچی (پاکستان) جانے کا مشورہ دیا کیونکہ وہاں سے ویزے کا حصول نسبتاً آسان تھا۔

اٹھارہ سالہ روتھ پاکستان کی بابت یکسر لاعلم تھی۔ لائپ زِش پر غیر ملکیوں کا قبضہ، وہاں سے ہجرت اور پھر پیرس کا رُخ کرنا۔ اِن تمام معاملات نے اُسے یہ جاننے کا موقع ہی نہیں دیا کہ 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھر چکا ہے۔

اُس نے پاکستان اور اپنے "آرڈر" کی اُس شاخ کی

بابت معلومات اکٹھی کرنا شروع کردی جو اُن دنوں کراچی میں کام کررہی تھی۔

بالآخر اُس نے کراچی جاکر ہندوستانی ویزے کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اور یوں قدرت نے اپنے منصوبے کی تکمیل کی جانب ایک اور قدم بڑھایا!

☆☆☆

وہ 8 مارچ 1960ء کی عام سی دوپہر تھی، جب اِس فرشتہ صفت خاتون نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔

ابتدائی تجربات حوصلہ افزا نہیں تھے۔ ناقابلِ برداشت گرمی اور تھکانے دینے والے سفر کے بعد جب روتھ آرام کرنے کی خواہش لیے گرومندر پر قائم گرلز ہاسٹل پہنچی تو منتظمہ کی جانب سے اُسے کھانے سے قبل دعائیہ عمل کا حصہ بننے کی ہدایت کی گئی۔ یہ کسی طور ایک اچھا آغاز نہیں تھا!

رات بھر گرمی اور ساتھ والے کمرے میں رکھے ریڈیو سے بُلند ہوتے شور نے اسے پریشان رکھا۔ دوسرا مسئلہ ابلاغی رکاوٹ تھی۔

"پیرس کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے مقابلے میں خود کو اِس گرم شہر کے ماحول میں ڈھالنا کئی گنا مشکل ثابت ہوگا۔" اُس بے چین رات روتھ نے خود سے کہا۔ اور وہ ٹھیک تھی، حالات واقعی پیچیدہ تھے، لیکن قدرت نے اس کی راہنمائی کے لیے ایک نیک فطرت عورت کا انتظام کر رکھا تھا۔

یہ سسٹر بیرنس وارگس تھی جس کی کہانی روتھ کی کہانی سے کم عجیب نہیں!

اِس بلند حوصلہ عورت نے میکسیکو کے جنوب مغربی شہر Guadalajara میں 10 مارچ 1926ء کو آنکھ کھولی تھی۔ نیشنل یونیورسٹی آف میکسیکو سے فارمیسی کے مضمون میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد مذہب کی جانب بڑھتے رجحان نے برنس کو Daughters of The Heart of Mary کا حصہ بنا دیا۔ 12 مارچ 1953ء کو اُس 29 سالہ میکسیکن فارماسسٹ نے آرچ بشپ آف کراچی کی درخواست پر ایک اجنبی ریاست کا رُخ کرنے کا مشکل فیصلہ کیا۔ اس سفر کا مقصد مہاجر کیمپس میں پھوٹ پڑنے والے صحت سے جُڑے مسائل کا حل تلاش کرنے کی خواہش تھی۔ اسی لیے وہ کراچی پہنچی تھی۔ اسی برس سسٹر سیمون فیبری اور سسٹر ایڈوری کیمبل بھی پاکستان پہنچیں۔ آج اِن تینوں خواتین کا شمار پاکستان میں جذام کے مریضوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے ابتدائی رضاکاروں میں ہوتا ہے!

اگست 1955ء کی ایک صبح اِس میکسیکن راہبہ نے یونیفیف کی ایک اہل کار کے ساتھ میکلوڈ روڈ کی عقبی تاریک گلیوں میں قدم رکھا، جہاں کوڑھی سسکتی ہوئی زندگی گزار رہے تھے۔

چوہوں کی بھرمار تھی اور گلیوں میں سیوریج کا گندا پانی کھڑا تھا۔ سسٹر بیرنس نے اُس روز کوڑھیوں کی بستی کے داخلی حصے میں ایک کتّے کی گلی سڑی لاش دیکھی جس سے اُٹھتی سرانڈ اور بستی کا وحشت ناک ماحول حوصلہ شکن تھا۔ قدم ڈگمگا گئے۔

"میں یہ نہیں کرسکتی!" اس نے خود سے کہا۔ اور ایسے میں بستی کے دو کوڑھیوں کی جن میں سے ایک مسلمان تھا اور دوسرا مسیحی، رنج و الم میں ڈوبی صدا بلند ہوئی جنہوں نے اُس فرشتہ صفت عورت کو اپنی طرف آتا دیکھ لیا تھا۔ عبدالوہاب نے اللہ کے نام پر مدد کی درخواست کی جبکہ لیزریس نے یسوع مسیح کے نام پر مدد چاہی!

اُن کے بگڑتے ہوئے جسموں پر سنڈیاں رینگ رہی تھیں۔ سسٹر بیرنس نے کرب کے وہ کریہہ مناظر دیکھنے کے بعد خود کو شکستہ پایا۔ گرومندر پر قائم کانونٹ پلٹنے کے بعد وہ بیمار... پڑ گئی۔

چند روز بعد میکلوڈ روڈ کے دھتکارے ہوئے جذام کے مریض کسی طرح اُس تک پہنچ گئے اور سسٹر کو اطلاع دی کہ جن دو کوڑھیوں نے اُسے مدد کے لیے پکارا تھا، اُن میں سے ایک مرگ کے قریب ہے۔ اب بیرنس پر لازم تھا کہ وہ ہمت مجتمع کرے اور پھر اُس تاریک بستی کا رُخ کیا۔

اُس روز جب بیرنس کوڑھیوں کی بستی پہنچی، لیزریس موت کے قریب تھا۔ رسومات کے مطابق پادری کو بلوایا گیا۔ جب پادری نے اُس شخص سے آخری خواہش دریافت کی تو وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا "میری خواہش ہے کہ سسٹر بیرنس ہم کوڑھیوں کے لیے کچھ کریں!"

پادری نے راہبہ سے سوال کیا..... "تم نے ایک عظیم مقصد کے لیے گھر بار چھوڑا ہے، کیا تم ان دھتکارے ہوئے انسانوں کے لیے کچھ کرسکتی ہو؟"

"ہاں!" یہ اُس باہمت عورت کا جواب تھا۔ اور یوں اُس نے ایک اجنبی ریاست کے کوڑھیوں کے لیے خود کو وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اُس کرب ناک تجربے کے بعد جب بیرنس نے میکسیکو میں مقیم اپنے والدین کو خط لکھا، تو یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا "میں آپ کے لیے اس بستی کا ہر کریہہ منظر بیان کرسکتی ہوں، تاہم جس تعفن کا مجھے سامنا کرنا پڑا، وہ بیان سے باہر ہے!"

والدین نے اپنی باہمت اور انسانیت کی فلاح کے لیے خود کو تیاگ دینے والی بیٹی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ادویہ کی صورت ابتدائی امداد بھیجی جس کے بعد سسٹر بیرنس تاریک بستی کو روشن کرنے کے نیک ارادے سے نکل پڑی۔

اگلی بار جب اس راہبہ نے بستی میں قدم رکھا، چوہوں کا بڑی حد صفایا کیا جاچکا تھا۔ ہاں، کیچڑ راہ میں کھڑا تھا تاہم وہ ہر رکاوٹ عبور کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا، جب جذام کو معتدی مرض تصور کیا جاتا تھا اور اُس سے دُور بھاگا جاتا تھا۔

جھونپڑیوں پر مشتمل، تعفن سے بھری اُس بستی کی وحشت کا سامنا کرنا سہل نہیں تھا، تاہم اب فیصلہ کیا جاچکا تھا۔

کُل سرمایہ تین سو روپے تھا جسے اکٹھا کرنے میں دوستوں کے علاوہ بستی کے اُن بھکاریوں نے بھی مدد کی، جو اپنا اور اپنے جیسوں کا بھلا چاہتے تھے اور فرشتہ صفت بیرنس کو اپنی آخری امید خیال کرتے تھے۔

16 اگست 1956ء کے روز ''کارڈ بورڈز'' کی مدد سے کوڑھیوں کی بستی میں ایک جھونپڑی قائم کی گئی، یوں ''میری ایڈیلیڈ ڈسپینسری'' کا قیام عمل میں آیا اور سسٹر بیرنس کا سفر شروع ہوا۔ یہ ڈسپینسری Daughters of the Heart of Mary نامی ''آرڈر'' کی بانی ''میری ایڈیلیڈ'' سے موسوم تھی اور اِس عمل کا مقصد دُھتکارے ہوئے انسانوں سے انسانوں سا سلوک کرنے کے آفاقی پیغام کو آگے بڑھانا تھا۔

اِس نیک عمل میں بیرنس کو سسٹر سمیون فیبری اور سسٹر فرانسس براؤن کی معاونت بھی حاصل تھی۔ یہ سسٹر سمیون فیبری ہی تھیں جنہوں نے شہر کی گہما گہمی میں چھپی کوڑھیوں کی بستی ''دریافت'' کی تھی، جسے سماج سے خارج کردہ مریضوں نے اپنی مدد آپ کے تحت تعمیر کیا تھا۔

اِن باہمت خاتون کی کوششوں کی سُن گُن ملنے کے بعد ''ریڈکراس'' نے ادویہ فراہم کیں، چند سفارت خانوں کی مدد سے ''بیڈشیٹز'' کا انتظام کیا گیا، ''کیتھولک ریلیف سروس'' نے خشک دودھ اور کھانا پکانے کا تیل فراہم کیا۔ ''ماما پارسی اسکول'' نے اُنہیں ایک کمرا بہ طور اسٹور روم استعمال کرنے کی سہولت دی دے۔ سسٹر بیرنس نے بازار کا رُخ کیا، جہاں سے کمبل اور کپڑے خریدے گئے۔

ڈسپینسری کے قیام کے بعد سسٹر بیرنس، سسٹر فیبری اور سسٹر براؤن ہر صبح کبھی پیدل اور کبھی بس میں سوار ہو کر بستی پہنچ جاتیں جہاں رنج و الم کی تصویر بنے مریض آنکھوں میں امید لیے اُن کے منتظر ہوتے۔ ابلاغ کا پیچیدہ مسئلہ درپیش ضرور تھا لیکن وہ اتنا توانا نہیں تھا کہ بیرنس کے سامنے بند باندھ پاتا۔ دو الفاظ ''صبح'' اور ''شام'' سے اردو زبان سے اُس کا ابتدائی تعلق قائم ہوا۔ ادویہ دن کے اِن ہی اوقات میں لی جاتی تھیں۔ جلد ہی یہ خاتون ''سسٹر صبح شام'' کے نام سے معروف ہوگئی۔

چند برس بعد سسٹر فیبری اور سسٹر براؤن کی جگہ سسٹر میری ڈوئل اور سسٹر ہیلن نے لے لی۔ ابتدائی ساتھیوں سے الگ ہونے کے بعد اب اس کٹھن مشن کی تمام ذمّے داری بیرنس کے کاندھوں پر تھی!

☆☆☆

روتھ کی کراچی آمد کے بعد بیرنس کی آنکھوں میں مسرت دمک اُٹھی، کیونکہ جذام کے مریضوں کے علاج میں معاونت کے لیے اُسے ایک پیشہ ور ڈاکٹر کی اشد ضرورت تھی اور اسے روتھ کی صورت ایک امید نظر آتی تھی۔

''مجھے بہت خوشی ہے کہ تم یہاں آئیں میری پیاری بہن!'' ایک روز بیرنس نے روتھ سے کہا۔ جواباً روتھ کے چہرے پر اجلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ گو کہ اسے اس اجنبی زمین پر کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس نے اُنہیں خدا کی مرضی اور اپنی تربیت کا حصہ سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔

جب بیرنس کو پتا چلا کہ روتھ نے عارضی طور پر پاکستان کا رُخ کیا ہے، تو وہ اداس ہوگئی۔ اس نے تنہائی میں خدا سے دعا کی۔ ''خداوند، مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے، مجھ پر اپنی رحمت نازل فرما!'' دعا کے بعد بیرنس امید سے بھر گئی۔ اُس نے روتھ کو کوڑھیوں کی بستی کا دورہ کرنے کی دعوت دی جہاں ناقابلِ بیان اذیت ناک مناظر منتظر تھے۔

1960ء میں کراچی کے علاقے میکلوڈ روڈ کی عقبی تاریک گلیوں میں وقوع پذیر ہونے والا واقعہ آج تاریخ کا حصہ ہے۔

اس اداس صبح جب روتھ فرشتہ صفت بیرنس کے ساتھ کوڑھی کی بستی پہنچی، وہاں اس کا سامنا بے بسی کی ایسی کیفیت سے ہوا جس سے ماضی میں کبھی اُس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ بستی کے باہر سڑک پر پھیلے گندے پانی پر نظریں ٹکائے چند ساعت متذبذب کھڑی رہی۔

''کیا مجھے اندر جانا چاہیے؟'' اُس نے خود سے سوال کیا۔

دوسری جانب بیرنس زیرِ لب دعائیں پڑھ رہی تھی۔ ''خداوندا ان بے بس انسانوں پر اپنی رحمت نازل فرما۔''

دعا قبول ہوئی... چند ساعت متعجب رہنے کے بعد

بالآخر جرمن راہبہ نے بیرنس کے نقشِ پا کا تعاقب کرتے ہوئے دھتکارے ہوئے انسانوں کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔

اور وہاں اُس نے جو کچھ دیکھا، وہ ناقابلِ بیان تھا۔ گو کہ وہ کئی صدمات سہہ چکی تھی، اُس نے ہجرت کا کرب برداشت کیا، فاقے کیے، بھائی کی موت کا دُکھ سہا لیکن اس صبح کوڑھیوں کی بستی میں وہ جن صدمات سے دوچار ہوئی، اس کا تصور بھی محال ہے۔

روتھ جرمنی میں پروان چڑھی تھی جہاں یہ مرض قصّہ پارینہ بن چکا ہے۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی جذام کا مریض نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ بستی سے لوٹی تو خاصی مضمحل تھی۔

بیرنس خاموش رہی۔ اسے یاد تھا، جب چند برس قبل اُس نے پہلی بار اس تاریک بستی کا رُخ کیا تھا تو اُسے بھی کچھ ایسے ہی تجربات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اُس کے ذہن میں ماضی کی وہ یادیں گردش کررہی تھیں، جب اس نے ایک عظیم مقصد کے لیے خود کو وقف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اُسے کامل یقین تھا کہ روتھ بھی ایسا ہی کرے گی کہ اُس نے بستی میں داخل ہونے کا مشکل فیصلہ کرنے کے بعد اِس ضمن میں پہلا قدم اُٹھا لیا تھا۔

اُس رات روتھ تذبذب کا شکار تھی۔ وہ جذام کے مریضوں کی حالتِ زار دیکھ کر اداس ہوگئی تھی اور ان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

''کیا میں اسی مقصد کے لیے یہاں آئی تھی؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ ''کیا یہی شہر میری منزل ہے؟ کیا میں ہندوستان جانے کا خیال ترک کردوں؟'' اس کے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔

اس رات وہ سو نہیں سکی اور زیرِ لب دعائیں پڑھتی رہی۔ وہ برتر قوت سے راہنمائی چاہتی تھی۔ دوسری جانب بیرنس کے لبوں پر بھی دعائیں تھیں۔ قدرت نے شاید اسی عظیم منصوبے کے لیے اس نیلی آنکھوں والی روتھ کو تیار کیا تھا!

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اپنی زندگی کا فیصلہ کرچکی تھی، ایک ایسا فیصلہ جو ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بدلنے والا تھا، ایک ایسا فیصلہ جو قدرت برسوں قبل... اُس کی پیدائش کے وقت کرچکی تھی!!

''میں پاکستان ہی میں رہوں گی، ان دھتکاروں ہوئے انسانوں کی مدد کرنا ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔'' جب روتھ کی عزم میں گندھی شیریں آواز بیرنس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس کی میکسیکن راہبہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے سر اُٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور برتر قوت کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆

جذام کے مریضوں کی حالتِ زار دیکھ کر روتھ نے ذلتوں کے مارے اِن انسانوں کے لیے خود کو تیاگنے کا فیصلہ تو... کرلیا تاہم اسے اِس موذی مرض کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ دراصل اس وقت ترقی یافتہ ممالک میں یہ بیماری تقریباً ناپید تھی۔

''میری بہن بیرنس بہت محنتی ہے۔'' روتھ نے ڈائری میں لکھا۔ ''اس نے وہاں ڈسپینسری قائم کی، کوڑھیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام شروع کیا، مریضوں کے دل میں امید کے دیپ جلائے لیکن وہ ڈاکٹر تو نہیں، ڈاکٹر تو میں ہوں، مجھے اب یہ ذمّے داری اُٹھانی ہوگی۔''

اس زمانے میں سسٹر بیرنس کو ایک ڈاکٹر اور ڈاؤ میڈیکل کالج کے چند رضا کاروں کا تعاون حاصل تھا لیکن وہ اس خدمت کو اپنے فارغ اوقات میں انجام دیا کرتے تھے جبکہ جذام کے مریضوں کو کُل وقتی مددگار کی ضرورت تھی۔

میں اُن کے زخموں پر مرہم رکھوں گی! روتھ نے مصمم ارادہ کرلیا۔

ابتدأ اُس نے چند دستیاب کتابوں کا مطالعہ کیا۔ پھر معروف امریکی ماہر جذام ڈاکٹر پال برینڈ کو ایک خط لکھا جو اس وقت تامل ناڈو، انڈیا کے ولاوری میڈیکل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں جذام کے مرض کی شرح سب سے زیادہ تھی۔

جب ڈاکٹر پال کو پاکستان کے مرکزی شہر کراچی سے ایک خط موصول ہوا، اُنہوں نے حیرت کے زیرِ اثر لفافہ چاک کیا اور جب خط کا متن پڑھا، اُن کے دل سے جرمن راہبہ کے لیے دعا نکلی اور اُنہوں نے فوراً ہی ڈاکٹر روتھ کو اپنے میڈیکل کالج میں جذام کے حوالے سے ایک خصوصی کورس کرنے کی دعوت دے ڈالی۔

جب یہ دعوت نامہ روتھ کو موصول ہوا، اُس کی آنکھوں میں خوشی دمکنے لگی۔

1961ء میں وہ کراچی سے مدراس جانے والے جہاز میں سوار ہوئی۔ اس کا رُخ ایک ایسی ریاست کی جانب تھا جہاں خدمات انجام دینے کا خواب لیے اُس نے کراچی میں قدم رکھا تھا لیکن اب وہ ہندوستان اس ارادے سے جارہی تھی کہ واپس پاکستان آکر جذام کے مریضوں کی مدد کرے۔

مدراس پہنچنے کے بعد اُس نے ولاوری تک کا راستہ بذریعہ بس طے کیا۔ دریا کے کنارے آباد یہ قصبہ اپنے میڈیکل کالج ہی کی وجہ سے معروف تھا۔

چھ ہفتے روتھ نے تامل ناڈو کے اس قصبے میں قیام کیا

جہاں ہر صبح وہ کالج سے ملحقہ سرسبز باغ میں چہل قدمی کرتی، پرندوں کو چہچہاتے اور بندروں کو گھنے درختوں پر جھولتے، شور مچاتے ہوئے دیکھتی۔

اِس دوران اُس نے ساؤتھ انڈین کھانے بھی چکھے اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات بھی کی، تاہم ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آنکھوں میں کراچی کی تاریک بستی کے سسکتے مریضوں کی کرب ناک تصاویر دھندلی نہیں پڑیں۔

اِس عرصے میں روتھ نے اِس مرض کو شناخت کرنے کا طریقہ، ادویہ کا استعمال اور مریض کی صحت کے بحالی کے حوالے سے کئی کارآمد باتیں سیکھیں۔

چھ ہفتے بعد جب وہ کراچی لوٹی تو وہ اس موذی مرض کے خلاف معلومات کے ہتھیار سے لیس تھی۔

☆☆☆

"میں تیار ہوں بیرنس!" روتھ نے میکسیکن راہبہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"چلو... پھر کام شروع کرتے ہیں۔" بیرنس مسکرائی۔

اب روتھ نے اُن کوڑھیوں کا علاج شروع کیا جنہیں ناقابلِ علاج تصور کیا جاتا تھا۔ گوکہ اُس وقت جیب میں فقط بیس روپے تھے لیکن وہ عزم کی دولت سے مالامال تھی۔

اب مریضوں کی رجسٹریشن، ان کی ہسٹری محفوظ کرنے اور لیبارٹری ٹیسٹ کا سلسلہ شروع ہوا۔

جذام کے ایک مریض عبدالرحمان کا ذکر ضروری ہے جس کا ایک ہاتھ اِس مرض کے سبب شدید متاثر ہوا تھا۔ عبدالرحمان پیشے کے لحاظ سے مدرس تھا، لیکن اس موذی بیماری نے اسے اس تاریک بستی میں لا پھینکا، البتہ اس نے اپنی عزت نفس کی قربانی نہیں دی اور کبھی بھیک نہیں مانگی۔ واضح رہے کہ اُس زمانے میں جذام کے مریض صدر کے علاقے میں باکثرت بھیک مانگتے نظر آتے تھے کہ اُن غریبوں کے پاس پیٹ کی آگ بجھانے کا کوئی اور وسیلہ نہیں تھا۔ خیر، تو عبدالرحمان نے جب ڈاکٹر روتھ کو جذام کے مریضوں کے لیے عملی اقدامات کرتے دیکھا تو وہ مسرت سے بھر گیا اور اِس نیک کام میں شامل ہوگیا۔

اُس وقت ٹی بی سینٹر سے ایک نیک فطرت ڈاکٹر اقبال یادمنسلک تھے۔ اُنہوں نے عبدالرحمان کو اپنے ادارے میں لیبارٹری ٹیکنیشن کا کورس کرنے کی اجازت دینے کا جرأت مندانہ فیصلہ کیا جس پر اُنہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ یوں چھ ماہ میں عبدالرحمان نے شان دار نمبروں کے ساتھ ٹیکنیشن کا کورس مکمل کیا اور "میری ایڈیلیڈ ڈسپینسری" میں خردبین کے استعمال کا ذمہ سنبھالا لیا۔ کیونکہ وہاں کوئی میز نہیں تھی اس لیے عبدالرحمان خردبین اپنے گھٹنوں پر رکھ کر کام کیا کرتا تھا۔

عبدالرحمان خوش تھا کہ اب وہ عملی طور پر اپنے جیسے انسانوں کی مدد کررہا ہے اور ایک بامقصد زندگی گزار رہا ہے۔

☆☆☆

گوکہ مشکلات قائم رہیں، لیکن دھیرے دھیرے نیک اور امید پرست افراد روتھ کی ٹیم میں شامل ہونے لگے۔

اس زمانے میں پاکستان، خصوصاً کراچی کے کئی طبی ماہرین دھتکارے ہوئے انسانوں کی دل سے مدد کرنا چاہتے تھے، پر معاشرتی رویوں اور جذام کے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیوں کی وجہ سے مجبور تھے لیکن جب انہوں نے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو عظیم جذبے اور یقین کے ساتھ اس ضمن میں بھاگ دوڑ کرتے دیکھا تو ان کا دل پسیج گیا اور کسی نہ کسی طرح اُس کی مدد کرنے لگے۔

روتھ کی کوششوں نے کراچی کے معروف معالجین ڈاکٹر ایم ایچ رضوی اور ڈاکٹر ہاشمی کو بھی متاثر کیا جنہوں نے اپنے اپنے شعبوں میں اُس سے تعاون کیا اور کوڑھیوں کے علاج کے تعلق سے اپنی خدمات پیش کیں۔

اُسی زمانے میں اُس کی ملاقات متمول گھرانے سے تعلق رکھنے والی اسکن اسپیشلسٹ، ڈاکٹر زرینہ فضل بائی سے ہوئی، جلد ہی دونوں میں دوستی ہوگئی۔

ڈاکٹر زرینہ فضل بائی کی شمولیت کے بعد روتھ اور بیرنس کی کوششوں کے مثبت نتائج آنے لگے۔ ڈاکٹر زرینہ کی تقلید کرتے ہوئے متمول خاندانوں سے تعلق رکھنے والی اور بھی کئی خواتین نے اِس تاریک بستی کا رُخ کیا۔

☆☆☆

مختصر سے ابتدائی فنڈ کے بعد "میری ایڈیلیڈ لپروسی سینٹر" رجسٹرڈ کروایا گیا۔ فلاحی تنظیم میں روتھ فاؤ اور سسٹر بیرنس کے علاوہ امریکا سے تعلق رکھنے والی سسٹر میری ڈوئل، پاکستانی ٹیچر لوئز ڈیسوزا اور بیلجیم سے تعلق رکھنے والی سسٹر جینن شامل تھیں۔ زرینہ فضل بائی کی تنظیم میں شمولیت کے بعد کام میں تیزی آگئی۔ اُس زمانے میں جب متعدی خیال کیے جانے کے سبب جذام کے مریضوں کے نزدیک جانے کا تصور بھی محال تھا، اِن باہمت خواتین نے ایک روشن جدوجہد شروع کی۔

روتھ نے اس بات پر بہت غور کیا کہ آخر لوگ ان مریضوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ خاصی غوروفکر اور لوگوں سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد روتھ مسئلے کی جڑ تک پہنچ گئی کہ

لوگ سمجھتے ہیں کہ انسان گناہوں کے سبب اِس مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔

جذام کے مریضوں کو دی جانے والی ادویہ کے مثبت نتائج آنے لگے تھے۔ مریض شفایاب ہونے لگے۔ اب روتھ کی ٹیم کے ارکان لوگوں سے دریافت کرتے "کیا یہ ممکن ہے کہ ایک گولی کھانے سے خدا خوش ہوکر مریض کے گناہ بخش دے؟ نہیں ناں!"

اِس طرح عام لوگ اِس بابت سوچنے پر مجبور ہوگئے۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ یہ مرض متعدی ہے۔ اس سوچ کو بدلنے کے لیے روتھ نے عملی اقدامات کیے۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ کوڑھیوں کی بستی میں جاتی، ان کے تاریک گھروں میں داخل ہوتی، مریضوں کے ساتھ بیٹھتی، اُن کے برتنوں میں پیش کی جانے والی چائے پیتی۔

یوں اُنہوں نے عوام میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کا آغاز کیا۔

اُسی زمانے میں ملکۂ برطانیہ، الزبتھ دوئم نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اس دورے کو "کور" کرنے کے لیے کئی مغربی صحافیوں نے اس ریاست کا رُخ کیا۔ انہوں نے اپنی رپورٹس مرتب کرنے کے لیے جب کراچی کی سڑکوں پر گشت شروع کی، تو اُنہیں کوڑھیوں کی بستی کی بھی سن گن ملی۔

کچھ عرصے بعد ایک جرمن اخبار میں ڈاکٹر روتھ فاؤ کی کہانی شائع ہوئی جس نے ورزبرگ میں مقیم ہیرمین کوبر کو چونکا دیا۔

یہ صاحب اُس وقت جرمن لپروسی ریلیف ایسوسی ایشن میں صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔

"حیرت انگیز!" کوبر نے روتھ کی بابت شائع ہونے والی رپورٹ پڑھنے کے بعد کہا اور فوراً ہی اُس باہمت عورت کو خط لکھنے کے لیے قلم تھام لیا۔

خط میں روتھ کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ کوبر نے یہ بھی لکھا "یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک جرمن ڈاکٹر جذام کے مرض پر کام کررہی ہے اور جرمن لپروسی ریلیف ایسوسی ایشن کو اس کی خبر ہی نہیں!"

خط پڑھ کر روتھ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جواب لکھنے کے لیے میز پر بیٹھ گئی، پہلے کوبر کا شکریہ ادا کیا۔ یوں دونوں تنظیموں میں رابطہ پیدا ہوا۔ جرمن لپروسی ریلیف ایسوسی ایشن نے روتھ سے پوچھا "مادام ہم کس طرح آپ سے تعاون کرسکتے ہیں؟"

جواب میں روتھ نے اپنے سینٹر کی چند تصاویر ارسال کردیں، جنہیں دیکھ کر کوبر کی آنکھوں میں نمی آگئی، کیونکہ تصویریں یہ واضح پیغام دے رہی تھیں کہ باہمت روتھ محدود وسائل کے ساتھ ایک بہت اُلجھے ہوئے مسئلے کو حل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

جرمن لپروسی ریلیف ایسوسی ایشن کی جانب سے فوراً ہی ضروری آلات، ادویہ اور ایک تربیت یافتہ نرس سسٹر ایلی کو کراچی بھیج دیا گیا۔

تبدیلی کا عمل شروع ہوگیا تھا!!

اُسی عرصے میں جرمنی سے تعلق رکھنے والی ایک کیتھولک فلاحی تنظیم نے بھی کراچی کا دورہ کیا۔ تنظیم کے نمائندوں نے روتھ سے بھی ملاقات کی اور اُسے اپنے نیک مشن کے لیے ایک اسپتال تعمیر کرنے کا مشورہ دیا۔

"لیکن ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں!" روتھ نے جواب دیا۔

"جرمنی کے لوگ اِس نیک کام میں آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔" تنظیم کے ترجمان نے اسے مطلع کیا۔

کچھ عرصے بعد تنظیم کے تعاون سے صدر کے علاقے میں دومنزلہ نرسنگ ہوم خرید لیا گیا۔

وہ روتھ اور بیرنس کے لیے ایک خوش گوار لمحہ تھا لیکن مسائل ٹلے نہیں تھے۔ وہ جانتی تھی کہ کوڑھیوں کو تاریک بستی سے شہر کے بیچوں بیچ ایک اسپتال میں منتقل کرنا، اس اسپتال کے اطراف بسنے والوں کے لیے کسی طور قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

"ہمیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔" بیرنس نے کہا۔

روتھ خاموش رہی۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی۔

9 اپریل 1963ء کے روز، رات کے اندھیرے میں بڑی خاموشی سے میری ایڈیلیڈ لپروسی ڈسپینسری کو اس دومنزلہ عمارت میں منتقل کردیا گیا اور صبح جب اطراف میں بسنے والوں کو.... اطلاع ملی، وہ احتجاج کرتے ہوئے ٹماٹر، پتھر اور انڈے لیے وہاں پہنچ گئے۔

روتھ کو اس ردِعمل سے دُکھ تو بہت ہوا لیکن جانتی تھی کہ احتجاج کرتے، گالیاں دیتے مظاہرین بے قصور ہیں، وہ تاحال جذام کو ایک لاعلاج مرض تصور کررہے ہیں۔

معاملہ مظاہروں تک ہی محدود نہیں رہا۔ کچھ عرصے بعد اُنہیں کورٹ کی جانب سے نوٹس مل گیا اور اِس سینٹر کے قیام کے حوالے سے عدالت میں مقدمہ شروع ہوگیا۔

اب روتھ کو قانونی جنگ لڑنی تھی اور اس ضمن میں وہ خاصی پریشان رہی۔

"میں تو خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت یہ سب کر رہی ہوں۔" اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"فکر مت کرو، ہم ہی جیتیں گے۔" بیرنس کی آنکھوں میں عزم تھا۔

اِس سلسلے میں زرینہ فضل بائی نے کلیدی کردار ادا کیا۔ روتھ کو بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہرین جذام، خصوصاً WHO کے لیپروسی ایڈوائزر ڈاکٹر اے میکلوی کا تعاون بھی حاصل رہا۔ اِن صاحبان کی آرا کو سامنے رکھتے ہوئے کورٹ نے روتھ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

☆☆☆

اُس زمانے میں حکومت کی جانب سے جذام پر قابو پانے کے لیے میونسپل لیپروسی کنٹرول پروگرام شروع کیا گیا تھا جو عدم توجہی کے باعث غیر فعال ہو گیا تھا۔ اس پروگرام کو دوبارہ سے فعال بنانے اور اپنی ٹیم کو اس سے منسلک کرنے کی خواہش نے روتھ کو متحرک کر دیا۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اُسے کئی بھونڈے اور تیکھے سوالوں کے جواب دینے پڑے، کئی رکاوٹیں عبور کرنی پڑیں لیکن اس کے قدم نہیں لڑکھڑائے۔

ان ہی کوششوں کے نتیجے میں اس کی ملاقات ایک پیرامیڈیکل ورکر سلطان محمد سے ہوئی جس کا سبب ڈاکٹر میکلوی ہی بنے جنہوں نے کچھ عرصے قبل سوات کا دورہ کیا تھا۔

انہوں نے روتھ کو بتایا "پیر بابا کا مزار پاکستان کے شمالی حصے میں جذام کے مریضوں کی پناہ گاہ تصور کیا جاتا ہے اور سلطان وہاں قائم چھوٹی سی ڈسپنسری سے منسلک ہے۔"

ڈاکٹر میکلوی نے روتھ کو سوات کے حکمراں ولی عبدالحق کی کوششوں سے بھی آگاہ کیا "میں سلطان کی ٹریننگ کے حوالے سے اُن سے اجازت لے چکا ہوں۔ وہ چند دنوں میں یہاں پہنچ جائے گا۔"

یوں سلطان کراچی پہنچا اور لیپروسی ٹیکنیشنز کے پہلے "بیچ" کا حصہ بن گیا۔ اس کورس کا نصاب روتھ اور زرینہ فضل بائی نے ترتیب دیا تھا۔

اُس چھ ماہ کے کورس کے اختتام پر روتھ اور اس کے ساتھی بے حد مسرور تھے کیونکہ دھیرے دھیرے ایک ایسا گروہ تشکیل پا رہا تھا جو مستقبل میں جذام کے خلاف لڑنے میں اُن کا ساتھ دے لیکن شومئی قسمت اسی زمانے میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر جرمن قونصل خانے نے روتھ کو پاکستان چھوڑنے کی ہدایت کی لیکن اس باہمت عورت نے صاف انکار کر دیا۔ "یہ میرے لوگ ہیں، اب یہی میرا وطن ہے، میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" یہ اس کا حتمی فیصلہ تھا۔

اب روشنیوں کا شہر "بلیک آؤٹ" کی لپیٹ میں تھا۔ وقفے وقفے سے دھماکے سنائی دیتے اور جب جنگی جہاز ہوا میں نمودار ہوتے تو اُن کی چنگھاڑ سناٹے کو چیر دیتی۔

روتھ اس صورتِ حال سے قطعی پریشان نہیں ہوئی۔ وہ اپنے بچپن میں اس کا خاصا تجربہ کر چکی تھی، تاہم حفاظتی نقطۂ نگاہ سے اسپتال میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ کھڑکیاں بند کر دیں گئیں اور جونہی خطرے کا الارم بجتا، تمام مریضوں کو نیچے محفوظ حصے میں پہنچا دیا جاتا۔

جنگ ختم ہوتے ہی روتھ پھر متحرک ہو گئی۔ اُسے اب ان شمالی علاقوں کا رُخ کرنا تھا جہاں سلطان اور اس کے ساتھی جذام کے خلاف لڑ رہے تھے۔

یہ سفر اُس کی زندگی بدلنے والا تھا!

☆☆☆

دراز قد اور تمام راہباؤں میں قابلِ احترام مدر میری ڈوئل جو اسپتال کے انتظامی معاملات دیکھ رہی تھیں، اُنہیں میری ایڈیلیڈ لیپروسی سینٹر کا نگراں مقرر کیا گیا۔ روتھ کو میری ڈوئل ہی کے ساتھ پشاور کا رُخ کرنا تھا۔

"جیسا دیس ویسا بھیس" روتھ دھیرے دھیرے اس ملک کے ماحول میں رنگتی جا رہی تھی۔ اس نے اس سفر کے لیے شلوار قمیص اور دوپٹے کا انتخاب کیا، جبکہ امریکا سے تعلق رکھنے والی ساٹھ سالہ میری ڈوئل روایتی لباس میں تھیں۔

سلطان کو اُن دونوں کی آمد کی بابت مطلع کر دیا گیا تھا، لیکن ائر پورٹ سے باہر آنے کے بعد اُنہیں وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

"سلطان نظر نہیں آ رہا!" روتھ نے میری ڈوئل سے کہا۔

"شاید وہ ائر پورٹ نہیں پہنچ سکا، تھوڑا انتظار کرتے ہیں۔" اُنہوں نے جواب دیا۔

طویل انتظار کے بعد بالآخر میری ڈوئل نے ایک تانگے کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اُنہوں نے تانگے والے کو مرکزی بازار پہنچنے کی ہدایت کی، جہاں سے وہ پیر بابا کے لیے ٹیکسی کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

پورے سفر کے دوران دونوں خواتین مقامی افراد کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔

گو کہ روتھ تھوڑی گھبرائی ہوئی تھی لیکن میری ڈوئل کے چہرے پر کامل اطمینان تھا۔

بازار پہنچ کر جب وہ ٹیکسی تلاش کر رہی تھیں اُنہیں اندازہ

ہوا کہ اس بھرے پُرے بازار میں ان کے علاوہ کوئی اور عورت نہیں۔ اِسی دوران روتھ کی نظر سلطان پر پڑی جو تیزی سے ہجوم کو چیرتا ہوا اُن کی طرف آ رہا تھا۔ اُس نے سکون کا سانس لیا۔

اب وہ بس میں سوار سوات کی جانب بڑھ رہے تھے اور یہ سفر ایک ناقابلِ فراموش تجربہ ثابت ہوا۔

اس دوپہر بس نے پہاڑ کو کاٹ کر بنائے جانے والے ایسے عجیب و غریب، پُرپیچ راستوں کو عبور کیا جن کے ساتھ گہری کھائی دوڑ رہی تھی۔

چند مقامات تو ایسے بھی آئے جب روتھ کو لگا کہ بس کھائی میں جا گرے گی اور اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جب سلطان نے اعلان کیا کہ ہم اپنی منزل تک پہنچ گئے ہیں، اس کی جان میں جان آئی۔

منزل پر پہنچنے کے باوجود مشکلات ختم نہیں ہوئیں، بلکہ اُن میں اضافہ ہو گیا۔

مزار کے احاطہ میں دو عورتوں کے قیام کا بندوبست کرنا ایک مسئلہ تھا جو کسی نہ کسی طرح حل ہو ہی گیا لیکن دوسری پیچیدگی یہ تھی کہ وہاں باقاعدہ بیت الخلاء اور غسل خانے نہیں تھے۔

خیر، کام تو کرنا تھا کہ یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا، جو اُنہیں شہری زندگی سے ان سنگلاخ چٹانوں میں کھینچ لایا تھا سو اُنہوں نے تمام پریشانیوں اور مسائل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خود کو تیار کیا۔

وہاں اُنہوں نے جذام کے درجنوں مریضوں کا معائنہ کیا جن میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی.... اور اُن سب کی نظروں میں ان نیک عورتوں کے لیے احساس تشکر تھا۔

وہاں چند ہفتوں کے قیام نے روتھ کو بیش بہا تجربوں سے روبرو ہونے کا موقع فراہم کیا کیونکہ وہ ایک ایسی سرزمین تھی جہاں عورتوں کا آزادانہ بغیر پردے کے کسی محرم کی موجودگی کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کا تصور مفقود تھا اور ایسے میں دو عورتیں، ہزاروں اجنبیوں میں گھری، فقط انسانیت کی خدمت کے ارادے سے وہاں، اُن کے درمیان موجود تھیں۔

اُن قبائلی علاقوں میں خواتین کا علاج کروانے کا تصور بھی تقریباً ناپید تھا جس کا ایک سبب لیڈی ڈاکٹرز کی عدم موجودگی بھی تھی لیکن روتھ اور میری ڈوئل کی آمد نے جیسے منظر ہی بدل دیا۔ اب علاقے کے مرد اپنی بیویوں کو علاج کی غرض سے اُن کے پاس لانے لگے۔

روتھ اور میری ڈوئل نے کئی ریاستی اہل کاروں کے دفاتر کا بھی دورہ کیا جہاں ہر شخص اُن کے ساتھ بہت احترام سے پیش آیا، اُنہیں عزت دی اور بھرپور تعاون کیا۔

"میں یہ تجربہ زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔" واپسی کے سفر میں روتھ نے خود سے کہا۔

اُس وقت بھی بس پُرپیچ راستوں پر رینگ رہی جس کے دائیں جانب گہری کھائی تھی لیکن اب روتھ خوف سے آزاد ہو چکی تھی۔

☆☆☆

65ء میں روتھ کی ٹیم نے "لیپروسی کنٹرول پروگرام" شروع کیا۔ پہلا سینٹر لاڑکانہ میں قائم ہوا، اگلی منزل میرپور خاص تھی۔

اب "نیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ فور لیپروسی" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس دوران باہمت روتھ نے سرحد اور کشمیر کی دشوار گزار گھاٹیاں اور پہاڑ عبور کیے، بلوچستان کے دُور دراز علاقوں کا سفر کیا۔

68ء میں حکومت نے "لیپروسی کنٹرول پروگرام" کو "نیشنل پروگرام" کی حیثیت دے دی، یوں روتھ کی کوششوں اور اُس کی خدمات کی رسائی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس دوران جرمنی بھی آنا جانا رہا کیونکہ اس کام کے لیے سرمایے کا حصول ضروری تھا۔

دھیرے دھیرے نیک فطرت لوگ ڈاکٹر روتھ کی ٹیم میں شامل ہوتے رہے۔ اُن میں سے بیشتر کا تعلق غریب طبقے سے تھا اور اُنہیں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر خود بھی معاشرتی استحصال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب اس نیک عمل کا حصہ بن کر وہ اُن محرومیوں کی تلافی کر سکتے تھے۔

گو کہ اُن افراد کی فہرست طویل ہے اور تفصیلی ذکر کے لیے علیٰحدہ دفتر درکار ہے لیکن یہ تمام افراد ڈاکٹر روتھ کے دل کے بے حد نزدیک تھے۔ وہ اُن سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ بھی اُس غیر ملکی عورت کا بہت احترام کرتے جو کشتیاں جلا کر کراچی کے ساحل پر اُتری تھی۔

ڈاکٹر زرینہ نے اس نیک مشن کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اُن کی اور اُن کے خاندان کی کوششوں سے روتھ کے مشن نے حکومتی توجہ حاصل کی اور اُسے ریاستی تعاون نصیب ہوا جس کے طفیل یہ پھلنے پھولنے لگا۔ ڈاکٹر زرینہ نے اپنے بچوں کو بھی اس نیک کام کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ 99ء میں اپنی وفات تک ڈاکٹر زرینہ روتھ کے ساتھ کھڑی رہیں۔ بے شک اس باہمت عورت کا ذکر سنہری الفاظ میں کیا جانا چاہیے!

ڈاکٹر زرینہ کی ایک دوست ڈاکٹر صفیہ کا کردار بھی قابلِ

تعریف ہے۔ اِس خاتون نے ممبئی سے گریجویشن اور برطانیہ سے انگلش لینگویج میں ڈپلوما کیا تھا۔ سرکاری درس گاہوں کے نیشنلائزڈ ہونے تک صفیہ تدریس کے پیشے سے وابستہ رہی پھر وہ روتھ کی ٹیم میں شامل ہوگئی اور 84ء میں اپنی موت تک ''میری ایڈیلیڈ لپروسی سینٹر'' کے بینر تلے کام کرتی رہی۔

یہاں لوئزا ڈیسوزا نامی ایک پاکستانی خاتون کا ذکر بھی ضروری ہے جو پیشے کے لحاظ سے ٹیچر تھی اور اسکول سے فارغ ہوکر روتھ کے ساتھ مریضوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔

ڈاکٹر زرینہ، ڈاکٹر صفیہ اور لوئزا ڈیسوزا کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ ان کی طرح اور بھی کئی پڑھی لکھی خواتین نے آگے بڑھ کر روتھ کا ساتھ دیا اور ایک ناممکن خواب کو ممکن بنانے کے لیے ناقابلِ یقین جدوجہد کی۔

ڈاکٹر روتھ کے قابلِ احترام ساتھیوں میں ایک اہم نام جیمن جینس کا بھی ہے۔ اِس ہنس مکھ نرس کا تعلق بیلجیئم سے تھا اور یہ 62ء میں روتھ کی ٹیم کا حصہ بنی تھی۔

جب ''میری ایڈیلیڈ لپروسی سینٹر'' 63ء میں باقاعدہ ایک عمارت میں منتقل ہوا، جیمن کو اپنی خدمات اور قابلیت کے پیشِ نظر پہلی میٹرن مقرر کیا گیا۔

عہدے پر فائز ہوتے ہی جیمن نے کام شروع کر دیا تھا۔ اُن ہی دنوں پارسی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب مسٹر خرسیگارا نے اسپتال کا دورہ کیا۔ جیمن ہی نے اُنہیں اسپتال کا دورہ کروایا۔ اس وقت اسپتال میں بستروں کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جیمن کے جذبۂ خدمت سے متاثر ہوکر دوسرے ہی روز مسٹر خرسیگارا نے اسپتال کو بارہ بستروں کا عطیہ دیا۔

جب 66ء میں روتھ نے دوسری بار سوات کا رُخ کیا تو جیمن اُس کے ساتھ تھی۔

اِس بار اُنہوں نے ڈائریکٹر ہیلتھ سروس، آزاد کشمیر اینڈ ناردن ایریاز این یو احمد سے بھی ملاقات کی جو اِن خواتین کے جذبے سے بہت متاثر ہوئے اور اُن کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

''اگر آپ چاہیں، تو ہم آپ کی سرپرستی میں کام کرنے والے پیرامیڈیکل اسٹاف کو تربیت فراہم کرسکتے ہیں۔'' روتھ نے پیشکش کی۔

چند روز بعد آٹھ افراد پر مشتمل ایک گروپ کراچی پہنچ گیا جنہیں ڈاکٹر روتھ اور اُن کی قابل ٹیم نے ٹریننگ دی۔ جب 79ء میں روتھ نے دوبارہ آزاد کشمیر کا دورہ کیا، اُسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ جن افراد کو اُنہوں نے تربیت دی تھی، وہ جاں فشانی سے کام کر رہے ہیں۔

☆☆☆

روتھ نے جذام کے تعاقب میں پورے پاکستان کا سفر کیا۔ ایسی زمینوں پر بھی قدم رکھا جہاں کے باسی سہولیات سے یکسر محروم تھے اور جن کی فلاح و بہبود کے لیے کبھی کوئی اقدام نہیں کیا گیا تھا۔

ان دور دراز مقامات پر روتھ کا سامنا جذام کے ایسے مریضوں سے بھی ہوا جنہیں خوف کے زیرِ اثر گاؤں، قصبوں سے بے دخل کر دیا گیا تھا اور جو اب غاروں میں سسکتے ہوئے اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے۔

ایسے بدنصیبوں کی تلاش اور اُن کا علاج آسان نہیں تھا لیکن روتھ تو فیصلہ کرچکی تھی دھتکارے ہوئے انسانوں کو گلے لگانے کا، اُن کے زخموں پر مرہم رکھنے کا... سو وہ ہر رکاوٹ عبور کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

اُس نے غاروں، گھاٹیوں سے ایسے ایسے مریضوں کو ڈھونڈ نکالا جن کے اہلِ خانہ یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ بدنصیب اب تک مر کھپ چکے ہیں لیکن روتھ نے اُن کے پیاروں کا علاج کر کے صحت مند حالت میں اُن کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور جواب میں وہ اُس فرشتہ صفت عورت کا شکریہ ہی ادا کر پائے۔ اِس کے سوا وہ اُسے بھلا اور کیا دے سکتے تھے!

کبھی کبھار دشوار گزار علاقوں کے سفر کے دوران روتھ کا عجیب انداز میں جذام کے مریضوں سے سامنا ہوتا!

یہ 1980ء کا ذکر ہے۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ گلگت کے قرب وجوار میں آباد دیہی علاقوں کا دورہ کر رہی تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ ایک گاؤں کے باسی کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُسے شک ہوا ''ضرور یہاں کوئی کوڑھی ہے، جس کی موجودگی کو ہم سے چھپایا جا رہا ہے۔''

واپسی میں اس نے گاؤں کے ایک لڑکے سے اِس بارے میں پوچھا تو اس نے پہاڑ کی چوٹی پر موجود ایک غار کی جانب اشارہ کر دیا اور بتایا کہ وہاں ایک لڑکی ہے جسے گاؤں بدر کر دیا گیا ہے۔

روتھ نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا، ایک رضا کار عبداللہ کی مدد سے بالآخر وہ اس بڑے سے پتھر کے کنارے پہنچ گئی جس کی اوٹ میں غار کا دہانہ تھا۔

اب وہ تاریک غار میں داخل ہوئی جہاں عجیب سی بُو گردش میں تھی جو یہ چغلی کھاتی تھی کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے اور پھر تاریکی میں اُس کا ایک انتہائی بدحال لڑکی سے سامنا ہوا جو سردی اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ اُس کی کھال اُس کے

کوڑھی ہونے کی گواہ تھی۔

روتھ نے جب انسانیت کو اِس حال میں دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے فوراً اپنے کاندھے پر پڑی چادر اس لڑکی کے ٹھٹھرتے ہوئے بدن پر ڈال دی۔

اُس بدنصیب لڑکی کا نام ادینہ تھا، جو اپنی دُکھی زندگی سے مایوس ہوچکی تھی لیکن خدا نے اس کی حفاظت کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

جب ادینہ نے ایک فرشتہ صفت عورت کو اپنے سامنے دیکھا تو وہ جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی، اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

روتھ ادینہ کو اس جہنمی غار سے باہر لے آئی۔ اس فیصلے پر گاؤں کے باسیوں نے شدید احتجاج کیا۔ روتھ نے اُنہیں سمجھانے کی بھرپور کوشش کہ یہ مرض قابلِ علاج ہے اور اُس کے خاندان سے درخواست کی کہ وہ اسے دوبارہ قبول کرلیں لیکن اُنہوں نے صاف انکار کر دیا۔

یہ ایک گمبھیر صورتِ حال تھی۔ روتھ جانتی تھی کہ چند دنوں میں ادینہ اِس موذی مرض سے آزاد ہوجائے گی لیکن اگر اُسے معاشرے میں قبول نہیں کیا گیا تو پھر اُس کی زندگی بے معنی ہے۔

''اِس بے چاری کو ایک چھت کی ضرورت ہے!'' روتھ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

ایسے میں عبداللہ سامنے آیا ''میں اس بدنصیب لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دینے کے لیے تیار ہوں۔''

روتھ نے جب اُس کا جذبہ دیکھا تو آنکھوں میں نمی لیے اجازت دے دی۔

ادینہ کا دل جمعی سے علاج کیا گیا نتائج مثبت رہے۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ مکمل صحت یاب ہوگئی۔ نیک دل عبداللہ نے اُس کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کر دی۔ یوں وہ لڑکی جسے معاشرے نے دھتکار دیا تھا روتھ کی کوششوں سے حیات کی روانی میں لوٹ آئی۔ اس نے چار صحت مند بچوں کو جنم دیا اور خوش گوار زندگی گزاری۔

بعد میں ادینہ کی کہانی پر پی ٹی وی نے ایک ڈراما بھی پیش کیا جس میں روحی بانو نے ادینہ کا کردار ادا کیا۔ روحی بانو نے اس حوالے سے ایک بیان میں کہا تھا ''ادینہ کا کردار نبھانا میری زندگی کا سب سے یادگار تجربہ رہا!''

☆☆☆

جذام کے دُکھی مریضوں کو سینے سے لگانے والی روتھ نے اپنے مشن کو پاکستان تک محدود نہیں رکھا۔ اُس نے افغانستان کا بھی رُخ کیا جہاں کابل کے اردگرد ہزاروں افراد اِس عذاب میں مبتلا تھے۔

خطروں میں گھرے افغانستان کا رُخ کرنے کا سبب وہ بدحال افغانی بنے جنہوں نے 79ء میں روس کی افغانستان پر چڑھائی کے بعد پاکستان کا رُخ کیا تھا۔ روتھ کی ٹیم نے محسوس کیا کہ افغان مہاجرین میں کئی جذام کے مریض ہیں، یقینی طور پر افغانستان میں بھی یہ خوف ناک بیماری عام ہے۔

گوکہ اُن حالات میں افغانستان کا سفر کسی طور سہل نہیں تھا لیکن روتھ دھن کی پکی تھی۔ اس ضمن میں اس نے سوویت یونین سے برسرِ پیکار قوتوں، یہاں تک کہ مجاہدین سے بھی بات چیت کی۔

ضیاء دور میں روتھ لپروسی کے تعلق سے صدر کی مُشیر مقرر ہوگئی تھی۔ سو اُس نے اِس موضوع پر صدرِ پاکستان سے اجازت طلب کی۔ مثبت جواب ملنے کے بعد 83ء کی ایک سرد رات وہ ایسی لینڈ کروزر میں جا بیٹھی جس میں مجاہدین سوار تھے۔ کوئٹہ کی تاریک سڑکوں پر دوڑتی گاڑی نے رات میں سرحد عبور کی۔

افغانستان میں بھی روتھ نے اپنا مشن جاری رکھا۔ اُس نے طالبان کے سخت گیر دور میں بھی خطرات کی پروا نہ کرتے ہوئے افغانستان کا رُخ کیا، حالانکہ وہاں کی فضا بارود کی بُو سے بوجھل تھی۔ اس نے جذام کے مریضوں کی تلاش اور اُن کا علاج جاری رکھا کہ یہی اس کا مقصد تھا جس کے لیے اس نے اپنی زندگی تج دی تھی۔

ڈاکٹر روتھ نے پاکستان میں قائم افغان کیمپس میں بھی خاصا کام کیا۔ افغانستان اور پاکستان کے یورش زدہ علاقوں کے باسی اُسے پہچانتے تھے اور بہت احترام سے پیش آتے تھے۔

ہاں، اِس طویل سفر میں اسے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس کی نیک جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لیے راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کی گئیں لیکن وہ بغیر رُکے کام کرتی رہی۔ ابلاغی رکاوٹیں بھی جذبے کے آگے بند باندھنے میں ناکام رہیں کہ وہ محبت سے لبریز تھی جو ایک آفاقی زبان ہے، جسے دنیا کے ہر کونے میں یکساں طور پر سمجھا اور بولا جاتا ہے۔

وہ اپنا مشن جاری رکھنا چاہتی تھی لیکن 9/11 کے سانحے کے بعد افغانستان بدترین تباہی کی زد میں آگیا جس کی وجہ سے روتھ کا کام محدود ہوگیا۔ روتھ کو اِس بات کا دُکھ تھا کہ اب وہ افغانستان میں آزادی سے سفر نہیں کرسکتی تھی، لیکن خوشی تھی کہ اُس نے خدا کی مدد سے اپنے محدود وسائل کے باوجود بھرپور کوشش کی، جس کے مثبت نتائج سامنے آئے!

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آج روتھ کو ڈاکٹر روتھ فاؤ کے نام سے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ چاہنے والے احتراماً اسے ڈاکٹر فاؤ یا ادام فاؤ کہہ کر پکارتے ہیں۔

ضیاء دور میں صدر کی مُشیر مقرر ہونا ایک بڑی کامیابی تھی کیونکہ یوں روتھ کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اُسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ حکومتی سطح پر اُس کی کوششوں کا احترام کرتے ہوئے اِس انتہائی اہم مسئلے کی جانب سنجیدگی سے توجہ دی گئی۔

ضیاء حکومت کے خاتمے کے بعد نئی حکمرانوں نے بھی روتھ کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور اُسے بھرپور سپورٹ کیا۔ بے نظیر حکومت اور نواز شریف حکومت کے دونوں ادوار میں وہ حکومتی اداروں کے ساتھ جذام کا تعاقب کرتی رہی۔ 2000ء تک روتھ صدر کی مشیر کی حیثیت سے کام کرتی رہی، پھر گرتی صحت کے باعث اِس عہدے سے علیحدہ ہوگئی۔ اُسے خوشی تھی کہ اس عرصے میں اُس کے مشوروں پر عمل کیا گیا۔

یہ روتھ کی شب و روز کی محنت ہی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان میں، بین الاقوامی طور پر برتے جانے والے طبّی کلیوں کے مطابق جذام پر قابو پالیا گیا ہے!

کلیتاً اگر دس ہزار کی آبادی میں ایک یا ایک سے کم مریض سامنے آئے، تو صورتِ حال کو ''کنٹرولڈ'' تصور کیا جاتا ہے۔ جب اقوام متحدہ نے اِس فارمولے کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کو جذام سے پاک قرار دیا تو روتھ کی آنکھوں میں مسرت رقصاں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ عجیب و غریب مرض ہے، جس کے جراثیم کافی عرصے تک انسانی جسم میں رہتے ہیں جس کے سبب مکمل خاتمے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اسی لیے وہ آج بھی اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہے۔

اس وقت صدر کے علاقے میں قائم ''میری ایڈیلیڈ لپروسی سینٹر'' 80 بستروں پر مشتمل ہے۔ اِس ادارے کے تحت ملک بھر میں 156 کنٹرول سینٹر کام کر رہے ہیں، جن میں سے گیارہ کراچی میں ہیں۔ کراچی میں قائم سینٹرز کو چھوڑ کر دیگر کے انتظامی معاملات صوبائی حکومتوں کے ذمے ہیں، جب کہ ٹریننگ اور ٹیکنیکل سپورٹ MLCA ہی فراہم کرتا ہے۔ یہ ادارہ ٹی بی، آنکھوں کے امراض اور نشے کے عادی افراد کے لیے بھی مختلف پروگرامز پر کام کر رہا ہے۔

روتھ کے کارناموں کی جھلک میری ایڈیلیڈ لپروسی سینٹر کے اعداد و شمار سے بھی جھلکتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِس عظیم عورت نے کس پیمانے پر خدمات انجام دیں۔ اب تک ملک بھر سے مجموعی طور پر جذام کے 54 ہزار 960 مریض رجسٹرڈ ہوچکے ہیں، علاج میں کامیابی کی شرح 98 فی صد رہی۔ اِس وقت تقریباً 800 مریض مختلف سینٹرز میں زیرِ علاج ہیں، جب کہ سالانہ 400 نئے کیسز سامنے آتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر فاؤ کو لاتعداد اعزازات سے نوازا گیا۔

68ء میں جرمنی کی جانب سے اُسے ''دی آرڈر آف دی کراس'' سے نوازا گیا۔ پاکستان میں 69ء میں ''ستارۂ قائداعظم'' اور 79ء میں ''ہلال امتیاز'' اس کے حصے میں آئے۔ پھر روتھ کو ''ہلالِ پاکستان'' سے بھی نوازا گیا۔ فلپائن کی حکومت نے اُسے Ramon Magsaysay ایوارڈ کے لیے چُنا۔ 2004ء میں آغا خان یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ 2006ء میں حکومت پاکستان نے ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' اور 2010ء میں ''نشانِ قائداعظم'' سے نوازا۔ ''جالب امن ایوارڈ'' بھی ڈاکٹر روتھ کے حصے میں آیا۔ دیگر ممالک نے بھی اس کی خدمات کا اعتراف کیا۔

البتہ یہ فرشتہ صفت خاتون اعزازات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ اُس کے نزدیک مریض کا علاج اور صحت یابی اہم ہے۔ ہاں! اِس بات پر خوش ضرور ہے کہ اُس کی کوششوں کو سراہا گیا، یوں عوام کو جذام کی بابت معلومات حاصل ہوئی اور سماجی شعور بُلند ہوا۔

اب تک جرمن زبان میں لکھی ڈاکٹر روتھ کی نو کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ اس سلسلے کا آغاز 85ء میں ہوا تھا۔ اِن کتابوں کا مقصد لپروسی پروگرام کے لیے فنڈز حاصل کرنا تھا اور اِن ہی کتابوں کے توسط سے بین الاقوامی تنظیمیں اُن کے ادارے کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ایک کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔

☆☆☆

روتھ فاؤ پاکستان کو اپنا گھر کہتی ہے۔ اس 82 سالہ خاتون کی خواہش ہے کہ موت کے بعد اسے یہیں دفن کیا جائے۔ وہ شلوار قمیص ہی میں نظر آتی ہے۔ اخبارات تو باقاعدگی سے پڑھتی ہے، لیکن ٹی وی کم ہی دیکھتی ہے۔ نثر اور شاعری دونوں ہی شعبوں سے دلچسپی ہے۔ جرمن ادب مطالعے میں رہتا ہے۔

روتھ زندگی سے مطمئن ہے۔ اس کے بقول ''اگر دوبارہ زندگی ملی، تو پھر پاکستان آؤں گی، تاکہ انسانیت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرسکوں۔''

موت بردار

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

یہ خودساختہ سپرپاور خود ہی زخم لگاتے ہیں اور انگشت بدنداں بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تک نہیں سوچتے کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے کبھی کبھی خود بھی اسی گڑھے میں گرتے ہیں۔ اس دنیا کو بارود کے ڈھیر پر کھڑا کردینے کی سعی خود ان کے لیے بھی گلے کا پھندا ثابت ہوسکتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ ایک معمولی سی غلطی نے سب کی زندگی پر خط تنسیخ کھینچ دی تھی۔ وہ سب موت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ کچھ دیر کی بات تھی کہ ایٹمی راکٹ پھٹتے اور تابکاری کئی ممالک کو لپیٹ میں لے لیتی۔ روس میں گھبراہٹ اور امریکا میں اضطراب پھیل گیا تھا۔

ایک بڑے حادثے کی روداد جسے دبانے کی کوشش ہوئی تھی

کیپٹن آئیگور برائیانوف نے چائے کا گھونٹ بھرا اور سر کو کرسی کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس سفر پر نکلے اسے ایک ماہ ہوچکا تھا اور اس کے کانوں میں کسی اور قسم کی آوازوں کی بجائے صرف آبدوز کے انجن سے نکلنے والی بھاپ کی ''شوں شوں'' اور اس کے دو انجنوں کا شور ہی سنائی دیتا تھا۔ اس کی دنیا سمٹ کر صرف آب دوز کی سینٹرل کمانڈ پوسٹ تک رہ گئی تھی۔

یہ ایک نیچی چھت والا کمرا تھا جس میں بیس آدمی ڈیوٹی پر ہوتے تھے اور اتنے لوگوں کے ٹھنسے رہنے سے یہ کمرا گرم رہتا تھا۔ اس گرم فضا میں مشینوں کی گھوں گھوں اور مختلف قسم کے سوئچ آن آف کرنے کی آواز آتی رہتی تھی۔ یہ چھوٹی سی جگہ ایک ایٹمی میزائل بردار آبدوز کے کمانڈ سینٹر سے کہیں زیادہ کسی فیکٹری کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

یہ یکم 1986ء کا دن تھا۔ برائیانوف کی یہ آبدوز، کے 219 نیویارک سے بارہ سو ناٹیکل دور بحر اوقیانوس میں گشت کر رہی تھی۔ اس کا مشن امریکی ساحلوں پر گشت کرنا تھا۔ روس اس آب دوز کے ذریعے کسی بھی امریکی شہر پر فوری طور پر ایٹمی حملہ کرسکتا تھا۔

☆☆☆

1980ء کے وسط تک روس اور امریکا میں سرد جنگ شباب پر تھی۔ دونوں ملکوں میں وہ لوگ پوری طرح چوکس تھے جن کے ذمے ایٹمی میزائلوں کا استعمال تھا۔ جس علاقے میں

براٹیانوف گشت کر رہا تھا، وہ ناردرن سیکٹر کہلاتا تھا اور اب اس کی ڈیوٹی اختتام کے قریب تھی۔ اختتام کے بعد اسے جنوب کی طرف جزیرہ برمودا کا گشت لگانا تھی اور وہاں موجود آب دوز کی جگہ لینی تھی۔

اس پُرانی آب دوز کو بہت سے مسائل درپیش تھے جو کیپٹن براٹیانوف کو پریشان کر رہے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ کمپارٹمنٹ نمبر 6 میں تھا۔ آب دوز دس کمپارٹمنٹوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ نمبر 4، ایک بڑا سا کمرا تھا جس میں سولہ ''والٹ'' تھے اور ہر والٹ میں ایٹمی میزائل رکھے ہوئے تھے۔ والٹ پانچ فٹ قطر کا تھا جس میں آر ایس ایم 28 قسم کے ایٹمی میزائل نصب تھے۔ یہ میزائل جس قدر دشمنوں کے لیے مہلک تھے اسی قدر ان لوگوں کے لیے بھی خطرناک تھے جو ان کے قریب موجود تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میزائلوں کے راکٹ دو ایسے ایندھنوں سے چلتے تھے جو بڑی تیزی سے آگ پکڑ لیتے ہیں۔

میزائل رکھنے والے خانوں (Silos) میں پمپ لگے ہوئے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی خانے میں سمندر کا پانی داخل ہو جائے تو اسے فوراً باہر نکال دیا جائے کیونکہ اگر یہ پانی میزائل سے خارج ہونے والے نائٹروجن ٹیٹرا آکسائڈ سے مل جاتا تو اس کے نتیجے میں بننے والا تیزاب میزائل کی باڈی کو کھا جاتا اور میزائل آب دوز کے اندر ہی پھٹ سکتا تھا۔

اس روز آفیسر الیکسی پیٹراچ کوف سیل نمبر 6 میں پانی کے رساؤ کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ آب دوز نے جس روز اپنا سمندری سفر شروع کیا تھا، اس دن سے اس سیل میں پانی داخل ہو رہا تھا اور اس نے دو آدمیوں کی چوبیس گھنٹے یہ ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ سمندر کا پانی فوری طور پر باہر نکال دیا جائے لیکن اب یہ طریقہ بے کار ثابت ہو رہا تھا کیونکہ پانی زیادہ تیزی سے رِس کر اندر آ رہا تھا۔

کیپٹن ائیگور براٹیانوف کے لیے اس طرح کے مسائل سے نمٹنا اس کی ملازمت کا حصہ تھا، 36 سالہ کپتان ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اس کی گھنی بھوری مونچھیں اور گنج پن کی طرف مائل سر کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ پُرانے زمانے کا سمندری ڈاکو ہو۔ حالانکہ وہ بڑے ہی ٹھنڈے دماغ کا ایک تجربہ کار اور سمجھ دار آدمی تھا۔ ریڈیو الیکٹرونکس ایکسپرٹ سے ترقی کرتے ہوئے وہ ایٹمی آب دوز کا کپتان بنا تھا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کے بڑے افسران اسے جنگی چالوں کا ماہر خیال کرتے تھے جو آب دوزوں کے ساتھ اس طرح کھیلتا تھا جس طرح شطرنج کے مہروں سے کھیلا جاتا ہے۔

اسے ایک فکر یہ لاحق تھی کہ جب وہ کھلے سمندر میں جائے گا تو امریکی اسے دیکھ رہے ہوں گے۔ روسیوں کو اندازہ تھا کہ اگر ان کے پاس آبدوزوں کا بہت بڑا بیڑا ہے تو امریکا بھی ان سے پیچھے نہیں، اس کے پاس فضا سے نگرانی کے انتظام کے علاوہ ہائیڈروفون لائنس بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر اس نے آب دوزوں کا شکار کرنے والی آبدوزیں بھی بنالی ہیں جن کا زیرِ آب آواز سن لینے والا نظام اس قدر طاقتور ہے کہ کئی میل دور سے روسی آبدوز کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ روسیوں کو پتا بھی نہ چلا اور امریکی آب دوزیں ان کے سر پر پہنچ گئیں، لہٰذا کیپٹن براٹیانوف جانتا تھا کہ امریکا کی اعلیٰ ٹیکنالوجی کو مات دینے کے لیے اسے اپنا سارا علم بروئے کار لانا ہوگا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ اس نے سمندر کی گہرائی سے روس میں واقع اپنے کمانڈ اسٹاف سے بات کی۔ اسے پتا چلا تھا کہ ایک امریکی آب دوز اس کے پیچھے آ گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس نے عملے کو حکم کر دیا۔

''پلٹ کر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔ ہم امریکیوں سے اس وقت ٹکر لیں گے جب وہ سو رہے ہوں گے۔''

اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ روسی آبدوز چلتے چلتے یک لخت پلٹا کھائے گی اور اس کے پیچھے جو امریکی آب دوز آ رہی ہوگی، وہ یا تو ٹکرانے کا خطرہ مول لے گی یا اس خطرے سے بچنے کے لیے اپنا راستہ تبدیل کر لے گی یا پھر رک جائے گی۔ تیزی سے سفر کرتی آبدوز کو روکنے سے اس کا ''پروپیلر'' سمندر کے پانی میں جوار بھاٹا پیدا کرے گا جس سے پیدا ہونے والا شور روسی آبدوز کی صوت گیر آلات (Sonar) پکڑ لیں گے اور اس طرح امریکی آب دوز کی پوزیشن معلوم ہو جائے گی۔

روسی آبدوز ''کے۔ 219'' نے گہرائی کی طرف غوطہ لگایا اور سیدھی نیچے اُترتی چلی گئی جس طرح لفٹ نیچے جاتی ہے، کمانڈ پوسٹ کے اندر موجود عملے کے پاؤں فرش سے اکھڑ گئے۔ پھر آبدوز نے بالکل ایسے پلٹا کھایا جیسے کوئی طیارہ یک لخت مڑ کر واپس ہو جائے۔

☆☆☆

امریکی بحریہ کی آبدوز ''اگوسٹا'' بڑی خاموشی سے روسی آبدوز کا تعاقب کر رہی تھی جس وقت براٹیانوف نے اپنی آبدوز کو پلٹ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت امریکی آب دوز کا کمانڈر جیمز وان سکل بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ روسی آبدوز جس پوزیشن پر تھی، وہاں سے وہ بہ آسانی امریکی

آبدوز پر حملہ کر سکتی تھی۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ امریکی ایٹمی آبدوز کے اس اہلکار نے جو ''سونار'' مشین کو کنٹرول کرتا تھا، اونچی آواز میں خبردار کرنا شروع کر دیا۔

''روسی آبدوز پلٹ کر حملہ آور ہو رہی ہے۔''

وان سکل نے اپنی کرسی کے ہتھے زور سے پکڑ لیے جیسے وہ خود کو ٹکر لینے کے لیے تیار کر رہا ہو۔ اس نے سر گھما کر اپنے اردگرد عملے کی طرف دیکھا۔ وہ سب کے مضطرب چہروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وان سکل نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اسے ''دھماکے'' کی ہلکی سی آواز آئی۔

روسی آبدوز ''کے۔ 219'' کے عملے کو ایسا محسوس ہوا جیسے آبدوز ان کے پیروں کے نیچے سے نکل جائے گی۔ ان کے قدم فرش سے اکھڑ گئے تھے۔ ہر آدمی سہارے کے لیے ہاتھ چلانے لگا۔ کسی نے دروازے کا ہینڈل پکڑ لیا اور کسی نے دوسرے کا سہارا لینے کی کوشش چاہی، کوئی فرش پر بیٹھ گیا۔ آب دوز کی گھٹی گھٹی فضا میں الارم کی آواز گونج اٹھی۔ یہ الارم چھٹے خانے میں بج رہا تھا۔

☆☆☆

ویپن آفیسر پیٹراچ کوف نے سہارے کے لیے دروازے کا ہینڈل پکڑ رکھا تھا۔ وہ سیل نمبر 6 کی طرف بھاگا۔ سیل کے ساتھ بنی ہوئی سیڑھی پر چڑھا اور اوپر جا کر کنٹرول پینل کی طرف لپکا۔ اس نے جلدی سے کنٹرول پینل پر پمپ چلانے کا بٹن دبا دیا اور دوسرے ہاتھ سے الارم کا بٹن بند کر دیا لیکن الارم مسلسل بج رہا تھا...... وہ حیران ہو کر پھٹی پھٹی نظروں سے کنٹرول پینل کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ اس نے دھیان لگایا مگر یہ الارم وہ نہیں تھا جو پہلے بج رہا تھا بلکہ یہ ایک دوسرا الارم تھا۔ اس نے ایک بار پھر کنٹرول پینل کی طرف دھیان سے دیکھا۔ کیمیاوی لیک کی نشاندہی کرنے والی سرخ رنگ کی سوئی خطرے کے زون کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ سمندر کا پانی میزائل سے لیک ہونے والے کیمیکل سے مل رہا تھا اور کسی وقت بھی میزائل پھٹ سکتا تھا۔ سیل نمبر 6 میں نائٹرک ایسڈ بن رہا تھا جسے آخر کار میزائل میں سرایت کر جانا تھا۔ سمندر کے اس مقام پر روس کا ایٹمی راکٹ پھٹ جانے سے تباہی کا منہ کھلنے والا تھا۔ دھماکا کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔

پیٹراچ کوف نے انٹرکام مائیکروفون پکڑ لیا اور جلد جلد اعلان کرنے لگا۔ ''ٹیوب نمبر 6 میں سمندری پانی داخل ہو رہا ہے اور یہاں گیس بن رہی ہے۔''

آبدوز کو اوپر اُٹھنے کے لیے ایک جھٹکا محسوس کیا۔ جس وقت وہ اوپر اُٹھ رہی تھی، پیٹراچ کوف کا ہاتھ کنٹرول پینل اس سرخ بٹن پر تھا جس پر جلی حروف میں ''6'' لکھا تھا۔ اس کے سرخ رنگ کا ہینڈل بھی تھا جو چھ نمبر ٹیوب کا ڈھکن کھولتا تھا۔ پیٹراچ کوف بٹن دبا کر ڈھکنا کھولنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس دوران کیمیکل کے ری ایکشن سے بننے والے دھوئیں کی نشاندہی کرنے والا الارم بجنے لگا۔ میزائل روم کا عملہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کہ کہیں گیس پوری آبدوز میں نہ پھیل جائے، میزائل روم کے راستوں کے ڈھکن بند کر دیے گئے۔ پیٹراچ کوف انٹرکام کے ذریعے پریشان عملے کو تسلیاں دے رہا تھا مگر وہ آنے والے خطرے سے پوری طرح باخبر تھے۔

آبدوز سطحِ آب کی طرف اُٹھنے کی حالت میں تھی اور اس کا منہ اوپر کی طرف ہو چکا تھا۔ اسی لمحے جب براٹیانوف نے آبدوز کے اگلے حصے میں سے دھماکے کی آواز سنی۔ دھماکے سے آبدوز خشک پتے کی طرح کانپنے لگی۔ میزائل والے خانے کا ڈھکن اُڑ کر معلوم نہیں کہاں جا گرا تھا۔

سیل نمبر 6 میں ایٹمی میزائل کے راکٹ سے ایندھن لیک ہو رہا تھا۔ جب سے آبدوز روس سے چلی تھی۔ سمندری پانی کے ساتھ ملنے سے جو کیمیائی ''تعامل'' ہوا، اس سے راکٹ پھٹ گیا لیکن یہ امریکا کی خوش قسمتی ہی تھی کہ سیل نمبر 6 میں رکھے ہوئے دو ایٹم بم پھٹنے سے محفوظ رہے۔ جونہی راکٹ پھٹا، اس کے ٹکڑوں کے ساتھ یہ دونوں ایٹم بم بھی سمندر میں جا گرے اور تابکار مادہ اس کے اوپر پھیل گیا۔ دھماکے کے بعد آبدوز نے اوپر اُٹھنا بند کر دیا۔ براٹیانوف نے محسوس کیا کہ یہ عملے کے کنٹرول سے نکل گئی ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ آبدوز کنٹرول سے باہر ہو چکی تھی اور اس کا رُخ شمالی بحرِ اوقیانوس کی ساڑھے تین میل کی گہرائی کی طرف ہو گیا تھا۔

دھماکے سے پیدا ہونے والا ارتعاش ختم ہوا تو امریکی آبدوز ''اگوسٹا'' پر صوت گیر مشین کنٹرول کرنے والے افسر نے کپتان کو اطلاع دی کہ کسی خالی ٹیوب نما چیز میں پانی داخل ہونے کی آواز آ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا تھا کہ روسی ایٹمی آبدوز، ایٹمی میزائل فائر کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو وان سکل کو اسے تارپیڈو مار کر غرق کر دینا چاہیے تھا۔ روسی آبدوز کو تارپیڈو مار دینے کا مقصد امریکی شہروں کو ایٹمی حملے کی تباہی سے بچانا تھا۔

صوت گیر مشین کنٹرول والے افسر نے دوبارہ کنٹرول

پینل کی طرف دیکھا۔ اسے سمندر میں دو چیزیں نظر آرہی تھیں، ایک روسی آبدوز، دوسرا ایٹمی میزائل۔ وان سکل نے روسی آبدوز کو اپنے نشانے پر لے لیا۔ کسی بھی لمحے روسی آبدوز پر فائر کرکے اس کے پرخچے اڑا دیے جاسکتے تھے لیکن صوت گیر مشین کنٹرول کرنے والے افسر نے وان سکل کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اسے یوں لگا جیسے روسی آبدوز کا ایٹمی میزائل پانی میں تیر رہا ہو۔ ساتھ ہی ایسی آوازیں آنا شروع ہوگئیں جیسے کشتی بڑی تیزی سے اپنے ''بلاسٹ ٹینکوں'' سے پانی خارج کررہی ہوتا کہ وہ ہلکی ہوکر اوپر اٹھ جائے۔ سونار چیف کو محسوس ہوا کہ یہ روسی آبدوز خود کو تباہی سے بچانے کی جنگ لڑ رہی ہے۔

امریکی ایٹمی آبدوز کی کمانڈ پوسٹ میں نصب ''ہائیڈرفونز'' سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی غرارے کررہا ہو۔ یہ آواز روسی آبدوز کے ڈوبنے کی آواز جیسی تھی۔ اس کے ساتھ آبدوز کے اندر پانی داخل ہونے اور بڑے بڑے بلبلے پیدا ہونے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ان آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ روسی آبدوز میں موجود عملہ سخت مصیبت میں ہے اور لوگ موت سے ہمکنار ہورہے ہیں۔ وان سکل سوچ میں پڑ گیا۔ روسی بھی آخر اس جیسے لوگ ہی تھے اور وہ اس کے بالکل قریب مر رہے تھے اور وہ ان کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

اس کی سوچوں کا دائرہ پھیلتا گیا۔ وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ روسی آبدوز کا ایٹمی ری ایکٹر پھٹ گیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اردگرد تابکاری پھیل جائے گی اور یہ ایک بڑا تباہ کن مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ اسے امریکی آبدوز ''تھریشر'' کا واقعہ یاد آنے لگا جس نے ایک مشن کے دوران جب غوطہ لگایا تو اس کا ایٹمی ری ایکٹر پھٹ گیا تھا، اس کے بعد وہ سطح پر نہیں آسکی تھی اور سمندر کی گہرائیوں میں دفن ہوگئی تھی۔ ان سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اس نے اپنے عملے کو آب دوز سطح سمندر پر لانے کا حکم دیا۔ وہ اپنے افسروں سے بات کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

روسی آبدوز اس وقت تین سو فٹ سے زیادہ گہرائی میں تھی جب براٹیانوف نے اپنے عملے سے کہا کہ مرکزی بلاسٹ ٹینکوں سے پانی خارج کردیا جائے، اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے عملے کے 119 ارکان کو زندہ سلامت روس پہنچائے گا خواہ اس کے لیے اسے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

مرکزی بلاسٹ ٹینکوں سے جونہی پانی خارج ہوا، آبدوز نے اوپر اٹھنا شروع کردیا۔ اس وقت اس میں دھماکے ہوئے دو منٹ گزر چکے تھے۔ وہ سطح سمندر پر تو آگئی لیکن براٹیانوف جانتا تھا کہ ابھی خوشی کا موقع نہیں آیا۔ کیونکہ دوسری کئی خرابیوں کے الارم بج رہے تھے۔ انہی الارموں کی آواز کے درمیان انٹرکام پر ایک آواز ابھری، بولنے والا ''ربڑ ماسک'' کے اندر سے بول رہا تھا۔

''کمپارٹمنٹ نمبر 4 میں دھواں بھر چکا ہے، کچھ نظر نہیں آرہا اور پیٹراچ کوف بے ہوش ہوچکا ہے۔'' اس اعلان کے بعد انٹرکام خاموش ہوگیا اور چند سیکنڈ بعد وہی آواز پھر ابھری۔ ''یہاں سخت گرمی ہوگئی ہے۔ ہر طرف دھواں ہے یا زہریلی گیس، خدا کے لیے یہاں سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔''

براٹیانوف نے مائیکروفون سنبھال لیا۔

''عملے کے تمام ارکان آکسیجن ماسک پہن لیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کمپارٹمنٹ نمبر 4 کی طرف ایک امدادی ٹیم روانہ کردی۔

میزائل روم کے باہر آب دوز کا ڈاکٹر آئیگور کوچ اندر جانے کی تیاری کررہا تھا۔ اس نوجوان ڈاکٹر کو طبی امداد پہنچانی تھی، آکسیجن ماسک چڑھائے کوچ جن نے کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکا جو بھورے رنگ کی دھند سے بھرا ہوا تھا۔ یہ زہریلی گیس تھی جو پھیلتی ہی جارہی تھی۔ اس نے اندر جانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ نیا حکم آگیا۔

''کمپارٹمنٹ نمبر 7 کی طرف جاؤ۔ وہاں دو ملاح بے ہوش ہوچکے ہیں۔ کوچ جن نے وہاں جاکر دیکھا کہ ان دونوں کے نتھنوں اور منہ سے سرخ رنگ کا جھاگ نکل رہا ہے۔ اسے فوراً اندازہ ہوگیا کہ یہ نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ کا زہر چڑھ جانے کی علامت ہے۔ یہ تیزاب تو میزائل کی باڈی بھی کھا جاتا ہے، وہ انسان کے پھیپھڑوں کا کیا حشر کرتا ہوگا۔ کوچ جن نے جان بچانے والی دوا اسٹیرائیڈ اور سولوکار ٹیف سرنج میں بھری اور ایک ملاح کے گیلے سوٹ کے اوپر ہی سے بازو میں اُتار دی۔ یہی عمل اس نے دوسرے ملاح کے ساتھ کیا۔ ٹیکے کا دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا، تب کوچ جن نے ان کی دل کی مالش کرکے انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش بیکار گئی، کچھ ہی دیر بعد منہ سے نکلنے والی جھاگ خون کی رنگت میں تبدیل ہوگئی اور دونوں ملاح جان کی بازی ہار گئے۔

امدادی ٹیم کمپارٹمنٹ نمبر چار میں پہنچی تو وہاں پیٹراچ کوف نظر آیا جو آب دوز کے فرش پر گرا ہوا تھا۔ ٹیم کے ارکان

اس کی طرف لپکے اور اسے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ پیٹراچ کوف کا جسم ان کے ہاتھوں میں لٹک گیا کیونکہ وہ مرچکا تھا۔ انہوں نے اسے وہیں لٹادیا اور ٹیم کے ارکان کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے کمرے کا ڈھکن نما دروازہ بند کردیا اور وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک آدمی نے ڈھکنے سے باہر سر نکالا اور بھوری گیس کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے تین بار ڈھکن بند کیا مگر گیس نکلنا بند نہ ہوئی۔ چوتھی بار ڈھکن کھول کر دیکھا تو پتا چلا کہ ربڑ کی سیلیں نائٹرک ایسڈ سے گل چکی ہیں۔ براٹیانوف کو خوف لاحق ہوا کہ ایندھن اور سمندری پانی کے ملاپ سے پیدا ہونے والا تیزاب آبدوز کی باڈی کاٹ ڈالے گا۔ دھماکے کی جگہ کے قریب انجنوں، میزائلوں اور ایٹمی ری ایکٹروں کا نظام کا کیا حال ہوگا؟ یہ خیال ہی روح فرسا تھا۔

اس کے حکم پر ایک آدمی نے مکمل حفاظت کا سوٹ پہنا اور کمپارٹمنٹ نمبر 4 میں ہونے والے نقصان کا جائزہ لینے چلا گیا۔ وہ جلد ہی ایک بڑی بُری خبر لے کر آیا کہ کمپارٹمنٹ نمبر 4 میں فرش پر آگ پھیل رہی ہے۔ براٹیانوف کو خدشہ تھا کہ حدت کے بڑھ جانے سے راکٹ کے ایندھن کو آگ لگ سکتی ہے۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا۔

☆☆☆

واشنگٹن میں اس وقت صبح کے سات بج کر چند منٹ ہوئے تھے جب وائٹ ہاؤس کے ''سچویشن روم'' میں فون کی گھنٹی بجی۔ اس مرکز کے انچارج کمانڈر مائیکل بوہن نے گھنٹی کی آواز سنتے ہی ریسیور اُٹھالیا۔ وہ آج اس ڈیوٹی پر جلد ہی آگیا تھا کیونکہ اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ صدر ریگن اور روسی صدر میخائل گورباچوف کے درمیان مذاکرات ہونے والے تھے اور دونوں ملک تیاریوں میں شب و روز مصروف تھے۔ صدر ریگن تیاری کے لیے کیمپ ڈیوڈ چلے گئے تھے اور بوہن انہیں دنیا کے ہر معاملے سے لمحہ بہ لمحہ باخبر رکھے ہوئے تھا۔

بہر طور کمانڈر مائیکل بوہن نے ریسیور اُٹھایا تو دوسری طرف چیف نیول آپریشنز کے دفتر کا ایک اعلیٰ افسر مخاطب تھا۔ وہ بوہن کو صبح بخیر کہتے ہوئے بولا۔

''برمودا کے ساحل کے قریب روس کی ایک ایٹمی آبدوز میں دھماکا ہوا ہے اور غالباً اس کا ایک میزائل پھٹا ہے...... ہم آپ کو آگاہ کررہے ہیں۔''

بوہن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

''ٹھیک ہے، تم اس کی مفصل رپورٹ مجھے پہنچاؤ۔ میں صدر ریگن کو آگاہ کرتا ہوں۔''

بوہن نے ریسیور رکھ دیا اور کرسی سے اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اس کا رُخ قومی سلامتی کونسل کے مشیر وائس ایڈمرل پوائنڈ یکسٹر کے دفتر کی جانب تھا جو وائٹ ہاؤس کی اوپری منزل پر واقع ہے۔

خبر سن کر پوائنڈ یکسٹر کے ماتھے پر شکن نمودار ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ اس نے بوہن کو چند ہدایات دیں اور بوہن نے وہیں سے جگہ جگہ فون کرنے شروع کردیے۔ نصف گھنٹے سے بھی کم عرصے میں امریکا کے جاسوس سیاروں اور طیاروں نے روسی آبدوز کی تصویریں اور ویڈیو فلم پہنچادیں۔ ان میں روسی آبدوزوں کی حالت واقعی خراب نظر آرہی تھی۔ اس کے میزائلوں والے حصے میں ایک بڑا سوراخ دکھائی دے رہا تھا جس میں سے زردی مائل دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔ بوہن اور پوائنڈ یکسٹر تصاویر دیکھ ہی رہے تھے کہ وزارت خارجہ نے روس کا ایک پیغام وائٹ ہاؤس پہنچادیا جس میں روسیوں نے بتایا تھا کہ برمودا کے شمال مشرق میں چھ سو میل دور ایک روسی آبدوز میں آگ لگ چکی ہے اور وہ خطرے سے دوچار ہے۔ روسیوں نے تسلیم کیا کہ اس پر ایٹمی میزائل موجود ہیں لیکن ان کے پھٹنے یا ایٹمی تابکاری پھیلنے کا کوئی خطرہ نہیں، کوئی میزائل حادثاتی طور پر چلے گا بھی نہیں اور ہمارے امدادی جہاز اس طرف بڑھ رہے ہیں۔

پوائنڈ یکسٹر نے صدر ریگن کو فوراً صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے تصاویر روانہ کردیں۔ ریگن نے پوائنڈ یکسٹر کو ہدایت کی کہ وہ روسی صدر کو مدد کرنے کی امریکن خواہش سے آگاہ کرے۔ پوائنڈ یکسٹر نے اس وقت گورباچوف سے رابطہ قائم کیا۔

☆☆☆

روسی آبدوز جونہی سطح آب پر آئی، کمانڈر براٹیانوف نے اس کو پہنچنے والے نقصان کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے حکم پر چیف انجینئر سیڑھی کے راستے برج میں داخل ہوا۔ وہاں سے دوسری سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھ کر اس نے مین ٹرنک کا دروازہ کھول دیا۔

روسی بندرگاہ سے روانگی کے بعد پہلی بار چیف انجینئر نے کھلی فضا میں سانس لیا تھا اور سمندر کی تازہ، ٹھنڈی، نمکین ہوا اسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ آبدوز کے پچھلے عرشے پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے سیٹی کی آواز نکل گئی ''او خدا......!''

میزائل رکھنے والے خانہ نمبر 6 کی جگہ ایک بڑا سا

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in. just visit www.paksociety.com for complaints and issues send mail at admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

شگاف تھا۔ سمندر کی لہر آبدوز کے اوپر سے گزرتی تو اس میں پانی داخل ہو جاتا۔ سوراخ میں بار بار پانی داخل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ میزائل راکٹ کے ایندھن اور اس کے ملاپ سے مسلسل تیزاب بن رہا ہے اور اس سے زہریلا دھواں خارج ہو رہا تھا۔ کپتان کے حکم پر آبدوز کا عملہ اس وقت کمپارٹمنٹ نمبر 8 میں پناہ لے چکا تھا۔ کمپارٹمنٹ نمبر 7 میں گیس بھر جانے سے ایٹمی ماہرین نکولائی بیلی کوف اور انجینئر سی مین سرجئی پریمانن بھی وہاں سے نکل آئے تھے۔

سرجئی پریمانن کا یہ دوسرا بحری سفر تھا۔ اسے انجینئر نگ اسکول سے فارغ ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اکیس برس کے اس نوجوان کا تعلق ایک پسماندہ گاؤں سے تھا جہاں ایک سال پہلے ہی بجلی آئی تھی۔ پریمانن اور اس کے بھائی نے دیہی زندگی چھوڑ کر بحریہ میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور دونوں یہاں ملازم ہو گئے تھے۔ بحریہ میں سب میرین سروس بہت ممتاز تصور ہوتی تھی لہٰذا پریمانن نے اس میں شامل ہونے کے لیے محنت کی۔

جب یہ حکم آیا کہ سب لوگ کمپارٹمنٹ نمبر 8 میں چلے جائیں تو پریمانن اور بیلی کوف بھی دوسروں کے ساتھ ہو لیے۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ انٹر کام پر اٹیانوف نے ان سے کہا کہ آبدوز ایٹمی ری ایکٹر کا نظام درست طریقے سے بند نہیں ہوا، وہ چار پرزے جو اس نظام کو مکمل طور پر بند کرتے تھے، اپنی جگہ نہیں تھے۔ میزائل روم میں لگنے والی آگ نے ری ایکٹر کو کنٹرول کرنے والے تاروں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔

روس میں چرنوبل ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی کا تازہ تازہ واقعہ رونما ہوا تھا اور براٹیانوف نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ایٹمی آبدوز بھی ایک ایسے ہی حادثے کا باعث بن جائے۔ اگر ایٹمی ری ایکٹر پگھل گیا تو یہ بہت بڑے آتشیں گولے کی شکل میں آبدوز کا جسم کاٹتا ہوا اس سے باہر نکل کر سمندر میں جا گرے گا اور ایک تابکار دھواں پیدا ہو گا جو بحر اوقیانوس کے ایک بڑے حصے پر چھا جائے گا۔

خوش قسمتی سے آبدوز میں متبادل نظام بھی موجود تھا۔ براٹیانوف نے اس سے کام لینے کا حکم جاری کیا اور انٹر کام پر بیلی کوف سے کہا کہ وہ ری ایکٹر کو بند کرنے کا متبادل نظام حرکت میں لے آئے، اس نظام کے ذریعے ”ایٹمی چین ری ایکشن“ کا عمل روکا جا سکتا تھا۔ اس نظام کی قباحت صرف یہ تھی کہ اسے ہاتھ سے حرکت دی جاتی تھی۔ ایک آدمی ری ایکٹر کے اوپر جا کر ہاتھ سے ایک خصوصی آلے کے ذریعے چار اسکریو ڈھیلے کرتا تھا۔

جب براٹیانوف نے انٹر کام پر اس نظام کو حرکت میں لانے کا حکم دیا تو بیلی کوف نے کہا کہ وہ خود جا کر یہ کام سرانجام دے گا۔ اس وقت وہ ساٹھ دوسرے افراد کے ہمراہ کمپارٹمنٹ نمبر 8 میں تھا۔ اسے علم تھا کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر جگہ زہریلی گیس پھیل چکی تھی۔ ری ایکٹر تک جانے کے لیے اسے آکسیجن ساتھ لے جانے کی ضرورت تھی، اس کے ساتھی چھ سلنڈر لے آئے، ان میں سے ہر ایک پندرہ منٹ تک کام دے سکتا تھا۔

اس نے سلنڈر کندھے پر لادا، ماسک چڑھایا اور ری ایکٹر کی طرف چل پڑا۔ اس وقت پریمانن نے بھی ساتھ جانے کے لیے ضد کی لیکن بیلی کوف نے اسے روک دیا، اس نے پریمانن کو سمجھایا کہ اگر میں یہ کام ختم نہ کر سکا تو تم یہ کام کر گزرنا، ری ایکٹر کمپارٹمنٹ نمبر 8 کے برابر ہی تھا۔

بیلی کوف نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ اسے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ یہ آواز معمول کی آواز نہیں تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اب یہ دروازہ شاید دوبارہ نہیں کھلے گا لیکن اس نے اسے اپنا واہمہ خیال کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

آبدوز کے دونوں ایٹمی ری ایکٹر کمپارٹمنٹ نمبر 7 کے نیچے واقع تھے۔ اس کمپارٹمنٹ میں سمندر کا بھورا پانی فرش پر پھیل چکا تھا۔ بیلی کوف نے ایک لاکر کا دروازہ کھولا۔ اندر سیف میں وہ آلہ تھا جس کے ذریعے اسے نٹ کھولنے تھے۔ معاً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ سیف کی چابی نہیں لایا تھا۔ واپس جانے کا مطلب وقت اور آکسیجن دونوں کا زیاں تھا۔ اس نے کمرے کی دیوار سے آویزاں وہ کلہاڑی اُتار لی جو آگ بجھانے کی صورت میں فائر مین استعمال کرتے ہیں۔ کلہاڑی کی ضرب سے تالا ٹوٹ گیا۔ بیلی کوف نے سیف میں سے قیمہ بنانے والی مشین کی شکل کا ٹھوس فولادی ہینڈل نکالا۔ یہی وہ آلہ تھا جس سے ری ایکٹر کو بند کرنے والے نٹ کھولے جاتے تھے۔

بیلی کوف اس تنگ سے راستے کی طرف بڑھا جو ری ایکٹر کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے کے منہ پر ایک دائرہ نما دروازہ کھلتا تھا۔ بوتل کے ڈھکن کی طرح، اس کے درمیان شیشہ لگا ہوا تھا جس سے ری ایکٹر نظر آتا تھا۔ اس دروازے سے باہر درجۂ حرارت 38 ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔

بیلی کوف نے دروازہ کھولا تو گرمی کا ایک بھبکا باہر نکلا جس کی حدت سے وہ سمٹ گیا اور اپنے جسم کو مزید سمیٹ کر وہ

ڈھکن نما دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اب وہ ایٹمی ری ایکٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ یہاں بے پناہ گرمی تھی۔ وہ ری ایکٹر کی طرف بڑھا جس کے باہر چھ کونوں والے ساکٹ نظر آرہے تھے۔ اسے ان ساکٹوں کے نٹ ڈھیلے کرنے تھے۔

بیلی کوف نے وہ آلہ ایک ساکٹ میں پھنسادیا، نٹ آلے کے اندر پھنس گیا۔ اس نے اسے ڈھیلا کرنے کے لیے جھٹکا دیا لیکن کوئی جنبش نہیں ہوئی، نٹ جام ہوچکا تھا۔ سخت گرمی کے باعث نٹ اور ری ایکٹر کی باڈی ایک ہوچکے تھے۔ بیلی کوف نے اپنے جسم کا تمام تر بوجھ آلے پر ڈال دیا۔ نٹ تھوڑا سا کھسکا۔ مسلسل زور لگانے سے اس کا سر چکرانے لگا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ یکدم گھبرا کر اس نے آکسیجن سلنڈر پر لگے پیمانے کی طرف دیکھا، وہ تقریباً خالی ہوچکا تھا۔ اسے ہوا کی سخت ضرورت تھی اور فوراً یہاں سے نکل جانا تھا۔

بیلی کوف تیزی سے پلٹا۔ اس کا سانس ٹوٹ رہا تھا۔ ڈھکن نما دروازے پر اس نے آلہ دے مارا اور لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس کے گھٹنے جواب دے گئے۔ وہ بے دم ہوکر فرش پر گر پڑا۔ اس نے اپنے منہ پر سے ماسک کھینچ کر علیحدہ کیا اور گہرے سانس لینے لگا۔ اتنے میں پریمانن اس کے پاس پہنچ گیا اور پوچھنے لگا، کیا وہ نٹ ڈھیلے کر آیا ہے؟ بیلی کوف میں بولنے کی سکت نہیں تھی۔ اس نے صرف انکار میں سر ہلایا۔

پریمانن نے جلدی سے حفاظتی سوٹ پہنا۔ اپنی بیلٹ کے ساتھ دو آکسیجن سلنڈر لگائے اور ری ایکٹر کی طرف بڑھتا گیا۔ بیلی کوف نے طاقت جمع کی اور اُٹھ کر آکسیجن سلنڈروں کی طرف لپکا، ایک سلنڈر کاندھے پر تھا۔ ماسک چڑھایا اور پریمانن کے پیچھے پیچھے ری ایکٹر والے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اب ایک کے بجائے دو آدمی اس جہنم میں داخل ہوچکے تھے۔

پریمانن نے دوسرے نمبر کا نٹ ڈھیلا کرنا شروع کردیا۔ بیلی کوف نے پہلے نٹ پر زور آزمائی جاری رکھی جو اب ڈھیلا ہوچکا تھا۔ بیلی کوف نے باہر جاکر سینٹرل کمانڈ پوسٹ کو اطلاع کردی اور اس کے بعد وہ ری ایکٹر کی طرف واپس آیا۔

اس نے دیکھا کہ پریمانن کی حالت اچھی نہیں، ری ایکٹر کے کمرے کی گرمی انہیں بے دم کیے دے رہی تھی لیکن وہ اس وقت تک اپنا کام کرچکا تھا۔ بیلی کوف اسے سہارا دے کر ڈھکن نما دروازے کی طرف لایا، اسے باہر نکال دیا اور پھر خود تیسرا نٹ ڈھیلا کرنا شروع کردیا۔ سخت جدوجہد کے بعد وہ اسے ڈھیلا کرنے میں کامیاب تو ہوگیا مگر خود اس کی اپنی ہمت جواب دے گئی، تاہم اپنی بچی کھچی توانائیاں مجتمع کرکے وہ تیزی سے باہر کے راستے کی طرف لپکا اور چند سیکنڈ بعد وہ باہر آچکا تھا۔ عین اس وقت براٹیانوف کی آواز انٹرکام پر گونجی۔

''میں چاہتا ہوں کہ ایٹمی ری ایکٹر اسی وقت بند کردیا جائے۔''

یہ آواز سن کر پریمانن اُٹھ کھڑا ہوا۔ فرش پر پڑا آلہ اُٹھایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دوبارہ ری ایکٹر میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

امریکی بحریہ کی آب دوز ''اگوسٹا'' پر کپتان وان سکل اور اس کے ساتھی ان خیالوں میں گم تھے کہ روسی آب دوز میں کیا ہوا ہے؟ انہوں نے یہ تو دیکھا تھا کہ اس میں سے ایک میزائل باہر نکلا تھا پھر پتا چلا کہ روسی آبدوز بھی سمندر کی تہ میں بیٹھ گئی ہے مگر دوبارہ بڑی خاموشی سے پانی کی سطح پر آکر تیرنے لگی ہے۔ وان سکل نے بہتر یہی جانا کہ وہ اپنی آبدوز کو محفوظ فاصلے تک لے جائے۔ اس نے ایک بار پھر اپنی ''پیری اسکوپ'' سے آنکھ لگادی۔ اسے روسی آب دوز سے دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا اور پھر یکا یک چند روسی بحری جہاز نظر آئے جو آبدوز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

پریمانن جب دوبارہ ری ایکٹر میں داخل ہوا تو کمپارٹمنٹ نمبر 7 گرم ہوا سے بھرے ہوئے ایک غبارے کے مانند ہوچکا تھا۔ اس نے ری ایکٹر کے کریک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسے اپنی جگہ کردیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

مرکزی کمانڈ پوسٹ میں کیپٹن براٹیانوف انتظار کررہا تھا کہ کس وقت ری ایکٹر مکمل طور پر بند ہوتا ہے۔ اس نے انٹرکام پر پریمانن کو آواز دی۔

''سر جی...... کام ہوگیا؟''

پریمانن کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ براٹیانوف نے اسے دوبارہ پکارا۔

''پریمانن......'' براٹیانوف کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ پریشان ہوگیا۔

انتظار کے لمحے طویل ہوگئے۔ لاؤڈ اسپیکر پر ایک کمزور سی آواز ابھری ''کامریڈ کمانڈو...... ری ایکٹر بند ہوچکا ہے۔''

کمانڈ پوسٹ میں تعینات عملے کے چہرے کھل اُٹھے۔

انہیں اپنے ساتھی پریمانن پر فخر تھا جس نے ایٹمی آبدوز ہی کو نہیں بلکہ پورے عملے کو بچالیا تھا۔

ادھر پریمانن ری ایکٹر بند کرنے کے بعد باہر نکلا اور لڑکھڑاتے ہوئے کمپارٹمنٹ نمبر 8 کی طرف چل دیا۔ اس نے بوتل نما شکل کا دروازہ کھولنے کے لیے اس کا ہینڈل کھینچا تو دروازہ نہیں کھلا۔ وہ جام ہوچکا تھا۔

پریمانن نے مائیکروفون اُٹھایا ''میں کمپارٹمنٹ نمبر 8 سے باہر نکلنے کا دروازہ نہیں کھول سکتا۔'' اس کی آواز میں تحیر تو تھا لیکن خوف نہیں تھا۔

''آکسیجن ختم ہورہی ہے...... ختم ہوگئی ہے......'' کچھ دیر بعد آواز آئی۔

کمرے سے باہر اس کے ساتھیوں نے دروازے کے نیچے جیک لگایا۔ جیک بھی دروازہ نہیں کھول سکا۔ دراصل کمپارٹمنٹ نمبر 7 میں ہزاروں پونڈ ہوا کے دباؤ نے اسے بند کررکھا تھا۔ کمرے کے اندر اور باہر ہوا کا دباؤ جب تک برابر نہیں ہوتا۔ دروازہ کھل نہیں سکے گا، یہ سوچ کر براٹیانوف نے کمرا نمبر 8 میں دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا اور جونہی اس کے حکم پر دباؤ بڑھانا شروع ہوا، لوگ چیخیں مارنے لگے کیونکہ اس کے ساتھ ہی زہریلی گیس کمرے میں داخل ہونے لگی تھی۔ اب صرف ایک ہی حل باقی رہ گیا تھا کہ کمرا نمبر 7 میں دباؤ کم کیا جائے جہاں پریمانن موجود تھا۔ براٹیانوف نے مائیک سنبھالا اور پریمانن کو مخاطب کیا۔

''پریمانن، کیا تم ہوا خارج کرنے والا نظام چلا سکتے ہو؟'' کپتان کو کوئی جواب موصول نہیں ہوا البتہ کپتان کو اپنے کمرے میں لاؤڈ اسپیکر پر ٹک ٹک کی آواز سنائی دی، یہی پریمانن کا جواب تھا۔ شاید وہ بول نہیں سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے خود ہی پریمانن سے پوچھا ''کیا نظام کام کرنے لگا ہے پریمانن!''

ایک طویل خاموشی کے بعد پریمانن کی آواز آئی ''نہیں...... اس کے والوز جام ہوگئے ہیں۔''

اب لاؤڈ اسپیکر پر ٹک ٹک کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد براٹیانوف اور دوسرے لوگوں نے سر جھکا دیے۔

پریمانن مر چکا تھا۔

کمپارٹمنٹ نمبر 8 میں زہریلی گیس سے متاثر ہونے والوں کو طبی امداد دی جارہی تھی، گیس نے پھیپھڑے زخمی کردیے تھے جس کی وجہ سے ان کے نتھنوں سے خون آرہا تھا۔ تین آدمی پہلے مر چکے تھے اور چوتھا پریمانن تھا جس تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کمپارٹمنٹ نمبر 8 میں ہوا کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا جس کے باعث درجۂ حرارت ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ براٹیانوف کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آدمیوں کو کمپارٹمنٹ نمبر 9 اور 10 میں لے جائے جو آخری کمرے تھے۔ عملے کے 60 ارکان لڑکھڑاتے ڈولتے اپنے کپتان کے حکم پر ان کمروں کی طرف چل دیے۔ یہ بہت تنگ کمرے تھے۔ یہاں کچھ دیر رہنے کا مطلب دم گھٹ کر مرجانا تھا۔ پھر کپتان کے نئے حکم پر وہ اس جگہ جمع ہوگئے جہاں سے ہنگامی حالت میں آبدوز سے باہر نکلا جاتا ہے۔ اس جگہ ایک سیڑھی تھی جس کے آخری سرے پر گول سوراخ نظر آرہا تھا۔ یہی باہر جانے کا راستہ تھا اور اس وقت وہ باہر نکلنے کے لیے تیار تھے۔ براٹیانوف ان کے پاس کھڑا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ اگلے چند لمحوں میں اس کے منہ سے جو الفاظ نکلیں گے، وہ اسے تمام عمر یاد رہیں گے۔ اس نے مائیک سنبھالا اور بولنے لگا۔

''......ہنگامی حالت میں استعمال ہونے والے راستے سے باہر نکلو اور آبدوز چھوڑ دو۔''

یہ الفاظ سنتے ہی ایک ملاح نے قدم اُٹھایا اور سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ عملے کی نظریں اس کے پیروں پر لگی ہوئی تھیں جو اوپر اُٹھتے جارہے تھے۔ ملاح اس گول سوراخ کے ڈھکن تک پہنچ گیا تھا۔ ڈھکن اس ٹیوب نما راستے کا دروازہ تھا جو آبدوز سے باہر نکلنے کے لیے تھا۔ ملاح نے ڈھکن کے باہر لگا ہوا چھوٹا سا پہیہ گھمایا اور اس کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ کر اسے اوپر اُٹھایا۔ نیچے کھڑے عملے کی سانسیں جیسے رک گئیں۔ وہ ڈھکن کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ اگر یہ ڈھکن نہ کھلا تو ان کی زندگی کا خاتمہ تھا، یقینی خاتمہ۔ وہ اس آبدوز میں زندہ دفن ہوجاتے۔

ملاح نے دونوں ہاتھوں سے زور لگایا۔ ڈھکن ''کھٹاک'' کی آواز کے ساتھ اوپر کی طرف کھل گیا۔ عملے کے منہ سے اطمینان بھری ہمکاریاں خارج ہوگئیں۔ ملاح سوراخ میں داخل ہوگیا۔ یہ راستہ صرف اتنا تھا کہ ایک آدمی رینگ کر اس میں سے باہر جاسکتا تھا، بالکل اسی طرح جیسی کوئی سیوریج کے پائپ میں سے رینگ کر باہر نکل جائے۔ ایک ایک کرکے عملے کے ارکان باہر نکل گئے۔ آبدوز کے اوپری حصے پر کھڑے ہوکر انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ موت کے پنجے سے بچ نکلے ہیں۔ سمندر کی ہوا بالکل صاف تھی اور خوشبودار، آسمان نیلا اور بالکل صاف، دھوپ نکلی ہوئی، عملے کو احساس ہوا کہ وہ اس جگہ اکیلے نہیں، کیونکہ فضا

میں ایک طیارہ چکر لگا رہا ہے۔ یہ امریکی بحریہ کا پی تھری سی اورین طیارہ تھا جو بحری نگرانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ روس کے تین بحری جہاز بھی موجود تھے۔ ان جہازوں کی بھیجی ہوئی کشتیاں ان کی طرف آرہی تھیں۔ ان کے دیکھتے دیکھتے امریکی بحریہ کا ایک جہاز بھی آگیا۔ ایک روسی جہاز کے ساتھ لوہے کے رسے کے ذریعے آبدوز باندھ دی گئی۔ روسی جہاز نے حرکت کی اور لوہے کا رسہ تن گیا۔ آبدوز ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔

براٹیانوف سمندر میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے قریب ہی ایک پیری اسکوپ پانی کی سطح پر نظر آگئی۔ یہ امریکن بحریہ کی آبدوز ''اگوسٹا'' کی پیری اسکوپ تھی۔ وہ لوگ بھی یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

روسی جہاز آبدوز کو کھینچ رہا تھا اور اس کا رُخ روس کی طرف تھا۔ یکا یک ایک خوفناک آواز کے ساتھ لوہے کا رسہ ٹوٹ گیا۔

براٹیانوف اس وقت اپنے عملے کے ساتھ آبدوز کے اوپر کھڑا تھا۔ اس کے ریڈیو پر ماسکو سے پیغام آیا کہ عملہ آبدوز کے اندر چلا جائے۔

براٹیانوف نے خود آکسیجن ماسک پہنا اور آبدوز کے اندر چلا گیا۔ وہ سیدھا کمپارٹمنٹ نمبر 3 میں آیا اور اس نے ''سی کاک'' کھول دیے۔ آبدوز آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوبنا شروع ہوگئی۔ براٹیانوف اوپر آیا۔ اس نے اپنے آدمی روسی جہاز کی بھیجی ہوئی لانچ پر منتقل کردیے اور خود آبدوز پر کھڑا رہا جو ڈوب رہی تھی۔ اس کے آدمیوں نے لانچ پر سے دیکھا کہ براٹیانوف آبدوز کے برج کی طرف بڑھتا جارہا ہے۔ اس کے اوپر چڑھ کر اس نے روس کا قومی پرچم کاٹا اور اسے تہ کرکے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ پھر جان بچانے والی ربڑ کی کشتی پانی میں پھینکی اور اس میں چھلانگ لگادی۔ آبدوز پانی میں ڈوب گئی تھی اور اس کے ڈوبنے سے جو زبردست بھنور پیدا ہوا، براٹیانوف کی جان بچانے والی کشتی اس بھنور میں غائب ہوگئی۔ اس کے آدمیوں کے منہ سے چیخیں نکل پڑیں۔

سینئر لیفٹیننٹ کیپی ٹلسکی اس منظر کو برداشت نہ کرسکا اور اس نے لانچ کا رُخ اس بھنور کی طرف موڑ دیا اور قریب آکر اس میں چھلانگ ماردی۔ وہ سیدھا تہ میں اُترتا گیا۔ چند لمحے بعد ہی اس کی ٹانگ کسی سے ٹکرائی۔ اندھیرے میں اس نے ہاتھ مارا، اس کے ہاتھ میں بال آگئے پھر اس کے ہاتھوں سے چہرہ ٹکرایا۔ وہ اسے کھینچ کر اوپر لے آیا۔ یہ براٹیانوف ہی تھا۔

☆☆☆

روس میں براٹیانوف پر فرائض سے غفلت اور سبوتاژ کرنے کا الزام لگا۔ اس کے کورٹ مارشل کی باتیں ہونے لگیں۔ مگر پھر اسے الزامات سے بری کرکے نیوی کے ریزرو دستوں میں بھیج دیا گیا۔ البتہ بحریہ کے افسروں کی محفلوں میں وہ ناپسندیدہ افسر قرار پایا اور اس نے لوگوں سے ملنا جلنا بند کردیا۔

''کے۔ 219'' کے عملے کے باقی ارکان پھیپھڑوں کے امراض، جگر کی خرابی، نمونیا اور کئی بیماریوں کا شکار ہوگئے۔

☆☆☆

8 برس بعد 27 اگست 1994ء کو گزہائیو کے مقام پر مرجانے والے ملاحوں کی یاد میں تقریب منعقد ہوئی۔ یہاں بحریہ کے لوگ اور مرجانے والوں کے لواحقین جمع تھے۔ ایک یادگار تعمیر کی گئی جس پر کپڑا ڈالا ہوا تھا۔ قصبے کے میئر نے تقریب سے خطاب کیا اور ایک رسہ کھینچ کر یادگار پر سے پردہ ہٹا دیا۔ یہ یادگار پریمانن کی یاد میں بنائی گئی تھی، اسے بعد از مرگ روس کا بہادری کا سب سے بڑا ایوارڈ ''ریڈ اسٹار'' دیا گیا۔

فوجی بینڈ نے دھن چھیڑی اور پریمانن کے لواحقین اور دوست آگے بڑھے۔ انہوں نے یادگار پر پھول رکھ دیے۔ اس وقت ایک کونے سے ایک تنہا آدمی گلدستہ اُٹھائے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے یادگار کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھتے ہی حاضرین میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ وہ اسے پہچان گئے تھے۔ ''کے۔ 219'' کے ارکان میں سے کوئی زور سے چلّایا۔

''اٹینشن!'' عملے کے افسر اور جوان سلامی کے لیے کھڑے ہوگئے۔ وہ آدمی گلدستہ تھامے فوجی انداز میں یادگار کی طرف جارہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے پھول پریمانن کی یادگار کے قدموں میں رکھ دیے اور سیلوٹ کرکے واپس جانے لگا۔ اب اس کا چہرہ سیدھا جوانوں اور افسروں کی طرف تھا۔ کے۔219 کے افسروں اور جوانوں نے اس لمحے سلامی دی۔ یہ آدمی آئیگور براٹیانوف تھا۔ برسوں الگ تھلگ زندگی گزارنے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں میں واپس آیا تھا جن کے لیے اس نے اپنی ملازمت اور اپنا کیریئر ختم کرلیا تھا۔

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

قسط: 205

بہرحال، پاکستان کی فلمی صنعت آج اسی موڑ پر کھڑی ہے۔ فلم تقسیم کار اور سنیما اونر آج بھی اسی طرح بھارتی فلموں کی درآمد کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور اس کے حق میں عجیب وغریب دلیلیں پیش کررہے ہیں۔ وہ یہ بھول

گئے ہیں کہ وہ قوم ملک اور نظریہ پاکستان کے ساتھ دشمنی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ بھارتی فلمیں پاکستان میں ہندو کلچر اور بھارتی پروپیگنڈا پھیلا رہی ہیں اور اگر ان کی آمد اسی طرح جاری رہی تو ہماری نئی پود اور نوجوان نسل بھارتی کلچر میں سرتاپا رنگ جائے گی جو قائداعظم کے نظریۂ پاکستان کے خلاف ہے۔ اگر یہی ہونا تھا تو پھر ایک علیحدہ ملک بنانے کے لیے جدوجہد اور قربانیاں دینے کی کیا ضرورت تھی؟ آج بھارت میں مسلمانوں کی جو حالتِ زار ہے اس کو دیکھ کر ہندو ذہنیت کی مسلم دشمنی کے پیشِ نظر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ہندوستان متحد رہتا تو مسلمانوں کا کیا حال ہوتا؟ آج پاکستان میں مسلمانوں کو کیا کچھ حاصل نہیں ہے۔ حکومت، دولت، صنعت وتجارت، پولیس، فوج سب مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ پاکستانی کھلاڑی اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں، کیا پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا تو اس علاقے کے مسلمانوں کو یہ نعمتیں حاصل ہوتیں؟ اور پھر آزادی جیسی نعمت جس کے لیے دنیا میں کئی جگہ جدوجہد جاری ہے ...... قربانیاں پیش کی جارہی ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہم اس کی قدر ہی نہیں کرتے اور کیونکہ سب کچھ مل چکا ہے اس لیے تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی حالتِ زار کو فراموش کرچکے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہاں بھارتی فلموں کی نمائش سے فحاشی، عریانی اور بھارتی کلچر پھیلنے کے علاوہ صرف چند سو افراد اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ جب پاکستان میں فلمی صنعت عروج پر تھی تو ہزاروں افراد برسرِ روزگار تھے اور لاکھوں گھرانوں کے افراد خوش حال تھے، مگر اب یہ سب پائی پائی کو محتاج ہیں۔ کیا چند سو افراد کے فائدے کے لیے لاکھوں افراد اور ہزاروں گھرانوں کے گھروں میں اندھیرا کردینا جائز ہے؟ اتنی بے حسی اور قوم وملک کے مفادات سے بے تعلقی کسی بھی قوم کے لیے تشویش کا مقام ہے لیکن حکام اور چند مفاد پرست اپنے فائدے کے لیے سارے ملک اور قوم کے مستقبل کو داؤ پر لگانے کے لیے کوشاں ہیں، اللہ ہم پر رحم کرے۔

☆☆☆

برصغیر اور پاکستان کے فلمی نغمہ نگاروں کا جب تذکرہ کیا جاتا ہے تو ان میں ایک انتہائی اہم اور معتبر نام عموماً فراموش کردیا جاتا ہے۔ یہ شیون رضوی ہیں جن کی خدمات ہندوستان اور پاکستان کی فلموں میں بحیثیت نغمہ نگار بہت نمایاں ہیں لیکن کیونکہ وہ خاموش طبع، گوشہ نشین اور لیے دیے رہنے والے آدمی تھے اس لیے ان کا زیادہ شہرہ نہیں ہوا۔

شیون رضوی ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے ادب اور مشاعروں کے ذریعے شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں کی۔ وہ محض ایک فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سچویشن کے اعتبار سے نغمات لکھنے میں انہیں بہت مہارت حاصل تھی۔

31 مئی 2011ء کو ان کی 24 ویں برسی تھی۔ وقت کس تیزی سے گزرتا ہے، اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ان کا پاکستان آنا، فلمی گانے لکھنا اور پھر خود بھی فلم ساز وہدایت کار بن جانا کل کی بات لگتی ہے لیکن جب حساب لگایا تو ان کے انتقال کو 24 سال گزر چکے ہیں۔ آج ان کی یادیں تازہ کی جارہی ہیں۔ شیون رضوی کے بارے میں پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے لیکن ضروری ہے کہ ان کی یادوں کے حوالے سے ایک بار پھر ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔

شیون رضوی 1925ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں صرف 21 سال گزارنے کے بعد وہ 1946ء میں بمبئی چلے گئے اور کم وبیش 25 سال بمبئی میں گزارنے کے بعد وہ 1968ء میں پاکستان آئے تھے لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ آخر دم تک لکھنؤ کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کا نمونہ تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز، شائستگی، محفل میں گفتگو کرنے کا طریقہ، لوگوں سے میل ملاپ میں وضع داری اور رکھ رکھاؤ میں لکھنؤ کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بات کرتے ہوئے وہ عموماً اپنے منہ کے آگے رومال رکھ لیا کرتے تھے جو کہ دیکھنے والوں کو عجیب سا لگتا تھا لیکن یہ ان کی بچپن کی تہذیبی تربیت کا اثر تھا۔ انہیں کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے ہم نے نہیں دیکھا۔ البتہ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے اور لبوں پر بکھری ہوئی نظر آتی تھی۔

شیون رضوی خوش قسمت تھے کہ انہوں نے اپنی نغمہ نگاری کا آغاز برصغیر کے مایہ ناز ہدایت کار محبوب خان کی مشہور زمانہ فلم ''الہلال'' میں گیت نگاری سے کیا تھا۔ ''الہلال'' میں ان کی لکھی ہوئی قوالی جو اس زمانے کے مشہور قوال اسماعیل آزاد کی آواز میں پیش کی گئی تھی بھی مقبول ہے اور عرصہ دراز تک برصغیر کے معروف قوال بھی اس کو گاتے رہے۔ یاد کیجیے تو آپ کو بھی اس کے بول یاد آجائیں گے۔

ہمیں تو لوٹ لیا مل کے حسن والوں نے
کالے کالے بالوں نے، گورے گورے گالوں نے

یہ قوالی ان کی اور اسماعیل قوال کی شہرت کا سبب بن گئی اور اس حوالے سے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

شیون رضوی نے برصغیر کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' کے لیے بھی ایک نعت لکھی تھی۔ یہ فلم 1933ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی لیکن یہ نعت آج بھی گائی جاتی ہے جس کے بول ہیں۔

محبت کے جلوؤں سے روشن ہے دنیا
محبت میں یہ دل بنا ہے مدینہ

یہ نعت محمد رفیع نے گائی تھی۔ ان کی لکھی ہوئی یہ قوالی بھی ناقابلِ فراموش ہے۔

بگڑی مری بنادے اجمیر والے خواجہ
غم سے مجھے چھڑا دے، اجمیر والے خواجہ

شیون رضوی سچویشن کی مناسبت اور فلم کے ماحول کے مطابق نغمات تحریر کرتے تھے۔ موسیقار او پی نیر کی فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'' میں ان کا لکھا ہوا یہ نغمہ بہت پسند کیا گیا تھا۔

ہم کو تمہارے عشق نے کیا کیا بنادیا
جب کچھ نہ بن سکا تو تماشا بنادیا

انڈیا میں شیون رضوی نے بہت سی فلموں کے مقبول نغمات لکھے ہیں جن میں چند قابلِ ذکر یہ ہیں۔

ہنستے آنسو، میرے بھگوان، مہربانی، عرب کا ستارہ، دھرم، میرا اسلام، سیندور، ایکٹر، خونی لاش، [illegible] گیر، حقدار، جمنا پار، بھیدی، ٹیکسی ڈرائیور وغیرہ شامل ہیں۔

شیون رضوی کی شہرت کا ایک سبب سید شوکت حسین رضوی کی مشہور فلم ''زینت'' بھی بنی۔ شیون رضوی کی نغمہ نگاری میں اس فلم کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک گھریلو اور معاشرتی فلم تھی جسے سارے خاندان کے افراد دل کر دیکھتے تھے اور پسند کرتے تھے۔ وہ خواتین جو عام طور پر فلمیں نہیں دیکھا کرتی تھیں انہوں نے بھی ''زینت'' دیکھی اور مہینوں تک اس کے تذکرے کرتی رہیں۔ اس فلم میں زینت کا مرکزی کردار میڈم نور جہاں نے کیا تھا اور دراصل یہ ان ہی کی یعنی ایک عورت کی کہانی تھی جو طرح طرح کی مشکلات اور صعوبتوں سے دوچار ہوتی ہے۔ فلم دیکھتے ہوئے تمام خواتین کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے اور وہ آہیں بھرتے ہوئے ہیروئن کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی رہتی تھیں۔ یہ ایک ایسی فلم تھی جس نے ہندوستان میں معاشرتی اور اسلامی گھریلو فلموں کے لیے میدان ہموار کیا۔

اخبار کے ایڈیٹر کا ایک نوٹ

''متعجب نہ ہوں گر آپ کو اس اخبار میں کوئی غلطی نظر آجائے۔ ہم ہر ایک کی پسند کو ملحوظ رکھتے ہیں اور کچھ لوگ صرف غلطیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔''

مرسلہ: ارم، کراچی

زینت کے بیشتر نغمات شیون رضوی نے لکھے تھے حالانکہ اس زمانے میں ایک ہی فلم کے لیے کئی نغمہ نگار گیت لکھا کرتے تھے۔ اس فلم کے یوں تو سبھی گانے بے حد مقبول ہوئے تھے لیکن ایک گیت ایسا تھا جسے بے سُرے لوگ بھی گاتے نظر آتے تھے۔

آندھیاں غم کی یوں چلیں
باغ اجڑ کر رہ گیا

یہ گیت خود میڈم نور جہاں نے گایا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن کے تمام گانے ان ہی کے گائے ہوئے تھے۔

شیون رضوی پچیس سال تک بمبئی میں قیام کے بعد 1968ء میں پاکستان آگئے تھے اور ان کا پہلا پڑاؤ کراچی میں ہوا تھا۔ اس زمانے میں ہدایت کار قمر زیدی جو ہمارے بے تکلف دوست بھی تھے وہاں فلم ''سالگرہ'' بنا رہے تھے۔ اتفاق سے یہ بھی ایک معاشرتی فلم تھی۔ شیون رضوی نے پاکستان آکر سب سے پہلے فلم ''سالگرہ'' کے لیے نغمات لکھے۔ ناشاد نے ان کی طرزیں بنائی تھیں جو ہندوستان میں بھی شیون رضوی سے واقف تھے بلکہ اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ فلم سالگرہ کے نغمات نے سارے پاکستان میں دھوم مچادی۔ ان نغمات کو پڑھیے اور یاد کیجیے۔

1۔ لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے
(گلوکارہ، نور جہاں)

2۔ زلف کو تیری گھٹاؤں کا سلام آیا ہے
(گلوکار، مہدی حسن)

سالگرہ کے قریب قریب بھی گانے مقبول ہوئے تھے جو آج بھی گائے جاتے ہیں۔ موسیقار ناشاد نے اس فلم کی بہت سادہ اور دلکش دھنیں بنائی تھیں اور نور جہاں کی آواز کو بہت مہارت سے استعمال کیا تھا۔

ہدایت کار ایم صادق جب پاکستان آئے اور انہوں نے فلم ''بہارو پھول برساؤ'' بنائی تو اس کے لیے بھی شیون رضوی اور موسیقار ناشاد کا انتخاب کرکے انہیں یکجا کردیا۔ اس فلم کے چند گانے ملاحظہ کیجیے۔

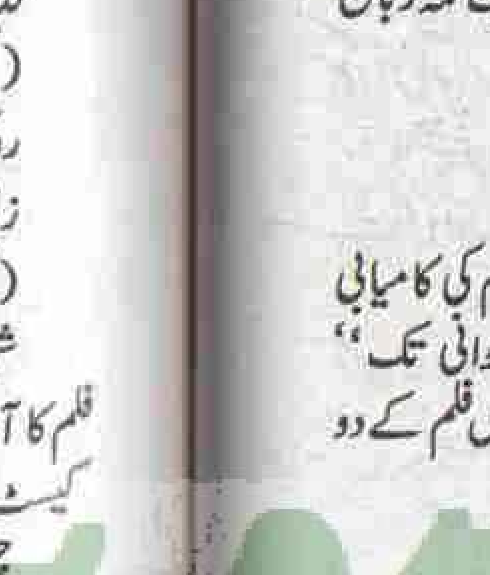

فلم ناجی کا پوسٹر

1. مرے دل کی ہے آواز کہ بچھڑا یار ملے گا
(گلوکار، مسعود رانا)

2. یہ گھر میرا گلشن ہے، گلشن کا خدا حافظ
(گلوکارہ، نور جہاں)

3. چندا رے چندا
کچھ تو ہی بتا میرا افسانہ
(گلوکارہ نور جہاں)

فلم ''چاند سورج'' میں بھی موسیقار ناشاد اور نغمہ نگار شیون رضوی کا ساتھ تھا۔ جنہوں نے ایسے نغمات کو جنم دیا۔

1. آج بھی جا، ساجنا رمانوں کے گلزاروں میں
(گلوکارہ نور جہاں)

چند اور فلموں میں ان کے لکھے ہوئے گیت پیش ہیں۔

میں نے اک آشیاں بنایا تھا
اب بھی شاید وہ جل رہا ہوگا
(گلوکارہ نور جہاں، فلم رم جھم)

جھکی جھکی نگاہیں
انہیں میں سلام کرلوں
(گلوکار، مہدی حسن فلم پالکی)

غالباً اس نغمے کی مقبولیت سے متاثر ہوکر شیون رضوی نے فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے ایک فلم کا آغاز کیا۔ وہ جس قدر نرم مزاج، وضع دار اور شریف آدمی تھے۔ اسے دیکھ کر ہم نے ان سے کہا تھا کہ شیون صاحب، آپ کس جھنجھٹ میں پڑ گئے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔''

انہوں نے منہ کے آگے رومال رکھ کر کہا ''آفاقی صاحب، بیڑا اٹھالیا ہے، بس آپ دعا کیجیے۔''

یہ فلم بہت کامیاب ہوئی اور فلم ساز وہدایت کار کی حیثیت سے بھی شیون رضوی نے اپنا لوہا منوالیا۔ ان کی فلم کے یوں تو تمام ہی گانے مقبول ہوئے لیکن ایک نغمہ زبان زد خاص وعام ہوگیا۔

اک حسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا
دل اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا

اس فلم کے موسیقار نثار بزمی تھے۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد انہوں نے دوسری فلم ''بات پہنچی تری جوانی تک'' بنائی۔ اس فلم کے موسیقار بھی نثار بزمی تھے۔ اس فلم کے دو مقبول ترین گانے دیکھیے۔

1. پیا پیا رٹ کے
میں تو ہوگئی پپیہا رے

2. میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ محبت نہ کرو
(گلوکار مہدی حسن اور نور جہاں)

ہدایت کار اے آر لکھن ہندوستان سے آئے تو انہوں نے ''سہرے کے پھول'' کے نام سے ایک معاشرتی رومانی فلم بنائی تھی۔ اس کے موسیقار ناشاد تھے۔ نغمہ نگار شیون رضوی تھے۔

اس فلم کا یہ گانا بہت مقبول ہوا تھا۔

آج تک یاد ہے وہ پیار کا منظر مجھ کو
جس کی تصویر نگاہوں میں لیے پھرتا ہوں

شیون رضوی پیدائشی شاعر تھے اور بہت ہی شاعرانہ مزاج لے کر آئے تھے۔ ان کے نغمات میں کلاسیکی اردو شاعری کا رنگ زیادہ حاوی تھا۔ وہ عام فہم، سلیس اور آسان الفاظ لکھتے تھے۔ غزلوں اور قوالی لکھنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ان کے نغمات کی طرز بنانا موسیقاروں کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا کیونکہ ان میں الفاظ کی موزونیت اور نغمگی پائی جاتی ہے۔

شیون رضوی اپنے الگ تھلگ رہنے والے مزاج کی وجہ سے فلمی حلقوں میں زیادہ گھلے ملے نہیں اس لیے انہوں نے بہت کم نغمات لکھے ہیں لیکن ان کے لکھے ہوئے گیتوں کی نغمگی، رومانیت کی وجہ سے وہ سننے والوں کے ذہن اور دلوں پر نقش ہوجاتے تھے۔ مثلاً ان کے چند اور نغمات دیکھیے۔

یہاں قدر کیا دل کی ہوگی
یہ دنیا ہے شیشہ گروں کی
(گلوکار، رنگیلا فلم میری زندگی ہے نغمہ)

تیرا کسی پہ آئے دل
تیرا کوئی دکھائے دل
(گلوکارہ، نور جہاں، رنگیلا فلم میری زندگی ہے نغمہ)

لذتِ سوزِ جگر پوچھ لے پروانے سے
(گلوکار احمد رشدی اور آئرن پروین، فلم سالگرہ)

روکنا مشکل ہوگیا تیرے دیوانے کو
زلف بے چین ہے لہرانے کو
(گلوکارہ مالا، فلم رم جھم)

شیون رضوی نے ''نغمات کی رات'' کے نام سے ایک فلم کا آغاز کیا تھا مگر یہ مکمل نہ ہوسکی لیکن اس کے نغمات کے کیسٹ بہت مقبول ہوئے۔

چل دھن میں اپنی پیارے
دھن تارا وے دھن تارا
(گلوکار، احمد رشدی، اخلاق احمد)

اس مطلبی دنیا کو کوئی پیار سکھادے
(گلوکارہ، مہناز، موسیقار نثار بزمی)

اف یہ حسن آپ کا اور شباب ذرا رکیے
(گلوکارہ شازیہ، ناہید اختر، احمد رشدی)

شیون رضوی چاق وچوبند اور صحت مند تھے۔ اپنے بیٹے کے پاس اسلام آباد گئے جہاں فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ انتقال کرگئے۔ 31 مئی 1987ء ان کا یوم وفات ہے۔

بے تکلف محفلوں میں وہ بہت دلچسپ اور معلومات افزا باتیں کرتے تھے لیکن عموماً کم گو تھے۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے، وہ آنکھوں میں سرمہ بھی لگاتے تھے۔ یہ خصوصیت ایک اور شاعر تنویر نقوی میں بھی تھی۔ اللہ غریق رحمت کرے، آمین۔

☆☆☆

بعض اوقات ہنسی آتی ہے جب لوگ پاکستان کی فلمی صنعت کی بحالی کی بات کرتے ہیں، ان سے کوئی پوچھے کہ ایک جمی جمائی، پھلتی پھولتی، ترقی کرتی ہوئی فلمی صنعت جب روبہ زوال ہورہی تھی تو کسی نے اس کے تحفظ کا کوئی خیال کیوں نہیں کیا؟ حکومت نے، نہ ہی فلم سازوں اور فلم ڈسٹری بیوٹرز نے اس کو بچانے کے لیے کیوں کوشش نہیں کی؟ سنیما اونرز جو آج بھارتی فلموں کی درآمد کے لیے شور مچارہے ہیں، انہوں نے ہماری ترقی یافتہ فلمی صنعت کو تباہ کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ بہرحال، یہ ایک الگ اور تکلیف دہ بحث ہے لیکن سوال صرف یہ ہے کہ لاہور میں جب کوئی باقاعدہ فلم اسٹوڈیو ہی باقی نہ رہا ہو تو یہ لوگ فلمی صنعت کیسے بحال کریں گے؟ ایک فلم اسٹوڈیو کی تعمیر کوئی آسان کام نہیں اور پھر آج کل کے فلم اسٹوڈیوز کے لیے تو جدید ترین ساز وسامان کے لیے بہت زیادہ وسائل اور سرمایہ درکار ہے۔ یہ کون فراہم کرے گا اور کیوں؟ یہ سوچنے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں کی۔

لاہور کے فلمی نگار خانوں کے بارے میں پہلے بھی لکھا جاچکا ہے لیکن اس بار قدرے تفصیل کے ساتھ بتایا جارہا ہے۔ فلم کے طلبا اور شوقین حضرات کے لیے یہ ایک معلوماتی دستاویز بھی سمجھیے۔

قیام پاکستان سے پہلے بھی لاہور میں فلم اسٹوڈیوز تھے جن میں بہت اچھی فلمیں بنائی جاتی تھیں اور لاہور کی اکثر فلمیں تو سارے ہندوستان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔ بمبئی اور کلکتہ کے بعد لاہور کی فلمی صنعت کو بھی ایک اہم مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک بڑی صنعت کے لیے فلمی نگار خانے بہت ضروری ہیں۔

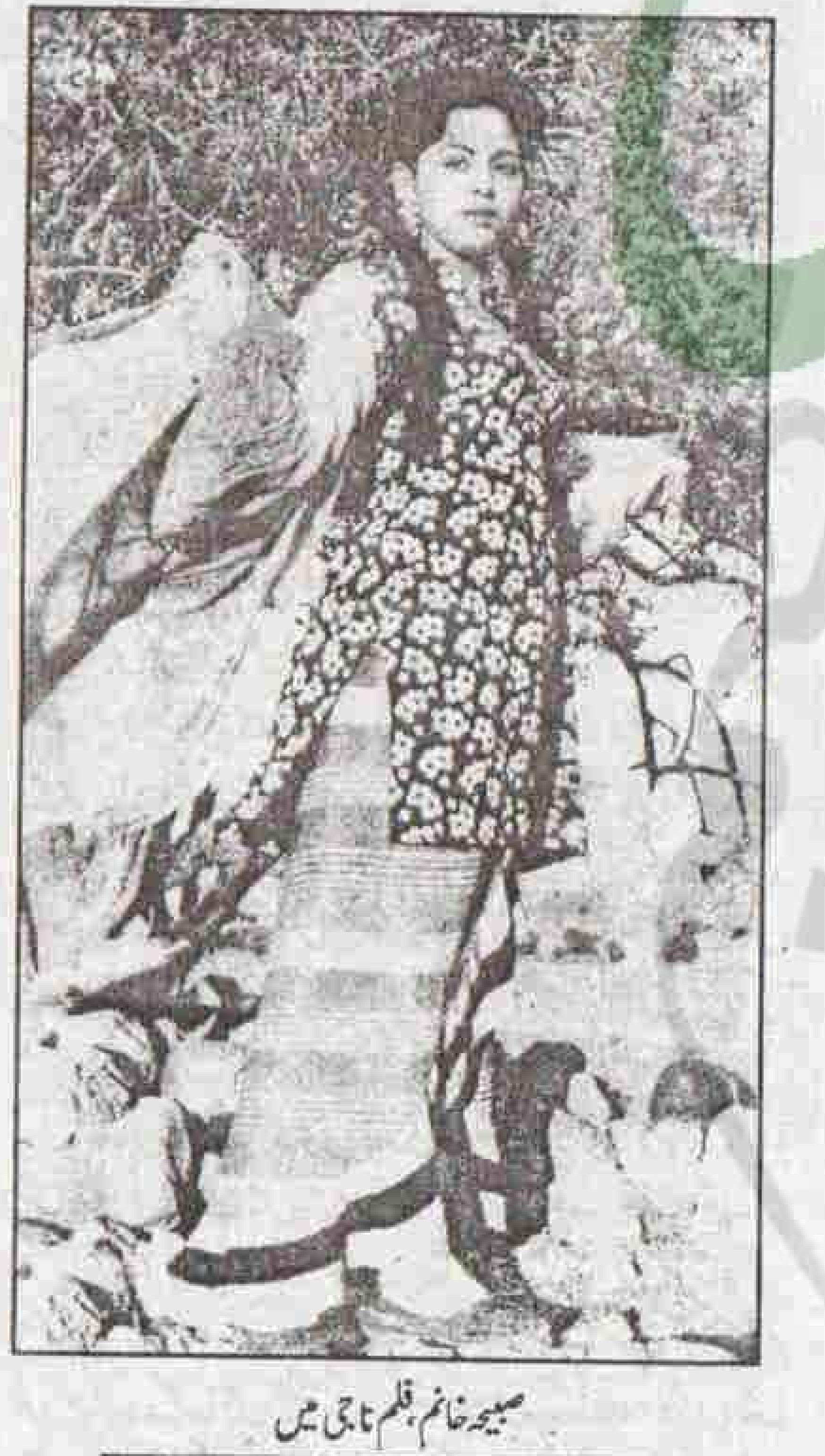

صبیحہ خانم فلم ناجی میں

قیام پاکستان سے پہلے لاہور میں پانچ فلمی نگار خانے تھے اور یہ سب غیر مسلموں کے تھے۔ ان میں پردھان اسٹوڈیو، پنجاب آرٹ اسٹوڈیو، سٹی اسٹوڈیو، پنچولی اسٹوڈیو،

سیلامندر اسٹوڈیو قابلِ ذکر ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد تمام ہندو سرمایہ کار، اسٹوڈیواونر، اداکار اور ہنرمند لاہور سے رخصت ہوگئے۔ بعض فلم اسٹوڈیوز بھی نذرِ آتش کردیے گئے۔ کچھ تو بالکل تباہ ہوگئے مگر بعض اسٹوڈیوز مکمل تباہ نہیں ہوئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد فلمی نگارخانوں کی مرمت اور ازسرِنو تعمیر کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

ہندو مالکوں کے جانے کے بعد حکومت نے ان نگارخانوں کو متروکہ املاک قرار دے دیا تھا۔

پردھان اسٹوڈیو اپر مال پر واقع تھا جس کے مالک سیٹھ دل سکھ پنچولی تھے۔ 1950ء میں یہ اسٹوڈیو ملکہ پکھراج کو الاٹ کردیا گیا اور اس کا نام ''ملکہ اسٹوڈیو'' ہوگیا۔ ملکہ پکھراج رہنے والی تو پاکستان ہی کی تھیں لیکن قیامِ پاکستان کے وقت بمبئی سے آئی تھیں اس لیے انہیں ''مہاجرہ'' قرار دے دیا گیا۔ اس طرح کے ''مہاجر'' پاکستان میں اور بھی بہت سے تھے جنہوں نے صحیح حق داروں کو بے حق کرکے فائدے حاصل کیے۔

ملکہ پکھراج نے اپنے اسٹوڈیو میں تین فلمیں بھی بنائی تھیں جو کامیاب نہ ہوئیں۔ 1953ء میں انہوں نے یہ اسٹوڈیو ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کو فلم آرپیٹو کے لیے کرائے پر دے دیا۔ ایک سال بعد یہ ادارہ باہمی جھگڑوں اور حصے داروں کی ناچاقی کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ملکہ پکھراج نے اسٹوڈیو پر اپنا تسلط قائم کرلیا مگر یہ مختلف ناموں سے چلتا رہا۔ اس اسٹوڈیو میں بہت سی فلمیں بنائی گئیں جن میں چند کامیاب فلمیں بھی شامل ہیں۔

ملتان روڈ پر آر ایل شوری اسٹوڈیو 1945ء میں بنایا گیا تھا۔ فسادات میں اس اسٹوڈیو کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ یہ قریباً برباد ہوگیا تھا۔ شوکت صاحب نے اس کو شاہ نور اسٹوڈیو کے نام سے بنایا، بعد میں شوکت صاحب اور میڈم نور جہاں کے مابین علیحدگی ہوگئی، طلاق کے بعد دونوں میں مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ شوکت حسین رضوی نے بعد میں میڈم یاسمین سے شادی کرلی۔ ان سے بھی ان کے دولڑکے ہیں جو کہ اب دونوں جوان ہیں۔ فلمی صنعت پر زوال آیا تو اس اسٹوڈیو کے مختلف حصے مختلف حصے داروں میں تقسیم ہوگئے۔ آج یہ صورتِ حال ہے کہ یہ عظیم ترین اور خوبصورت اسٹوڈیو ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ بیشتر حصہ گودام بن گیا۔ ایک آدھ حصہ ایسا ہے جس میں برائے نام کبھی کبھار شوٹنگ ہوجاتی ہے ورنہ اجاڑ ہی پڑا ہے۔

پنچولی آرٹ اسٹوڈیو کا ایک حصہ جو مسلم ٹاؤن میں واقع تھا اور نہر کے کنارے پُرفضا مقام پر تھا، یہ زمین فدا حسین کے خاندان کی تھی اس لیے قیامِ پاکستان کے بعد یہ فدا حسین کے نام ہی الاٹ ہوگیا۔ 1948ء میں انہوں نے یہ اسٹوڈیو فلم ساز وہدایت کار نذیر کے سپرد کردیا۔ انہوں نے یہاں فلم ''ہیر رانجھا'' کا آغاز کیا۔ بعد میں اسٹوڈیو آغا جی اے گل کو کرائے پر دے دیا گیا جنہوں نے اس کا نام ایورنیو اسٹوڈیو رکھ دیا۔ اس اسٹوڈیو میں آغا صاحب نے فلم ''دلا بھٹی'' بنائی جو بے انتہا کامیاب ہوئی اور آغا صاحب نے بہت دولت کمائی۔ اسی فلم کی آمدنی سے انہوں نے ملتان روڈ پر ''نیو ایورنیو اسٹوڈیو'' کے نام سے ایک اور شاندار اسٹوڈیو کی تعمیر شروع کردی۔ نیو ایورنیو اسٹوڈیو میں کئی کامیاب فلمیں بنائی گئیں۔ نئے اسٹوڈیو کی تعمیر کے بعد انہوں نے اسٹوڈیو چھوڑ دیا اور اس کو ملک باری نے لے لیا ہے۔ یہاں دوسرے فلم سازوں نے بھی فلمیں بنائیں اور اپنی بھی فلمیں بنائیں۔ ان کی دو فلمیں ''منڈا ماہی'' اور ''یکے والی'' حد درجہ کامیاب ہوئیں جنہوں نے روپے کی ریل پیل کردی۔ ان فلموں کی آمدنی سے انہوں نے بھی ملتان روڈ پر ایورنیو اسٹوڈیو کے برابر اپنا نیا فلم اسٹوڈیو ''باری اسٹوڈیو'' کے نام سے بنایا جو فلورز کی تعداد کے اعتبار سے دس فلور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لاہور کا سب سے بڑا اسٹوڈیو تھا۔

آپ نے یہ اندازہ لگالیا ہوگا کہ وہ فلم ڈسٹری بیوٹرز جو پاکستان میں بھارتی فلموں پر پابندی کے سخت مخالف تھے، یہ پابندی عائد ہونے کے بعد انہی فلم ڈسٹری بیوٹرز نے بے انتہا روپیا فلمیں بناکر کمایا اور لکھ پتی، کروڑ پتی بن گئے۔ یہی تقسیم کار اور سنیما اونرز آج پھر پاکستان میں انڈین فلموں کی درآمد کے حق میں مہم چلا رہے ہیں۔

باری صاحب کا اپنا اسٹوڈیو بن جانے کے بعد فلم ساز اشفاق ملک نے پُرانا ایورنیو اسٹوڈیو کرائے پر لے لیا اور اس کا نام یو بی اسٹوڈیو رکھا۔ اس اسٹوڈیو میں اشفاق ملک نے اپنی فلمیں بھی بنائیں اور دوسرے فلم سازوں کو بھی کرائے پر دیتے رہے لیکن کچھ عرصے بعد باہمی مقدمہ بازی کی وجہ سے اس کا صرف آدھا حصہ ملک اشفاق کے پاس رہ گیا۔ باقی نصف حصے میں ارم سنیما بن گیا۔ کچھ عرصے بعد یہ نصف حصہ بھی اسٹوڈیو نہ رہا۔ اشفاق ملک نے اس کو چھوڑ کر بند روڈ پر اے ایم اسٹوڈیو کے نام سے ایک نئے فلم اسٹوڈیو کی تعمیر شروع کردی جو بہت جلد ایک معیاری اور کامیاب فلم

اسٹوڈیو میں تبدیل ہوگیا اور بہت مصروف بھی ہوگیا۔ اشفاق ملک نے اور دوسرے فلم سازوں نے یہاں بہت سی کامیاب فلمیں بنائی ہیں۔

فیروز پور روڈ پر نہر کے نزدیک ''میلا مندر اسٹوڈیو'' تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ اسٹوڈیو کیو زمان، تصدق حسین اور شفیع اعجاز کو الاٹ ہوگیا۔ انہوں نے اس کا نام ''اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو'' رکھ دیا۔ کیو زمان ایک ٹیکنیکل آدمی تھے۔ انہوں نے پہلی دیسی رنگین فلم ''گل بکاؤلی'' بنائی۔ یہاں اور فلموں کی بھی شوٹنگ ہوتی رہی۔ کمال کی فلم ''جوکر'' کی شوٹنگ اسی اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ لالہ سدھیر کی فلم ''ساحل'' بھی اسی اسٹوڈیو میں بنی تھی۔

سٹی اسٹوڈیو میکلوڈ روڈ پر ریجنٹ سنیما کے عقب میں واقع تھا۔ تقسیم سے پہلے روپ کے شوری کی فلمیں اسی اسٹوڈیو میں بنتی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد یہ اسٹوڈیو چوہدری عید محمد کو الاٹ کردیا گیا۔ رتن سنیما بھی انہی کو الاٹ کیا گیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد الاٹ منٹ میں جو دھاندلیاں ہوئیں، یہ بھی اسی کا ایک حصہ تھا۔ اس اسٹوڈیو میں زیادہ تر ریکارڈنگ ہوا کرتی تھی۔ 1980ء میں یہ اسٹوڈیو ختم ہوگیا کیونکہ دوسرے بہت سے اچھے اسٹوڈیوز تعمیر ہوچکے تھے۔

ملتان روڈ پر کافی فاصلے پر شباب کیرانوی نے بھی شباب اسٹوڈیوز کے نام سے ایک پُرفضا مقام پر خوبصورت اور وسیع اسٹوڈیو تعمیر کیا تھا، یہاں باغ، پھلواری، نہر، کھیت اور کھلے میدان تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس اسٹوڈیو کے حصے بخرے ہوگئے۔ آج بھی یہاں فلموں کی شوٹنگ ہوتی ہے لیکن برائے نام۔

ملتان روڈ ہی پر فلم ساز اقبال شہزاد نے ''سینی ٹل اسٹوڈیو'' تعمیر کیا تھا، لیکن تین چار سال بعد ہی وہ اس کو فروخت کرکے امریکا چلے گئے اور یہ اسٹوڈیو ختم ہوگیا۔ 1973ء میں فلم ساز اور تقسیم کار چوہدری ثناء اللہ نے شیخ رشید کے اشتراک سے ثنائی اسٹوڈیو بنایا جہاں کئی کامیاب فلموں کی شوٹنگ ہوئی۔ جب فلمی صنعت روبہ زوال ہوئی تو 1979ء میں جماعت اسلامی نے یہ اسٹوڈیو خرید کر جماعت کا ہیڈ آفس بنالیا۔ اسی کا نام منصورہ رکھا گیا ہے۔

وحدت روڈ پر ڈبلیو زیڈ احمد نے بہت بڑی زمین پر ڈبلیو زیڈ اسٹوڈیو کے نام سے ایک فلم اسٹوڈیو تعمیر کیا۔ اس میں شوٹنگ کی تعمیر تو نہیں ہوئی لیکن لیبارٹری میں کام ہوتا رہا

افسانے پر بات کرتے ہوئے سب سے پہلے جو سوال میرے سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ کیا افسانہ لکھنا محض ہنرکاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو افسانہ نگار اور کارپینٹر کی کارکردگی میں، جو آری، تیشے اور رندے سے دوسروں کے بنائے ہوئے نقشے پر لکڑی کو شکلیں دیتا ہے کیا فرق رہ جاتا ہے، مثال کے لیے کمہار کی کارکردگی کو بھی زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے مگر میرے نزدیک چاک کے گھومنے کے ساتھ ساتھ کمہار کا گھومتا ذہن، متحرک ہاتھ اور ایک تواتر وترتیب کے ساتھ اس کا آگے پیچھے جھولتا جسم، اس کی ہنرکاری سے زیادہ اس کے تخلیقی استغراق کی غمازی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر افسانہ محض ہنرکاری ہے تو کیا پوری صنف کو ادب سے باہر نہیں نکالنا پڑے گا؟ اور اگر افسانہ تخلیقی حیثیت رکھتا ہے تو اس سے ''ایسا ہو'' یا ''کیسا ہو'' جیسے لچر سوال کیوں کیے جاتے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کی تخلیق اجتماع سے متعلق ہونے کے باوجود انفرادی فعل ہے۔ میں ماضی کی نفی نہیں کرتا لیکن اگر آج کے افسانے کے لیے 1940ء کے افسانے کو ہی ماڈل بنانا ہے تو افسانے کو 40ء سے آگے ہی کیوں آنے دیا گیا اور پھر اس کے بعد اس میں تجربوں کے امکانات کی نفی کیوں نہ کی گئی؟

اقتباس: چند سوال از اعجاز راہی
مرسلہ: نعمان اشرف، حاصل پور

لیکن اب نہ فلمیں رہیں، نہ یہ اسٹوڈیو رہے۔ کئی اسٹوڈیو گودام بن چکے ہیں۔ کہیں ٹی وی ڈرامے بنتے ہیں اور کہیں کچھ اور کام ہوتے ہیں سوائے فلم سازی کے۔

لاہور کے فلمی نگارخانوں کی یہ مختصر داستان ہے۔ ایورنیو اسٹوڈیو کو آغا سجاد گل نے ازسرِنو تزئین کی بعد اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا ہے۔ یہاں ان کے اور دوسروں کے ٹی وی ڈراموں کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ باقی غائب ہوچکے ہیں، رہے نام اللہ کا!

☆☆☆

صبیحہ خانم اور سنتوش کمار نے شادی کے بعد ایک پنجابی فلم ''تاجی'' بنائی تھی۔ عجب اتفاق ہے یا پھر دونوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ میاں بیوی دونوں نے ایک ساتھ ہی

فلم سازی شروع کی۔ سنتوش کمار نے بھی پنجابی فلم ''مکھڑا'' کے نام سے فلم سازی شروع کی تھی۔ یہ دونوں فلمیں ایک ساتھ ہی شروع کی گئی تھیں اور آگے پیچھے نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ ناجی کے ہدایت کار قدیر غوری تھے۔ ''مکھڑا'' کی ہدایت کاری کے لیے جعفر ملک کو منتخب کیا گیا تھا۔ ہدایت کار کی حیثیت سے ''ناجی'' قدیر غوری کی پہلی فلم تھی لیکن انہوں نے ایک پختہ کار ہدایت کار ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ غالباً ان کی اسی کارکردگی سے متاثر ہوکر سنتوش کمار نے اپنی دوسری فلم ''شام ڈھلے'' جو اردو فلم تھی، اس کی ہدایت کاری بھی قدیر غوری کو سونپ دی تھی۔ ''شام ڈھلے'' ایک کامیاب اور میوزیکل فلم تھی جس میں نیم کلاسیکی اور کلاسیکی نغمات بھی شامل تھے۔ قدیر غوری کو موسیقی سے بذاتِ خود بہت دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فلموں کی موسیقی عام طور پر بہت اچھی ہوتی تھی۔ سنتوش کمار کی ایک اور بہت کامیاب فلم ''دامن'' کے ہدایت کار بھی قدیر غوری ہی تھے۔

فلم ''ناجی'' اپریل 1959ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی اور ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔ قدیر غوری نے ہی ''ناجی'' کا منظر نامہ بھی لکھا تھا جو بطورِ ہدایت کار ان کی پختگی کا ثبوت ہے۔ کہانی سلطان کھوسٹ نے تحریر کی تھی۔ مکالمے بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔

آج اس یادگار پنجابی فلم ''ناجی'' کی کہانی اور دیگر تفصیلات بیان کی جارہی ہیں۔ تاکہ ہماری نئی نسل کو بھی اس بارے میں معلوم ہوسکے۔

''ناجی'' پنجاب کے پس منظر میں ایک رومانی فلم تھی۔ اس میں صبیحہ خانم اور سنتوش کمار نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم کی کہانی کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

ناجی گاؤں کے چوکیدار کی نوجوان اور حسین بیٹی تھی جو اپنی شوخی اور شرارت کی وجہ سے بھی بہت مقبول تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اکھڑ اور منہ پھٹ بھی تھی اور کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔

گاؤں کے جاگیردار کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کا بیٹا اسلم خان (سنتوش کمار) اپنے دوست نذر کے ساتھ شکار کھیلنے کی غرض سے گاؤں میں آتا ہے۔ اس سے پہلے وہ کبھی گاؤں میں نہیں آیا تھا۔ راہ میں اس کی ملاقات ناجی (صبیحہ) سے ہوجاتی ہے۔ اس مڈبھیڑ میں بھی وہ ایک دوسرے سے انجان رہتے ہیں۔

ناجی کا باپ امام دین گاؤں کی چوکیداری بھی کرتا ہے۔ اس کا بڑا بھائی (ایم اسماعیل) جاگیردار کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ایک روز اسلم خان کا دوست چوکیدار کے گھر کھانا لینے آتا ہے۔ (گاؤں کا چوکیدار ہی مہمان کو کھانا فراہم کرتا ہے) تو اسلم خان بھی اس کے ہمراہ ہے۔ چوکیدار ان دونوں کو گھر میں بٹھا کر کسی کام سے باہر جاتا ہے۔ اسی دوران میں ناجی گھر میں داخل ہوتی ہے اور دو اجنبی لوگوں کو گھر میں دیکھ کر ان سے بدسلوکی کرتی ہے اور وہ گھر سے چلے جاتے ہیں۔

باپ واپس آتا ہے تو معزز مہمان غائب ہیں۔ وہ ان کے بارے میں پوچھتا ہے تو ناجی بتاتی ہے کہ دو انجان لوگ گھر میں گھس آئے تھے، میں نے انہیں بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا۔ چوکیدار بتاتا ہے کہ یہ تو نے کیا غضب کیا، ارے وہ تو جاگیردار کا بیٹا اور اس کا دوست تھا۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب تم خود یہ کھانا لے کر جاؤ اور ان سے معافی بھی مانگو۔

ناجی اپنی سہیلی (زینت) کے ساتھ اسلم خان کو کھانا دینے جاتی ہے اور اس سے معافی مانگتی ہے کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی۔ میں آپ کو غنڈا سمجھی تھی۔ اسلم خان ہنستا ہے اور کہتا ہے، کیا میں شکل سے تم کو غنڈا نظر آتا ہوں؟

ناجی پھر شرمندگی سے اظہار معذرت کرتی ہے۔ اس طرح پہلی ملاقات ہی میں دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اسلم خان کے مزاحیہ دوست (نذر) کی زینت سے دوستی ہوجاتی ہے۔ اس زمانے میں فلموں میں ہیرو کے ساتھ ایک کامیڈین ضرور ہوتا تھا۔ اس طرح ہیرو، ہیروئن کی طرح کامیڈین کی بھی جوڑی بن جاتی تھی۔

الیاس کاشمیری (گاما) گاؤں کا بدمعاش ہے اور ناجی پر اپنا حق سمجھتا ہے اور اس کو مختلف طریقوں سے پریشان کرتا رہتا ہے۔ وہ ناجی کے باپ کے کان بھرتا ہے کہ جاگیردار کا بیٹا ناجی پر ڈورے ڈال رہا ہے اور وہ بھی اس کے جال میں پھنس چکی ہے۔ چوکیدار کو اس کی بات پر یقین آجاتا ہے۔ وہ ناجی پر جاگیردار کی حویلی میں جانے پر پابندی لگا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ آیندہ میں خود کھانا دینے جایا کروں گا۔ اس طرح ناجی اور اسلم خان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے۔

کچھ عرصے بعد گاؤں کے میلے میں ناجی اپنی سہیلی کے ساتھ جاتی ہے تو وہاں اسلم خان اور نذر (شبو) سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہیں گاما بھی موجود ہے۔

میلے میں گھڑسواری کا مقابلہ ہوتا ہے جس میں اسلم گھوڑے سے گر کر زخمی ہوجاتا ہے۔ ناجی بے اختیار اس کی مدد کو آگے بڑھتی ہے اور اس کو گلے لگالیتی ہے۔ چوکیدار بھی

بیٹی کی تلاش میں میلے میں جاتا ہے اور یہ واقعہ سن کر بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ گاؤں بھر میں بدنامی ہوجانے کی وجہ سے چوکیدار (ایم اجمل) اسلم خان کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ سرکار ہم غریب لوگ ہیں مگر عزت بھی پیاری ہے۔

آپ میرا استعفیٰ منظور کریں اور آیندہ میری بیٹی سے ملنے کی کوششیں نہ کریں۔

اسلم کہتا ہے کہ آپ نوکری نہ چھوڑیں۔ میں خود ہی گاؤں چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔ جانے سے پہلے وہ موقع پاکر ناجی سے ملتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ اس سے سچی محبت کرتا ہے اور اس کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہے۔ میں شہر جاکر اپنی ماں کو رشتہ لے کر بھیجوں گا۔ ناجی وعدہ کرتی ہے کہ میں تمہارا انتظار کروں گی اور تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔

اسلم کے جانے کے بعد گاما بدمعاش ناجی کا رشتہ مانگتا ہے مگر چوکیدار اس کی بُری عادتوں کی وجہ سے صاف انکار کردیتا ہے۔ اسلم شہر جاکر اپنی ماں کو ''ناجی'' کے بارے میں سب کچھ بتادیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ ناجی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسلم کی ماں یہ سن کر آگ بگولا ہوجاتی ہے کہ ایک چوکیدار کی بیٹی جاگیردار گھرانے کی بہو کیسے بن سکتی ہے؟ بہتر ہے کہ تم ناجی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔

گاؤں میں بدمعاش گاما اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں ہے۔ وہ اپنے بدمعاشوں کے ذریعے ناجی کو اغوا کرالیتا ہے۔ ناجی کا باپ بیٹی کو آزاد کرانے کے لیے بدمعاشوں کا پیچھا کرتا ہے۔ بدمعاش امام دین کو قتل کرکے اس کی لاش اٹھا کر لاتے ہیں۔ باپ کی لاش دیکھ کر ناجی اپنے ہوش وحواس کھودیتی ہے۔

پولیس موقعے پر پہنچتی ہے تو ناجی کا چچا پولیس کو بتاتا ہے کہ امام دین کو اپنی بیٹی کا رشتہ نہ دینے پر گاما نے اس کو قتل کرادیا ہے۔ اس کے برعکس گاما پولیس کو بیان دیتا ہے کہ شہر سے جاگیردار کا بیٹا آیا تھا جس کے ساتھ ناجی کے تعلقات تھے۔ ناجی کے باپ نے اس کی بے عزتی کی تھی جس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے امام دین کو قتل کردیا۔ اس طرح امام دین کے قتل کا الزام اسلم پر ڈال دیا جاتا ہے۔ گاما کے بدمعاشوں کی گواہی پر پولیس شہر جاکر اسلم کو امام دین کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیتی ہے۔

اِدھر ناجی کی دماغی حالت خراب ہوچکی ہے اور وہ سڑکوں پر پاگلوں کی طرح پھرتی رہتی ہے۔ ایک دن اسلم کا ماموں (غلام محمد) گاؤں آتا ہے تو ناجی اس کی کار سے ٹکرا کر زخمی ہوجاتی ہے تو غلام محمد جو کہ ایک ڈاکٹر ہے اس کو اپنے ساتھ شہر لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر غلام محمد کی ایک جوان بیٹی بھی ہے جو اتفاق سے ناجی کی ہم شکل ہے۔ بیماری میں مبتلا ہوکر وفات پاچکی ہے۔ ڈاکٹر ناجی کو اپنی بیٹی کی ہم شکل پاکر اس کو اپنی بیٹی بنالیتا ہے۔

ایک دن وہ ناجی کو اسلم کی ماں کے گھر لے جاتا ہے۔ اسلم کی ماں اس کو اپنے بھائی کی بیٹی سمجھ کر بہت پیار سے پیش آتی ہے۔ ناجی گھر میں اسلم کی تصویر دیکھتی ہے تو اس کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آجاتی ہے۔ ناجی اپنا حافظہ واپس آنے کے بعد ڈاکٹر اور اسلم کی ماں کو اپنی تمام داستان سنادیتی ہے۔ تمام حالات سے واقف ہونے کے بعد اسلم کی ماں ناجی کو چوکیدار کی بیٹی کی حیثیت سے حقارت سے دیکھتی ہے لیکن اس کا بھائی اپنی بہن کو رضامند کرلیتا ہے کہ اسلم کی شادی ناجی کے ساتھ کردی جائے۔

ڈاکٹر ناجی کو بتاتا ہے، اس کے باپ کے قتل کے الزام میں اسلم پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ناجی ڈاکٹر کے ساتھ عدالت میں جاکر تمام واقعات عدالت کے سامنے بیان کردیتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس کے باپ کو گاما نے قتل کرایا ہے۔ ناجی عدالت کے دریافت کرنے پر قاتلوں میں سے ایک کی پہچان بھی بتادیتی ہے۔ اس طرح اس کے بیان کی صداقت ثابت ہوجاتی ہے۔ اسلم کو بری کردیا جاتا ہے۔ گاما کو اس کے بدمعاشوں کے ساتھ گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔

فلم کی کہانی ایک روایتی کہانی ہے لیکن اسکرین پلے، مکالموں اور اداکاروں کی خوبصورت اداکاری کی وجہ سے یہ ایک دلچسپ اور معیاری فلم بن گئی تھی۔ اس کہانی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں پنجابی فلمیں مار دھاڑ اور قتل وغارت سے محفوظ تھیں اور رومانی مزاحیہ فلمیں بنائی جاتی تھیں۔

صفدر حسین نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ انہوں نے بہت اچھی طرزیں بنائی تھیں جو اس زمانے میں بھی مقبول ہوئی تھیں اور آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ موسیقار صفدر حسین اس سے پہلے کئی مقبول فلموں کی موسیقی بنا چکے تھے۔ ناجی کے نغمات وارث لدھیانوی نے لکھے تھے۔ وہ پنجابی فلموں کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب بہت خوبصورت نغمات اور مکالمے لکھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ وہ دور بھی ختم ہوگیا۔ اب نہ ایسے کہانی نویس رہے، نہ نغمہ نگار، بشیر نیاز، حزیں قادری، عالم سیاہ پوش، تنویر کاظمی کا دور ختم ہوچکا ہے اور

موجودہ قحط الرجال میں دوبارہ ایسے لوگوں کے آنے کی توقع بھی نہیں رہی۔

فلم میں سب اداکاروں نے بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ صبیحہ خانم کی اداکاری میں بے ساختگی اور ایک والہانہ انداز تھا۔ سنتوش کمار، ایم اجمل، غلام محمد، ایم اسماعیل اور ولن کے کردار میں الیاس کاشمیری نے بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ ایم فاضل اس کے عکاس تھے۔ وہ پاکستان کے بہت اچھے عکاسوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

☆☆☆

12 اکتوبر 1970ء کو کراچی میں بیک وقت دو شخصیات اس دنیا سے پُراسرار انداز میں رخصت ہوگئیں۔ بہ ظاہر یہ ایک ہی انسان تھا لیکن دو حصوں میں بٹا ہوا۔ وہ ذہنی اور پیشہ ورانہ حیثیت سے دو مختلف شخصیات تھے۔ وہ ساری زندگی ایک بھٹکی اور بھکی ہوئی روح کی مانند گھومتے رہے۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی موت بھی اسرار کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی اور آج تک اس کا راز فاش نہیں ہوسکا۔

یہ تذکرہ ہے شاعر اور بیورو کریٹ مصطفیٰ زیدی کا۔ ان کا اصل نام مصطفیٰ زیدی تھا لیکن شاعری کے لیے انہوں نے تیغ تخلص اختیار کیا اور تیغ الہ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔

ایک صبح وہ اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے۔ ان کی ناک پر خون جما ہوا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں قتل کیا گیا مگر انہیں قتل کیوں کیا گیا؟ کس نے قتل کیا؟ یہ راز آج تک پردۂ راز میں ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں قتل کیا گیا لیکن قاتل کون تھا اور قتل کا مقصد کیا تھا، ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ خود اپنے معروف شعر کا مضمون بن گئے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
کہ سارے شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

یہ دستانے شہر والوں نے اب تک نہیں اُتارے ہیں۔

مصطفیٰ زیدی انڈیا کے مشہور شہر الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے ایم اے کا امتحان گورنمنٹ کالج سے پاس کیا۔ اس زمانے میں تیغ الہ آبادی کہلاتے تھے۔ پاجامہ اور شیروانی پہنا کرتے تھے مگر شاعری ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ وہ پیدائشی شاعر تھے تو غلط نہ ہوگا۔ ابتدائی عمر ہی سے انہوں نے شعر کہنے شروع کردیے تھے۔ الہ آباد میں انہیں برصغیر کے عظیم ترین شعرا کی صحبت سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا۔ جوش ملیح آبادی سے وہ بہت متاثر تھے اور جوش بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آغاز میں ان کی شاعری پر جوش ملیح آبادی کی شاعری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ جوش نے ان کی وفات کے بعد کہا تھا۔

"اگر وہ زندہ رہتے تو مجھ پر بازی لے جاتے۔" اس سے بڑا اعزاز کسی نوجوان شاعر کے لیے اور کیا ہوسکتا ہے۔

الہ آباد میں تعلیم کے دوران .... ان کی توجہ پڑھائی سے زیادہ شاعری کی طرف مبذول رہی۔ فراق گورکھپوری، مجاز لکھنوی کے ساتھ ان کی زیادہ تر ملاقات رہی۔ پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری ان کے کالج میں انگریزی کے لیکچرر تھے۔ ان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ سائنس کا مطالعہ کریں اس لیے میٹرک کے بعد انہیں ایک ٹیکنیکل کالج میں داخل کرادیا گیا مگر پہلے ہی سال وہ فیل ہوگئے اور دوبارہ الہ آباد میں انہوں نے آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ انہیں میتھ میٹکس کے مضامین پسند نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا رجحان ادب، خصوصاً شاعری کی طرف زیادہ تھا۔

انگریزی اور اردو میں وہ بہت مہارت رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ اردو اور انگریزی کا ہر امتحان انہوں نے بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ کالج کے زمانے میں ہی انہوں نے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی تھی اور انہیں مشاعروں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ یہ دوسری عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بہت مقبول ادبی تنظیم تھی۔ زیادہ تر نوجوان اس سے متاثر تھے۔ تیغ الہ آبادی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انجمن کے ایک فعال رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہوں نے اسی زمانے کی شاعرانہ فیشن کے اعتبار سے لمبے لمبے بال رکھ لیے اور عینک استعمال کرنے لگے حالانکہ ان کی نظر ٹھیک تھی۔ یہاں تک کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ وہ سیکولر نظریات کے حامی ہوگئے اور ایک ہندو لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ وہ اس زمانے میں کھدر کا لباس پہنتے تھے اور فرش پر سویا کرتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ وہ خود کو عوام کے نزدیک بنانا چاہتے ہیں۔

ہندو لڑکی سے محبت میں ناکامی پر انہوں نے دوبار خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ بے انتہا حساس اور زود حس نوجوان تھے۔ وہ اپنے بھائی مجتبیٰ زیدی کے ہمراہ پاکستان آئے تھے جو کہ ایک بیورو کریٹ تھے اور انہوں نے پاکستان جانے کو ترجیح دی تھی۔ بعد میں وہ پاکستان کی سول سروس میں کام کرتے رہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کرنے کے بعد

انہوں نے کراچی کے اسلامیہ کالج میں پڑھانا شروع کردیا۔ اسی دوران میں وہ تیغ الہ آبادی سے مصطفیٰ زیدی بن گئے۔ اپنے پہلے مجموعے "شہرِ آزار" میں انہوں نے اپنا نام تیغ الہ آبادی ہی استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ وہ خیالی آرٹسٹ کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آنا چاہتے تھے۔

ان کی اضطرابی طبیعت نے انہیں زیادہ عرصے تک کراچی میں نہیں رہنے دیا۔ وہ کراچی سے انگریزی کے لیکچرر کے طور پر پشاور منتقل ہوگئے۔

اس کے بعد انہوں نے سول سروس کا امتحان دیا۔ اسی زمانے میں ہماری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے دوست مسعود اشعر کے بے تکلف دوست تھے اور مسعود اشعر ہی انہیں "آفاق" کے دفتر میں ہم سے ملانے کے لیے لائے تھے۔ وہ اس زمانے میں مال روڈ کی اکیڈمی میں سول سروس کے امتحان کی تیاریاں کررہے تھے، ہماری بہت جلد دوستی ہوگئی۔ سول سروس اکیڈمی سے فارغ ہوکر وہ اکثر ہمارے پاس آجایا کرتے تھے اور ہم دونوں ادبی موضوعات پر گفتگو کرنے کے علاوہ ہلکی پھلکی شرارتیں بھی کرتے تھے جو عموماً ٹیلی فون کے ذریعے ہوتی تھیں۔ کبھی ہم کسی بھی غیر کو ملا کر جو بھی دوسری طرف ہوتا تھا اس سے باتیں شروع کردیا کرتے تھے۔ اگر وہ کوئی لڑکی یا خاتون ہوتی تو اس کے ساتھ فلموں اور شاعری کی بات کرتے اور اس طرح یہ سلسلہ شروع ہوجاتا۔ ایک بار ہم نے فون ملایا تو ایک ڈاکٹر صاحب سے مل گیا وہ کافی بدمزاج انسان تھے۔

ہم نے ان سے بہت تہذیب سے بات چیت کی مگر وہ یہی کہتے رہے کہ میرا وقت قیمتی ہے۔ مطلب کی بات کرو۔

مطلب کی بات تو کوئی تھی نہیں۔ ہم نے ان سے کہا "مطلب کی بات یہ ہے کہ ہمیں کسی نے بتایا ہے کہ آپ کے پاس بہت سے خاندانی کتے ہیں اور آپ انہیں فروخت کرتے ہیں۔ کیا ایک جوڑی پلے ہمیں دے سکتے ہیں۔"

وہ سخت ناراض ہوئے اور گالیاں دینے لگے کہ میں ڈاکٹر ہوں، کتے نہیں فروخت کرتا۔

ہم نے کہا "آپ یہی بات تمیز سے بھی کرسکتے ہیں۔"

انہوں نے بے نقط سنانی شروع کردیں اور بہت غلیظ گالیاں دیں جو ہم نے مصطفیٰ زیدی کو بھی سنوائیں۔ آخر انہوں نے جھلا کر فون پٹخ کر بند کردیا۔

ہم دونوں بہت دیر تک ہنستے رہے۔ زیدی صاحب بولے "اب تم کیا کروگے؟"

ہم نے کہا "ان کا علاج کریں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"ابھی دیکھ لو۔"

ہم نے اپنے مختلف اخباروں کے صحافی دوستوں کو فون کرکے ڈاکٹر صاحب کا فون نمبر بتایا اور کہا کہ آپ ان سے فون کرکے صرف اتنا پوچھیے کہ آپ کتے کے پلے کتنے میں دیں گے۔ درجنوں صحافیوں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کرنے شروع کردیے۔ وہ حسبِ عادت انہیں بُرا بھلا کہتے اور گالیاں دیا کرتے تھے۔ چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا فون کٹوا دیا ہے۔

کچھ روز بعد زیدی صاحب آئے اور کہنے لگے "وہ آپ کے ڈاکٹر دوست کا کیا ہوا؟"

ہم نے انہیں بتایا اور پھر ٹیلی فون کے دفتر میں ایک جاننے والے سے پوچھا کہ انہوں نے کوئی نیا نمبر ضرور لیا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کا نیا نمبر بھی بتادو۔

انہوں نے معلومات حاصل کرکے بتایا کہ انہوں نے چند دن بعد وہی پُرانا نمبر لے لیا ہے۔

ہم نے فوراً انہیں فون ملایا۔ انہوں نے فون اُٹھایا "ہیلو، ڈاکٹر فلاں اسپیکنگ!"

ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب، بہت ضروری کام ہے آپ سے۔"

"جی بتایئے۔"

"آپ کتے کے پلے کتنے میں دیں گے؟"

انہوں نے مشتعل ہوکر ہمیں پھر بُرا بھلا کہا اور گالیاں دینی شروع کردیں۔ "ارے کم بخت، منحوس تو پھر پیدا ہوگیا؟"

ہم سنتے رہے اور چپ ہوئے تو ہم نے کہا "دیکھیے ڈاکٹر صاحب، اپنی بدزبانی اور بدکلامی کی وجہ سے پہلے بھی نقصان اُٹھا چکے ہیں۔ اگر آپ نے تمیز سے بات نہ کی اور ہم سے معافی نہیں مانگی تو آپ کا پہلے سے بھی بُرا انجام ہوگا۔"

ڈاکٹر صاحب کو یہ بات سمجھ آگئی اور نرم لہجے میں کہا "میرے بھائی، میرے باپ، مجھے معاف کردو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ میرا تو بزنس ہی برباد ہوکر رہ گیا تھا۔"

"اچھا، توبہ کیجیے۔"

انہوں نے توبہ کرلی۔

"کان پکڑیے۔"

"کس کے؟" انہوں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"بھئی اپنے اور کس کے۔ کیا کتے کے کان پکڑیں گے؟"

”بھائی سوری، ویری سوری۔ یہ دیکھو، کان پکڑ لیے۔ اب خدا کے واسطے مجھ پر اور میرے بال بچوں پر رحم کرو۔“

ہم نے انہیں معاف کر دیا اور پھر فون نہیں کیا۔

اس قسم کی بہت سی شرارتیں ہم کیا کرتے تھے۔ کبھی کسی خاتون کو ان کے شوہر کی طرف سے پیغام دیتے تھے کہ رات کو دس مہمانوں کے کھانے کا بندوبست کر لو۔ کبھی کسی شوہر سے کہتے کہ آپ کی بیگم، میری بیگم کی سہیلی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ گھر واپس آتے ہوئے ایک بڑا کیک اور کوئی اچھا سا تحفہ لے آنا ورنہ میری ناک کٹ جائے گی، وغیرہ۔

اس طرح ہماری دوستی اور بے تکلفی بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ سول سروس اکیڈمی سے فارغ التحصیل ہو کر چلے گئے۔

پہلے انہیں اسسٹنٹ کمشنر اور پھر ڈپٹی کمشنر کے عہدے ملتے رہے اور وہ مختلف شہروں میں تعینات رہے۔ ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ اس دوران.... ان کے بارے میں سنتے رہے۔

ان کے اعلیٰ افسران خوش نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے فرائض اور ایڈمنسٹریشن کے بجائے شعر و شاعری پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سرکاری کارکردگی پر اثر پڑتا ہے۔ جن لوگوں کو ان سے یہ شکایت تھی، ان میں قدرت اللہ شہاب، الطاف گوہر، مرتضیٰ برلاس وغیرہ شامل تھے۔ وہ سب بھی ادبی ذوق رکھتے تھے مگر اپنے فرائض کو اوّلیت دیتے تھے لیکن مصطفیٰ زیدی دوسرے ادبی کاموں، مشاعروں کے انتظام اور تقریبات پر زیادہ توجہ دیا کرتے تھے۔

مصطفیٰ زیدی بہت اعلیٰ درجے کے شاعر تھے جن کی کئی اشعار کے بہت زیادہ حوالے دیے جاتے ہیں مثلاً

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
کہ سارے شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اپنے رومانی مزاج کی وجہ سے ایک بہت اچھی غیر ملکی بیوی کے ہوتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر بھی دل پھینکتے رہتے تھے۔ ان کی ایک دوست شہناز کا اسکینڈل تو بہت زیادہ مشہور ہو گیا تھا۔ شہناز ایک خوبصورت سوشل گرل تھیں۔ زیدی صاحب ان کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد بہت بدنام ہوئے اور سرکاری حلقوں میں بھی ان پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ اس زمانے میں ایسے بڑے بیوروکریٹس بھی شامل تھے جو نامور ادیب اور شاعر بھی تھے۔ اوپر دیے جانے والے ناموں کے علاوہ مختار مسعود، خالد حسن، ہاشم رضا، منظور الٰہی جیسے اہلِ قلم بھی بیوروکریسی میں شامل رہے ہیں لیکن یہ لوگ اپنے فرائض بھی پوری یکسوئی سے ادا کیا کرتے تھے۔ مصطفیٰ زیدی کی زیادہ تر دلچسپی ادبی مصروفیات میں رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے افسرانِ بالا کی تنقید کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔

مصطفیٰ زیدی نے راولپنڈی، نواب شاہ، جہلم، ساہیوال اور لاہور میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیے۔ ان کی کارکردگی بہت اچھی رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے اندر افسرانہ شان نہیں تھی۔

ایک بار ہم کسی فضول سی بات پر ان سے ناراض ہو گئے۔ انہیں تو خبر ہی نہ ہوئی کہ ہم ان سے ناراض ہیں چونکہ کبھی ہم نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ کافی عرصے تک ان سے نہ ملاقات ہوئی نہ کوئی اور رابطہ قائم ہوا۔ کئی سال کے بعد ایک فلمی تقریب میں شرکت کے لیے راولپنڈی گئے تو وہاں مصطفیٰ زیدی بھی موجود تھے اور فلم والوں کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

ہم تو اپنی دانست میں ان سے ناراض تھے اس لیے ان سے دور دور ہی رہے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو سب کو چھوڑ کر ہال کے دوسرے کونے سے ہماری طرف آئے۔ بہت بے تکلفی اور گرم جوشی سے ملے۔ گلے لگایا۔ حال احوال پوچھا۔ چند فقرے چست کیے۔ ہم بھی ان سے پرانے دوستوں کی طرح ملے اور دیر تک سوچتے رہے کہ آخر ہم کس بات پر ان سے ناراض تھے۔ چند فلم والوں کو ان سے دفتری قسم کے کام تھے۔ وہ ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ بھائی، ہمارے کام کرا دو۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ اب ہم انہیں کیا سمجھاتے کہ بھائی فلمی معاملات کا تعلق ڈپٹی کمشنر سے نہیں ہوتا۔ بس ہاں ہاں کرتے رہے۔

مصطفیٰ زیدی ایک اچھے بیوروکریٹ تھے مگر یحییٰ خان کے زمانے میں جب نااہلی کے الزام میں بیوروکریسی میں چھانٹی کی گئی تو مصطفیٰ زیدی بھی اس فہرست میں شامل تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ کراچی میں رہا کرتے تھے۔ اسی شہر میں ان کی ملاقات شہناز نامی ایک حسینہ سے ہوئی اور یہ اسکینڈل کچھ دن بعد عام ہو گیا۔ ان کے دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ شہناز سے عشق کرنے لگے تھے مگر شہناز ایک سوشل تتلی کی طرح فضاؤں میں پرواز کرتی رہتی تھی۔

مصطفیٰ زیدی کی پُراسرار موت کے بارے میں شہناز سے بھی پوچھ گچھ کی گئی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ان کے بڑے بھائی

مجتبیٰ زیدی اس سے پہلے ایران بذریعہ کار پاکستان آتے ہوئے کوئٹہ کے قریب کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ ان دنوں مصطفیٰ زیدی سیالکوٹ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ہم ایک اخباری مقدمے کے سلسلے میں سیالکوٹ گئے تو ان کے بھائی کے حادثے کا علم ہوا۔ اسی رات وہ سیالکوٹ سے بھائی کی میت لینے کے لیے کوئٹہ چلے گئے تھے۔

مصطفیٰ زیدی کے کچھ افسرانِ بالا، ان کی ادبی سرگرمیوں سے نالاں رہے لیکن صرف فنانس سیکریٹری ممتاز حسن کا یہ کہنا تھا کہ مصطفیٰ زیدی ادب میں دلچسپی ضرور لیتے ہیں مگر انہوں نے اپنے سرکاری فرائض کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ یہ واحد سرٹیفکیٹ تھا جو ان کی حمایت میں سرکاری طور پر دیا گیا تھا۔

مصطفیٰ زیدی کے چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ”روشنی“ اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ الٰہ آباد میں تھے۔ یہ مجموعہ تیغ الٰہ آبادی کے نام سے شائع ہوا تھا۔

دوسرا مجموعہ ”شہرِ آزار“ اگرچہ پاکستان میں شائع ہوا تھا لیکن اس میں شامل بہت سا ایسا کلام تھا جو ہندوستان میں لکھا گیا تھا۔ کچھ کلام طالب علمی کے زمانے کا بھی تھا۔ تیغ الٰہ آبادی کے نام سے ان کی مشہور نظموں میں مندرجہ ذیل نظمیں شامل ہیں مثلاً

موج میری صدف صدف
گریبان

”شہرِ آزار“ میں ان کی بہت اچھی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کریں۔

سینے میں خزاں آنکھوں میں برسات رہی ہے
اس عشق میں ہر فصل کی سوغات رہی ہے

اک پیشہ عشق تھا سو عوض مانگ کر
رسوا اسے بھی کر گئی سوداگروں کی ذات

اس کتاب میں ایسا کلام بھی شامل ہے جو سماجی اور سیاسی مسائل کے بارے میں ہے، ملاحظہ کیجیے۔

کہیں کہیں پہ ستاروں کے ٹوٹنے کے سوا
اُفق اداس ہے، دنیا بڑی اندھیری ہے

ہم تیری لاش کو کندھا بھی نہ دینے آئے
ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا

آج تو خیر ستارے بھی ہیں ویرانے بھی
ہم پہ وہ رات بھی گزری ہے کہ غم خوار نہ تھا

اپنی وفات (یا قتل) سے چند دن قبل انہوں نے شہناز کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ نظمیں لکھی تھیں۔ آئیے، ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فن کار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی
وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی

شاعرو نغمہ گرو، سنگتراشو دیکھو
اس سے مل تو لو بتانا کہ حسیں تھا کوئی

یا تو اس کھیل میں پڑنا ہی نہیں تھا یا اب
جاں کی بازی بھی لگا دی ہے تو ڈرنا کیا ہے

مصطفیٰ زیدی کی موت بھی ایک اسرار تھی اور ابھی تک پُراسرار ہی رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کا یہ مشہور شعر انہوں نے خود اپنے لیے لکھا تھا۔

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
کہ سارے شہر نے پہنے ہوئے دستانے

یہ دستانے آج 41 سال گزر جانے کے بعد قاتل نے اپنے ہاتھ سے نہیں اُتارے ہیں اور نہ جانے کبھی اُتارے گا بھی یا نہیں۔ تیغ الٰہ آبادی اور مصطفیٰ زیدی کا کوئی حلقہ نہیں تھا۔ شاگرد نہیں تھے، کوئی لابی نہیں تھی جو ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے ان کی برسی، سالگرہ یا یادیں مناتی۔ ٹی وی چینلز اور اخبار و جرائد بھی انہیں بھول چکے ہیں مگر ان کی بہت سے دوستوں اور پرستاروں کا یہ حال ہے کہ

نہیں آتی جو ان کی یاد تو برسوں نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

☆☆☆

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سہگل اور کانن بالا کے نغمات ہمارے کانوں میں پڑے۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے سب سے بڑے بھائی، جنہیں ہم سب آکا بھائی کہتے تھے، اعلیٰ قسم کا ذوق رکھتے تھے۔ کھانے پینے اور فنونِ لطیفہ میں بھی۔ وہ درمیانہ درجے کے معیار کی کسی چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ گھر میں ایک ہی گراموفون تھا جو ان کے کمرے میں رہتا تھا۔ ان کا کمرا سب سے دور تھا جہاں فارغ اوقات میں وہ موسیقی سنتے رہتے تھے۔

ان ہی دنوں ایک گانا ہم نے سنا جو ہمیں اتنا پسند آیا کہ زبانی یاد ہو گیا۔ آواز اتنی میٹھی تھی کہ سن کر دل میں گدگدی پیدا ہونے لگتی تھی۔ نغمہ یہ تھا۔

تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی
میں بات کروں گا تو یہ خاموش رہے گی

سینے سے لگالوں گا تو یہ کچھ نہ کہے گی
یہ تیری طرح مجھ سے تو شرما نہ سکے گی

یہ گانا طلعت محمود کی آواز میں تھا۔ اور اسی روز سے طلعت محمود ہمارے پسندیدہ گلوکار بن گئے۔ پھر ان کے اور بھی گانے سنے۔

یہ چاند نہیں تیری آرتی ہے
ہونٹوں سے گلفشاں ہیں پر آنکھوں سے اشکبار ہم
ساون سے وہ ہیں بے خبر، بیگانہ بہار ہم

بعد میں پتا چلے کہ یہ عام گیت فیاض ہاشمی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ گراموفون کمپنی کلکتہ میں تھی اور فیاض ہاشمی بھی وہیں رہتے تھے۔ ان کے ذریعے گراموفون کے نغموں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ بعد میں وہ ترقی کرکے کمپنی کے جنرل منیجر بھی بن گئے تھے۔ فیاض ہاشمی فلمی گانے بھی لکھتے تھے۔ نیو تھیٹرز کی فلموں کے بہت سے گانے انہوں نے لکھے۔ آرزو لکھنوی جیسے استاد کے بعد نغمہ نگاروں میں ان ہی کا کلکتے میں ڈنکا بج رہا تھا۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی فیاض ہاشمی سے ملاقات ہوگی، ملاقات ہی نہیں ان کے ساتھ بے تکلفی سے اُٹھنا بیٹھنا ہوگا اور اِن کی کہانیاں خود اُن کی زبانی سنا کریں گے۔ فیاض ہاشمی کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس زمانے میں ایک فلم کے نغمات کا معاوضہ دس ہزار روپے تک وصول کیا ہے۔ انہوں نے بہت پیسا کمایا لیکن ہمیشہ خالی ہاتھ ہی رہے۔ دولت مندی کیا خوشحالی کے آثار بھی کبھی ہم نے نہیں دیکھے۔

فیاض ہاشمی نے بمبئی کی فلموں میں بھی نغمات لکھے اور پھر جب ہدایت کار ایس ایم یوسف بمبئی سے پاکستان آئے تو فیاض ہاشمی بھی آگئے۔ وہ یوسف صاحب کی فلموں کے نغمات لکھتے رہے اور پاکستان میں بھی یہ ساتھ برقرار رہا اور انہوں نے یوسف صاحب کی تمام فلموں کے نغمات لکھے جو بہت مقبول بھی ہوئے۔ اس زمانے میں فلم یونٹ ایک خاندان کی طرح ہوتا تھا اور ان کا زندگی بھر کا ساتھ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں ''ٹیم ورک'' کی وجہ سے فلمیں بہت اچھی اور معیاری بنا کرتی تھیں۔

فیاض ہاشمی جن دنوں پاکستانی فلموں میں گیت اور گانے لکھتے تھے، اسی زمانے میں اور بھی کئی قد آور شاعر فلمی شاعری کرتے تھے۔ سیف الدین سیف، قتیل شفائی، تنویر نقوی، کلیم عثمانی، مشیر کاظمی، منیر نیازی، حبیب جالب، مسرور انور، ریاض الرحمٰن ساغر، تسلیم فاضلی، حمایت علی شاعر، سرور بارہ بنکوی جیسے نامور اور مستند شاعر فلموں کے لیے لکھتے تھے۔ ایسے شاعر جن فلموں کے نغمات لکھتے تھے، ان کا معیار کیسا ہوتا ہوگا؟

پاکستان میں فیاض ہاشمی نے پہلی بار فلم ''دوپٹا اور انوکھی'' کے لیے نغمات لکھے۔ انہوں نے آخری نغمہ فلم ''دیوانے تیرے پیار کے'' لیے لکھا تھا۔

اس کے بعد وہ فلمی دنیا ترک کرکے تارک الدنیا اور صوفی ہوگئے تھے۔ 29 نومبر کی شب کو کراچی میں خاموشی سے دنیا چھوڑ گئے۔ اس سے کئی سال پہلے وہ فلم والوں کے لیے لاپتا ہوچکے تھے۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی اور زیادہ وقت مساجد اور مدارس میں گزارتے تھے۔ فلم والوں سے انہوں نے تعلق منقطع کردیا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فیاض ہاشمی نے پاکستان میں 120 فلموں کے لیے تقریباً 490 نغمات لکھے جن میں سے اکثر بہت مقبول ہوئے۔ ایس ایم یوسف کی فلموں میں موسیقار عموماً اے حمید ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں کی باہمی کوششیں بیشتر کامیاب ہوتی تھیں۔ فیاض ہاشمی کے نغمات میں معاشرتی خرابیوں پر طنز پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''دیور بھابی'' کا یہ نغمہ۔

یہ کاغذی پھول جیسے چہرے
مذاق اُڑاتے ہیں آدمی کا
انہیں کوئی کاش یہ بتادے
مقام اونچا ہے سادگی کا

فلم ''سہیلی'' کے لیے ان کے گیت سچویشنز کے مطابق اور بہت خیال انگیز تھے۔

1۔ ہم بھول گئے ہر بات مگر ترا پیار نہیں بھولے
2۔ کہیں دو دل جو مل جاتے بگڑتا کیا زمانے کا

فیاض ہاشمی بہت آسان اور عام فہم شاعری کرتے تھے جو سننے والوں کے دلوں میں اُتر جاتے تھے۔ فیاض ہاشمی کے لکھے ہوئے چند مقبول گانے ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں۔

ارے او بے مروت، ارے او بے وفا
(فلم سوال۔ نور جہاں)
نام لے لے کے تیرا ہم تو جیے جائیں گے
(فلم اولاد۔ نسیم بانو)
کیا ہوا دل پہ ستم تم نہ سمجھو گے بلم
(فلم رات کے راہی۔ زبیدہ خانم)
تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
(گلوکار، ایس بی جون)
جارے بے دردی تو نے کہیں کا نہ چھوڑا
جس دل میں تو ہی تو تھا اس دل کو توڑا

(آشیانہ۔ نور جہاں)
نہ جانے کیسا سفر ہے میرا جہاں ہے منزل وہیں لٹیرا
(فلم بنجارن۔ نور جہاں)
چلو اچھا ہوا تم بھول گئے اِک بھول ہی تھا مرا پیار او ساجنا...... (فلم لاکھوں میں ایک۔ نور جہاں)
لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم میں نہ لگاؤں گی ہاتھ رے
(فلم سوال۔ نور جہاں)

فیاض ہاشمی کے ملی نغمے اور اصلاحی نغمے بھی قابلِ ذکر ہیں۔

1۔ آؤ بچو سیر کرائیں تم کو پاکستان کی...... (فلم بیداری۔ گلوکارہ منور سلطانہ)
2۔ یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران
اے قائداعظم ترا احسان ہے احسان...... (فلم بیداری۔ گلوکارہ منور سلطانہ)
3۔ ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس دیس کو رکھنا مرے بچوں سنبھال کے...... (فلم بیداری۔ گلوکار سلیم رضا)

فیاض ہاشمی نے بہت مقبول قوالیاں بھی لکھی ہیں۔
1۔ شکر الحمد للہ چلے آؤ...... (گلوکار امانت علی خاں، فتح علی خاں)
2۔ بگڑی بنادے میری
تیرے صدقے کملی والے...... (گلوکارہ، نور جہاں)

فیاض ہاشمی کی آخری فلم ''دیوانے تیرے پیار کے'' چند نغمات ملاحظہ کیجیے۔
1۔ دیوانہ دیوانہ اِک میں ہی نہیں...... (گلوکارہ تحسین جاوید، شبانہ کوثر)
2۔ ہم نکل آئے آگے آگے
پیچھے رہ گیا زمانہ...... (گلوکار وارث بیگ، شازیہ منظور)

فیاض ہاشمی کے تمام گیت لکھنے کے لیے ایک طویل وقت کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ہر قسم کی فلموں کے لیے اسی مزاج کے گانے لکھے۔ ان کے لکھے ہوئے بیشتر گانے بے حد مقبول ہوئے۔ فلم ''سویرا'' کے لیے ایس بی جان کا گایا ہوا نغمہ۔

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے

وہ نغمہ ہے جس نے ایس بی جان کو راتوں رات مقبول ترین گلوکار بنا دیا تھا اور وہ آج بھی اسی کے حوالے سے یاد کیے جاتے ہیں۔

فیاض ہاشمی ہمارے بزرگ دوست تھے مگر ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا تھا۔ ایک دن موسیقار رشید عطرے اور فیاض ہاشمی اکٹھے بیٹھے تھے۔ ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے کہا کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، آپ دونوں کے نغمات سنتے آئے ہیں۔ آپ دونوں نے کلکتہ میں بھی کام کیا ہے۔ کم از کم ہماری اطلاع کے لیے ہمیں اپنی اصل عمریں بتادیں، قسم لے لیجیے ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔

اس سوال پر دونوں حضرات میں بحث شروع ہوگئی۔ دونوں نے واقعات گنوانے شروع کردیے کہ آپ نے فلاں زمانے میں فلاں فلم ساز کے لیے گیت لکھے تھے یا فلاں زمانے میں فلاں فلم کی موسیقی بنائی تھی۔ یہ بحث کافی دیر تک چلتی رہی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

ہم نے عرض کی کہ یہ آپ دونوں بزرگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ مہربانی فرما کر جب حل ہوجائے تو ہمیں بھی بتادیجیے گا لیکن اتنا معلوم ہوگیا کہ ہم آپ دونوں کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔

دونوں ہنسنے لگے اور ایک دوسرے سے کہا ''یار، چھوڑو یہ بحث۔ یہ کل کا لڑکا ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔''

اب نہ رشید عطرے اس دنیا میں ہیں اور نہ فیاض ہاشمی۔ عطرے صاحب کی وفات کو 26 سال ہوگئے۔ فیاض ہاشمی صاحب نومبر 2011ء میں وفات پاگئے۔ دنیا دو باکمال ہنرمندوں سے محروم ہوگئی اور فلمی دنیا تو کنگال ہی ہوگئی مگر ٹھہریے، فلمی دنیا اب ہے کہاں؟

☆☆☆

پہلے بھی اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کی مشہور و معروف ہیروئنوں کی اکثریت نے بے شمار پرستاروں اور خواہش مندوں کے ہوتے ہوئے آخر شادی کے لیے ایک شادی شدہ اداکار یا کسی اور فلمی شخصیت ہی کو کیوں منتخب کیا؟ خیال تھا کہ اس موضوع پر قارئین بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ممکن ہے ہیروئنوں کی شادیوں کے ذکر سے اکثر ''شوہروں'' کو یہ خوف ہوتا ہو کہ اگر سچی بات لکھ دی تو بیگم ناراض ہوجائیں گی۔ پچھلے دنوں یہی سوال انگلستان میں ایک خاتون نے بھی دریافت کیا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہیں اور اس کا سبب جاننا چاہتی ہیں۔

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ہندوستان میں صرف دو معروف ہیروئنیں ایسی ہیں جنہوں نے عمر بھر شادی ہی نہیں

کی۔ ان میں ایک گلوکارہ اور اداکارہ ثریا ہیں جو کسی زمانے میں ہندوستان کی صفِ اوّل کی اداکارہ تھیں۔ گلوکارہ بھی ہونے کی وجہ سے انہیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ میڈم نور جہاں کے سوا اس زمانے میں کوئی ایسی معروف اور مقبول ہیروئن برصغیر کی فلمی دنیا میں نہیں تھی جو گلوکاری اور اداکاری دونوں شعبوں میں یکساں مہارت رکھتی ہو۔ البتہ اداکارہ خورشید کو اس فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے جو گلوکارہ بھی تھیں اور ہیروئن بھی مگر انہیں اتنا زیادہ بلند مقام حاصل نہ ہوسکا کیونکہ وہ بہت کم فلموں میں کام کرسکی تھیں۔

مشہور میوزیکل فلم ''تان سین'' میں سہگل کے ساتھ ''تانی'' کا کردار ادا کیا تھا۔ سہگل ایک معروف اور بہت بڑے گلوکار تھے اس لیے ''تان سین'' کے لیے ان ہی کی آواز استعمال کی گئی تھی۔ تان سین کی ہیروئن خورشید تھیں۔ اس فلم میں۔ ''برسو رے برسو رے، جھوم جھوم کر برسو'' جیسے ناقابلِ فراموش نغمات تھے۔ فلم کی کہانی کے مطابق شہنشاہ کے حکم پر تان سین نے دیپک راگ گایا، اس راگ کو گانے سے ان کے جسم پر آبلے پڑ گئے جس کا کوئی علاج نہ تھا مگر جب وہ اپنے گاؤں واپس آئے تو تانی نے ''راگ ملہار'' گا کر ایسا ماحول پیدا کردیا کہ اچانک گھرے بادل چھاگئے اور دھواں دھار بارش ہوگئی۔ راگ ملہار بارش کا راگ کہلاتا ہے۔ اس بارش کے پانی میں نہا کر ''تان سین'' تندرست ہوگئے، یہ گانا راگ ملہار میں ثریا نے گایا تھا۔

ثریا کے شادی نہ کرنے کا سبب عشق میں ناکامی بتایا جاتا ہے۔ ثریا کو اداکار دیو آنند سے محبت تھی۔ وہ بھی انہیں چاہتے تھے۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے اور دیو آنند اسلام قبول کرنے کے لیے بھی تیار تھے لیکن ثریا کی با اثر اور با اختیار نانی اور والدہ نے ''سونے کی چڑیا'' کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کے سبب سے یہ شادی نہ ہونے دی۔ دیو آنند نے تو کچھ عرصے بعد فلم ''کالا پانی'' کی نئی ہیروئن کلپنا کارتک۔ سے شادی کرلی تھی جو ایک ناکام اور ناخوشگوار شادی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی کبھی خوشگوار نہیں رہی۔ دیو آنند نے اپنا گھر چھوڑ کر ایک علیحدہ فلیٹ میں رہنا شروع کردیا تھا حالانکہ کلپنا کارتک نے شادی کے بعد نہ صرف فلمی دنیا سے تعلق منقطع کرلیا تھا بلکہ وہ کبھی کسی فلمی تقریب میں بھی نظر نہیں آتیں۔ ان دونوں کا ایک بیٹا ہے۔

دیو آنند نے انگریزی میں اپنی سوانح عمری لکھی تو دنیا بھر کے واقعات اور قریبی لوگوں کے بارے میں لکھا لیکن اس سوانح میں ان کی بیگم کے بارے میں ایک سطر بھی موجود نہیں ہے۔ اسی سوانح میں دیو آنند نے یہ بھی لکھا تھا کہ بلاشبہ دلیپ کمار ہندوستان کا عظیم ترین اداکار ہے۔

دوسری معروف انڈین ہیروئن جنہوں نے شادی نہیں کی، ریکھا ہیں۔ ویسے کہنے کو تو ریکھا نے دو شادیاں کیں۔ ایک اداکار ونود مہرہ سے جو صرف چھ ماہ جاری رہی۔ دوسری شادی 1990ء میں انہوں نے ایک بزنس مین مکیش اگروال سے کی تھی لیکن اگلے ہی سال یہ ساتھ چھوٹ گیا اور اگروال کا قتل ہوگیا۔ اس کے بعد ریکھا نے شادی نہیں کی۔ ان کے رومان ہوتے رہے اور مختلف اداکاروں کے ساتھ ان کا نام منسلک ہوتا رہا لیکن ازدواجی زندگی کی صحیح خوشی انہیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ ان میں اکشے کمار، جتیندرا اور امیتابھ بچن نمایاں ہیں۔ کہتے ہیں کہ دراصل وہ امیتابھ بچن کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اس کے بعد ہی ان کے اسکینڈلز مشہور ہوئے۔ انہیں فلمی صنعت میں کام کرتے ہوئے 43 سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور ان کی عمر 60 سال کے لگ بھگ ہے۔ اگرچہ وہ آج بھی اسمارٹ ہیں مگر وہ اپنی بدقسمتی کا ماتم کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ''ہر وقت یہی دعا کرتی ہوں کہ خدا مجھ جیسی قسمت کسی کو نہ دے۔''

وہ اپنی ناکام زندگی کے بارے میں ایک خودنوشت بھی لکھنا چاہتی ہیں جس میں وہ اپنی زندگی کے تمام واقعات پر سے پردہ ہٹائیں گی۔

اب ذرا شادی شدہ ہیروئنوں پر ایک نظر ڈالیے۔ پاکستان سے اگر آغاز کریں تو ہماری فرسٹ لیڈی، صبیحہ خانم نے سنتوش کمار سے دوسری شادی کی تھی یعنی وہ پہلے ہی شادی شدہ تھے۔ اس سے پہلے معروف اداکارہ راگنی نے ایک شادی شدہ اداکار فلم ساز اور موسیقار ایس گل سے شادی کی تھی جو پہلے ہی شادی شدہ تھے۔ شمیم آرا نے بھی شادی کے لیے ہمیشہ شادی شدہ حضرات ہی کا انتخاب کیا۔ رانی بیگم نے بھی تین شادیاں کی تھیں اور تینوں شادی شدہ حضرات سے۔

ہندوستان کی طرف نظر ڈالیے تو وہاں بھی یہ دستور عام رہا ہے۔ اپنے وقت کی حسین ترین اداکارہ مدھو بالا نے شادی شدہ اداکار و گلوکار کشور کمار سے شادی کی تھی۔ مینا کماری کی شادی کمال امروہوی سے ہوئی تھی جو پہلے شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھے۔ اداکارہ مینا کشی کی شادی بھی ایک شادی شدہ بزنس مین سے ہوئی تھی۔ نرگس نے دس سال ایک شادی شدہ اداکار و فلم ساز راج کپور کے ساتھ ضائع کردیے۔ وہ تو شادی کرنے کے لیے تیار تھیں مگر راج کپور آمادہ نہ ہوئے۔

بعد میں حالات کے باعث ان کی شادی سنیل دت سے ہوگئی جو اتفاق سے کنوارے تھے۔ اپنے زمانے کی مقبول ترین ہیروئن سری دیوی نے بھی ایک شادی شدہ فلم ساز سے شادی کی جو انیل کپور کے بڑے بھائی ہیں۔ انیل کپور کے ساتھ ان کی بہت سی کامیاب فلمیں بے حد مقبول ہوئیں۔ اپنے مقبول فلمی ہیرو کی اب وہ بھابی ہیں۔ سری دیوی اور انیل کپور نے چند یادگار فلموں میں ایک دوسرے کے ساتھ کام کیا ہے۔

ہیما مالنی کو ''ڈریم گرل'' کہا جاتا تھا۔ اداکاری تو وہ واجبی سی کرتی تھیں مگر غضب کی ڈانسر تھیں۔ ان کی شخصیت بہت دلکش اور خوبصورت تھی۔ انہوں نے اتنے سال گزر جانے کے باوجود اپنے حسن و جمال اور جسمانی کشش کو برقرار رکھا ہے۔

ہیما مالنی سے شادی کرنے کے امیدواروں کی کروڑوں فلم بینوں میں کوئی کمی نہ تھی جن میں اداکار بھی شامل تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ان کی والدہ سائے کی طرح ہر وقت ان کے ساتھ رہتی تھیں اور ان پر کڑی نگرانی رکھتی تھیں۔ ان کی عقابی نظریں بھانپ لیتی تھیں کہ کون سا اداکار ان کی بیٹی میں دلچسپی لے رہا ہے اور ہیما مالنی بھی اس کی طرف مائل ہیں۔ ان میں ایک سنجیو کمار بھی تھے۔ بہت اچھے اداکار تھے اور خوبصورت بھی تھے۔ وہ ہیما مالنی کے خاموش پرستاروں میں سرفہرست تھے۔ ہیما مالنی بھی اس بات سے بخوبی واقف تھیں لیکن غالباً کوئی فیصلہ نہیں کرسکی تھیں یا پھر ''ممی'' کی جانب سے اجازت نہ ملی تھی۔

اسی دوران.... انہوں نے اداکار دھرمیندر کے ساتھ چند کامیاب فلموں میں کام کیا اور دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آگئے۔ جہاں چاہ ہو وہاں راہ بھی نکل ہی آتی ہے۔ ایک رازدار میک اپ مین کی مدد سے وہ مختلف اسٹوڈیوز کے میک اپ روم میں ملتے رہے۔ ''میک اپ مین'' باہر نگرانی پر کھڑا رہتا تھا اور جوں ہی کوئی خطرہ دیکھتا ان دونوں کو باخبر کردیتا تھا۔

جب یہ جذبہ سنجیدگی اور شدت اختیار کرگیا تو ہیما مالنی نے دھرمیندر کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ شادی خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلتی رہی اور آج تک چل رہی ہے۔ دھرمیندر نے اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے پہلی بیوی کے بیٹے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہوگئے۔ بہ ظاہر دونوں خاندانوں کے بہت اچھے تعلقات ہیں اگرچہ باہمی رابطہ زیادہ نہیں ہے۔ دونوں بیویوں سے دھرمیندر کی اولاد ہے لیکن عجب اتفاق ہے کہ پہلی بیوی سے تین بیٹے ہیں اور دوسری بیوی سے دو بیٹیاں۔ ہیما مالنی نے ایک طویل انٹرویو میں اپنی داستانِ محبت بیان کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دھرمیندر کی شرافت، صاف گوئی اور صاف دلی سے بہت متاثر ہوئیں مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ آخر انہوں نے ایک شادی شدہ اداکار ہی کا شادی کے لیے کیوں انتخاب کیا جو صاحبِ اولاد بھی تھا؟

ہماری فلمی صنعت میں انگلستان میں پلی بڑھی اور مشہور فلمی خاندان سے وابستہ سلمیٰ آغا نے بھی جاوید شیخ کو ہی شادی کے لیے منتخب کیا جو پہلے ہی شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے۔ ان کی پہلی شادی ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والی ٹی وی اداکارہ زینب منتھی سے ہوئی تھی اور زینب کے گھر والوں نے اس شادی کے بعد زینب سے ملنا جلنا بھی ترک کردیا تھا۔ ایک ایسی بیوی اور دو پیارے بچوں کو چھوڑ کر انہوں نے سلمیٰ آغا سے شادی کرلی۔

ہم نے کئی اداکاراؤں سے بھی دریافت کیا کہ آخر انہوں نے ساری دنیا کے لوگوں کو چھوڑ کر ایک شادی شدہ مرد ہی سے کیوں شادی کی؟

اس کا جواب کوئی واضح نہیں تھا سوائے اس کے کہ ''پسند آگئے تھے۔''

یہ ایک علیحدہ گورکھ دھندا ہے جس کے بارے میں اصلیت کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری رہا ہے اور خیال ہے کہ آئندہ بھی جاری رہے گا، چاہے کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔

☆☆☆

50ء کی دہائی میں ہندوستان کی فلمی دنیا پر تین سپر اسٹارز کا راج تھا۔ یہ دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند تھے۔ فلم بین ان کے نام ہی دیکھ کر سنیما گھروں کی طرف کشاں کشاں کھنچے چلے جاتے تھے۔ ایسے فن کاروں کو ہی باکس آفس اسٹار کہا جاتا ہے۔

یہ تینوں ذہین، باشعور، باصلاحیت اور انتہائی مہذب اداکار تھے۔ تینوں کا تعلق اچھے خاندانوں سے تھا۔ راج کپور ایک فن کار (پرتھوی راج) کے صاحب زادے تھے لیکن دلیپ کمار اور دیو آنند کا کوئی فلمی پس منظر نہیں تھا۔ دیو آنند ایک بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ گورداسپور میں پیدا ہوئے تھے۔ 26 ستمبر 1922ء ان کا یومِ پیدائش ہے۔ انہوں نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی اے کی ڈگری لی تھی۔ اداکارہ کامنی کوشل نے بھی اسی

درس گاہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا اصلی اور پورا نام دھرم پشوری مل آنند تھا۔ اداکار بننے کے بعد انہوں نے دیو آنند کا نام اپنایا اور اسی سے شہرت حاصل کی۔ ان کے خاندان میں اس سے پہلے کسی نے شوبزنس سے تعلق نہیں رکھا تھا لیکن دیو آنند اور ان کے بھائیوں نے فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی رکھنے کی وجہ سے اسی شعبے کو اپنایا۔ دیو آنند اداکار اور پھر فلم ساز اور ہدایت کار بنے۔ ان کے بڑے بھائی چیتن آنند پہلے ہی فلمی کہانی رائٹر تھے۔ چھوٹے بھائی وجے آنند اور بھتیجے شیکھر کپور بھی فلمی صنعت سے وابستہ ہوگئے اور نام پیدا کیا۔

دیو آنند ایک دراز قد، کھلتے ہوئے گندمی رنگت، سیاہ گھنے بالوں اور بہت اچھے نین نقش کے باعث ایک خوبرو نوجوان تھے۔ فلموں میں اداکار بن جانے کے بعد انہوں نے اپنی اداکاری کا ایک منفرد اور مختلف انداز اپنایا۔ ان کی بول چال بالکل حقیقی لگتی تھی۔ ہلکے پھلکے، رومانی کرداروں میں وہ بہت کمال رکھتے تھے۔ ڈرامائی کرداروں کے ساتھ اس طرح انصاف نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ ہندوستانی فلمی صنعت کے تین بڑے ستاروں میں شامل تھے۔ اب ان میں سے دو ستارے غروب ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے راج کپور گئے اور اب 3 دسمبر 2011ء کو لندن میں دیو آنند کا انتقال ہوگیا ہے۔ ان کی عمر وفات کے وقت 88 سال تھی لیکن وہ آخری دم تک فلم سازی میں مصروف رہے۔ ان کی زندگی میں سینما اور فلم کے سوا کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔ فلم ساز اور ہدایت کار بننے کے بعد وہ مسلسل فلمیں بناتے رہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے وہ اداکاری ترک کر چکے تھے مگر کہانی نویس اور ہدایت کار و فلم ساز کی حیثیت سے ہر وقت مصروف نظر آتے تھے۔ انہوں نے کافی معمر ہونے کے بعد اپنی فلموں میں ہیرو بننے کا سلسلہ بند کیا تھا۔

دیو آنند نے ایک سو سے زائد فلموں میں اداکاری کی۔ خود ان کی بنائی ہوئی فلموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ وہ فلم کے موضوع پر خود ہی سوچتے اور تلاش کرتے تھے۔ انہیں بھارت کی فلمی دنیا میں سب سے زیادہ ہیروئنیں متعارف کرانے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی دریافت کی ہوئی کئی ہیروئنیں...... بے حد مقبول اور مشہور ہوئیں۔

ان سے جب عمر رسیدہ ہونے کے بعد بھی کام جاری رکھنے کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو ان کا کہنا تھا کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اپنے کام سے محبت بلکہ عشق کرو۔ یہ وہ جذبہ ہے جو آپ کو طویل عرصے تک متحرک اور باعمل رکھتا ہے۔ جس روز میں اپنے کام سے بور ہو جاؤں گا تو وہ میری زندگی کا اختتام ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر میں فلمیں نہ بناؤں تو پھر کیا کروں گا؟

یہی وجہ ہے کہ وہ تھکے اور بور ہوئے بغیر آخری دم تک فلمیں بناتے رہے۔ وہ اپنی پسند کی فلمیں بناتے تھے۔ کامیاب ہو یا ناکام ان کے پرستار انہیں فلمیں بنانے کے لیے سرمایہ فراہم کرتے رہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ایک ایک پائی فلم پر خرچ کرتے ہیں۔

دیو آنند نوجوانوں میں مقبول تھے۔ ان کی فلموں کے گانے عموماً بہت اچھے ہوتے تھے اور وہ اپنے مخصوص انداز میں گانے فلم بند کراتے تھے جو دوسرے اداکاروں سے مختلف تھا۔ ان کی فلموں کے بعض گانے آج تک لوگ نہیں بھولے، مثلاً

1۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہوگیا
(فلم سی آئی ڈی)
2۔ اے لو میں ہاری پیا
تیری ہوئی جیت رے
(فلم کالا پانی)
3۔ چھوڑ دو آنچل زمانہ کیا کہے گا
(فلم پے انگ گیسٹ)
4۔ ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر
کہ دل ابھی بھرا نہیں
(فلم ہم دونوں)

ان میں سے کچھ گانے ہیروئنوں نے گائے تھے مگر دیو آنند کی موجودگی نے انہیں رنگین اور پُراثر بنا دیا تھا۔ ان کا تاثر بھی ان گانوں میں اہم کردار ادا کرتا تھا۔ گانے فلم بند کرانے میں دیو آنند کا ایک مختلف اور انوکھا انداز تھا۔ ان کی بول چال اور جسم کی حرکات میں بھی ایک بے ساختگی تھی۔ سچ پوچھا جائے تو دیو آنند اداکار کی حیثیت سے بہت اعلیٰ معیار کے حامل نہ تھے لیکن اپنی دلکش شخصیت، شائستگی اور طرزِ گفتگو کے باعث انہیں ایک انفرادی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اپنے دونوں ممتاز ہم عصر اداکاروں کے مقابلے میں اداکاری کے لحاظ سے تو پیش نہیں کیے جاسکتے لیکن ان کا منفرد انداز اور آنکھوں کی شوخی اور شرارت کے باعث وہ نوجوانوں میں بہت مقبول تھے۔

دیو آنند نے دلیپ کمار کی طرح اپنے بالوں کا مخصوص انداز تو نہیں اپنایا تھا لیکن وہ اپنے لباس کی وجہ سے دوسرے ہم عصروں سے قطعی مختلف تھے۔ وہ اس زمانے میں عام طور

پر پہنے جانے والے لباس سے ہٹ کر لباس پہنتے تھے۔ اس زمانے میں سفید اور مردوں میں سوبر کلرز کا رواج تھا لیکن دیو آنند چیختے چنگھاڑتے، گہرے رنگوں یا چیک کی قمیصیں پہنتے تھے جن کے کالر وہ عام طور پر اوپر تک بند رکھتے تھے۔ حالانکہ دوسرے اداکار اور عام لوگ قمیص کے اوپر کا بٹن کھول کر رکھتے تھے۔ بعض اوقات وہ بہت چوڑے کالر کی قمیصیں اور ان کے اوپر ڈھیلے ڈھالے سوئٹر یا اوور آل استعمال کرتے تھے۔ ان کے یہی انداز انہیں دوسرے اداکاروں سے مختلف بناتے تھے۔

دیو آنند نے اداکاری کے بعد ہدایت کاری اور فلم سازی شروع کر دی تھی۔ دراصل انہیں سینما کے آرٹ سے اتنی محبت تھی کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے وقف کرنا پسند کرتے تھے۔ آخر وقت جب وہ بہت زیادہ بیمار پڑ گئے تھے پھر بھی وہ رات گئے تک کام میں مصروف رہتے تھے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کچھ سال بعد ہی تلخیوں کا شکار ہو گئی تھی جس کا اصلی سبب کوئی نہیں جانتا کیونکہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں منہ کھولنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران.... ئی ہیروئن کلپنا کارتک سے شادی کرلی تھی۔ کلپنا نے شادی کے فوراً بعد اداکاری ترک کر دی تھی اس لیے نہیں کہ دیو آنند کو اعتراض تھا بلکہ اس لیے کہ اداکارہ کی حیثیت سے وہ پسند نہیں کی گئی تھیں۔ ان دونوں کی شادی کی یادگار ایک بیٹا ہے۔ شادی کے چند سال بعد ہی ان کے مابین دوریاں پیدا ہو گئی تھیں یہاں تک کہ دیو آنند اپنا گھر چھوڑ کر ایک اور بلڈنگ میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ یہیں ان کا آنند ریکارڈنگ اسٹوڈیو بھی تھا اور اسی عمارت میں ان کا دفتر اور رہائش بھی تھی۔ ان کا رہائشی کمرا پہلے ان کا دفتر یا ان کا دفتر ہی ان کی رہائش گاہ تھی جہاں وہ ہمہ وقت اکیلے ہی مصروف رہتے تھے۔

دیو آنند نے انگریزی لٹریچر میں ڈگری لی تھی۔ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ وہ فلمی تقاریب میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ فلموں کے بارے میں سوچنا، لکھنا، منصوبہ بندی کرنا اور مطالعہ کرنا ان کا مشغلہ بھی تھا اور پیشہ بھی۔ ان کے ملنے والوں کا حلقہ بہت محدود تھا جن میں اہلِ علم اور ہنر مند لوگ شامل تھے۔ ان محفلوں میں شریک ہو کر وہ اپنی تھکن دور کرلیا کرتے تھے۔

دیو آنند کو اس زمانے کے ہالی ووڈ کے مشہور اداکار گریگوری پیک سے تشبیہ دی جاتی تھی بلکہ انہیں انڈیا کا گریگوری پیک کہا جاتا تھا۔ گریگوری پیک، ایک اسٹائلش ہیرو تھے جن کی اداکاری اور بولنے کا انداز منفرد تھا۔ ان کا شمار ہالی ووڈ کے دس ممتاز ترین اداکاروں میں کیا جاتا تھا۔ ان کی ہر فلم ہٹ ہوتی تھی جس میں ان کی دلکش شخصیت اور اداکاری کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔ دیو آنند کہتے تھے کہ ابتدا میں تو انہیں گریگوری پیک سے تشبیہ دینا اچھا لگتا تھا مگر بعد میں جب وہ خود بڑے اداکار ہو گئے تو انہیں انڈیا کا گریگوری پیک کہلانا پسند نہ تھا کیونکہ ان کی اپنی ایک پہچان بن چکی تھی۔

دیو آنند اسکینڈلز سے ہمیشہ دور ہی رہے حالانکہ وقت کی بڑی بڑی ہیروئنیں ان سے دوستی کرنا پسند کرتی تھیں۔ ان کا صرف ایک اسکینڈل یا رومان بہت مشہور ہوا تھا۔ اس زمانے کی گلوکارہ اور ہیروئن ثریا کے ساتھ ایک فلم میں کام کرتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ اسے ”عشق“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہالی ووڈ کے اداکار گریگوری پیک ثریا کے پسندیدہ اداکار تھے۔ ایک بار جب وہ بمبئی آئے تو خاص طور پر ثریا سے ملنے کے لیے اس کے گھر بھی گئے تھے۔

ثریا نے گریگوری پیک کی جستجو میں ان کے مشابہ دیو آنند سے محبت کی تھی یا اس کے دوسرے عوامل تھے لیکن ایک زمانے میں یہ رومان بہت مشہور رہا تھا۔ یہاں تک کہ دیو آنند اسلام قبول کرنے پر بھی آمادہ تھے لیکن ثریا کی ماں اور نانی نے ”سونے کی چڑیا“ سے محروم ہونے کے ڈر سے شادی سے صاف انکار کر دیا۔ ثریا اس زمانے میں نانی اور ماں کی ”اسیر“ تھیں اور بذاتِ خود کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتی تھیں۔ لیکن اس ”جرم“ کے لیے انہوں نے اپنی ماں اور نانی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ نانی کی وفات کے بعد جب ثریا کو ”آزادی“ حاصل ہوئی تو انہوں نے ماں کو خود سے علیحدہ کر دیا تھا یہاں تک کہ جب ان کی والدہ شدید بیمار ہوئیں تو ثریا نے ان کی خبر تک نہ لی اور انہوں نے ایک سرکاری اسپتال میں بے بسی کے عالم میں وفات پائی۔ ثریا نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ انہوں نے 1962ء میں اداکاری اور گلوکاری ترک کرنے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ وہ اپنے فلیٹ سے باہر قدم نہیں رکھتی تھیں اور نہ تقاریب میں جاتی تھیں۔ سنا تھا کہ 60 سال کی عمر کے بعد انہوں نے ایک معروف ہندو ریکارڈسٹ سے شادی کرلی تھی۔ مگر ساری جوانی انہوں نے تنہا اور سب سے دور رہ کر ہی گزاری تھی۔

دیو آنند کی شادی کی ناکامی اور تلخی کا سبب بھی غالباً پہلی محبت سے محرومی کا داغ ہی تھا۔ شادی میں تلخیاں پیدا

ہو جانے کے بعد دیو آنند نے بھی کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ ان کا کوئی اسکینڈل بنا نہ ہی کسی اداکارہ کے ساتھ ان کا نام منسوب ہوا۔ یہاں تک کہ 88 سال کی عمر میں وہ لندن کے ایک اسپتال میں زندگی ہار گئے۔

دیو آنند نے بے شمار فلمیں بنائیں اور ان کی ہدایت کاری بھی کی۔ ان کی کئی فلمیں بے حد کامیاب ہوئیں لیکن آخری چند سالوں میں فلاپ ہونے والی فلموں کا اوسط زیادہ ہے۔ دیو آنند سمجھوتا کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ اپنی پسند کی فلمیں بناتے تھے خواہ کامیاب ہوں یا ناکام۔ اداکار کی حیثیت سے انہیں فلم ''کالا پانی'' اور ''گائیڈ'' میں فلم فیئر ایوارڈز بھی ملے تھے۔

گفتگو کے دوران میں سر ہلاتے رہنا اور چلتے ہوئے ایک جانب جھکاؤ رکھنا ان کا اسٹائل تھا جو آخر وقت تک قائم رہا۔ وہ ایک ایسی شخصیت اور اداکار تھے جنہیں عوام، نقاد اور فلمی دنیا کے لوگ سبھی پسند کرتے تھے۔ ان کی چوڑے کالر والی قمیص بھی ایک زمانے میں فیشن میں داخل ہو گئی تھی۔

ایک بار ان سے ان کی مقبولیت کا راز دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا۔ ''اس زمانے میں اداکاروں کے اندر حریفانہ جذبہ یا دشمنی نہیں تھی مگر کوئی فلم ساز مجھے فلم میں سائن کرنے کے لیے آتا تھا اور کہانی پڑھ کر یا سن کر میں وہ کردار اپنے لیے موزوں نہیں سمجھتا تھا تو میں ان سے کہتا تھا کہ اس کردار کے لیے (راج کپور) یا یوسف (دلیپ کمار) زیادہ موزوں ہوں گے اور وہ میرے مشورے پر عمل کرتے تھے۔ اسی طرح ہم لوگ اپنے انداز کے کردار ہی پسند کرتے تھے جو فلم بینوں کو بھی پسند آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے درمیان میں کوئی حریفانہ جذبہ یا دشمنی نہیں تھی۔''

دیو آنند نے جن فلموں میں کام کیا اور جو فلمیں بنائیں ان کی موسیقی ہمیشہ بہت اچھی ہوتی تھی۔ اگر فلم کامیاب نہ ہو تو بھی اس کے گانے ضرور مقبول ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ساٹھ سال سے اوپر عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ گانے تروتازہ ہیں اور پسند کیے جاتے ہیں۔ دیو آنند کی ایک سو سے زیادہ فلموں میں مقبول گانوں کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے۔ دیو آنند کے گانے فلمبند کرانے کا انداز دوسروں سے مختلف اور بہت مقبول تھا۔

دیو آنند کو دو فلم فیئر ایوارڈز، پدم بھوشن، دادا بھائی پھالکے ایوارڈ اور دوسرے ممتاز اعزازات سے نوازا گیا تھا جو فلم میں ان کی خدمات کے لیے دیے گئے تھے۔

دیو آنند نے جب فلم سازی اور ہدایت کاری شروع کی تو اپنے ساتھ عموماً نئی اداکاروں کو متعارف کرایا۔ اس سے ان کی خود اعتمادی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور جدت پسندی کا بھی۔ ان کی متعارف کرائی ہوئی بہت سی ہیروئنوں نے بہت مقبولیت اور عروج حاصل کیا۔ جن نئے چہروں کو انہوں نے روشناس کرایا ان میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

جیکی شیروف، زینت امان، تبو، ٹینا منیم وغیرہ۔ ان سب نے فلمی صنعت میں بہت عروج حاصل کیا تھا۔ انہوں نے اپنی فلم ''جانی میرا نام'' میں پریم ناتھ کو مرکزی کردار میں پیش کیا تھا۔

دیو آنند اداکاروں کے علاوہ فلموں کے موضوعات میں بھی تجربے کرتے رہتے تھے۔ مثلاً عامر خان کو ہیرو لے کر انہوں نے کرکٹ کے بارے میں ایک بہت اچھی فلم بنائی تھی جس میں عامر خان کا حریف کھلاڑی سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے آمادہ تھا۔ ''گائیڈ'' اپنے موضوع اور انداز پیشکش کے علاوہ موسیقی کے اعتبار سے بھی ایک یادگار فلم ہے۔ اس فلم میں وحیدہ رحمن ان کے مقابل ہیروئن تھیں۔ ''ہرے کرشنا ہرے رام'' انہوں نے ہپی ازم کے خلاف بنائی تھی جسے نہ صرف بہت پسند کیا گیا بلکہ اپنے اصلاحی موضوع کی وجہ سے بھی اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ یہ ہندوستان کی لازوال فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ ان کی فلم ''تیرے میرے سپنے'' بھی ایک مختلف انداز کی فلم تھی۔ ان کی ہر فلم میں کوئی اصلاحی پیغام یا مقصد ضرور ہوتا ہے۔ وہ ایسے موضوعات فلماتے رہے جن پر دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔

زندگی کے آخری سالوں میں عمر کا غلبہ ہو جانے کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے تھے مگر وہ کبھی سیریس بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے۔ عمر رسیدگی اور جسمانی کمزوری کے باوجود وہ ان تھک کام کرتے رہے۔

دیو آنند ایک کشادہ دل اور کشادہ ذہن فنکار تھے۔ اپنی سوانح عمری میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ دلیپ کمار سے بڑا اداکار ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔

ان کی موت کی وجہ سے بالی وڈ کی صنعت ایک شریف اور غیر متعصب قابل فنکار سے محروم ہو گئی ہے جس سے سب محبت کرتے تھے۔

دیو آنند کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ قدرت نے انہیں اپنے دونوں ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ دیر تک کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ ان کے ایک ہم عصر اور ''تین بڑوں'' میں سے ایک راج کپور تو سالہا سال قبل ہی دنیا سے رخصت

ہو چکے ہیں۔ ان کے دوسرے ہم عصر دلیپ کمار سالہا سال سے کام کرنا بند کر چکے ہیں۔ اداکاری، فلم سازی، ہدایت کاری سے وہ سبکدوش ہو چکے ہیں......... (دسمبر 2011ء) میں ان کی صحت کے بارے میں بھی خبریں آتی رہی ہیں۔

ان تینوں میں سے صرف دیو آنند جب تک زندہ رہے، مسلسل فلم سازی اور ہدایت کاری میں مصروف رہے۔ دنیا چھوڑتے وقت بھی وہ ایک فلم کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے بڑھاپے سے کبھی ہار نہیں مانی۔ اس لحاظ سے انہوں نے دلیپ کمار اور راج کپور سے زیادہ کام کیا۔ دیو آنند کی فلمیں فلاپ بھی ہوئیں اور نقادوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اب فلم سازی اور ہدایت کاری ترک کر دیں مگر وہ ناکام فلم کے بعد پھر ایک سپر ہٹ اور مقبول فلم بنا کر اپنے نقادوں کا منہ بند کر دیتے تھے۔ دراصل وہ فلموں میں موضوعات، پیشکش اور اداکاروں کے انتخاب میں تجربات کرتے رہتے تھے۔ وہ ناکامی سے نہیں ڈرتے تھے اور ہمیشہ اپنی پسند کی فلمیں بناتے رہے۔ کامیابی اور ناکامی تو ساتھ ساتھ چلتی ہی رہتی ہیں۔ ان کی فلموں کی موسیقی ہمیشہ بہت اچھی تھی اور ان کی فلموں کے گانے آج بھی مقبول ہیں۔

دیو آنند کو ہمیشہ اپنے بھائیوں سے اخلاقی اور عملی مدد ملتی رہی جو خود ذہین اور فلموں میں نامور تھے۔ آغاز میں ان کے نامور بھائی چیتن آنند سے انہیں بہت مدد ملی جو ایک تجرباتی فلم بنا کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ چیتن آنند گورنمنٹ کالج کے ڈرامیٹک کلب میں بھی نمایاں تھے۔ ان کے دوسرے بھائی وجے آنند تھے جو تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ مصنف، ڈائریکٹر بھی تھے۔ یہ تینوں بھائی گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈرامائی مصروفیات میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو کا سکہ چلتا تھا۔ اسٹیج کا دور ختم ہو رہا تھا اور فلمی صنعت کا عروج شروع ہو چکا تھا۔

لاہور گورنمنٹ کالج میں پطرس بخاری، امتیاز علی تاج اور سوندھی کی وجہ سے ڈرامے کو بہت فروغ حاصل ہوا تھا مگر ڈراموں کے مقابلے میں ریڈیائی ڈرامے زیادہ مقبول تھے۔ ریڈیو کے ڈرامے بمبئی اور کلکتہ کی فلموں کی طرح پسند کیے جاتے تھے۔

یہی وجوہات تھیں کہ جب انڈین پیپلز تھیٹرز ایسوسی ایشن نے ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنایا تو اس کی ہدایت کاری کے لیے چیتن آنند کو منتخب کیا۔ اس فلم کا نام ''نیچا نگر'' تھا۔ اس فلم میں پیشہ ور افراد کی جگہ تعلیم یافتہ تخلیق کار شامل تھے۔ جن میں رفیع پیرزادہ کا نام بھی تھا۔ یہ فلم بین الاقوامی میلوں میں بھی دکھائی گئی اور اس کو کئی ایوارڈ ملے۔

اس ادارے کی دوسری فلم خواجہ غلام عباس کی ہدایت کاری میں بنائی گئی جس کا نام ''دھرتی کا لال'' تھا۔ یہ فلم بنگال کے قحط کے بارے میں بنائی گئی تھی۔ تیسری فلم ''کلپنا'' اودے شنکر کی ہدایت کاری میں بنی تھی۔ یہ فلمیں حقیقت پسندی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں جو سینما میں چمک دمک اور مبالغہ آرائی کی جگہ زندگی کے حقائق کو پیش کرنے کا انداز تھا۔

چیتن آنند نے اس انداز کو بعد میں بھی جاری رکھا۔ جنگ کے خلاف ان کی فلم ''حقیقت'' بھی ایک یادگار فلم تھی۔ اس میں جنگ کی تباہ کاریاں دکھا کر دنیا کو جنگوں سے محفوظ رکھنے کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم کو عالمی فلمی میلوں میں بہت سے ایوارڈز ملے تھے اور اس کو انڈیا کی کلاسیکل فلموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

دیو آنند کی فلم ''ہم دونوں'' بھی جنگ کی تباہ کاریوں کے بارے میں تھی مگر یہ کمرشل انداز میں بنائی گئی تھی۔

دیو آنند نے اپنے تخلیقی بھائیوں کے نقش قدم پر چل کر گورنمنٹ کالج لاہور میں اور پھر فلمی صنعت میں شہرت اور بلند مقام حاصل کیا۔

دیو آنند فلموں کی دھن میں بمبئی گئے تو ان کی ملاقات ایک اور تخلیق کار گورودت سے ہوئی۔ ان دونوں کے اشتراک سے بمبئی کی فلمی صنعت نے متعدد یادگار فلمیں بنائیں۔ فلم کا میڈیا دیو آنند کو ایسا پسند آیا کہ وہ پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔

انہوں نے مقبول اداکار بننے کے بعد اپنی فلم ساز کمپنی ''نوکیتن'' کی بنیاد رکھی جس کی فلموں کی ہدایت کاری کے لیے گورودت کو موقع دیا گیا۔ اس ادارے سے ایس ڈی برمن، ساحر لدھیانوی، راج کھوسلہ، جانی واکر، زینت امان، ٹینا منیم، خالد مستری جیسے لوگ بھی وابستہ رہے۔

دیو آنند کی پہلی فلم ''ہم ایک ہیں'' تھی لیکن باکس آفس پر ان کی پہلی کامیاب فلم ''ضدی'' تھی۔ دیو آنند نے انڈیا کی فلمی صنعت میں ایک نئی قسم کی فلموں کی بنیاد رکھی۔ وہ ہالی وڈ کے معروف ہدایت کاروں اور فلم سازوں سے متاثر تھے۔ دیو آنند کی ابتدائی فلموں میں ان کے بھائی وجے آنند مصنف کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے وہی مصنف تھے۔ اس کے بعد ''ترے گھر کے سامنے'' کالا بازار، گائیڈ اور تیرے میرے سپنے کے ہدایت کار بھی وجے آنند تھے۔

وجے آنند نے دیو آنند کی اداکاری کے انداز کو بنانے

میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اداکاری میں ان کا انداز ہالی ووڈ کے اداکاروں کیری گرانٹ اور گریگوری پیک سے متاثر تھا۔

دیو آنند پچاس سال سے زیادہ عرصے تک فلموں میں مصروف رہے۔ انہوں نے ثریا، کامنی کوشل، گیتا بالی، مینا کماری، مدھوبالا، نرگس جیسی اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد نمی، وجنتی مالا، وحیدہ رحمٰن، نوتن اور بعد کی دہائی میں سچترا اسین، سائرہ بانو، نندہ، سادھنا، شرمیلا ٹیگور، آشا پاریکھ کے ساتھ کام کرتے رہے۔

1970ء کی دہائی میں انہوں نے زینت امان، ممتاز، ٹینا منیم کے ساتھ بھی کام کیا۔

دیو آنند وزیراعظم اٹل بہاری باجپائی کے وفد کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جو کہ ان کی مادرِ علمی تھی۔ پچاس سال کے طویل عرصے کے بعد جب انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں قدم رکھا تو یہ ایک جذباتی ماحول تھا۔ اس ادارے نے ان کی تعلیمی اور ذہنی آبیاری میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی کی بدولت وہ پچاس سال تک انڈیا کے مشہور اور مقبول ہیرو رہے تھے۔

1964ء میں گورنمنٹ کالج کی سوویں سالگرہ میں حصہ لینے کے لیے بلراج ساہنی بھی لاہور آئے تھے۔ دیو آنند نے گورنمنٹ کالج کی زمین کو چوما۔ اس کے برآمدوں میں گھومے اور پرانی یادوں کو تازہ کیا۔ یہی وہ درسگاہ تھی جس سے تعلیم حاصل کرکے انہوں نے زندگی میں نام اور شہرت کے علاوہ مقبولیت بھی حاصل کی تھی۔ نمناک آنکھوں کے ساتھ وہ کالج میں گھومتے رہے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ زندگی میں دوبارہ وہ گورنمنٹ کالج میں قدم رکھیں گے۔

دیو آنند نے انگریزی میں ”رومانسنگ ود لائف“ (Romancing with Life) کے عنوان سے اپنی سوانح عمری بھی لکھی پھر بھارت کے اعلیٰ ترین اعزازات پدم بھوشن، دادا بھائی پھالکے ایوارڈ بھی حاصل کیے۔ اتنا بہت سا عظیم سرمایہ چھوڑ کر وہ 88 سال کی عمر میں لندن میں دنیا سے رخصت ہوگئے مگر اپنی یادیں چھوڑ گئے جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔

دیو آنند کی دنیا سے رخصتی کے بعد فلمی دنیا کا ایک عظیم دور ختم ہوگیا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، مہذب، غیر متعصب اور عظیم تخلیق کار تھے۔ اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆

اور اب چند خطوط۔ محمد اسلم مغل کا تبصرہ، ملاحظہ فرمائیے۔

”دسمبر 2011ء کا سرگزشت نظروں سے گزرا جسے پڑھ کر میں ایک بار پھر اپنے بچپن کے دھندلکوں میں کہیں کھو گیا۔ آپ نے فلم ”بلے بوائے“ کی کہانی اور اس فلم سے منسلک واقعات کو کافی تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ فلم ویسے تو میری پیدائش کے تین سال پہلے ریلیز ہوئی تھی لیکن مجھے 1988ء میں پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، بہت خوبصورت فلم تھی، اپنے اسکرپٹ اور کہانی کے لحاظ سے تو ایک کمزور فلم تھی لیکن ندیم (نذیر بیگ) کی منفرد اور دلچسپ اداکاری نے اس فلم میں جان ڈال دی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں پاکستان فلم انڈسٹری کے سپر اسٹار رہے ہیں ان کی کامیابیوں کو مدِنظر رکھا جائے تو وحید مراد صاحب کا قد بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ بلے بوائے 1978ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اگر صرف اسی سال کا جائزہ لیا جائے تو اس سال ندیم صاحب کی کل پانچ فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے ”امبر“ جس میں ممتاز نے ہیروئن کا رول کیا تھا۔ اس کے بعد ”زندگی، بلے بوائے، پرنس“ اور سنگیتا کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم ”مٹھی بھر چاول“ تھی۔ ان میں چار فلمیں باکس آفس پر سپر ہٹ رہیں جبکہ پانچویں فلم نے اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی اس لحاظ سے کامیابی کا تناسب سو فی صد تھا۔ دراصل میں آپ کو معلومات نہیں دے رہا۔ فلم نگری کو بلاشبہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں تو صرف اپنی یادداشتیں دُہرا رہا ہوں۔ بعد میں آپ نے ذکر کیا تھا کہ ”مس ہانگ کانگ“ بنائی گئی۔ آپ نے آصف رضا میر کی کچھ زیادہ ہی تعریف کردی جبکہ ان کی اداکاری کچھ خاص نہیں تھی۔ چہرے پر ایکسپریشن تو بالکل ہی نہیں تھے۔ جہاں تک ڈراموں کا تعلق ہے تو ان میں اداکاری کچھ بہتر کرلیتے ہیں۔ البتہ مس ہانگ کانگ میں وہ بہتر لگے۔ بلے بوائے میں تو کافی دبلے پتلے تھے بلکہ اسی سال ریلیز ہونے والی پرنس میں بھی ایک چھوٹا سا رول کیا تھا۔ ندیم کی بہن کے کلاس فیلو کا، ایک کردار شمسی شیخ کا آپ نے ذکر کیا، تو مجھے یاد نہیں پڑتی غالباً جو آغا طالش کی بیٹی ہوتی ہیں اور مغربی سوسائٹی میں رہ کر اسی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ (یہ کردار حسنہ نے ادا کیا تھا۔ آفاقی) آخر میں چار پانچ لوگ ان کو بے آبرو کرتے ہیں۔ ندیم اور رضا میر پہنچ جاتے ہیں اگر یہ وہی شمسی شیخ ہیں تو ان کی اداکاری بھی بہت ناقص رہی ہے۔ ہاں البتہ اس فلم کے دو مضبوط کردار ندیم اور ننھا ہیں۔ ننھے پر پکچرائز وارث شاہ کے کلام کے انداز میں گانا اس سے پہلے ان کے

مکالمے مثلاً ”پپو پتر، نو کیسز دا ایدر آ (باپ بیٹے سے کہتا اِدھر آؤ) تو پپو نو کہتا Quiet (بیٹا باپ سے کہتا چپ کر) اور پھر گانا شروع ہوتا ہے۔ ”میں ولایت کانوں آیا، میں ولایت کانوں آیا“ بابرا شریف کی اداکاری اس فلم میں اچھی ہے۔ اچھے کام کی تعریف تو پوری دنیا میں کی جاتی ہے۔ میں تو پھر آپ کے اپنے وطن کا ایک معمولی سا شہری ہوں، آپ کی آخری دو فلمیں بیٹا، معاملہ گڑبڑ ہے۔ مجھے بہت پسند آئی تھیں۔ پرانی فلموں میں کنیز اور آشی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آبرو بھی دیکھی ہے، کنیز اور آبرو اچھی فلمیں ہیں لیکن عاشی فلم نے مجھے مایوس کیا۔ بابرا شریف کی اداکاری پہلے ہاف میں تکلیف دہ ہے، دوسرے ہاف میں اچھی ہوجاتی ہے، ان کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سنجیدہ اور ڈرامائی اداکاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں لیکن کامیڈی میں اوور ایکٹنگ کا شکار ہوجاتی تھیں جس کی وجہ سے کامیڈی ان کے لیے ناموزوں تھی۔ ویسے یہ میری ذاتی رائے ہے، امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے۔“

اداکاروں، فلموں اور اداکاری کے بارے میں ہر فلم بین کی اپنی رائے ہوتی ہے جس میں بحث کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بلے بوائے کا پہلا حصہ واقعی تفریحی تھا۔ کہانی کا مقصد آخری حصے میں پیش کیا گیا تھا۔ ندیم کی اداکاری پر سب متفق ہیں۔ وہ بہت اچھے اداکار ہیں اور وقت کے ساتھ مزید بہتر ہورہے ہیں۔

بابرہ شریف کی اداکاری عاشی میں اوور ایکٹنگ نہیں تھی۔ یہ ان کے کردار اور پس منظر کے مطابق تھی۔ دراصل ایکٹنگ اور ”اوور ایکٹنگ“ میں معمولی سا فرق ہوتا ہے جسے قائم رکھنا اداکار اور ہدایت کار کی ذمے داری ہوتی ہے۔

شمسی شیخ کا اداکاری سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن وہ ایک انگریز خاتون کی صاحب زادی تھیں اور لندن میں رہ چکی تھیں اس لیے ان کا مختصر کردار میں انتخاب کیا گیا تھا۔ ان کی اداکاری بس گزارہ ہی تھی اسی لیے وہ فلمی دنیا سے جلد رخصت ہوگئیں۔ البتہ آصف رضا میر کے صرف دبلے پتلے نوعمر ہونے کی وجہ سے نکتہ چینی کا ہدف نہیں بنانا چاہیے۔ وہ جب بلے بوائے میں شوٹنگ کے لیے گئے تو ان کا اور بابرہ شریف کا شناختی کارڈ نہیں بنا تھا چونکہ وہ دونوں بیس سال سے کم عمر کے تھے۔

☆☆☆

اداکار بننے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، پشاور سے شوکت رحمٰن خٹک اپنے دلچسپ واقعات کے ساتھ موجود ہیں۔

”پرانے وقتوں کی بات ہے۔ میں نے فلمی دنیا میں جب کچھ عرصہ قیام کیا تو گھر کی یاد نے مجھے پشاور جانے پر مجبور کردیا۔ یہ دور شاہد آفریدی کے گرما گرم چھکوں کا تھا۔ بوم بوم کے کھیل نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ انہی دنوں میرے آبائی گاؤں مانکی شریف میں ایک قریبی عزیز کا انتقال ہوا۔ نماز جنازہ کے لیے دس بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ بیوی نے میرے کپڑے استری کرکے باتھ روم میں رکھے اور مجھے بتا دیا کہ مرحوم بہت قریبی عزیز تھے، پابندی وقت کا خیال رکھیے گا۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور گلی کے نکڑ کی جانب چل پڑا جہاں رکشا اسٹینڈ ہے۔ پروگرام یہ تھا کہ رکشے میں لاری اڈا پہنچوں اور وہاں سے بذریعہ بس مانکی شریف روانہ ہوجاؤں۔ جونہی میں بلو کی دکان کے قریب پہنچا تو وہاں سے کرکٹ کمنٹری سنائی دی۔ کمنٹیٹر نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا کہ بوم بوم نے ایک اور چھکا مارا۔ میں اُلٹے قدموں واپس گھر آیا۔ بیوی نے گھر آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ ایک ضروری کام سے گھر آیا ہوں۔ میں نے ٹی وی کے تمام چینلز چیک کیے مگر کہیں بھی کرکٹ میچ کے آثار نظر نہیں آئے۔ خیال ہوا کہ شاید کرکٹ میچ ختم ہوچکا ہو۔ اب کے بار میں جب بلو کی دکان کے قریب پہنچا تو دکان کے باہر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ساتھ کرکٹ کمنٹیٹر نے کہا کہ آج تو بوم بوم نے چھکوں کی بارش کردی۔ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا، گھر اس خیال سے آیا کہ ممکن ہے کہ یہ میچ ریڈیو پر نشر ہورہا ہو۔ ہمارے گھر میں ہٹلر کے زمانے کا پرانا ریڈیو موجود ہے جس کے اسکرین کی سوئی غائب ہے مگر ریڈیو کے کان دبانے سے ریڈیو بول اُٹھتا ہے۔ اب کے بار بیوی نے کہا کہ شاید تمہارا ارادہ گاؤں جانے کا نہیں ہے۔

میں نے بیوی کو تسلی دی کہ نماز جنازہ میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ ریڈیو پر بہتیری کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ کسی اسٹیشن سے بھی کرکٹ کمنٹری سنائی نہیں دی۔ اب کی بار جب بلو کی دکان کے قریب سے گزرا تو کرکٹ میچ کا شور و غل ہنگامہ بہ دستور تھا۔ بہت غصے میں بلو کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا کہ خدا کے بندے، تم ریڈیو اور ٹی وی کے علاوہ کس ذریعے سے یہ کرکٹ میچ سن رہے ہو؟

بلو میری پریشانی سمجھ گیا، بہت دیر ہنستا رہا اور بتایا کہ میں ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے شاہد آفریدی کا پاکستان اور سری لنکا کے مابین یادگاری میچ سن رہا ہوں، اس نے ٹیپ ریکارڈر سے آڈیو کیسٹ نکال کر میرے حوالے کی۔ گھر پہنچے

کے بعد ٹیپ ریکارڈر پر کرکٹ میچ سن ہی رہا تھا کہ بیوی غضبناک انداز میں بولی کہ ”دیکھو، یہ کیا وقت ہے۔ تم جنازہ میں کب شرکت کروگے؟“

میں نے اسے تسلی دی کہ نیک بخت، اس وقت پونے گیارہ بجے کا عمل ہے، اب تو میت کو دفنایا بھی جاچکا ہوگا۔

میری پہلی پنجابی فلم ”جاگیردار“ میں بہترین اداکاری کرنے پر میرے بچپن کا دوست ارشاد میرے گھر آیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے میری اداکاری سے متاثر ہوکر مجھ سے آٹوگراف لیا اور وہی آخری شخص بھی ثابت ہوا جس کے بعد کسی نے مجھ سے آٹوگراف نہیں لیا۔ اس نے فلم میں میرے کردار کی تعریف کی اور مجھے سنہری لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا کہ تم آرٹ فلموں کے اداکار ہو تمہیں ہالی ووڈ جانا چاہیے، یہاں تمہاری قدر نہیں ہے۔ آج دوپہر میں تمہیں تمہاری فلم کی کامیابی پر دعوت شیراز دوں گا مگر تم بھی اپنی جیب میں کچھ رقم لے کر آنا، فائیو اسٹار ہوٹل ہے، بل میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

مجھے ارشاد کے پُرخلوص جذبے پر رشک آیا کہ دوست ہو تو ایسا ہو۔ اس نے پہلی فرصت میں میرا آٹوگراف لیا اور مجھے آرٹ فلموں کا اداکار قرار دیا اور مجھے عزت افزائی کے لیے کھانے کی دعوت دی۔ وعدے کے مطابق میں اس ہوٹل میں وقت کے مطابق جا پہنچا۔ ارشاد ہوٹل کے مین گیٹ پر میرا انتظار کررہا تھا۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے ملا، بعد میں ہم ہوٹل کے ٹیبل پر جابیٹھے، کھانا سجایا گیا، بہت پُرتکلف دعوت تھی۔ ہم دونوں دوست خوش گپیوں میں مصروف کھانا کھاتے رہے۔ ارشاد میری اداکاری کی تعریف کررہا تھا اور میں انکساری کا اظہار کررہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ارشاد نے کہا۔ کچھ ایسا کام آن پڑا ہے کہ میری مجبوری ہے ورنہ تمہاری محفل چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ارشاد کاؤنٹر پر جا پہنچا۔ جیب سے رقم نکالی اور بقیہ رقم لے کر ہوٹل سے باہر جانکلا۔ چونکہ کھانا ختم ہوچکا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی ہوٹل سے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ ارشاد بل دے چکا ہے۔ میں ہوٹل کے گیٹ کی طرف گامزن تھا کہ ہوٹل کا ویٹر دوڑ کر آیا اور کھانے کا بل پیش کیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے کہا کہ میرا دوست کاؤنٹر پر اس کھانے کی ادائیگی کرچکا ہے مگر ویٹر نے یہ کہہ کر میری غلط فہمی دور کی کہ وہ تو ہزار کا نوٹ تڑوا کر چلا گیا۔ البتہ تمہاری طرف اشارہ کرکے یہ کہہ گیا کہ سامنے میرا بہترین دوست کھانے کے بل کی ادائیگی کرے گا۔ میرا یہ دوست آرٹ فلموں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اور آنے والے دور میں اس کے نام کا ڈنکا بجے گا۔ مجھے احساس تھا کہ ارشاد واقعی میرا پرستار ہے اس لیے میں نے خوشی خوشی بل ادا کردیا۔

ایک زمانے میں پشاور میں ہر دوسرے شخص کی زبان پر یہ بات تھی کہ اداکار شمی کپور اپنا مکان دیکھنے پشاور آیا ہے۔ میں نے جب سے اس کی فلم ”محبوبہ“ دیکھی تھی، وہ میرے پسندیدہ اداکاروں میں شامل ہوگیا تھا۔ میں نے بھی اس کے گھر کا راستہ لیا۔ قصہ خوانی کے وسط میں ڈھکی نعلبندی میں شمی کپور کا حویلی نما مکان واقع ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس کے گھر کے باہر بے شمار خالی کرسیاں پڑی تھیں۔ غالباً پرستاروں کے آنے میں وقت تھا۔ میں بھی ایک کرسی پر جابیٹھا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد ایک بزرگ شخص بھی ایک کرسی پر آبیٹھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے اس شخص کے پاس جاکے ان سے پوچھا کہ کیا آپ بھی اداکار شمی کپور سے ملنا چاہتے ہیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ میں نے تو آج تک کوئی فلم دیکھی ہی نہیں۔ میں تو کراکری ہاؤس والوں کا ملازم ہوں۔ یہ کرسیاں لینے آیا ہوں۔ جب لوگ جنازے سے واپس آجائیں گے، میں اپنی کرسیاں واپس لے جاؤں گا۔ مزید پتا چلا کہ شمی کپور کے ساتھ والے مکان میں ایک شخص کا انتقال ہوگیا ہے اور لوگ جنازے پر گئے ہوئے ہیں اس لیے یہ کرسیاں پڑی ہیں اور اداکار شمی کپور کا پاکستان آنے کا پروگرام کینسل ہوگیا ہے۔

میں اپنا سامنہ لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک دوست ملا، اس نے مجھے بتایا کہ آپ کی فلم جاگیردار کی دوسری بار نمائش ہورہی ہے۔ یہ سن کر میرا غم غلط ہوا۔

میں نے گھر پہنچ کر اپنے بھانجے سلمان سے کہا کہ جاکر دیکھو کہ جاگیردار فلم کی نمائش کس سنیما میں ہورہی ہے۔ کچھ دیر بعد سلمان واپس آیا اور مجھے بتایا کہ تین سنیماؤں میں ایک ہی فلم لگنے والی ہے اور اس کا نام ہے آجشبکو، مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ”آجشبکو“ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کو اتنی شہرت ملی کہ تین سنیماؤں میں اس کی بیک وقت نمائش ہونے والی ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے خود سنیما گھروں میں جانا پڑا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ سلمان جس فلم کو آجشبکو سمجھ رہا تھا، وہ دراصل ”آج شب کو“ یکجا کرکے آجشبکو لکھا گیا تھا۔ ایسی غلطیاں آج بھی بعض لوگ کردیتے ہیں۔

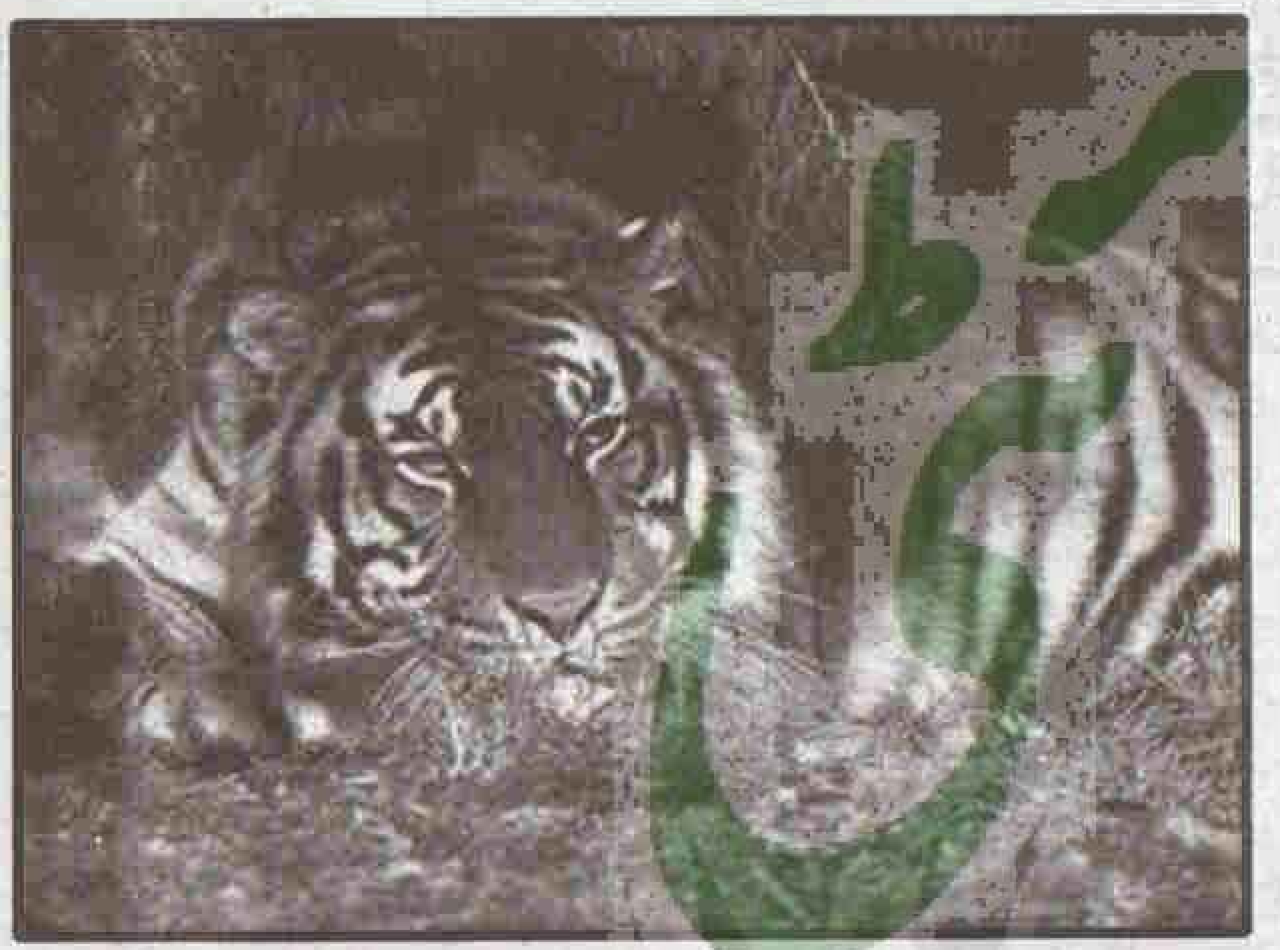

آدم خور

محمد مجید ارشد خان

درندوں کی خصلت کا صحیح ادراک ہو تبھی شکار کا صحیح لطف آتا ہے اور اگر شیر آدم خور ہو تو مزہ دوبالا ہوجاتاہے۔ سنسنی خیزی بڑھ جاتی ہے۔ وہ بھی درندوں کی نفسیات سے آگاہ تھا اس لیے اس نے اس طرح آدم خور کو گھیرا کہ وہ گھرتا چلاگیا۔

ایک آدم خور شیر کے شکار کی روداد

علاقے کے فارسٹ آفیسر نے تار دیا تھا کہ اس علاقے میں آدم خور شیر نے مکینوں کو ہراساں کررکھا ہے۔ ایک عرصہ ہوچکا تھا میں نے شیر کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ گویا زندگی میں جو ہلچل مچتی ہے وہ مفقود تھی۔ شکار کو اکثر لوگ ہیجان خیزی بھرا شوق سمجھتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ایک نشہ ہے یہی وجہ ہے کہ جب کئی ماہ بغیر کہیں گئے، کسی درندے پر گولی چلائے گزر جائے تو ہم جیسے لوگ اوب جاتے ہیں۔ میں بھی سخت بوریت کا شکار تھا۔ ایسے وقت میں تار کا پہنچنا نعمت غیر مترقبہ تھا۔ میں نے فوراً چلنے کی تیاری کرلی۔

نیپال کی ترائی کا یہ علاقہ شیروں کے شکار کے لیے بہت مشہور ہے۔ یہاں بہ کثرت شیر ملتے ہیں۔ ایسے علاقے میں کسی شیر کا آدم خور بن جانا عجب نہیں مگر آدم خور کا شکار کرنا ہیجان انگیز ضرور ہے۔

جس وقت میں کوسی کے علاقے میں پہنچا تو شام ہوچکی تھی۔ وہ رات میں نے فارسٹ آفیسر کے بنگلے پر گزاری اور

صبح ''چکنال'' سڑک کا معائنہ کرنے کے لیے نکل پڑا۔ اسی سڑک کنارے دو وارداتیں ہوئی تھیں۔ دوپہر سے شام تک کا سارا وقت میرے پاس تھا۔ اس لیے میں نے تین میل لمبی سڑک کے ایک ایک حصے کا بغور معائنہ کیا۔ راستہ جب زیرِ کاشت رقبوں کو چھوڑ کر بائیں جانب مڑتا تھا تو وہاں پر شیر کے پنجوں کے نشانات موجود تھے۔ میں نے ان نشانات سے اندازہ لگالیا کہ یہ کسی ایسے شیر کے پیروں کی چھاپ ہیں جو اگلے پنجے پر کم دباؤ ڈال کر چلتا ہے۔ لنگڑے شیر ہی عموماً آدم خور بنتے ہیں۔ ایسے شیر پر قابو پانا آسان نہیں۔ اسی لیے میں نے بغور معائنہ کیا تھا۔

میں نے احتیاط کے طور پر صبح ہی دو بھینسے منگوانے کا کہہ دیا تھا۔ جب میں سڑک کے معائنے سے واپس آیا تو بھینسے آچکے تھے مگر اب شام کا جھٹپٹا ہو چکا تھا اور ان کو مقررہ جگہ باندھنے کا وقت نکل چکا تھا اسی لیے میں آرام سے سوگیا۔ صبح بیدار ہوا تو پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ اسی شام کو میں نے ایک بھینسا اس درخت کے نیچے بندھوا دیا جہاں چار روز پہلے آدم خور شیر نے ایک عورت کو ہلاک کیا تھا اور دوسرا اس جگہ پر جہاں شیر کے پنجوں کے نشانات دیکھے گئے تھے۔ دوسری صبح جب وہاں پہنچا تو دونوں بھینسے اپنا چارا ختم کرنے کے بعد جگالی کررہے تھے۔ اس سے میں مایوس ہوگیا۔ تاہم دوسری شام میں نے ایک بھینسے کی جگہ تبدیل کرکے اسے سڑک کے نزدیک واقع جوہڑ کے کنارے باندھ دیا۔ چار دن گزر گئے مگر بھینسے سلامت رہے۔ چوتھی شام میں درخت کے نیچے بندھے بھینسے کا معائنہ کرکے واپس آرہا تھا کہ معاً ایک موڑ پر میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور میں پانچ منٹ تک ساکت و جامد اپنی جگہ پر کھڑا رہا لیکن چٹان کے اوپر خاموشی مسلط تھی۔ اگرچہ چٹان پر میں نے کسی قسم کی سرگرمی نہیں دیکھی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ آدم خور چٹان کے اوپر ہی موجود ہے۔ صورتِ حال بڑی عجیب ہوگئی تھی۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ اگر میرے پاس وقت زیادہ ہوتا تو میں اُلٹے قدموں پہاڑی کے گرد لمبا چکر کاٹ کر چٹان کے سر پر آجاتا اور وہاں سے آدم خور شیر پر گولی چلاتا مگر مجھے ابھی ایک میل مزید سفر طے کرنا تھا۔ چنانچہ رائفل کی لبلبی پر انگلی رکھے میں چٹان کے نیچے سے گزرنے لگا۔ راستے کے ساتھ ایک گہری کھائی بھی تھی۔ یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں شیر سے بچتے بچتے کھائی کا شکار نہ ہوجاؤں۔ مجھے امید تھی کہ شیر کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہے گا اور آگے چل کر جب میرا راستہ بلند ہوجائے گا تب میں اسے دیکھ لوں گا لیکن وہ درندہ بھی چوکنا تھا۔ جب میں چٹان کے نزدیک سے گزرا تب مجھے عقب میں غراہٹ سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ بھی مخالف سمت میں چل رہا تھا۔ اس طرح وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور یہی حال میرا بھی تھا۔ چنانچہ کفِ افسوس ملنے کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ جہاں شیر موجود تھا وہاں جوہڑ کے قریب بندھے بھینسے کے گلے میں بندھی گھنٹی اپنی آواز شیر کی سماعتوں کے گوش گزار ضرور کرے گی۔ واپسی پر دیہاتی میرے منتظر تھے لیکن بندروں کی آواز اور ہرنوں کی موجودگی نے انہیں مایوس کردیا تھا لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ اگلی صبح ہماری ہوگی، اس شیر کا آخری دن ہوگا تو وہ مطمئن ہوگئے۔

رات کو تیز آندھی کے ساتھ زبردست بارش ہوئی اور جھونپڑی کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکی جس سے میری طبیعت مکدر ہوگئی تاہم مجھے ایک محفوظ کونا مل گیا اور دوبارہ کمبل سمیٹ کر خراٹے لینے لگا۔ صبح جب بیدار ہوا تو ہر چیز صاف، واضح، روشن اور دھلی دھلی ملی۔ آج میں خلافِ معمول پہلے چکنال سڑک پر بندھے بھینسے کو دیکھنے گیا مگر روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنی 450/400 رائفل کو صاف کرلیا تھا۔ یہ میری کئی برس سے بڑی وفادار دوست تھی اور مشکل کے لمحات میں اپنی اہمیت ثابت کرچکی تھی۔ اس صبح جب میں گزشتہ شام والی چٹان کے قریب سے گزرا تو مجھے ذرا بھی خطرہ محسوس نہیں ہوا حالانکہ گزشتہ شام یہاں سے گزرتے ہوئے گویا میری جان نکل گئی تھی۔ گزشتہ شام کی بارش نے شیر کے پنجوں کے نشانات مٹاڈالے تھے لہٰذا ثبوت تلاش کرنا سعی لاحاصل تھا لیکن جوہڑ کے قریب نمدار جگہ پر شیر اپنی آمد کے نشان چھوڑ گیا تھا۔ یہاں ایک تین فٹ اونچی چٹان تھی جہاں سے چالیس گز دور بھینسا بندھا تھا مگر آج وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔

وہاں جاکر معائنہ کرنے سے معلوم ہوا کہ شیر نے آندھی چلنے سے پہلے بھینسے کو ہلاک کیا تھا اور بارش رکنے کے بعد شکار اُٹھا کرلے گیا تھا۔ وہ سیدھا موہن پہاڑی کے سامنے والی پہاڑی کی سمت گیا تھا۔ اگرچہ منصوبے کے تار و پود بُری طرح بکھر گئے تھے لیکن خوش قسمتی میرے کام آئی تھی اور بکھرے ہوئے گیلے پتوں پر شیر کے پنجوں کے نشان ثبت تھے۔

کسی ایسے جنگل میں جہاں چشم زدن میں گولی چلانی پڑے میں کبھی خوش نہیں ہوتا۔ جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو کہ میری رائفل بھری ہوئی ہے۔ کیونکہ گولیاں بھرے بغیر رائفل ہاتھ میں لیے جنگل میں داخل ہونا اور بعد میں یہ کہنا (بشرطیکہ یہ کہنے کا موقع نصیب ہوسکے) کہ گولیاں بھرنا بھول گیا تھا ایک ایسا فعل ہے جسے دوسرا کبھی معاف نہیں کرتا۔

اگرچہ میری رائفل لوڈ تھی پھر بھی چٹان کے نزدیک پہنچ کر میں نے رائفل کو دوبارہ چیک کیا اور اس میں سے مشکوک کارتوس نکال کر نئے کارتوس بھرے۔ رائفل کے منہ پر کارک نہ لگایا (کیوں کہ بعض اوقات کارک ہٹانے کا موقع بھی نہیں ملتا) اور شیر کے نشانات کا تعاقب شروع کردیا۔

یہ بات آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ شیر اپنے شکار کو گھسیٹتا نہیں بلکہ اُٹھا کر چلتا ہے۔ اگر شکار وزنی ہو تو وہ اسے چھوڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شکار کے وزن کا بھی بڑا عمل دخل ہے مثلاً اگر شیر نے ہرن کو مار کر اسے گردن سے پکڑ رکھا ہے تو لازماً اس کی ٹانگیں زمین کے ساتھ گھسٹیں گی لیکن اگر کمر سے پکڑ رکھا ہے تو پھر ممکن ہے کہ ٹانگیں زمین کے ساتھ نہ لگیں۔

موجودہ حالات میں شیر نے بھینسے کو گردن سے پکڑا تھا اور یہی وجہ تھی کہ پچھلی ٹانگیں زمین پر گہرے نشانات ثبت کرگئی تھیں اور یہاں نشانات کا پیچھا کرنا نہایت آسان تھا۔ سو گز سامنے کی طرف چل کر شیر تھوڑا سا داہنی طرف مڑا تھا۔ یہاں ایک مٹی کا بند تھا اور اسے عبور کرنے کے دوران میں شکار شیر کی گرفت سے نکل کر تقریباً تیس گز دور نیچے ایک جھاڑی میں گر گیا تھا۔ شیر اس کے پیچھے نیچے گیا تھا۔ اب کی بار شیر نے شکار کو پشت سے پکڑا تھا اسی وجہ سے زمین پر نشانات کم کم تھے۔ شکار منہ سے نکلنے کے بعد گویا شیر ہڑبڑا گیا تھا اور اپنی منزل بھول گیا تھا۔ اوپر آنے کے لیے پہلے تو وہ دو سو گز داہنی طرف گیا پھر سیدھا سو گز تک بانسوں کے جھنڈ سے گزرا مگر دقت سے۔ جھنڈ عبور کرنے کے بعد وہ پھر داہنی طرف مڑا اور دو سو گز چلنے کے بعد ایک بیس فٹ اونچی چٹان پر ٹھہرا تھا۔ چٹان کا جھکاؤ میری مخالف سمت میں تھا اور میں نے سوچا کہ شاید وہاں کچھار وغیرہ ہوگی اور وہاں شیر اپنے شکار کو لے گیا ہوگا لہٰذا میں بے حد چوکنا ہوکر نشانات سے ہٹ کر گویا رینگ رینگ کر اوپر بڑھنے لگا مگر چٹان کے آخر پر پہنچ کر یہ عقدہ کھلا کہ وہاں کوئی کچھار نہیں تھی بلکہ وہ چٹان ایک پہاڑی کے ساتھ مل رہی تھی۔ یہاں سے میں گرد و نواح کا منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ چونکہ یہ جگہ آدم خور کے حملے سے محفوظ تھی، لہٰذا کچھ دیر کے لیے سستانے بیٹھ گیا۔ اچانک سامنے ایک گھنی جھاڑی میں مجھے کوئی سرخ اور سفید چیز دکھائی دی۔ جب آپ شیر کے تعاقب میں ہوں تو ہر وہ چیز جو سرخ ہو شیر شخص جاتی ہے۔ بغور جائزے سے پتا چلا کہ وہ چیز شیر نہیں بلکہ اس کا شکار ہے۔ سفید اس کی پسلیاں تھیں اور سرخ خون تھا۔ غنیمت ہوا کے میں نے گولی نہیں چلائی ورنہ

شیر کو مارنے کا ایک نادر موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ جب شیر کا شکار کھلی جگہ پر پڑا ہوا ہو تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ شیر کہیں نزدیک ہی ہوگا۔ اگرچہ میں نے شیر کو نہیں دیکھا تھا مگر یقین تھا کہ وہ آس پاس موجود ضرور ہے۔ شیروں کو مکھیاں بہت تنگ کرتی ہیں اور وہ ساکت نہیں لیٹ سکتے' لہٰذا میں نے شیر کو مانیٹر کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اچانک ہی میرے گلے میں خارش ہونے لگی کیونکہ ابھی تک میں مکمل صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ جتنا میں کھانسی کو دباتا وہ اتنی ہی شدت سے حملہ آور ہوجاتی۔ ایسی صورتِ حال میں ایک بہترین طریقہ سانس روکنے کا ہے لیکن جب یہ طریقہ بھی ناکافی ہوا تو میں نے اپنی کھانسی کی آواز کو لنگور کی آواز میں بدل لیا۔ اگرچہ نقل اُتارنا مشکل کام ہے مگر شکاری اس فن میں خاصے طاق ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد نصف گھنٹے تک میں سن گن لیتا رہا۔ جب یقین ہوگیا کہ شیر گردونواح میں موجود نہیں ہے تو میں احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا شکار کے پاس پہنچا۔ شیر نصف کے قریب بھینسا کھا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شیر کہیں دور نہیں گیا ہوگا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ شیر کو تلاش کیا جائے اور موقع ملے تو ہلاک بھی۔

یہ اندازہ لگانا ذرا مشکل تھا کہ شیر کہاں گیا تھا پھر بھی تھوڑی سی کوشش سے اور برسہا برس کے تجربات بروئے کار لاتے ہوئے اس کی سمت کا تعین کیا اور ایک سائے کی طرح خاموشی سے شیر کے پیچھے چل پڑا۔ ابھی کچھ دور گیا ہوں گا کہ بیس مربع فٹ کے قریب ایک چوڑی جگہ پر گھاس بچھی تھی۔ اس جگہ پر شیر لیٹا ہوا تھا کیونکہ گھاس پر اس کے نقش واضح تھے اور کچھ پتیاں گھاس کی رفتہ رفتہ کھڑی ہو رہی تھیں۔ یقیناً شیر کچھ لمحے پہلے ہی اُٹھ کر گیا تھا۔ گھاس کی پتیاں کھڑی ہوتے دیکھ کر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کے شیر نے مجھے دیکھا تھا اور پھر وہاں سے چل دیا تھا مگر میرا یہ خیال باطل ثابت ہوا کیونکہ اس قطعہ گھاس سے نہ تو شیر کا شکار دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی وہ چٹان جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ دو منٹ پہلے شیر اتنی آرام دہ جگہ کو چھوڑ کر کہاں گیا تھا۔ اس کا جواب مجھے پشت پر سورج کی تپش سے معلوم ہوا۔ سورج اپنا سر نکال چکا تھا اور مئی کا ناخوشگوار دن نو بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔ سورج کی تیز کرنوں کی حدت کی تاب نہ لاکر شیر کسی سایہ دار جگہ کی تلاش میں اپنا مذکورہ مسکن چھوڑ گیا تھا۔ گھاس کے اس قطعے کے دوسرے سرے پر ایک درخت شمالاً جنوباً گرا تھا اور اس کا قطر کوئی چار فٹ کے قریب تھا۔ اگر شیر دھوپ سے تنگ آکر وہاں سے اُٹھا تھا تو یہ جگہ یقیناً اس کا مسکن تھی' لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ میں درخت کے نزدیک جاؤں اور اس کے اوپر سے جھانک کر گرے ہوئے درخت کے سائے کا معائنہ کروں۔ لہٰذا میں بڑی احتیاط سے اس جانب چل پڑا کہ اچانک پتھریلے راستے پر ایک کالی اور زرد چیز کو دیکھا جو تین انچ لمبی تھی اور بالکل ساکت تھی۔ میں نے کافی دیر تک اس چیز کو دیکھا اور یہ نتیجہ نکالا کہ وہ شیر کی دُم تھی۔ میں پاؤں کے بل بیٹھ گیا اور رینگتا رہا۔ یہاں تک کہ سارا شیر میرے سامنے آگیا۔ اس کے پیٹ کے مدوجزر سے پتا چلتا تھا کہ وہ سویا ہوا ہے۔ اس کے سر کی پشت گھاس کے تختے پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر آسمان کی طرف۔ اس سے بڑا نادر موقع اور کیا ہوسکتا تھا۔ اگلے ہی لمحے میری رائفل کی گولی اس کا ماتھا پھاڑ گئی۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ دوسری گولی اس کی گردن..... سے آر پار ہوگئی۔ آدم خور کو ہلاک کرنے کے بعد اعصاب کو سکون پر لانے کے لیے میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ مجھے خاص خوشی محسوس نہ ہوئی۔ مزہ تب ہوتا جب آدم خور کو معلوم ہوتا کہ اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ شیر کو ہلاک کرنے کے بعد میں واپس آیا تاکہ دیہاتیوں کو جمع کرکے شیر کو وہاں سے اُٹھایا جائے۔

گولی کی آواز سن کر خود ہی لوگ جمع ہوچکے تھے اور مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھنے لگے تھے۔ وہ لوگ دو مضبوط بانس اور رسوں کی مدد سے شیر کو وہاں سے اُٹھا کر گھاس کے تختے کی طرف لے آئے۔ میں اس کی کھال اُتارنا چاہتا تھا' مگر دیہاتیوں نے کہا کہ اگر اردگرد کے دیہات کے لوگوں کو اپنا دشمن دیکھنے کا موقع نہ ملا تو وہ بہت مایوس ہوں گے۔

آخر اسے جھونپڑی تک لایا گیا۔ جب لوگ اس کا دیدار کرچکے تو میں نے دیکھا کہ اس کی اگلی بائیں ٹانگ کی سمت سے کچھ بال اُڑے ہوئے تھے۔ جلد میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن میں سے گاڑھا سیال مادہ نکل رہا تھا۔ کھال اُتارنے کے بعد جب اس جگہ کو مزید چیرا گیا تو اس میں سے خارپشت کے پندرہ بیس کانٹے نکلے۔ ان میں سب سے بڑا کانٹا چار انچ کے قریب لمبا تھا۔ اسی کے باعث وہ چلتے ہوئے لنگڑاتا تھا اور اس کے آدم خور بننے کی وجہ بھی یہی تھی۔ خارپشت کے کانٹے خواہ کتنی دیر جلد کے اندر رہیں گلتے نہیں ہیں۔ جب شیر خارپشت کو غذا کی خاطر مارتے ہیں تو انہیں یہ کانٹے چبھ جاتے ہیں اور شیر لنگڑاہٹ کے باعث بڑے شکار پر قابو نہیں پاسکتا..... میری زندگی کا سب سے آسان شکار یہی تھا۔ اس آسان شکار سے کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا تھا مگر وقت بہ آسانی کٹ گیا تھا۔

اس مکروہ شخص کا قصہ جس نے نبیوں کو بھی پریشان کردیا تھا

ذوالفقار ارشد گیلانی

سامری

وہ مثلِ سیاہِ شب تھا کہ تیرگی پر اس کی اجارہ داری تھی مگر قدرت اسے ذلیل کرنا چاہتی تھی اسی لیے اسے اسی چراغ نے شکست دی جو ہواؤں کی دسترس میں رہتے ہوئے بھی شعلہ سر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودی میں اس مکروہ جادوگر نے بولنے والا بچھڑا بنالیا تھا۔ لوگوں کو سربسجود ہونے پر آمادہ بھی کرلیا تھا لیکن خدا کے قہر سے خود کو بچا نہ سکا اور تاقیامت ذلیل ہونے کے لیے اس کا نام باقی رہ گیا۔

اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام 1440 سے 1430 قبل مسیح کے درمیان اپنی قوم بنی اسرائیل کو ارضِ موعود (کنعان) لے جاتے ہوئے وادی سینا (توریت کی زبان میں بیابانِ شور اور بیابانِ سین) میں چھوڑ کر بہ حکمِ الٰہی چالیس دن کے لیے کوہِ طور پر معتکف ہوئے جہاں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو نہ صرف شرفِ ہم کلامی سے نوازا بلکہ دس احکامات بھی عنایت کیے جو بنی اسرائیل کے اس تقاضے کے عین مطابق تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کے لیے کوئی مستقل کتاب نازل فرمادے۔

لیکن عجیب اتفاق تھا کہ کوہِ طور پر توحید خالص کے احکام کے لیے احکامات ودیعت ہورہے تھے اور نیچے صحرائے سینا میں بے صبری اور نافرمان قوم اپنے لیے کوئی اور ہی راستہ چنے بیٹھی تھی۔ خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے اس صورتِ حال کی پیشگی آگاہی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اکتالیسویں دن جب اپنی قوم میں واپس آئے تو ان کا استقبال ایک پُراسرار سنہرے بچھڑے نے کیا جس کے منہ سے سیٹی کی آواز بھی نکلتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا گیا کہ بنی اسرائیل کا اصل معبود تو یہ ہے، آپ جانے اسے کہاں ڈھونڈنے گئے تھے۔

آپؑ نے جلال کی کیفیت میں اپنے نائب اور بھائی حضرت ہارون علیہ السلام، جو خود بھی اللہ کے نبی تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام انہی کو قوم کی نگہبانی کے لیے چھوڑ

کرکوہ طور پرتشریف لے گئے تھے، کے داڑھی اور سر کے بال پکڑ لیے کہ تم نے قوم کو اس جہالت اور گمراہی سے کیوں نہیں روکا لیکن حضرت ہارون علیہ السلام کی صفائی سے مطمئن ہوکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پُراسرار بچھڑے کو جلا کر خاکستر کر دیا اور اس کی راکھ پانی میں بہادی۔

اس پُراسرار بچھڑے کی تخلیق ایک ایسا واقعہ ہے جسے اسلام، یہودیت اور عیسائیت کے پیروکار تمام سیاق وسباق کے ساتھ درست تسلیم کرتے ہیں کیونکہ اس کی گواہی تینوں مذاہب کی مقدس الہامی کتابیں یعنی قرآن مجید اور بائبل (پُرانا مقدس عہد نامہ) دیتی ہیں لیکن بدقسمتی سے یہودی اور عیسائی، بچھڑے کے خالق کے حوالے سے نہ صرف اسلام سے متصادم ہیں بلکہ اس کے وجود سے ہی منکر ہیں۔ مسلمان مفسرین، محققین، محدثین اور مشاہیر، یہودیوں اور عیسائیوں کی اس روش کو اس تناظر میں دیکھتے ہیں کہ ایک تو توریت اور زبور یعنی بائبل کا پُرانا مقدس عہد نامہ اپنی اصل حالت میں موجود نہیں اور اس میں اتنی ترمیم وتحریف ہو چکی ہے کہ بیشتر واقعات کی صحت ہی مشکوک ہے جبکہ دوسرا یہ کہ دونوں اقوام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اور بعد میں آنے والے اپنے نبیوں پر مختلف الزامات لگانے سے کبھی نہیں چوکیں۔ اس لیے اس مرتبہ بھی انہوں نے اگر ایسا ہی کیا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

قرآن مجید نے اس پُراسرار سنہرے بچھڑے کا خالق سامری نامی جادوگر کو قرار دیا ہے لیکن یہودی اور عیسائی نہ صرف سامری کے وجود سے منکر ہیں بلکہ بچھڑے کے خالق کے طور پر حضرت ہارون علیہ السلام کا نام پیش کرتے ہیں مگر معاملہ صرف اسی ایک اختلاف پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی اسکالرز اور عبادات ومناجات کے ذمے دار ربی اور پادری حضرات نے اپنے تحقیقی مقالہ جات میں بائبل کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں بیان کردہ واقعات جھٹلانے بالخصوص پُراسرار بچھڑے کے خالق کی شناخت مسخ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

بائبل میں پُراسرار بچھڑے کی تخلیق اور بنی اسرائیل کی جانب سے اسے اپنے معبود کے طور پر پوجنے کا واقعہ کتاب ''خروج'' کے باب نمبر 32 میں بیان ہوا ہے، جو کچھ یوں ہے۔

آیت نمبر 1۔ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ نے پہاڑ سے اُترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارونؑ کے پاس جمع ہوکر اس سے کہنے لگے کہ اُٹھ ہمارے لیے دیوتا بنادے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰؑ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا ہے، کیا ہوگیا۔

آیت نمبر 2۔ ہارونؑ نے ان سے کہا، تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اُتار کر میرے پاس لے آؤ۔

آیت نمبر 3۔ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اُتار اُتار کر ان کو ہارون کے پاس لے آئے۔

آیت نمبر 4۔ اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے ''اے اسرائیل، یہی تمہارا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔''

آیت نمبر 5۔ یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کردیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہوگی۔

آیت نمبر 6۔ اور دوسرے دن صبح سویرے اُٹھ کر انہوں نے قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گزرانیں۔ پھر ان لوگوں نے بیٹھ کر کھایا پیا اور کھیل کود میں لگ گئے۔

آیت نمبر 7۔ تب خداوند نے موسیٰؑ کو کہا نیچے جا کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا، بگڑ گئے ہیں۔

آیت نمبر 8۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے انہیں حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل! یہ تمہارا دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔

آیت نمبر 9۔ اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے۔

آیت نمبر 10۔ اس لیے تو مجھے اب چھوڑ دے کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں ان کو بھسم کردوں اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔

آیت نمبر 11۔ تب موسیٰؑ نے اپنے خداوند، اپنے خدا کے آگے منت کرکے کہا اے خداوند، کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر بھڑکتا ہے، جن کو تو قوت عظیم اور دست قوی سے ملک مصر سے نکال کر لایا ہے۔

آیت نمبر 12۔ مصری لوگ یہ کیوں کہنے پائیں کہ وہ ان کو بُرائی کے لیے نکال لے گیا تاکہ ان کو پہاڑوں میں

مار ڈالے اور ان کو روئے زمین پر سے فنا کردے۔ سو تو اپنے قہر وغضب سے باز رہ اور اپنے لوگوں سے اس بُرائی کرنے کے خیال کو چھوڑ دے۔

آیت نمبر 13۔ تو اپنے بندوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کر جن سے تو نے اپنی ہی قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ میں تمہاری نسل کو آسمان کے ستاروں کی مانند بڑھاؤں گا اور یہ سارا ملک جس کا میں نے ذکر کیا ہے تمہاری نسل کو بخشوں گا کہ وہ سدا اس کے مالک رہیں۔

آیت نمبر 14۔ تب خداوند نے اس بُرائی کے خیال کو چھوڑ دیا جو اس نے کہا تھا کہ اپنے لوگوں سے کرے گا۔

آیت نمبر 15۔ اور موسیٰؑ شہادت کی دونوں لوحیں ہاتھ میں لیے ہوئے اُلٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اُترا اور وہ لوحیں اِدھر سے اور اُدھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں۔

آیت نمبر 16۔ اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا وہ بھی خدا ہی کا لکھا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔

آیت نمبر 17۔ اور جب یسوع نے لوگوں کی للکار کی آواز سنی تو موسیٰؑ سے کہا کہ لشکر گاہ میں لڑائی کا شور ہورہا ہے۔

آیت نمبر 18۔ موسیٰؑ نے کہا یہ آواز تو فتح مندوں کا نعرہ ہے نہ مغلوبوں کی فریاد بلکہ مجھے تو گانے والوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

آیت نمبر 19۔ اور لشکر گاہ کے قریب آکر اس نے وہ بچھڑا اور ان کا ناچنا دیکھا۔ تب موسیٰؑ کا غضب بھڑکا اور اس نے ان لوحوں کو اپنے ہاتھوں سے پٹک دیا اور ان کو پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالا۔

آیت نمبر 20۔ اور اس نے اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا، لیا اور اس کو آگ میں جلایا اور اسے باریک پیس کر پانی پر چھڑکا اور اسی میں سے بنی اسرائیل کو پلوایا۔

آیت نمبر 21۔ اور موسیٰؑ نے ہارونؑ سے کہا کہ ان لوگوں نے تیرے ساتھ کیا کیا تھا کہ تو نے ان کو اتنے بڑے گناہ میں پھنسا دیا۔

آیت نمبر 22۔ ہارونؑ نے کہا کہ میرے مالک کا غضب نہ بھڑکے۔ تو ان لوگوں کو جانتا ہے کہ بدی پر تلے رہتے ہیں۔

آیت نمبر 23۔ چنانچہ انہی نے مجھ سے کہا کہ ہمارے لیے دیوتا بنادے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس آدمی موسیٰؑ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہوگیا ہے۔

آیت نمبر 24۔ تب میں نے ان سے کہا کہ جس جس کے ہاں سونا ہو وہ اسے اُتار لائے۔ پس انہوں نے اسے مجھ کو دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا تو یہ بچھڑا نکل آیا۔

آیت نمبر 25۔ جب موسیٰؑ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہوگئے کیونکہ ہارونؑ نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کردیا۔

آیت نمبر 26۔ تو موسیٰؑ نے لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑے ہوکر کہا جو خداوند کی طرف ہے وہ میرے پاس آجائے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوگئے۔

آیت نمبر 27۔ اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند، اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔

آیت نمبر 28۔ اور بنی لاوی نے موسیٰؑ کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تقریباً تین ہزار مرد کھیت آئے۔

آیت نمبر 29۔ اور موسیٰؑ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔

آیت نمبر 30۔ اور دوسرے دن موسیٰؑ نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا اور اب میں خداوند کے پاس اوپر

علامہ شکم پرور لدھیانوی رسم قل اور چہلم میں بھی باقاعدگی سے شرکت فرماتے ہیں، اس حوالے سے انہوں نے کبھی اپنے پرائے کی تمیز نہیں کی۔ بلاناغہ اخبار کا مطالعہ ان کے معمولات میں شامل ہے اور اس میں بھی سب سے پہلے وہ قل اور چہلم کے اعلانات پڑھتے ہیں۔ یہاں انہیں کبھی کسی تنگ دل مہمان سے پالا نہیں پڑا بلکہ ایسی تقریبات میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس موقع پر مہمان جتنا زیادہ کھائیں گے، مرحوم کی روح اتنی زیادہ خوش ہوگی چنانچہ وہ اس وقت تک مرحوم کی روح خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں جب تک مرحوم کی بے چین روح ان کے گرد منڈلانے نہیں لگتی۔

(عطاء الحق قاسمی کی کتاب وصیت نامے سے اقتباس)

مرسلہ: جی اے مغل، چھچھیاں شمسی، گجرات

جاتا ہوں۔ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ دے سکوں۔

آیت نمبر 31۔ اور موسیٰ خداوند کے پاس لوٹ کر گیا اور کہنے لگا، ہائے ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لیے سونے کا دیوتا بنایا۔

آیت نمبر 32۔ اور اب اگر تو ان کا گناہ معاف کردے تو خیر ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے جو تو نے لکھی ہے، مٹا دے۔

آیت نمبر 33۔ اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔

آیت نمبر 34۔ اب تو روانہ ہو اور لوگوں کو اس جگہ لے جا جو میں نے تجھے بتائی ہے۔ دیکھ میرا فرشتہ تیرے آگے آگے چلے گا لیکن میں اپنے مطالبہ کے دن ان کو ان کے گناہ کی سزا دوں گا۔

آیت نمبر 35۔ اور خداوند نے ان لوگوں میں قری بھیجی کیونکہ جو بچھڑا ہارونؑ نے بنایا وہ ان ہی کا بنوایا ہوا تھا۔

بائبل کی مندرجہ بالا آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اس واقعے کو اپنے مذہب اور تاریخ میں..... بے حد معمولی حیثیت دیتے ہیں لیکن قرآن مجید نے اس پر سخت گرفت کی ہے اور بچھڑے کی پرستش کرنے والوں کے ساتھ ساتھ اس کے خالق کی سخت سزا کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہودی بائبل کے مطابق سنہرا بچھڑا محض ایک بت تھا جسے کوہ طور پر جانے کی وجہ سے موسیٰ کی غیر موجودگی میں ہارونؑ نے اسرائیلیوں کو مطمئن کرنے کے لیے بنایا تھا۔ عبرانی بائبل اس سلسلے میں یہ بھی کہتی ہے کہ بچھڑا تو صرف اسرائیل کے خدا کی جسمانی نمائندگی کے لیے بنایا گیا تھا جس سے یہ غلط تاثر لیا گیا کہ اسرائیلی نہ صرف بت پرستی میں ملوث تھے بلکہ انہوں نے ہی خدا کو مادی شکل میں ڈھالا۔

عبرانی میں اس واقعے کو "بچھڑے کا گناہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تاہم اس کے ماخذ کے طور پر کتاب خروج کے باب نمبر 32 کا حوالہ ہی دیا جاتا ہے۔ اس گناہ کے زمرے میں جو دلائل یا جواز پیش کیے جاتے ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اتنی بڑی بات نہ تھی جسے بنیاد بنا کر پوری اسرائیلی قوم کو ہی معطون قرار دے دیا جائے۔ ان کے بقول بیل کی پرستش اس زمانے کی بیشتر تہذیبوں میں عام سی بات تھی اور خروج کے متعدد ابواب میں بتایا گیا ہے کہ عبرانی (یعنی یہودی) حال ہی میں مصر کی جس سرزمین کو چھوڑ کر آئے تھے، وہاں بیل دیوتا (اپیس بل) کی پرستش ہوتی تھی اس لیے بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ اسرائیلی دشت سینا میں اسی روایت کو زندہ کر رہے تھے۔

کچھ کا کہنا ہے کہ مذہبی تقاریب اور پرستش کے دوران اسرائیل کے خدا کو بسا اوقات بیل یا بچھڑے کی صورت مجسم کیا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ مصریوں کے ہاں ہوتا تھا لیکن چونکہ قدیم مشرق وسطیٰ اور ایجین میں مصری اور عبرانی ایک دوسرے کے پڑوسی تھے اس لیے اروکس یعنی جنگلی بیل کی پوجا بڑے پیمانے پر ہوتی تھی جبکہ بعض اوقات اس کو شمسی بیل اور ایل بھی قرار دیا جاتا تھا۔

عبرانی، بچھڑے کی پرستش یا بچھڑے کے گناہ کے حوالے سے توریت کی جس تفصیل کا حوالہ دیتے ہیں وہ وہی ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے لیکن وہ اس گمراہی کی شدت کم کرنے کے لیے مستقبل کے بعض واقعات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں کہ بچھڑے کی پرستش میں صرف موسیٰ کی قوم ہی شریک نہیں تھی بلکہ موسیٰ کے بعد آنے والے کچھ نبیوں نے بھی بنی اسرائیل کو گئو پرستی کی ترغیب دی لیکن حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ کے بعد آنے والے نبیوں کے دور میں بچھڑے ضرور بنائے گئے لیکن ان کے تعمیر کنندہ نبی نہیں تھے بلکہ وقت کے بادشاہ تھے جبکہ زمانے کے نبیوں نے اس گئو پرستی کی شدت سے مخالفت کی تھی۔

922 قبل مسیح میں جب یربعام نے اسرائیل کی شمالی بادشاہت قائم کی تو بیت ایل اور دان میں دو سنہرے بچھڑے بھی بنوائے تاکہ اسرائیلی ان کے سامنے قربانی کی رسومات ادا کرسکیں۔ توریت کی کتاب سلاطین، اوّل کے باب 12 میں ان بچھڑوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

آیت نمبر 26۔ یہ یربعام نے اپنے دل میں کہا کہ اب سلطنت داؤد کے گھرانے میں پھر چلی جائے گی۔

آیت نمبر 27۔ اگر یہ لوگ یروشلم میں خداوند کے گھر میں قربانی گزرانے کو جایا کریں تو ان کے دل اپنے مالک یعنی یہوداہ کے بادشاہ رجعام کی طرف مائل ہوں گے اور وہ مجھ کو قتل کرکے شاہ یہوداہ رجعام کی طرف پھر جائیں گے۔

آیت نمبر 28۔ اس لیے اس بادشاہ نے مشورت لے کر سونے کے دو بچھڑے بنائے اور لوگوں سے کہا یروشلم کو جانا تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ اے اسرائیل اپنے دیوتاؤں کو دیکھ جو تجھے ملک مصر سے نکال لائے۔

آیت نمبر 29۔ اور اس نے ایک کو بیت ایل میں قائم

کیا اور دوسرے کو دان میں رکھا۔

آیت نمبر 30۔ اور یہ گناہ کا باعث ٹھہرا کیونکہ لوگ اس ایک کی پرستش کرنے کے لیے دان تک جانے لگے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بے حد ضروری ہے کہ بنی اسرائیل، مصریوں کی غلامی سے نجات پانے کے بعد اپنی نافرمانی اور سرکشی کے باعث چالیس سال تک دشت سینا میں بھٹکتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہ طور سزا ان کا ارض مقدس میں داخلہ حرام کردیا۔ بنی اسرائیل کے دو افراد (یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ) کے سوا حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام سمیت تمام بالغ افراد نے اسی صحرا میں موت کو گلے لگایا جو مصر سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ انہی بیابانوں میں بھٹکتے ہوئے بنی اسرائیل کی دوسری نسل جوان ہوئی جو یوشع بن نون کی سرکردگی میں فلسطین یعنی ارض موعود پر قدم رکھ سکی۔

مورخین بنی اسرائیل کے فلسطین میں داخلے کا سال 1400 قبل مسیح قرار دیتے ہیں۔ 1050 قبل مسیح (یعنی ساڑھے تین سو سال) تک بنی اسرائیل کا عہد قضاۃ تھا یعنی ان کے امور کی دیکھ بھال قاضیوں یا منصفوں کے سپرد تھی جس کے خاتمے پر متحدہ بادشاہت وجود میں آئی لیکن محض ایک سو چھبیس سال قائم رہی۔ طالوت، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے پورے کروفر کے ساتھ اس متحدہ سلطنت پر حکومت کی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال پر جب ان کے بیٹے رجعام نے تخت سنبھالا تو یربعام نے ان کے خلاف بغاوت کردی۔ رجعام کا تعلق چونکہ بنی یہوداہ سے تھا اور دارالحکومت یروشلم تھا اس لیے اس کی حکومت صرف یہوداہ کے قبیلے تک محدود رہ گئی۔

بنی اسرائیل کے باقی گیارہ قبائل نے یربعام کی سربراہی میں جو حکومت قائم کی وہ سامریہ یا مملکت اسرائیل کہلائی۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی اسرائیلی سلطنت یہوداہ اور شمالی اسرائیلی سلطنت اسرائیل بن گئے جس کا دارالحکومت پہلے سچم (موجودہ نابلس) پھر طرزہ اور آخر میں سامریہ قرار پایا۔

یربعام چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے نہیں تھا اس لیے اسے خطرہ تھا کہ اس کی رعایا اگر قربانیاں گزارنے اور عبادت کرنے یروشلم گئی جو جنوبی اسرائیل میں رجعام کے زیر نگیں تھا تو اس کی وفاداریاں تبدیل ہوجائیں گی چنانچہ اس نے اپنی اور اپنی بادشاہت کے تحفظ کی آڑ میں اپنی رعایا

کو گو پرستی میں مبتلا کر دیا لیکن توریت کے بہ قول کچھ عرصے بعد ایک مرد خدا آیا اور اس نے ان بچھڑوں اور ان کے سامنے بنائے گئے مذبح تباہ کر دیئے لیکن توریت نے اس مرد خدا کا نام بتایا ہے نہ کوئی شناخت بیان کی ہے۔

توریت میں ایک اور جگہ بھی سنہرے بچھڑے کا تذکرہ موجود ہے لیکن یہ حوالہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بنائے جانے والے بچھڑے کا ہی ہے۔ کتاب نمیاہ کے باب نمبر 9 میں ہے۔

آیت نمبر 18: پر جب انہوں نے (یعنی ہمارے آباؤاجداد) اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنا کر لائے اور کہا یہ تیرا خدا ہے جو تجھے ملک مصر سے نکال لایا اور یوں غصہ دلانے کے بڑے بڑے کام کیے۔

آیت نمبر 19: تو بھی تو نے اپنی گوناگوں رحمتوں سے ان کو بیابان میں چھوڑ نہ دیا۔ دن کو بادل کا ستون ان کے اوپر سے دور نہ ہوتا تاکہ راستہ میں ان کی رہنمائی کرے اور نہ رات کو آگ کا ستون دور ہوا تاکہ وہ ان کی روشنی اور راستہ دکھائے جس سے ان کو چلنا تھا۔

یہ بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت عزیر علیہ السلام کا کلام ہے۔ یہ جملے انہوں نے اپنی قوم سے خطاب کے دوران کہے تھے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کا سن پیدائش 600 قبل مسیح سے 586 قبل مسیح کا درمیانی عرصہ بتایا جاتا ہے کیونکہ آپ کم سنی میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (جس نے 586 قبل مسیح میں یروشلم پر حملہ کر کے شہر تباہ کر دیا اور ایک لاکھ کے لگ بھگ یہودیوں کو اسیر بنا کر بابل لے گیا) کے ہاتھوں قید ہوئے۔

بائبل کے محققین حضرت عزیر علیہ السلام کے انہی کلمات کو بنیاد بنا کر بنی اسرائیل کی جانب سے سنہرے بچھڑے کی پرستش کو مشکوک قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے خدا کو صیغہ واحد میں استعمال کیا جس سے اسرائیلیوں کی جانب سے بچھڑے کے استعمال اور پوجا کی حقیقت غیر مستند ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب خروج کے باب 32 کی آیت نمبر 4 میں کہا گیا ہے کہ ”اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے ”اے اسرائیل یہی تمہارا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔“

بائبل کے محققین کہتے ہیں کہ ”یہی تمہارا وہ دیوتا ہے“ کے الفاظ سے دُہرا مطلب سامنے آتا ہے۔ ایک یہ کہ تذکرہ خدا کا نہیں بلکہ دیوتا کا ہو رہا ہے اور دیوتا کا خدا یا خداوند سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرا یہ کہ ان الفاظ سے یہ ظاہر بھی ہوتا ہے کہ مصر سے نکال کر لانے والے دیوتا کے علاوہ بھی دیگر دیوتا موجود تھے چنانچہ اگر اس سے مراد خداوند بھی ہے تو یہ جمع کے صیغے میں استعمال ہوا ہے جو حقائق کے منافی ہے۔ بائبل کے محققین کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ توریت کی کتابیں خروج اور سلاطین اوّل، یہوداہ کی جنوبی بادشاہت (یعنی سلطنت یہوداہ) کے متعصب مورخین کی تحریر کردہ ہیں اور انہوں نے جان بوجھ کر یا تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسرائیلیوں کو بھٹکی ہوئی قوم قرار دیا کیونکہ بنی یہوداہ کے علاوہ بنی اسرائیل کے باقی گیارہ قبائل ان کی مخالفت میں سلطنت میں شامل تھے۔

توریت کے غیر عبرانی اور غیر کنعانی (شامی اور فلسطینی) نسخوں میں سنہرے بچھڑے کی پرستش کے موقف کی تو نفی کی گئی ہے لیکن سامری کے حوالے سے یہ مواد بھی خالی ہے۔ مثال کے طور پر بحیرہ مردار سے ملنے والی نادر دستاویزات جنہیں ڈیڈ سی اسکرولز کہا جاتا ہے، میں نہایت سرسری ساذکر ہے کہ پہاڑ سے واپسی پر موسیٰؑ نے دیکھا کہ اسرائیلی ایک نزدیکی ساحل پر کچھ مشکوک یا غیر ذمے دارانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ ان اسکرولز میں درج عبارت کا عام فہم ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

”......اور موسیٰؑ نے دیکھا کہ اسرائیلیوں نے ساحل پر ایک ڈھانچا تعمیر کر رکھا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے تھے۔ موسیٰؑ کو یقین تھا کہ ان کی حرکتوں سے خداوند ناراض ہوگا چنانچہ وہ غصے سے کھولنے لگا۔“

وادیٔ سینا میں بنی اسرائیل کی جانب سے بچھڑے کی پرستش ایک سیدھا، سادا اور ناقابلِ تردید واقعہ ہے کیونکہ تمام الہامی کتب اس پر متفق ہیں لیکن یہودی محققین نے اسے بُری طرح اُلجھا دیا ہے۔ بائبل کا ایک محقق مائیکل کوگن کہتا ہے کہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سنہرا بچھڑا کسی اور خدا کا بت نہیں بلکہ ایک جھوٹا خدا تھا۔ وہ اس سلسلے میں خروج کے باب نمبر 32 کی آیات 4 اور 5 کا حوالہ دیتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ اس (ہارونؑ) نے ان کا سونا ان سے لیا، بھٹی میں ڈالا اور بچھڑے کا بت بنا دیا اور انہوں (اسرائیلیوں) نے کہا یہ تمہارے دیوتا ہیں اسرائیلیو! جو تمہیں مصر کی سرزمین سے نکال کر یہاں لائے ہیں۔ جب ہارونؑ نے یہ دیکھا تو اس نے بچھڑے کے سامنے ایک چبوترہ (قربان گاہ) بنا دیا اور اعلان کیا کہ کل خداوند کے حضور جشن ہوگا۔

مائیکل کوگن کا کہنا ہے کہ بچھڑا ایک تھا لیکن لوگوں نے اسے دیوتاؤں کا نمائندہ قرار دیا جبکہ ایک واحد خدا کے تذکرے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ لازمی طور پر یہوداہ کی عبادت ہی ہو اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ بہت سے خداؤں یا دیوتاؤں کا حوالہ دینے کے باوجود لوگ یہوداہ کی پرستش ہی کر رہے ہوں۔ آیت نمبر 5 میں خداوند کے حضور جشن کو بعض اوقات یہوداہ کے حضور جشن بھی کہا جاتا ہے۔ مائیکل کوگن کے بقول یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ جب یہ واقعہ رونما ہوا اس وقت موسیٰؑ دس شرعی احکامات لینے کے لیے کوہِ طور پر موجود تھے اور وہ احکامات ابھی تک بنی اسرائیل کے حوالے نہیں کیے گئے تھے۔ اس لیے اگر بنی اسرائیل نے الہامی احکامات سے پہلے ہارونؑ سے ایسا کوئی بچھڑا اپنانے کا مطالبہ کیا تو ان کا یہ عمل حتیٰ کہ بچھڑے کی پرستش بھی غیر شرعی نہیں تھی۔

لیکن بائبل کے محققین اکثر بھول جاتے ہیں کہ توریت کی مذکورہ آیت میں واضح طور پر خدا اور دیوتا کو صنف واحد میں ذکر ہوا ہے، جمع میں نہیں لیکن اگر ان کے اس لایعنی استدلال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی اس امر کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ عبرانی زبان میں خداؤں یا دیوتاؤں کی اصطلاح درحقیقت سامی زبان سے لی گئی ہے اور اس کا مطلب ایک خدا یعنی یہوداہ ہی ہے۔ اس سلسلے میں استعمال ہونے والا اصل عبرانی لفظ الوہیم ہے جس کے معانی یہی بنتے ہیں۔ سو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہارونؑ نے (بہ قول یہودی مفکرین کے) الوہیم کا بت ہی بنایا تھا۔

کچھ یہودی محققین اپنی قوم کو بت پرستی اور شرک کے الزامات سے بچانے کے لیے ایک اور دور کی کوڑی لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بچھڑے کو خدا نہیں بلکہ خدا کی سواری کے طور پر تخلیق کیا گیا تھا۔ عہد عتیق کے مشرقی آرٹ میں خداؤں یا دیوتاؤں کو کسی تخت پر براجمان ہونے کے بجائے جانور پر سوار دکھایا جاتا تھا۔ اس لیے یہ سنہرا بچھڑا یہوداہ نہیں تھا بلکہ اس کی سواری تھا اور بنی اسرائیل نے اسی سواری کے جانور کو اصل خدا سمجھ کر پوجنا شروع کر دیا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بچھڑے کی تخلیق اور اس کے خالق کے حوالے سے متضاد آرا کا خود یہودیوں کو بھی ادراک ہے اور اس کی وجہ حضرت ہارون علیہ السلام کی شخصیت ہے۔ بے شک توریت میں ہارونؑ کو ہی بچھڑے کا خالق قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہودی مذہب کے علاوہ عیسائیت میں بھی ایک بلند درجے پر فائز ہیں۔ یہودی اور عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی اور اللہ کے نبی تھے۔ انگریزی اور عبرانی میں انہیں ”ایرون دی پریسٹ“ اور ”ایرون دی لاوی“ جیسے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہی بنی اسرائیل کی تمام مذہبی عبادات اور رسوم ان کی سربراہی میں انجام پاتی تھیں چنانچہ انہیں اسرائیلیوں کا پہلا کاہن اعظم بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کہانت کا سلسلہ انہی سے شروع ہوا۔

مائیکل کوگن جیسے محققین حضرت ہارون علیہ السلام کے اسی مقام اور فضیلت کی وجہ سے انہیں بچھڑے کا خالق قرار دینے میں تذبذب کا شکار ہوتے ہیں جبکہ دوسری وجہ اسرائیلیوں کی شمالی اور جنوبی بادشاہتوں کے مابین مذہبی اور ریاستی چپقلش بتائی جاتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں ”یربعام کے گناہ“ کو بھی بہ طور ثبوت پیش کرتے ہیں جو شمالی بادشاہت کا پہلا بادشاہ تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ یربعام کے اسی گناہ کے نتیجے میں 698 قبل مسیح (بعض کتابوں میں یہ سال 722 قبل مسیح درج ہے) میں اسیریا کے بادشاہ شال مانسر کے ہاتھوں اس سلطنت کا انجام ہوا۔

اور یربعام کا گناہ یہ تھا کہ اس نے سونے کے دو بچھڑے بنوائے۔ ایک سلطنت کے جنوب میں بیت ایل اور دوسرا شمال میں دان کے مقام پر نصب کرایا تاکہ شمالی بادشاہت کی رعایا عبادات کے لیے یروشلم نہ جائے لیکن مائیکل کوگن دیگر محققین کے برعکس یربعام کے اس عمل کا دفاع کرتا ہے۔ وہ یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ توریت کا یہ حصہ شمالی بادشاہت کے زوال کے بعد جنوبی بادشاہت یعنی سلطنت یہوداہ میں لکھا گیا لیکن اسے شمالی سلطنت کے خلاف تعصب اور دل آزاری کا مواد قرار دیتا ہے۔ اس کے بہ قول یربعام نے یروشلم کے ہیکل میں موجود رتھ کے متبادل کے طور پر سنہرے بچھڑے بنوائے تھے اور یہ بچھڑے یہوداہ کے علاوہ کسی اور کی پرستش کی نشان دہی نہیں کرتے۔

آیت نمبر 85: فرمایا، اچھا تو سنو! ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

آیت نمبر 86: موسیٰؑ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اس نے کہا، اے میری قوم کے

لوگو! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے۔ کیا تمہیں دن لگ گئے ہیں یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے ہو کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی۔

آیت نمبر 87: انہوں نے جواب دیا، ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا۔

آیت نمبر 88: اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے، یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا، موسیٰؑ اسے بھول گیا۔

آیت نمبر 89: کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع ونقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔

آیت نمبر 90: ہارونؑ (موسیٰ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ لوگو، تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو۔ تمہارا رب تو رحمٰن ہے، پس تم میری پیروی کرو اور میری بات سنو!

آیت نمبر 91: مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک موسیٰؑ واپس نہ آجائے۔

آیت نمبر 92: موسیٰؑ قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارونؑ کی طرف پلٹا اور بولا۔ ہارونؑ، تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو۔

آیت نمبر 93: کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔

آیت نمبر 94: ہارونؑ نے جواب دیا، اے میری ماں کے بیٹے، میری داڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی ہے اور میری بات کا پاس نہ کیا۔

آیت نمبر 95: موسیٰؑ نے کہا' اور سامری، تیرا کیا معاملہ ہے؟

آیت نمبر 96: اس نے جواب دیا، میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی۔ پس میں نے رسولؑ کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سمجھایا۔

آیت نمبر 97: موسیٰؑ نے کہا، اچھا تو جا اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا اور تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے۔ جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ، اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا، اب ہم اسے جلا دیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔

قرآن کا بیان بلاشبہ کسی بھی قسم کے شک وشبے سے بالاتر ہے اور اس سے ان تمام لغو کہانیوں اور داستانوں کی تردید ہو جاتی ہے جن میں حضرت ہارون علیہ السلام کو سنہرے بچھڑے کا خالق قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے لیکن قرآن کے اس بیان سے یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا؟ روایات وحکایات کے مطابق وہ ایک جادوگر تھا اور اپنے اس شیطانی اور مکروہ فعل میں اس قدر طاق تھا کہ آج بھی جادو اور سفلی عمل کرنے والے شیطانی مقاصد کے حصول کے لیے سامری کی روح طلب کرتے اور اس سے کام لیتے ہیں لیکن تاریخ اس کے وجود اور ذکر سے خالی ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا قدیم ترین ماخذ بائبل ہے اور بائبل چونکہ سامری کو تسلیم ہی نہیں کرتی اس لیے اس کا تذکرہ بھی اس میں نہیں جبکہ قرآن مجید نے عہد عتیق اور گم گشتہ ادوار کے واقعات ضرور بتائے ہیں۔ ان کی تاریخ بیان نہیں کی۔ چنانچہ قرآن کے ارشاد کی روشنی میں سامری کا وجود ہرگز ہرگز مشکوک نہیں، لیکن اس کی شناخت بہرحال دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔

مفسرین حضرات اس امر پر تقریباً متفق ہیں کہ سامری کسی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہرحال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے۔ اس سلسلے میں گیلانی، جعفری، علوی، فاروقی، دہلوی، بریلوی، دیوبندی، بلگرامی اور رضوی وغیرہ بہترین مثالیں ہیں جو نام نہیں بلکہ نسبت ہیں۔ مفسرین کا خیال ہے کہ سامری کی نسبت کسی قبیلے، نسل یا مقام کی جانب ہو سکتی ہے۔ قرآن نے بھی "السامری" کہہ کر جس طرح اس کا ذکر کیا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سامری نسل، قبیلے یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہرے بچھڑے کی پرستش کرائی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ قرآن کے اس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت اس

سے زیادہ کوئی تشریح درکار نہیں، لیکن یہ مقام ان اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مشنریوں اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سلطنتِ اسرائیل کا دارالحکومت "سامریہ" اس واقعہ کے کئی صدی بعد 925 قبل مسیح (بعض کے نزدیک 897 قبل مسیح اور کچھ کے خیال میں 878 سے 867 قبل مسیح کے درمیان) میں تعمیر ہوا۔ پھر اس کے بھی کئی صدیوں بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہرے بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا اور یہودیوں کے ذریعے سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (نعوذ باللہ) اس بات کی سن گن پالی ہوگی اس لیے انہوں نے اس کا تعلق حضرت موسیٰؑ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہرے بچھڑے کی پرستش رائج کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔

یہودی مبلغین اور عیسائی مشنری حضرات، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ بغض وعناد میں یہ بھی بھول گئے کہ خود انہوں نے سنہرے بچھڑے کی پرستش کا ذمے دار یربعام کو ٹھہرایا ہے جس نے اپنے شہروں دان اور بیت ایل میں سنہرے بچھڑے نصب کرائے۔ یربعام شمالی اسرائیلی سلطنت کا بانی بادشاہ اور 922 قبل مسیح میں برسرِ اقتدار آیا تھا۔ بعض مورخین اس کا عہد 975 قبل مسیح سے 953 قبل مسیح اور کچھ 924 سے 903 قبل مسیح بیان کرتے ہیں۔

جبکہ جن سامریوں کا حوالہ یہودی اور عیسائی محققین دیتے ہیں وہ اسرائیلیوں سے بڑے اسرائیلی اور یہودیوں سے زیادہ راسخ یہودی ہونے کے دعوے دار ہیں۔ ان سامریوں کا کہنا ہے کہ وہ بنی لاوی (جس اسرائیلی قبیلے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تعلق تھا) کا ہی مذہبی اور نسلی گروہ ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ دینِ ابراہیمی کے سامری ازم کے پیروکار ہیں جو یہودی ازم سے نہایت قریب ترین ہے۔ سامری توریت کی بنیاد پر سامریوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی عبادات ان اسرائیلیوں سے زیادہ درست ہیں جنہیں بابل بدر کیا گیا تھا کیونکہ بابل جانے والے واپسی پر مذہب کی ترمیم شدہ شکل ساتھ لائے تھے جبکہ زمین پر رہ جانے والوں یعنی سامریوں نے اپنے اصل اور قدیم مذہب کی حفاظت کی تھی۔ سامری یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ نام کسی جغرافیائی مقام سے حاصل نہیں کیا بلکہ یہ عبرانی لفظ شمریم سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی رکھوالے کے ہیں۔ یعنی اسرائیلی، سامریوں پر جو الزام عائد کرتے ہیں وہ اس کی صریحاً تردید کرتے ہیں اور اسرائیلیوں کو ترمیم شدہ مذہب کا پیروکار قرار دیتے ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے سامری جیسا رویہ ہامان کے ساتھ بھی روا رکھا ہے جسے قرآن پاک فرعون کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے لیکن عیسائی مستشرقین اسے ایران کے بادشاہ اخسویرس کے درباری امیر ہامان سے ملاتے ہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ تاریخ اب تک فیصلہ ہی نہیں کر پائی کہ بائبل کا بادشاہ اخسویرس، زرکسیز اوّل (خشایارشا) تھا یا اس کا کوئی جانشین؟ مورخین کا کہنا ہے کہ زرکسیز اوّل جسے زرکسیز دی گریٹ بھی کہا جاتا ہے، 485 سے 465 قبل مسیح تک برسرِ اقتدار تھا لیکن وہ اس بارے میں حتمی رائے دینے سے قاصر ہیں کہ یہی اخسویرس تھا۔

سامری کے معاملے پر اسرائیلیوں کی کم علمی پر مفسرین کا کہنا ہے کہ شاید ان مدعیانِ علم وتحقیق کا گمان یہ تھا کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص، قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا اس سے زائد افراد، قبائل یا مقامات ہونے کا قطعی کوئی امکان نہ تھا حالانکہ سومیری یا سمیری قدیم دور کی ایک نہایت طاقت ور قوم تھی جس نے پہیہ اور کیونے فارم رسم الخط بھی ایجاد کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے یعنی 2160 قبل مسیح میں بھی سومیری عراق اور اس کے ملحقہ علاقوں پر چھائے ہوئے تھے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اس قوم کے یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔

توریت کے مطابق مصر سے ہجرت کے وقت بنی اسرائیل نے فرعون کے دارالحکومت رعمسیس سے ارضِ جوشن تک پیدل سفر کیا۔ پھر سکات سے کوچ کر کے اتیام میں قیام کیا اور وہاں سے چل کر مجدال اور سمندر کے درمیان فی ہجروت کی بالمقابل بعل صفوان میں ڈیرے لگائے۔ یہ اس بحیرۂ قلزم کے عین کنارے واقع ہے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے بہ حکم الٰہی دو حصوں میں تقسیم کر کے بنی اسرائیل کے لیے پانی میں خشکی کا راستہ بنایا تھا۔ بعض غیر مصدقہ روایات کے مطابق بعل صفوان اور اس کے گرد ونواح

میں سومیری قوم کے افراد آباد تھے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو سمندر پار کرنے میں مدد بھی دی تھی۔

توریت یہ بھی بتاتی ہے کہ مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کرنے والوں میں صرف اسرائیلی ہی نہیں تھے بلکہ بعض مقامی مصری لوگ بھی ان کے ہمراہ ہو لیے تھے۔ کتاب خروج کے باب 12 میں ہے۔

آیت نمبر 38: اور ان کے ساتھ ایک ملا جلا گروہ بھی گیا اور بھیڑ، بکریاں اور گائے، بیل اور بہت چوپائے ان کے ساتھ تھے۔

کتاب احبار کے باب 20 میں تحریر ہے۔

آیت نمبر 1: پھر خداوند نے موسیٰؑ سے کہا۔

آیت نمبر 2: تو بنی اسرائیل سے یہ بھی کہہ دے کہ بنی اسرائیل میں سے یا ان پردیسیوں میں سے جو اسرائیلیوں کے درمیان رہتے ہیں جو کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی کو مولک کی نذر کرے گا، وہ ضرور جان سے مارا جائے گا۔ اہلِ ملک اسے سنگسار کریں۔

اس لیے توریت کی روشنی میں بھی اس امر کے امکانات بہر حال موجود ہیں کہ بنی اسرائیلیوں کے ساتھ آنے والے ملے جلے گروہ یا پردیسیوں میں سومیری قبیلے کے افراد بھی شامل ہوں اور قرآن مجید میں اسی قوم کے فرد یعنی السامری کا حوالہ ہو۔

اسی طرح 924 یا 922 قبل مسیح میں جب سلطنتِ اسرائیل دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیٹے رجعام نے جنوبی بادشاہت یعنی سلطنت یہوداہ قائم کی اور اس کے مخالف یربعام نے شمالی بادشاہت یعنی سلطنتِ اسرائیل کی بنیاد رکھی۔ یہوداہ کا دارالحکومت یروشلم رہا لیکن سلطنتِ اسرائیل نے سخم (موجودہ نابلس) کو دارالخلافہ قرار دیا۔ بعد میں اسے طرزہ اور پھر سامریہ منتقل کر دیا گیا۔

سامریہ، دارالحکومت بننے سے پہلے ایک پہاڑ تھا جس کے مالک کا نام سمر تھا۔ شاہانِ اسرائیل کے چھٹے بادشاہ عمری نے یہ پہاڑ خرید کر اس پر اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا۔ عام طور پر سامریہ کی تعمیر کا سال 925 قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے لیکن عمری، سلطنت اسرائیل کا چھٹا بادشاہ تھا جس کا زمانہ 878 سے 867 قبل مسیح کا درمیانی عرصہ رہا ہوگا۔

یہ بائبل کا اپنا بیان ہے اور اس کا احوال سلاطینِ اوّل، باب 16 کی آیت 24 میں درج ہے۔ اسی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے سمر نامی اشخاص پائے جاتے تھے اور ان کی نسبت پا کر ان کی نسل یا قبیلے کا نام سامری اور مقامات کا نام سامریہ ہونا، ناممکن نہ تھا۔

قرآن مجید کی آیات کریمہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سونا لا کر پھینکنے والے اسرائیلی ازخود بچھڑے کی تخلیق کے خواہش مند نہ تھے۔ ان کا عذر تھا کہ وہ سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے زیورات پھینک دیے تھے (یہ زیورات توریت کے مطابق بنی اسرائیل نے دھوکا دہی سے اپنے پڑوسی اور شناسا مصریوں سے لیے تھے) ہماری نیت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا، وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ ہم اسے دیکھ کر بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

اور یہ تھا بھی درست کیونکہ محض سونے کو آگ میں ڈال دیے جانے سے بچھڑا نہیں بنتا بلکہ یقینی طور پر کوئی عمل ہی کیا گیا تھا جس کا براہِ راست ذمّے دار سامری ہی تھا۔ زیور گلانے کی ذمّے داری سامری نے لی اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا سلاخیں بنانے کے بجائے ایک بچھڑے کی مورت بھٹی سے برآمد ہوئی جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ اس طرح سامری نے قوم کو دھوکا دیا کہ میں تو صرف سونا گلانے کا قصوروار ہوں۔ یہ تمہارا خدا خود ہی اس شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

بائبل چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام کو بچھڑا بنانے کا قصوروار قرار دیتی ہے اس لیے مسلمان مفسرین نے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں رقم طراز ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ غلط روایت اس وجہ سے مشہور ہوئی کہ سامری کا نام ہارون ہو جس کا تعلق سامری قبیلے سے ہو اور بعد کے لوگوں نے اس ہارون کو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو۔ لیکن یہ قول مولانا مودودی کے آج عیسائی محققین اور مغربی مستشرقین کو اصرار ہے کہ قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ اُلٹا قصور کیا ہے۔

بائبل نے کتاب خروج کے اسی باب، جس میں بچھڑے کی تخلیق کا تذکرہ ہے، آگے چل کر اپنی ہی غلط بیانی کا راز فاش کیا ہے۔ کتاب خروج کے باب 32 کی آخری دس

آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس واقعے کے بعد بنی لادی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہ عظیم کیا ہے، انہیں قتل کر دیا جائے اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اس بھائی، ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گئوپرستی کا مرتکب ہوا ہے چنانچہ اس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس قتلِ عام سے حضرت ہارون علیہ السلام کیسے بچ گئے اور انہیں کیوں کر چھوڑ دیا گیا۔ اگر وہی اس جرم کے ذمّے دار تھے تو انہیں اس قتلِ عام سے کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا۔ کیا بنی لادی یہ نہ کہتے کہ موسیٰؑ ہمیں تو حکم دیتے ہو کہ ہم ایسے گناہ گار بھائیوں اور ساتھیوں اور اپنے پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے حالانکہ اصل گناہ گار وہی تھا۔ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کا نام اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا لیکن حضرت ہارون علیہ السلام کا نام نہ مٹایا گیا بلکہ اس کے برعکس انہیں اور ان کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب یعنی بنی لادی کہ سرداری اور مقدس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا۔

کتاب گنتی کے باب 18 میں ہے۔

آیت نمبر 1: اور خداوند نے ہارونؑ سے کہا کہ مقدس کا بارِ گناہ تجھ پر اور تیرے بیٹوں اور تیرے آبائی خاندان پر ہوگا اور تمہاری کہانت کا بارِ گناہ بھی تجھ پر اور تیرے بیٹوں پر ہوگا۔

آیت نمبر 2: اور تو لادی کے قبیلہ یعنی اپنے باپ کے قبیلہ کے لوگوں کو بھی جو تیرے بھائی ہیں اپنے ساتھ لے آیا کرنا کہ وہ تیرے ساتھ ہو کر تیری خدمت کریں پر شہادت کے خیمہ کے آگے تو اور تیرے بیٹے ہی آیا کریں۔

آیت نمبر 3: وہ تیری خدمت اور سارے خیمہ کی محافظت کریں۔ فقط وہ مقدس کے ظروف اور مذبح کے نزدیک نہ جائیں تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اور تم بھی ہلاک ہو جاؤ۔

آیت نمبر 4: سو وہ تیرے ساتھ ہو کر خیمہ اجتماع اور خیمہ کے استعمال کی سب چیزوں کی محافظت کریں اور کوئی غیر شخص تمہارے نزدیک نہ آنے پائے۔

آیت نمبر 5: اور تم مقدس اور مذبح کی محافظت کرو تا کہ آگے کو پھر بنی اسرائیل پر قہر نازل نہ ہو۔

آیت نمبر 6: اور دیکھو میں نے بنی لادی کو جو تمہارے بھائی ہیں بنی اسرائیل سے الگ کر کے خداوند کی خاطر بخشش کے طور پر تم کو سپرد کیا تا کہ وہ خیمہ اجتماع کی خدمت کریں۔

آیت نمبر 7: پر مذبح کی اور پردہ کے اندر کی خدمت تیرے اور تیرے بیٹوں کے ذمّے ہے۔ سو اس کے لیے تم اپنی کہانت کی حفاظت کرنا۔ وہاں تم ہی خدمت کیا کرنا۔ کہانت کی خدمت کا شرف میں تم کو بخشتا ہوں اور جو غیر شخص نزدیک آئے وہ جان سے مارا جائے گا۔

بائبل کے ان واضح احکامات سے ثابت ہوتا ہے کہ سنہرے بچھڑے اور حضرت ہارون علیہ السلام کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ اللہ نے ہارون علیہ السلام کو سزا دینے کے بجائے انہیں اس عظیم ترین منصب پر فائز کیا جسے آج بھی عیسائیت اور یہودیت میں نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان آیات سے یہ گواہی بھی ملتی ہے کہ ہارونؑ اور سامری دو علیحدہ علیحدہ شخصیات تھیں چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو تو اپنی جماعت سے الگ کر دیا لیکن ہارونؑ کے مراتب میں اضافہ ہو گیا۔

بعض لوگ یہاں یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ جب تمام مشرکین کو بہ حکم الٰہی موت کی سزا دی گئی تھی تو سامری کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ اس کا جواب بعض مسلمان اور مغربی محققین یہ دیتے ہیں کہ سامری چونکہ بنی اسرائیل کا حصہ نہ تھا اور یہ احکامات صرف بنی اسرائیل کے لیے تھے اس لیے سامری کے لیے علیحدہ سزا تجویز کی گئی۔ اس بات سے اس نظریے کو بھی تقویت ملتی ہے کہ سامری اس گروہ کا رکن تھا جو بہ قول بائبل کے، مصر سے بنی اسرائیل کی روانگی کے وقت ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔

اب ایک اور سوال یہ ہے کہ سامری نے بچھڑا کیسے بنایا اور اس میں سے بیل یا سیٹی کی آواز کیسے نکالی؟ قدیم ذرائع سامری کے جادوگر ہونے کی تصدیق کرتے ہیں جبکہ اس سوال کا جواب سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر 96 میں موجود ہے۔ اس آیت کی مختلف انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ ایک گروہ جس میں قدیم مفسرین کی اکثریت شامل ہے، اس کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ سامری نے بنی اسرائیل کی مصر سے ہجرت کے وقت رسول یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو گزرتے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہی اس قافلے کی رہنمائی کر رہے تھے۔ سامری نے ان کے نقشِ قدم سے مٹھی بھر مٹی اُٹھالی تھی اور یہ اسی مٹی کی

کرامت تھی کہ جب اسے بچھڑے کے بت پر ڈالا گیا تو اس میں زندگی پیدا ہوگئی اور جیتے جاگتے بچھڑے کی سی آواز نکلنے لگی لیکن ذہن میں رہے کہ یہ قرآن کے الفاظ نہیں، مفسرین کا خیال ہے۔ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باز پرس کے جواب میں سامری نے یہ بات بتائی۔

دوسرا گروہ سامری کے قول کو ایک اور ہی معنی پہناتا ہے۔ اس کی تاویل کے مطابق سامری نے دراصل یہ کہا تھا کہ مجھے رسول یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام یا ان کے دین میں وہ کمزوری نظر آئی جو دوسروں کو نہ آئی تھی اس لیے میں نے ایک حد تک تو اس کے نقشِ قدم کی پیروی کی مگر بعد میں اسے چھوڑ دیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بہ قول یہ تاویل غالباً سب سے پہلے ابو مسلم اصفہانی کو سوجھی تھی۔ پھر امام رازی نے اسے اپنی تفسیر میں نقل کرکے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور اب طرز جدید کے مفسرین اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا جس نے خوب سوچ سمجھ کر مکروفریب کا ایک زبردست منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کردی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا بلکہ اس پر مزید جسارت بھی کی کہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پُرفریب داستان گھڑ کر پیش کردی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اسے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی بنا دیا کہ رسول کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔

تفہیم القرآن کے مطابق رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبرئیل علیہ السلام ہی ہوں جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے استعمال کیا تھا تو یہ اس کی ایک اور مکّاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ذہنی رشوت دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے اپنے نقشِ قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھ کر بھول جائیں اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کرلیں۔ قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب کی حیثیت سے ہی پیش کرتا ہے، اپنی طرف سے بہ طور واقعہ بیان نہیں کر رہا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے جس طرح پھٹکارا اور اس کے لیے سزا تجویز کی۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گھڑے ہوئے اس پُرفریب افسانے کو سنتے ہی انہوں نے اس کے منہ پر مار دیا۔

سامری سے صرف یہی نہیں کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلقات توڑ دیے گئے اور اسے اچھوت قرار دے دیا گیا بلکہ یہ ذمّے داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور دور ہی سے لوگوں کو اپنے اچھوت پن سے مطلع کرتا رہے کہ میں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائبل کی کتاب احبار میں کوڑھیوں کے چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے باب 13 میں جو قواعد بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے۔

آیت نمبر 45: اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلّا چلّا کر کہے، ناپاک، ناپاک۔

آیت نمبر 46: جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے، وہ ناپاک رہے گا اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہا کرے۔ اس کا مکان لشکر گاہ کے باہر ہوگا۔

اس سے گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سامری کو عذاب کے طور پر کوڑھ کے مرض میں مبتلا کردیا ہوگا یا پھر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہوگی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مریض، لوگوں سے الگ کردیا جاتا ہے، اسی طرح اس اخلاقی کوڑھ کے مریض کو بھی الگ کردیا گیا ہو اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر ہر قریب آنے والے کو مطلع کرتا رہا ہو کہ میں ناپاک ہوں، مجھے نہ چھوؤ۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو بددعا دی کہ اگر کسی سے اس کا جامہ چھو جائے تو بخار میں مبتلا ہو جائے چنانچہ سامری جب بھی گھر سے نکلتا تو بخار میں مبتلا ہونے کے خوف سے چلّاتا اور شور مچاتا ”لامساس، لامساس“ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے، مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ اسی طرح زندگی بھر شور مچاتا ہوا مر گیا۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی تفسیر القرآن میں مولانا مودودی کی طرح اس امر کے قائل ہیں کہ سامری کسی شخص کا نام نہیں بلکہ ایک نسبت ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ ہم اگر قدیم مصریوں کا جائزہ لیں تو ہمیں شمیر ملتا ہے جو اجنبی اور غیر ملکی نام ہے لیکن اسرائیلیوں کے لیے نہیں۔ اس لیے ممکن

ہے کہ جب بنی اسرائیل، مصر سے ہجرت کر رہے ہوں تو اس ”نک نیم“ کا کوئی مصری یہودی بھی ان کے ساتھ ہو اور یہودی ربیوں کا دعویٰ ہے کہ سنہرا بچھڑا تخلیق کرنے کی ترغیب دینے والوں میں صرف اسرائیلی ہی شامل نہیں تھے بلکہ وہ مصری بھی تھے جو خروج مصر کے وقت ان کے ہمراہ تھے اور جنہوں نے بہ قول بائبل، موسیٰ اور اسرائیلیوں کے لیے بے پناہ مشکلات کھڑی کی تھیں۔

یہودی ربیوں کے تحقیقی مقالہ جات جنہیں Arabbinical Literature کہا جاتا ہے، میں تحریر ہے کہ سنہرے بچھڑے کی پرستش ایک گناہ آلود واقعہ ہے جسے اسرائیلیوں کے سر تھوپ دیا گیا۔ ان مقالہ جات کا انداز ہارونؑ کو اس واقعے میں ملوث کرنے پر معذرت خواہانہ ہے جبکہ وہ اس امر پر بضد ہیں کہ سنہرا بچھڑا بنانے کا تقاضا اسرائیلیوں نے نہیں بلکہ مصریوں نے کیا تھا جو خروج کے وقت ان کے ساتھ تھے اور موسیٰؑ اور اسرائیلیوں کے لیے تکالیف اور مشکلات کا باعث بھی تھے۔ وہ بائبل کی کتاب گنتی کے باب 11 کا حوالہ دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے۔

آیت نمبر 4: اور جو ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کے حرص کرنے لگی اور بنی اسرائیل بھی پھر رونے اور کہنے لگے کہ ہم کو کون گوشت کھانے کو دے گا۔

یہودی ربی لکھتے ہیں کہ جب موسیٰؑ کی جانب سے پہاڑ سے واپسی کا دیا ہوا وقت گزر گیا تو مصری ایک ہجوم کی صورت ہارونؑ کے پاس آئے۔ ان کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ دو مصری جادوگر یانوس (Yanos) اور یمبروس (Yambros) بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ وہی جادوگر تھے جنہوں نے موسیٰؑ کو مصر میں طاعون، بیماریاں اور وبائیں پھیلانے سے روکا تھا۔ مصریوں نے ہارونؑ سے کہا کہ موسیٰؑ نے چالیسویں دن کے چھٹے گھنٹے (یا پہر) پہاڑ سے واپس آنے کا وقت دیا تھا لیکن وہ اب تک نہیں آیا اور نہ کبھی آئے گا۔ شیطان نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا اور باقی لوگوں کے ذہنوں میں بھی ایسی ہی باتیں پیدا کردیں۔

شیطان نے لوگوں کو بتایا کہ چھٹا پہر آگیا ہے لیکن موسیٰؑ نہیں لوٹا جس کا مطلب ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ لوگ اس کی اس بات کا یقین نہیں کر رہے تو اس نے انہیں پہاڑ پر رکھی ایک مسہری دکھائی جس پر موسیٰؑ پڑا ہوا تھا۔ اس سے انہیں یقین آگیا کہ موسیٰؑ واقعی اب اس دنیا میں نہیں چنانچہ انہوں نے ہارونؑ سے مطالبہ کیا کہ انہیں خدا بنا دے۔

اس موقع پر حور (Hur) نامی ایک شخص آگے آیا اور اس نے انہیں خداوند کی ناشکری پر بُرا بھلا کہا اور انہیں اس کے وہ معجزات یاد دلائے جو ان کی بہتری اور بھلائی کے لیے کیے گئے تھے۔ لوگوں نے اسے موقع پر ہی مار ڈالا اور ہارونؑ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے ان کی بات نہ مانی تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

ہارونؑ کو ان کے مطالبے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ کسی طریقے سے اسے ناممکن بنا دے یا کم از کم اس میں اتنی تاخیر کردے کہ تب تک موسیٰؑ واپس آجائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہارونؑ، شیطان کے بہکاوے میں نہ آیا تھا چنانچہ اس نے انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنی بیویوں کے سونے کے زیورات لے آئیں۔ وہ جانتا تھا کہ مردوں کی نسبت عورتیں، خداوند کی زیادہ شکر گزار ہیں اور وہ بت پرستی کے کسی بھی مقصد کے لیے اپنے زیورات دینے سے انکار کردیں گی۔ اس کی توقعات درست نکلیں اور عورتوں نے اپنے زیورات دینے سے انکار کردیا تب مردوں نے اپنے زیورات اس کے حوالے کردیے چنانچہ ہارونؑ کے پاس سونے کو آگ میں ڈالنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور آگ سے ایک زندہ اور بولتا ہوا بچھڑا نکل آیا۔

ایک اور مقالے میں یہودی ربی اسے مصریوں کی جادوگری قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خروج مصر کی رات موسیٰؑ نے پورے مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں تلاش کیں لیکن وہ نہ ملیں (واضح رہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے انتقال کے وقت وصیت کی تھی کہ اسرائیلی جب مصر سے واپس جائیں تو ان کا جسد خاکی ساتھ لے جائیں۔ بائبل کتاب پیدائش، باب 50۔ آیت 24) ایک آخری کوشش کے طور پر اشیر کی بیٹی نے دریائے نیل کے ایک مقام کی نشان دہی کی جہاں مصریوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا تابوت دفن کیا تھا۔ موسیٰؑ نے پتھر کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر ”بیل، اوپر آجاؤ۔“ (بہ قول ربیوں کے حضرت یوسف علیہ السلام کو بیل سے تشبیہ دی جاتی تھی) کے الفاظ لکھے اور دریا میں پھینک دیا جس کے نتیجے میں تابوت پانی کی سطح پر آگیا۔

یہودی ربی کہتے ہیں کہ یہ پتھر میکاہ نامی ایک مصری نے محفوظ کرلیا چنانچہ جب ہارونؑ نے سونا پگھلنے کے لیے آگ میں ڈالا تو میکاہ نے یہ پتھر بھی آگ میں پھینک دیا جس کے

نتیجے میں جیتا جاگتا بچھڑا باہر نکل آیا۔

ربی اس بچھڑے کا ایک اور تصور کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جب خداوند شرعی احکامات دینے کے لیے سینا کے پہاڑ پر اُترا تو وہ ایک رتھ پر سوار تھا جسے حزقیل کے چار درندے کھینچ رہے تھے۔ لوگوں نے ان درندوں کو دیکھا چنانچہ آگ میں سے نکلنے والا بیل انہی درندوں میں سے ایک تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ خداوند کے رتھ کو چار بیل کھینچ رہے تھے چنانچہ اسرائیلیوں نے اسی جیسا بیل بنالیا اور اسی کی بنیاد پر موسیٰؑ نے لوگوں کو معاف کردیا۔

ربی کہتے ہیں کہ بنی لادی نے بچھڑے کی پرستش میں حصہ نہیں لیا۔ اگر تمام لوگ اس بچھڑے کو پوجنے سے انکار کردیتے تھے تو شرعی احکامات پر مبنی مٹی کی تختیاں کبھی نہ توڑی جاتیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اسرائیلی میں نہ تو کبھی قانون ٹوٹتا اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت عبرانیوں پر غلبہ حاصل کرتی۔

ربیوں نے قرآن مجید میں بیان کردہ واقعات کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اسے (معاذ اللہ) شرارت و جہالت ہی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بہ قول قرآن، سامری کو قبیلے سے نکالنے سے پہلے موسیٰؑ نے بچھڑے کو جلانے اور اس کی راکھ پینے کے پانی میں ملانے کے احکامات دیے جن کا تذکرہ سورۃ بقرہ کی آیات 51 اور 87 میں بھی کیا گیا ہے۔ پانی پینے سے انہیں پیٹ میں شدید مروڑ اُٹھے اور انہوں نے مدد کے لیے موسیٰؑ کو پکارا لیکن موسیٰؑ نے انہیں ایک دوسرے کو قتل کرنے کے احکامات دیے۔ بہ قول ربیوں کے، مجموعی طور پر ستّر ہزار افراد قتل ہوئے۔ خداوند نے ان پر ایسی تاریکی مسلط کی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ پاتے تھے تاکہ کسی عزیز کی لاش ان کا ذہن نہ پلٹ دے۔ بالآخر عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سے موسیٰؑ کا دل پسیج گیا اور اس نے خداوند سے قتل و غارت روکنے کی درخواست کی جس کا فوری طور جواب آیا اور یہ سلسلہ ختم گیا۔

ربیوں کی متعصبانہ تحقیق اپنی جگہ لیکن چونکہ قرآن نے سامری کی اصلیت اور قومیت کے حوالے سے کوئی تفصیل نہیں بتائی اس لیے اغلب امکان ہے کہ سامری اگر جادوگر تھا تو اس کا تعلق مصر سے ہونا خارج از امکان نہیں کیونکہ قدیم مصر کو جادو کی سرزمین کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جب پہلی مرتبہ کوہِ طور سے معجزات لے کر مصر گئے تو ان کے مقابلے کے لیے فرعون نے اپنے جادوگروں کو ہی میدان میں اُتارا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے جادوگروں کی پھینکی ہوئی رسیوں، جو سانپوں کی صورت اختیار کر گئی تھیں، کو نگل لیا تھا۔

فی زمانہ گو مصر کے قدیم جادوگروں کے نام تو دستیاب نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مصری دیومالا میں جادو (ہیکا) کو کائنات کی تخلیقی قوتوں میں سے ایک قوت قرار دیا جاتا تھا اور جادو کے ذریعے علامتی حرکات کو عملی صورت دی جاتی تھی۔ یہ طاقت تمام مصری خداؤں اور لوگوں کو حاصل تھی لیکن اسے کب اور کیسے استعمال کیا جائے اس کے باقاعدہ قوانین موجود تھے۔

مصری فراعین کے زمانے میں جادو کرنے کا حق صرف پروہتوں کو حاصل تھا جو خدا کی طرف سے انسانوں کو تقدیر کے بے رحم تھپیڑوں کے وار روکنے کے لیے دیے جانے والے خفیہ علم کے سرپرست کہلاتے تھے۔ جادو کرنے والے وہ لوگ زیادہ اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے جنہیں مہا پروہت کہا جاتا تھا کیونکہ انہیں معابد اور محلات کی لائبریریوں میں جادو کی قدیم کتب کے مطالعے کی اجازت تھی۔ ان سے منسوب معروف قصّوں کے مطابق وہ لوگ مومی جانوروں کو زندہ کرسکتے تھے یا کسی جھیل کے پانیوں کو اُلٹ سکتے تھے۔

اصل مہا پروہت عام طور پر جادوئی عملیات اپنے بادشاہ کے تحفظ اور مردے کو دوبارہ زندگی دینے کے لیے کیا کرتے تھے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے پروہتوں کی ذمے داریاں جادوگروں (ہیکاؤ) نے سنبھال لیں۔ اسی لیے فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کا مقابلہ جادوگروں نے کیا اور بہت ممکن ہے کہ سامری بھی انہی مصری جادوگروں کے قبیلے کا کوئی فرد ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پریشان کرنے یا ان کی قوم کو آزمائشوں میں مبتلا کرنے کے لیے خروجِ مصر کے وقت بنی اسرائیل کے ساتھ چلا آیا ہو۔ (وعلم باللہ الصواب)

☆☆☆

مندرجہ بالا مضمون کی تیاری میں تفہیم القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، تفسیر القرآن از مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مقدس بائبل (پرانا مقدس عہد نامہ) آور پیل، ہسٹری آف جیوز از جیکب آئزک، محفل انبیاء از محمد جمیل۔ تاریخ الانبیاء، کاروان تہذیب، ڈیڈ سی اسکرولز کے بعض اقتباسات اور یہودی ربیوں کے لٹریچر کے کچھ حصوں سے مدد لی گئی)

ایب اوریجن

ایس جی یزدانی

آسٹریلیا ایک ایسا خطۂ ارض ہے جہاں اس خطے کے اصل باشندے دبے کچلے جارہے ہیں اور ممالک غیر سے آنے والے عیش کررہے ہیں کیونکہ مقامی باشندے خود میں عجیب ہیں۔ اپنے مردوں کو درختوں پر رکھتے اور کپڑوں کی جگہ چھال پہننا پسند کرتے تھے۔ مگر بچوں کو تعلیم دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اولمپک گیمز میں تمغے بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔

اک خطۂ عجیب کا تاریخی سفر، ایک دلچسپ معلوماتی تحریر

آسٹریلیا کئی معنوں میں منفرد و یکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں جب بھی عزیز و اقربا سے وہاں کی تعریفیں سنتا تو دل میں ایک ہی خیال انگڑائی لینے لگتا کہ بس ایک بار وہاں کا ماحول اپنی نظروں سے دیکھ لوں۔ عرصہ سے اسی خیال میں تھا اور وقت میسر نہ تھا۔ بالآخر وہاں رہائش پذیر اقربا کے اصرار پر رختِ سفر باندھ ہی لیا۔ کراچی سے آسٹریلیا تک سفر کی داستان الگ ہے جسے پھر کبھی بیان کروں گا کیونکہ آج میرا دل کررہا ہے کہ صرف اور صرف معلومات بیان کروں۔ یوں بھی سرگزشت کے قارئین معلومات زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تو جناب، جس وقت میں ائرپورٹ پر اُترا تو یہاں کی دنیا ہی

الگ نظر آئی۔ یورپی معاشرے کی جھلک تو نظر آئی ہی آئی، یہاں کی قدیم تہذیب کی جھلک بھی عیاں تھی۔ یہ بتاتا چلوں کہ یہاں کی تہذیب بہت پُرانی ہے۔ یہاں کی اصل قوم کو پوری طرح دبادیا گیا ہے مگر ان کی جھلک جابجا نظر آجاتی ہے۔اس لیے ابتدا ان کی تاریخ سے کرتا چلوں۔

ساٹھ ہزار سے چالیس ہزار سال قبل جب زمین آخری آئس ایج یعنی وہ زمانہ جب زمین سردی تھی اور گلیشیئر سے ڈھکی ہوئی تھی اور آسٹریلیا کے اطراف میں پانی منجمد تھا تو نیوگنی اور تسمانیہ آسٹریلیا سے جڑے ہوئے تھے۔ جاوا، ساترا ایشیا سے بھی ملے ہوئے تھے اور آسٹریلیا کا شمالی ساحل جنوبی مشرقی ایشیا سے صرف 160 کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ ایسے زمانے میں جاوا سے لوگ نقل مکانی کر کے آسٹریلیا کے شمال میں داخل ہوئے۔اس وقت آسٹریلیا کی زمینی اور موسمی حالت کچھ مختلف تھی۔ جنگلات زیادہ تھے۔ پانی کا ذخیرہ وافر تھا۔ جنوبی حصہ زیادہ سرد اور نمدار تھا اور جو وسطی آسٹریلیا کا ایک حصہ ریگستانی ہے یہ بھی مختصر تھا۔ موجودہ ریگستان کو وجود میں آئے ہوئے تو صرف بیس ہزار سال ہوئے ہیں۔

آئس ایج کا زمانہ ختم ہوا۔ سطح سمندر جو آئس ایج کے زمانے میں جمی ہوئی تھی، آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہوئی جس سے تسمانیہ اور نیوگنی آسٹریلیا سے الگ ہوگئے اور آسٹریلیا کی سرزمین میں تبدیلی آنے لگی۔ زمینی سطح جہاں پانی جما ہوا تھا آہستہ آہستہ خشک ہونے لگی اور سخت بنجر بن گئی۔

یہاں عظیم الجثہ جانوروں کی بہتات تھی جن میں سرفہرست کئی قسموں کے اور کئی رنگ کے عظیم الجثہ کینگرو تھے۔ گینڈے کی طرح بڑے منہ والے، جن کے منہ میں نوکیلے دانت تھے، Diprotodon تھے، شترمرغ جیسے نہ اُڑنے والے Geryoronits تھے، جن کی اونچائی 6 فٹ سے بھی زیادہ تھی۔

سفید فام باشندوں کے آنے سے قبل یہاں پالتو جانور ناپید تھے۔ گائے، بھینس، گدھے گھوڑے، کتے بلیاں، بھیڑ بکری، مرغ بطخیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

یورپی باشندوں کی آمد سے قبل یہاں لوگوں کا کوئی نام نہیں تھا اس لیے انہیں ایب اوریجن نام دیا گیا۔ لفظ ایب اوریجن لاطینی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی "شروع سے" ہیں۔

انیسویں صدی میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ قدیم باشندے ہندوستان کے جنوبی پہاڑیوں کے قبائل ہیں پھر خیال کیا گیا کہ یہ جاپان کے Ainu یا سری لنکا کے Vedas قبائل کی نسلوں سے ہیں لیکن جدید تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ جاوا (انڈونیشیا) کے باشندے تھے۔

پہلے پہل یہ قوم آسٹریلیا کے شمالی علاقوں میں قیام پذیر ہوئی پھر جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو وسطی مشرقی اور جنوبی آسٹریلیا کی طرف بڑھتے چلے گئے ویسے بھی یہ لوگ ایک جگہ جم کر نہیں رہتے تھے بلکہ خانہ بدوشوں کی طرح خوراک کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے تھے۔

ایب اوریجن کے عقیدے اور مذہب کی بنیاد Dreamtime سے وابستہ ہے۔ dreamtime ان کے مذہبی عقائد کا فلسفہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ جب دیویوں اور دیوتاؤں نے یہ دنیا بنائی۔ اس وقت زمین ہموار تھی، اندھیرا تھا اور ہر سو خاموشی تھی۔ دنیا کی تمام چیزیں زمین کی سطح کے نیچے محوِ خواب تھیں۔ ان کے جدِ امجد کی روحیں زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلیں اور انسانی شکلوں میں ظاہر ہو کر اپنی آئندہ نسلوں کے لیے اس زمین کو رہائش کے لائق بنادیا۔ نباتات اور حیوانیات کو موجودہ شکلیں بخشیں۔ وہ اس سرزمین پر مسلسل گشت کرتیں، ٹھہر جاتیں تو ضرورتوں کے مطابق پہاڑ کھڑا کردیتیں، ندی نالے بنادیتیں یا ریگستان پھیلا دیتیں۔ جب ان کا کام ختم ہوگیا تو کچھ روحوں نے اپنے آپ کو ٹیلوں، جانوروں، ستاروں، پہاڑوں یا کسی اور شکل میں تبدیل کرلیا اور کچھ واپس زمین کے اندر اپنی آرام گاہ میں چلی گئیں۔ جو روحیں اپنی شکلیں تبدیل کرنے کے بعد ظاہراً منجمد ہوگئیں، وہ دراصل اپنی قوم اور اس سرزمین کی رکھوالی کرتی ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد روحیں جسم کو چھوڑ کر مرکز کو خبر کرتی ہیں۔ وہاں سے ان روحوں کو دوبارہ جنم لینے یا نہ لینے کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں روح اپنے مردہ جسم میں دوبارہ داخل نہ ہوجائے، یہ لوگ اپنے مُردوں کو جلا دیا کرتے ہیں۔ مگر کئی قبیلے ایسے بھی ہیں جو اپنے مُردوں کو گہرے غار میں پھینک دیتے، پانی میں بہادیتے یا درختوں کی شاخوں پر رکھ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے مُردوں کو یوں ہی پڑا رہنے دیتے اور جب جسم گل سڑ کر صرف ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں تو یہ لوگ ان ہڈیوں کو جمع کر کے رنگ دیتے ہیں اور کسی کھنڈر میں رکھ چھوڑتے ہیں، کچھ قبیلے کے لوگ دفن بھی کیا کرتے ہیں۔

یہ لوگ درمیانہ قد کاٹھ کے ہوتے ہیں۔ آنکھیں چھوٹی، ناک پھیلی ہوئی اور گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی ہیں۔ ان کا رنگ زردی مائل تھوڑا گہرا بھورا اور کالا ہوتا ہے۔ ان کے بال گھنے، کالے لہردار اور گھونگھریالے، ابرو کالے اور

گھنے ہوتے ہیں۔

ایب اوریجن کی آبادی یورپی باشندوں کی آمد کے وقت جو اٹھارویں صدی کے آخری دہائی کے لگ بھگ ہے، ان جگہوں پر زیادہ تھی جو مشرقی اور مشرقی جنوبی آسٹریلیا کے زرخیز علاقے ہیں جو آج کوئنز لینڈ، نیوساؤتھ ویلز اور وکٹوریا کی ریاستیں ہیں۔ یہ لوگ بڑے دریاؤں کے دہانے پر جھیلوں کے کنارے اور زرخیز میدانی علاقوں میں آباد تھے۔ کچھ قبیلے مغربی اور وسطی آسٹریلیا کے خشک اور کم پانی والے علاقوں میں آباد تھے۔ یہ قبیلے مختلف برادریوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک برادری کی جماعت میں دس سے لے کر پچاس افراد ہوا کرتے تھے جو ان کے عزیز واقارب اور اپنے خاندان پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ہر قبیلے کی اپنی اپنی بے نشان سرحدیں تھیں۔ ان کا گزر بسر اپنی ہی سرحدوں میں رہتے ہوئے جانوروں اور مچھلیوں کے شکار اور ذخیرۂ اجناس پر تھا۔ ہر خاندان کا اپنا نام تھا اور اسی نام سے ان کی شناخت ہوتی تھی۔ ان کی اپنی علیحدہ زبان ہوتی تھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق ان کی سرحدیں ان کے آباواجداد کی روحوں کا مسکن ہے۔ جو ان کی زمینوں، جنگلی جانوروں، پودوں، جنگلوں اور پانی کے ذخیروں کی خبر گیری کیا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ زمین اور سرحدی معاملات میں دخل اندازی نہیں کیا کرتے، نہ ہی دوسروں کی زمین پر قبضہ کیا کرتے ہیں۔ ابتدا میں سرحدوں کے علاقے کا انحصار زیادہ تر معاشی صورتِ حال پر تھا۔ چنانچہ زیادہ تر لوگ زرخیز علاقوں میں آباد تھے۔ جبکہ وسطی آسٹریلیا کے خشک اور ریگستانی علاقوں میں صرف اراندا نامی قبائل آباد تھے۔

ایب اوریجن قوم کا معاشرہ روایتی تھا۔ روایتی معاشرہ کی ساخت ایک پیچیدہ انداز میں قائم تھی۔ جو ان کے آپس کے قریبی تعلقات کو ظاہر کرتی تھی۔ اور اب بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔ برادری کی اپنی بیٹھک اور متبرک جگہ مخصوص ہوتی تھی جو ان کے اپنی سرحدوں کے اندر ہوتی تھی۔ آپس کے صلاح مشورے یہیں ہوا کرتے تھے۔ مذہبی رسومات مخصوص جگہوں پر ادا کی جاتی تھی۔ صلاح مشورے سے دوسری جماعتوں کے لوگوں کو اپنی سرحدوں کے اندر شکار کی اجازت مل جاتی تھی۔

لوگوں کی سماجی اور اقتصادی عمل میں تفریق قائم تھی۔ نوعمر کو کوئی خاص کام اس وقت تک نہیں دیا جاتا تھا جب تک کہ وہ روایتی انداز میں ہنر اور تربیت حاصل نہیں کرلیتے تھے۔ نوعمر کے لیے باضابطہ شرکت پر مختلف طرح کی رسوم ادا کراتے تھے۔ نوجوانوں میں مقبول رسم ختنہ تھا۔ ختنہ کی رسم

میر انیس نے 7 برس کی عمر میں ایک بکری پال لی جس کو بہت چاہتے تھے۔ جب وہ مری تو انہیں بے حد ملال ہوا اور شعر لکھا۔

افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئی بکری
آنکھیں تو کھلی رہ گئیں پر مر گئی بکری

ان کے والد کو خبر ہوئی تو بلا کے مکرر اس شعر کو پڑھوایا۔ تعریف سے دل بڑھایا اور اسی خوشی میں صاحب زادے نے پہلے پہل شعر کہا ہے، اپنے بیگانوں میں مٹھائی تقسیم کی اور یوں بڑی دھوم دھام سے میر انیس کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔

مرسلہ: اظہر الدین، حیدر آباد

کے بعد یہ خیال کیا جاتا تھا کہ نوآموز کا ننھیالی تعلق توڑ دیا گیا ہے جو اس کی ماں کے ساتھ تھا اور اب اسے باضابطہ مردوں کے مشاغل میں جگہ ملے گی۔ نوآموز کو ایک سال کی مدت کے لیے الگ تھلگ رکھا جاتا اور دستور کے مطابق اسے مُردہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس دوران اس کے بڑے اسے متبرک جگہ پر لے جاتے جہاں اسے اپنے اعتقاد کے مطابق تعلیم حاصل کرنی پڑتی۔ وہاں خون پینے کی ایک رسم بھی ہوتی جس میں جوانوں کو اپنے بڑوں کے بازوؤں سے نکالا گیا خون پینے کو دیا جاتا پھر انہیں آگ کی رسم میں شامل کیا جاتا تاکہ وہ پاک وصاف ہوجائیں۔

برادری میں سب سے بڑا جرم اعتماد کو ٹھیس پہنچانا اور زنا تھا اور اب بھی ہے۔ لڑکیوں کو بھگا کر لے جانا، کسی کو قتل کردینا، دوسروں کی سرحدوں میں بلا اجازت گھس کر شکار کرنا، مذہبی علوم کو ان نئے جوانوں کو جو ابھی نوعمر ہیں اور رسومات ادا نہیں کیے ہیں ان پر ظاہر کرنا بھی جرم میں شامل تھا۔ لڑکیوں کو بھگا کر لے جانے والا اگر دوسری برادری کا فرد ہوتا تو اس کی سزا سخت نہیں تھی لیکن اگر اپنی ہی برادری کا ہوتا اور جوڑے کا تعلق قریبی ہوتا تو اس صورت میں سرحدوں سے بدر کرنا یا موت تھی۔ قتل اور دوسروں کی سرحد کے جنگلوں میں بلا اجازت داخل ہونا سخت سزا کا مستحق قرار پاتا۔ یہ لوگ اپنی زمینوں کی حفاظت اپنے زورِ بازو سے کرتے۔ اگر اس سے کام نہیں بنتا تو مختلف جماعت لڑائی جھگڑے نمٹانے کی کوشش کرتے اور جب تک دونوں فریقین کے کچھ لوگ مر نہ جاتے یا زخمی نہ ہوجاتے یا ہتھیار برباد نہ ہوجاتے، لڑائی ختم نہیں ہوتی۔ ذاتی معاملات کو ختم کرنے کے لیے دو مردوں یا

دوعورتوں کا آپس میں مقابلہ کرایا جاتا تھا، کسی خاص جرم کی سزا مذہبی پیشوا جوان کا معالج اور جھاڑ پھونک کرنے والا بھی ہوتا تجویز کرتا۔ اگر موت کی سزا ہوتی تو مجرم کو موت دینے کی جگہ پرلے جایا جاتا۔

ہر برادری کا اپنا اجدادی امتیازی نشان ہے جوان کے اعتقاد کے مطابق Dreaming Time سے منسلک ہے۔ آباواجداد کی روح کا تعلق قدرتی مناظر، پودے اور جانوروں کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ جوان کے اپنے حدود کے اندر تھے۔ مذہبی رسومات کی ادائیگی عام طور سے مرد حضرات کیا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی عورتوں کو بھی شامل کرلینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ چند ایسی رسوم بھی تھیں جو صرف عورتیں ہی کیا کرتی تھیں۔

جادو اور عملیات پر ان کا اعتقاد کافی مضبوط ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ عملیات سے ان کی خوراک میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیمار کو تندرستی ملتی ہے اور مجرم کو سزا دی جاسکتی ہے۔ ان کے یہاں اپنی اپنی جماعتوں کے مخصوص عامل ہوا کرتے تھے یا روایتی معالج تھے۔ چھوٹی موٹی عام بیماریوں کا علاج عورتیں بھی جانتی تھیں۔ زیادہ خطرناک بیماری جس کے بارے میں قیاس کیا جاتا تھا کہ کالا جادو کی وجہ سے ہے ایک عامل ہی اس کا علاج کیا کرتا تھا۔ عامل بیمار جسم سے عمل کے ذریعے پتھر، کنکریاں نکال دیتا جو کسی کے کالے جادو کے سبب مانا جاتا۔ اس کے نکل جانے سے مریض بھلا چنگا ہو جاتا۔ یہ بھی اعتقاد ہے کہ عامل کا تعلق روحانی دنیا سے ہوتا ہے۔ وہ فضا میں اڑ سکتا ہے اور روحوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ غالباً سب سے زیادہ بھیانک جادو کا وہ عمل ہے جس میں بدلہ لینے کے لیے کسی مُردے کے بازو کی ہڈی ہوتی ہے جو عملیات کے ذریعے مجرم کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ اگر کسی مرے ہوئے عامل کی ہڈی ہوتی تو زیادہ موثر سمجھا جاتا ہے۔ عامل ایسی ہڈی کو نوکدار بنا کر کچھ رسم ادا کرنے، عمل کرنے اور مذہبی گیت گانے کے بعد مجرم کی طرف پھینکتا ہے۔ ان کا یقین ہے کہ وہ ہڈی غائبانہ سفر کرکے مجرم تک پہنچے گی اور مجرم مارا جائے گا۔

معاشی لحاظ سے ایب اوریجن کی ضرورتیں ان کے اپنے اپنے علاقے میں ہی میسر تھیں۔ جانوروں اور مچھلیوں کے شکار اور جنگلی پھل، جڑیں اور سبزیاں جمع کرکے وہ گزارا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جگہوں کو اس وقت تک نہیں بدلتے جب تک ان کے پاس وافر مقدار میں خوراک موجود ہوتی یا آیندہ خوراک ملنے کی امید ہوتی۔ کھیتی باڑی اور جانوروں کو پالنے کا رواج نہیں تھا۔ ویسے بھی پالتو جانور مثلاً گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، مرغی، بطخ وغیرہ ناپید تھے۔ ایک عام طریقہ یہ تھا کہ یہ لوگ جہاں رہائش اختیار کرتے، آس پاس کے جنگل جھاڑ کو کاٹ کر اور جلا کر صاف کردیتے تاکہ ان جگہوں پر خودرو گھاس، اجناس اور جنگلی جڑیں نکل سکیں۔

مرد عام طور پر جانوروں اور مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔ جانوروں میں کنگرو، ایموز، نہ اڑنے والے پرندے ہوا کرتے۔ جبکہ ان کی عورتیں، جنگلی پھل، سبزیاں، جڑیں، جانوروں کے انڈے، شہد اور چھوٹے جانور مثلاً چھپکلی، سانپ اور کچھوے وغیرہ خوراک کے لیے جمع کرتی تھیں۔ ان کا کام خودرو پودوں سے بیج بھی جمع کرنا تھا جنہیں کوٹ کر روٹی کی طرح پکا کر کھاتے تھے۔ عورتیں کھانا پکانے کا کام بھی انجام دیتی تھیں۔ شکار کو ہنکا کر بے دم کرکے برچھے یا بوم رنج سے شکار کرتے۔ مچھلیاں برچھوں کی مدد سے شکار کرتے۔ دریاؤں میں رکاوٹیں ڈال کر بھی مچھلیاں پکڑتے تھے۔ کچھوے اور کیکڑے ان کی خوراک کا وافر ذریعہ ہوتے تھے۔ شکار کو عام طور پر لکڑیوں کے گرم کوئلوں پر پکاتے اور ہڈیوں کے علاوہ سبھی چیزوں کو کھا جاتے تھے۔

ایب اوریجن بچہ پانچ سال کی عمر سے ہی اوزار بنانا سیکھ لیتا ہے۔ بڑوں کے ساتھ رہ کر شکار کرنے کا طریقہ بھی سیکھتا ہے۔ اسے جانوروں کی عادات، خصائل اور رہنے کی جگہوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو عورتیں جڑوں کے جمع کرنے کے لیے گڑھا کھودنے، بیج جمع کرنے اور چھوٹے چھوٹے جانوروں اور کیڑوں کو مارنے کا ہنر سکھاتی ہیں۔ ابتدا میں یہ لوگ پانی ندیوں، نالوں اور جھیلوں سے حاصل کرتے تھے۔ کبھی پانی کی قلت کے موقع پر درختوں کی جڑوں کو کھود کر یا ان کے تنوں میں سوراخ کرکے پانی کے قطرے جمع کرتے۔

ایب اوریجن قوم کے ہتھیار اور اوزار پتھروں، ہڈیوں، لکڑیوں اور گھونگھے سے بنائے جاتے تھے۔ اوزار بنانے کی فیکٹریاں ہوا کرتی تھیں۔ کھدائی کرنے والے ماہرین نے بہت سی ٹول فیکٹریاں دریافت کی ہیں۔ برچھیاں کئی طرح کی ہوتی تھیں۔ جانوروں کے شکار کے لیے پتھروں یا ہڈیوں کو نوکدار بنانے کے بعد ایک لکڑی کے ٹکڑے کو گول کرکے چمڑے کی پٹیوں سے بہت مضبوطی سے باندھ دیتے تھے۔ مچھلی شکار کے لیے بھی برچھیاں استعمال ہوتی تھیں لیکن یہ لمبی لکڑی میں بندھی ہوتی، اس میں پتھر کو رگڑ رگڑ کر بہت ہی پتلا بنا کر گول کی ہوئی لکڑی میں باندھ دیتے تھے۔ بومرنگ کئی طرح کی ہوتی تھیں جنہیں درخت کی جڑوں کو کاٹ کر بناتے تھے۔ شکار کے لیے بومر بل کھاتی ہوئی لکڑی کی ہوتی۔ بومر لوٹ کر واپس بھی آتا تھا، واپس نہ آنے والا بومر ہاکی کی شکل کا ہوتا تھا، لکڑی کی ڈھال بھی استعمال ہوتی تھیں۔ ان سبھوں کے علاوہ مختلف کاموں کے لیے اور بھی کئی طرح کے ہتھیار ہوتے تھے۔ متبرک تقریب میں بھی چند اوزار استعمال ہوتے تھے۔ مرد کلہاڑا برچھی، بومر اور پتھر کے چاقو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

مرد اور عورت دونوں مختلف سائز کے بیگ ساتھ لے کر چلتے۔ یہ تھیلے اُبالے ہوئے اور جانوروں کی آنت اور ریشوں سے بنے ہوتے تھے۔ چھوٹے تھیلے عموماً چھوٹے ہتھیار، ہڈیوں سے بنائی گئی سوئیاں، برچھے بھالے کے لیے نوکیلے پتھر رکھنے کے لیے اور بڑے تھیلے عموماً عورتیں بچوں کو بٹھا کر لے جانے اور خوراک کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ مرد شکار کے گوشت کے لیے بھی ساتھ رکھتے تھے۔ پانی کے لیے مشک جانوروں کے چمڑے سے بنائی جاتی تھیں۔ پانی کے لیے لکڑی کی ڈول بھی بناتے تھے۔

یہ لوگ کوئی مستقل ٹھکانا نہیں بناتے تھے۔ موسمی حالات کے باعث غار یا غار نما جگہوں پر گزارا کرتے۔ زیادہ عرصہ کسی ایک جگہ پر رہنے کی صورت میں خیمے کی شکل کا گھر سوکھی گھاس پھونس سے بنا لیتے۔

لوگ ننگ دھڑنگ رہتے تھے۔ مرد کینگرو کی کھال کا ٹکڑا کمر میں کسی رسی سے باندھ لیتے اور عورتیں پودوں کے ریشوں اور انسانی بالوں کو ایک چمڑے کے بیلٹ نما شے سے باندھ لیتی تھیں اور کمر کے نیچے کا حصہ جانوروں کی ملائم کھال سے ڈھانک لیتی تھیں۔ سردیوں میں لوگ کوٹ نما لمبا لبادہ پہن لیتے جو کینگرو کے چمڑے کا ہوتا اسے ملا جلا کر جانوروں کی موٹی نسوں سے جوڑ دیتے۔ فر اندر ہوتا اور باہر کچھ چکنی چیز کو مل دیتے تھے جس کی وجہ سے کوٹ واٹر پروف بن جاتا تھا۔

یورپی باشندوں کی آمد سے قبل تقریباً دوسو پچاس طرح کی زبانیں رائج تھیں۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے قریبی جماعتوں کی زبانیں بول اور سمجھ سکتے تھے۔ ان کی زبانیں ابھی بھی لوگوں میں اپنے علاقائی زبان کی طرح رائج ہیں۔ 1960ء میں ایک تحقیق سے پتا چلا کہ مختلف خاندانوں میں ابھی بھی 28 طرح کی زبان رائج ہیں۔ جن میں 27 طرح کی زبانیں آسٹریلیا کے شمالی علاقہ جات میں ایب اوریجن خاندانوں میں بولی جاتی ہیں۔ سرزمینِ آسٹریلیا کے باقی جگہوں پر کئی طرح کی علاقائی بولی زیرِ استعمال ہے۔

ایب اوریجن اشاروں اور جسم کی حرکتوں سے بھی زبان کا کام لیا کرتے تھے۔ دھویں کے سگنل کا بھی رواج تھا۔ اشاروں اور کنایوں کی زبان شکار میں اور کچھ رسومات جہاں آواز نکالنا منع تھا، بہت کار آمد تھی۔ دھویں کا سگنل عام طور سے نزدیک کے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔

کبھی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ تسمانیہ کے لوگ سرزمینِ آسٹریلیا میں رہنے والے ایب اوریجن سے مختلف قبائل کی نسل کے لوگ ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ پہلی جماعت جو آسٹریلیا سے تسمانیہ ہجرت کرکے گئی اور وہاں بسی وہ عرصہ آج سے تقریباً بیس ہزار سال قبل کا ہے۔ یہ لوگ آخری آئس ایج کے پگھل جانے کے بعد آسٹریلیا سے جدا ہوگئے تھے۔ تسمانیہ کے ایب اوریجن باشندوں کی بول چال اور رسم ورواج سے پتا چلتا ہے کہ تسمانیہ کی زبان آسٹریلیا کے ایب اوریجن لوگوں کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ ویسے جو ہتھیار اور اوزار آسٹریلیا کے لوگ استعمال کرتے تھے، وہ تسمانیہ میں نہیں پائے گئے۔

ایب اوریجن ہزاروں سالوں سے جس طرح کی زندگی گزارتے تھے یورپی باشندوں کی آمد کے بعد وہ آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔ یورپی باشندوں کی آمد کے وقت ایب اوریجن کی کل آبادی تقریباً تین لاکھ سے پانچ لاکھ تک تھی۔ موجودہ آبادی صرف ڈیڑھ، دو لاکھ کے قریب ہے۔ یورپی باشندوں کے یہاں آنے کے بعد انہیں طرح طرح کی بیماریوں نے جکڑ لیا تھا۔ ان لوگوں کو ایسی بیماریوں کا قطعی علم نہیں تھا۔ ان کی صحت قابلِ تعریف ہوتی تھی۔ اس کی وجہ شکار میں دوڑ دھوپ، کٹھن محنت، تازہ پھل اور خودرو اجناس کی خوراک اور اپنی گزر بسر پر اطمینان تھا۔ ان کے معالج جڑی بوٹیوں سے بہ خوبی علاج کرلیتے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ کس پودے کی خاصیت کیا ہے؟ ان کے حکیم یا معالج ایک خاص اہمیت کی حامل شخصیت ہوتے جو لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لوگوں کو ان کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ ان اشخاص میں روحانی قوت بھی پائی جاتی تھی۔ یورپی باشندوں کی آمد کے بعد ان قدیم باشندوں میں ایسی بیماریاں پیدا ہونے لگی تھیں جن کا انہیں کوئی علم نہیں تھا۔ چیچک، نزلہ، زکام جیسی بیماریاں ان سے دور تھیں۔ کچھ باشندے جو یورپی مشن کے زیرِ کفالت آگئے تو انہیں ان کی روایتی سادہ غذا کے بجائے آٹا، شکر اور شراب ملنے لگی جس سے لوگوں کی تندرستی گرنے لگی۔ انہیں اور بھی دوسری طرح کی خطرناک بیماریوں

سے واسطہ پڑ گیا جن میں ذیابیطس، مٹاپا، دل کی تکلیف، ہیپاٹائٹس، وغیرہ تھیں۔ بیماریوں کے پھیلنے سے اموات کی شرح بڑھ گئی۔ بچوں کی ہلاکت بھی بڑھ گئی تھی۔ اموات سے ان کی آبادی نصف کے قریب رہ گئی تھی۔ کچھ لوگ یورپی باشندوں سے جھگڑوں میں بھی اجل کا شکار ہوئے۔

یورپی باشندوں کی آمد پر کچھ عرصہ تک ایب اوریجن خاموش تماشائی بنے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ لوگ کچھ عرصہ گزار کر واپس چلے جائیں گے لیکن یہ خیالات ان کے خواب ہی ثابت ہوئے۔ یورپی باشندوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور وہ زمینوں پر قابض ہونے لگے حتیٰ کہ ان کی اپنی زمین ان پر تنگ ہوگئی۔

یورپی باشندوں کی آمد کے بعد آسٹریلیا کی زمین کے مالکانہ حقوق کی صورتِ حال بگڑ گئی۔ کہاں وہ وقت کے ایب اوریجن بلاشرکتِ غیرے تمام زمینوں کے مالک تھے اور اب انہی پر ان کی زمین تنگ ہونے لگی تھی۔ قدیم زمانے سے یہ باشندے نسل در نسل اپنی زمینوں پر قابض اور دیکھ بھال کرتے چلے آرہے تھے۔ 1770ء میں Captain Cook نے آسٹریلیا کے مشرقی ساحل پر قبضہ کرکے یہ حصہ شاہ برطانیہ کے نام وقف کردیا تھا۔ اس کے بعد سے آسٹریلیا کی زمین تاجِ برطانیہ کی ملکیت کہلانے لگی۔ حکومت کو اختیار مل گیا تھا کہ وہ نئے آنے والوں میں جسے بھی چاہے زمین فروخت کرے یا بخش دے۔

ایب اوریجن باشندوں کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے بہت کوششیں کی گئیں۔ شروع شروع میں نئے لوگوں کے ساتھ ساتھ مشنری بھی یہاں وارد ہوئے۔ انہوں نے کچھ جگہیں مخصوص کرکے ایب اوریجن باشندوں کو چھت، کپڑے اور خوراک دینا چاہا۔ سب سے پہلی مشنری 1823ء میں قائم ہوئی، یہ مشنری حکومتی اہلکاروں کے ذریعے چلتی تھی۔ آسٹریلیا میں ابتدا میں جہاں جہاں یورپی کالونیاں بنیں وہاں مزید مشنری ادارے کھولے گئے۔ شروع شروع میں اصلی باشندوں کو یہاں زبردستی نہیں لایا گیا۔ بہت سے لوگوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن کچھ لوگوں نے یہاں آنا پسند کیا۔

1880ء کے آخری حصے میں حکومت نے کچھ مشنریوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی عمل داری شروع کردی۔ پھر زبردستی لوگوں کو لایا گیا۔ انکار کی صورت میں سزا کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ حکومتی سطح پر بنائی گئی ان مشنریوں میں ان باشندوں کے ساتھ بڑا بُرا سلوک کیا گیا تھا۔

کچھ یورپی واقعی چاہتے تھے کہ ان باشندوں کی حالت بدلے۔ لیکن جو طریقے وہ اپنا رہے تھے، وہ اصلی باشندوں کو ناپسند تھے۔ بہت سے نام ہیں جن کی جدوجہد اصلی باشندوں کی ترقی کے لیے منصفانہ طریقوں پر عمل پیرا رہی ہیں۔ وہ لوگ آزادی، برابری اور انصاف کی آواز اُٹھاتے رہے۔

1800ء میں ایب اوریجن قوم کے بہت سے لوگ یورپی باشندوں کے آڑے آتے رہے جن میں کچھ تو قید کرلیے گئے اور کچھ لوگوں کو مجبوراً مشنری اور وقف کی ہوئی جگہوں میں رہنا پڑا۔ انہیں یہاں آزادی نہیں تھی۔ انہیں اپنی روایتی زندگی گزارنے، اپنی رسومات ادا کرنے، اپنی زبان استعمال کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ 1900ء میں بہت سے اصلی باشندے اس قابل ہوگئے تھے کہ ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرسکیں اور اپنی آیندہ نسلوں کو بھی تحریک میں شامل رکھیں۔ ان وجوہات کی بنا پر حکومت مجبور ہوگئی اور بہت طرح کی مراعات ان باشندوں کو دینا شروع کردیں اور آج یہ لوگ یورپی باشندوں کے برابر حقوق حاصل کرنے کے اہل ہوگئے ہیں۔ جو جگہیں مشن اور سیٹلمنٹ کے لیے قائم تھیں وہاں آج ان باشندوں کی آبادی قائم ہے۔ بہت سی مذہبی رسومات ادا کرنے کی جگہیں محفوظ کردی گئی ہیں۔ کچھ جگہیں اس لیے مشہور ہیں جہاں ان باشندوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی اور کچھ جگہیں وہ ہیں جو کان کنی کے لیے ہیں اور زمین کے حقوق پر جھگڑا ہے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ ایب اوریجن بڑے شہروں میں اپنے کمیونٹی سینٹرز میں الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ لوگ 20 فی صد اس طرح سے رہائش پذیر ہیں۔ یہیں وہ چھوٹے موٹے کاروبار کرتے ہیں عام لوگوں کی طرح شہر میں کمرشل علاقے میں کوئی کاروبار نہیں کرتے۔

ریاست کوئنز لینڈ کے صدر مقام سے شمال مشرق میں Cherbourge نامی علاقے میں 1904ء میں حکومت نے ان کی رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ 1960ء تک کام کے عوض صرف راشن دیا جاتا رہا۔ اس کے بعد اجرت بھی دی جانے لگی۔ 1986ء میں کمیونٹی کونسل قائم ہوئی جو اسی قوم کے افراد پر مشتمل ہے اور سارا انتظام ان کے حوالے کردیا گیا۔

کوئنز لینڈ ہی میں Capeyork کے پاس Aurukun نامی جگہ پر لینڈ سٹلمنٹ کے ذریعے ایک ریذیڈنٹ کونسل بنائی گئی ہے۔ یہاں کی پوری آبادی اس کونسل کے تحت رہائش پذیر ہے۔ اس علاقے میں سیاحوں کو جانے کے لیے کونسل کی اجازت کی ضرورت پڑتی ہے Cooberpedy جنوبی آسٹریلیا کا ایک خشک اور گرم

علاقہ ہے یہاں ایب اوریجن مختلف نسلوں کے لوگوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔

مغربی آسٹریلیا کی ریاست میں صدر مقام پرتھ کے شمال میں New Norcia کے علاقے میں بڑی زمین الاٹ کی گئی ہیں جہاں انہوں نے بھیڑوں اور زراعت کے فارم بنا رکھے ہیں۔ یہاں گھوڑوں کی بھی پرورش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شراب کشیدگی اور زیتون کے تیل کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔

1977ء کے مالکانہ حقوق ایکٹ کے تحت ایب اوریجن کو شمالی علاقہ کا تقریباً پانچواں حصہ دے دیا گیا ہے۔ ان کے حصے میں شمالی علاقے کے تمام نیشنل پارک کو ان کے حوالے کردیا گیا ہے، ان علاقوں میں معدنیات کے ذخیرے ہیں لیکن کان کنی کے لیے ان سے اجازت لینی ضروری ہے اور معدنیات پر رائلٹی دینی ہوتی ہے۔

قدیم باشندوں کے بچے دو طریقوں سے تعلیم پاتے تھے، ایک رسمی اور دوسرا غیر رسمی طور پر۔

رسمی تعلیم اس وقت دی جاتی جب بچہ ذرا بڑا ہوجاتا۔ اس تعلیم میں بہت طرح کے مذہبی اعتقاد کی باتیں اور مختلف رسموں سے گزرنا پڑتا تھا جو بیس سے تیس سال کی عمر تک جاری رہتا تھا۔

غیر رسمی تعلیم میں انہیں کھیل، کھیل میں شکار کے طریقے وغیرہ سکھائے جاتے، مناظر اور مصوری کی نقل کرائی جاتی اور وہ ہنر سکھائے جاتے جو شکار کے لیے کام آتے، کھانے پینے کی چیزوں کو جمع کرنا اور رکھنا سکھایا جاتا تھا۔

آج کل بھی بچے دو طریقوں سے علم حاصل کرتے ہیں، ایک خاندان اور جماعت کے ہمراہ اور دوسرا اسکولوں کے ذریعے۔ کوششیں کی گئی ہیں کہ موجودہ نسل موجودہ تعلیم سے بہرہ مند ہوسکے۔ ایسے مضامین رکھے گئے ہیں جو ان باشندوں کے بارے میں ہیں اور موجودہ دور کے طور طریقوں کے بارے میں بھی ہیں تاکہ وہ پڑھ لکھ کر آج کی سوسائٹی میں پنپ سکیں۔

1977ء میں نیشنل ایب اوریجن ایجوکیشن کمیٹی قائم ہوئی جو وفاقی تعلیم کے منسٹر کو مشورہ دیتی ہے کہ کن کن باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے نصاب تیار کیا جائے۔ 1989ء میں حکومتی سطح پر ان کے لیے ایجوکیشن پالیسی مرتب کی گئی ہے۔

ایب اوریجن باشندوں کی قانونی نکتہ دانی اور فیصلے بزرگ مرد اور عورتوں کے علم و فراست پر تھے اور اپنی نسلوں کو بتاتے اور سکھاتے تھے۔ یہ لوگ جرم کی نوعیت کو جاننے کے بعد کسی متفقہ فیصلے پر راضی ہوتے تھے اور مجرموں کو سزا دیتے تھے۔ اب یہ باشندے اپنی کمیونٹی میں رہتے ہوئے دو طرح کے قانون و دستور کے پابند ہیں۔ ایک وہ جو ان کی کمیونٹی میں رائج ہے اور دوسرا وہ جو حکومتی قانون ہے۔ ان باشندوں کا اپنا قانون جو صدیوں سے ان کے یہاں رائج تھا وہ ان کی طرزِ زندگی کے مطابق تھا، ان کو اب مروجہ قانون کہا جاتا ہے۔ حکومتی عدالت بھی کبھی مروجہ قانون کے مطابق بھی فیصلہ کرسکتی ہے۔ کسی بھی عدالت کا جج اصل باشندے کے قانون داں کو عدالت میں دعوت دے سکتا ہے کہ وہ جرم و سزا میں اس کی مدد کرے۔

ایب اوریجن باشندوں کے اپنے عقیدے اور مذہب تھے۔ جو ہزاروں سال سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے۔ اسی سے ان کے قوانین وابستہ تھے کہ کس طرح زندگی گزارنی ہے اور اپنی زمینوں کی کس طرح حفاظت کرنی ہے۔ وہ Dreamtime کا زمانہ ہمیشہ مدِنظر رکھتے ہیں۔ یہ ان کا عقیدہ ہے کہ اس دور میں ان کے آباواجداد نے اس ملک کا دورہ کیا تھا اور ان کے آباد ہونے کے لیے یہ زمین ان کو دی تھی۔ یہ یادگار آج بھی ان کے گانے، ناچ، جسمانی پینٹنگ اور مورتیوں اور آرٹ میں زندہ ہیں۔ جب ان کو مجبور کیا گیا تھا کہ اپنی زمین کو بھول کر مشن میں شامل ہوجائیں جہاں انہیں اگرچہ روٹی، کپڑا اور چھت ملتی تھی لیکن انہیں درپردہ عیسائی بنانے کی کوششیں جاری رہتی تھیں۔ کچھ لوگ مسیحی بن گئے لیکن ساتھ ساتھ اپنے مذہبی عقائد کو بھی اس میں شامل رکھا۔

ان باشندوں کا طرزِ تجارت ہزاروں سال پر محیط ہے۔ ماضی بعید میں یہ لوگ مقرر شدہ جگہوں پر جمع ہوجاتے جہاں یہ اپنا تجارتی سامان مثلاً مختلف قسم کے اوزار، چمڑا، گیروا رنگ یا مٹی، مٹی کے برتن اور ایسے سامان جو ان کی رسومات میں کام آتے تھے، ان کی لین دین کیا کرتے تھے، دوسروں کی زمینوں سے گزرتے وقت محفوظ سمجھے جاتے، جب ان تک مخصوص راستوں پر چلتے تھے اور کوئی جرم نہیں کرتے تھے۔

آج کے دور میں ان کے اپنے کاروباری ٹھکانے ہیں اور وہ حکومت کی معاشی دھارے میں شامل ہیں۔ یہ لوگ مارکیٹنگ آرٹ، کپڑوں پر ڈرائنگ، چھاپے خانے، ریڈیو، ٹیلی وژن کے کاروبار میں مشغول ہیں، اس کے علاوہ مویشیوں کی تجارت بھی کرتے ہیں۔

اسپورٹس کے میدان میں بھی انہوں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اصل باشندوں پر مشتمل کرکٹ ٹیم "نیو" آسٹریلیا کی پہلی ٹیم تھی جو کرکٹ کھیلنے انگلینڈ گئی تھی۔

باکسنگ میں بھی ان کا مقام ہے جہاں انہوں نے عالمی اور آسٹریلین ٹائٹل جیتے ہیں۔ فٹ بال بھی کھیلتے ہیں۔ ان کی عورتیں ٹینس، والی بال اور نٹ بال اور ہاکی کی کھلاڑی رہی ہیں۔ کیتھی فری مین نے 1994ء میں کینیڈا کے کامن ویلتھ گیم میں 400 میٹر کی دوڑ میں آسٹریلیا کا نام روشن کیا۔ اولمپکس گیم میں گولڈ میڈل اور ومبلڈن ٹینس میں کامیابی بھی اس کمیونٹی کے اسپورٹس کی فہرست میں شامل ہے۔

آسٹریلیا میں 1901ء میں ریاستی نظام کے رائج ہونے سے قبل ایب اوریجن قوم کی شہریت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ ہر ریاست اس معاملے میں اپنی من مانی کرتی تھی۔ سب سے زیادہ لیت و لعل مغربی آسٹریلیا، کوئنز لینڈ اور شمالی علاقہ جات میں ہوتا رہا۔ شہری حقوق اور ووٹ ڈالنے کا اختیار بہت کم لوگوں کو تھا۔ 1964ء میں شمالی علاقہ جات میں جہاں ان کی آبادی زیادہ تھی، انہیں عارضی شہریت دی گئی۔ کوئنز لینڈ میں 1966ء میں یہ حق محدود پیمانے پر حاصل ہوا بہرحال دوسرے ہی سال یعنی 1967ء میں تمام ایب اوریجن قوم کو پوری شہریت اور ووٹ ڈالنے کے حقوق مل گئے۔

ایب اوریجن قوم میں بیداری کی لہر پیدا ہو چکی ہے اور اس کے لیے مختلف تنظیمیں قائم ہیں۔ چند آسٹریلین ادارے ایسے بھی ہیں جو ان کے کاز کو سپورٹ کرتے ہیں۔ 1958ء میں فیڈرل کونسل برائے ترقی قائم ہوا۔ اس ادارے نے مختلف تنظیموں کو ایک سایہ تلے جمع کر دیا تاکہ سیاسی رہنماؤں، چرچ گروپ اور سماجی اداروں پر دباؤ ڈالا جا سکے جو ان باشندوں کی طرف سے ان کے حقوق کے لیے کوشاں رہیں۔ مطالبہ کیا جاتا رہا کہ آسٹریلین دستور میں نمایاں تبدیلی لائی جائے جو ان باشندوں کے فائدے میں ہو۔ 1967ء کے ریفرنڈم سے قبل ان باشندوں کو آسٹریلیا کے شہری حقوق یا تو نہیں تھے یا عارضی تھے۔ انہی دنوں ایب اوریجن افیئرز کے نام سے ایک علیحدہ محکمہ قائم ہوا۔ اس محکمے کے ذریعے ایب اوریجن قوم اپنے معاملات کا خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس سے قبل ان کے تمام معاملات حکومت کی اپنی مرضی پر حل کیے جاتے تھے۔ 1990ء میں ایب اوریجن قوم کے لیے ایک کمیشن قائم ہوا جس نے ایب اوریجن افیئرز کی جگہ لے لی۔ اس کمیشن کے سپرد یہ ذمہ ہے کہ وہ پتا کریں کہ اصل باشندوں کی معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ضرورتیں کیا ہیں اور انہیں کس طرح بروئے کار لایا جائے؟ اس محکمے نے تقریباً دس ہزار لوگوں کی نشاندہی کی ہے جن کو 1915ء سے 1970ء تک کے عرصے میں زبردستی ان کے خاندان سے جدا کر دیا گیا تھا۔

ایب اوریجن قوم میں اصلاحات پر زور صرف آسٹریلیا ہی میں نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ہوا۔ یہ قوم خاص خاص موقعوں پر جب بین الاقوامی لوگ بھی موجود ہوتے، اپنا احتجاج بلند کرتے۔

1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں کچھ بین الاقوامی اداروں نے آسٹریلیا پر سخت تنقید کی تھی کہ ان کا رویّہ ایب اوریجن کے ساتھ منصفانہ نہیں ہے۔ 1960ء کے آخر اور 1970ء کے شروع میں آسٹریلین ڈپلومیٹ بین الاقوامی سطح پر لسانی معاملات کی میٹنگ میں سخت خجالت کا شکار ہوئے تھے۔ 1970ء میں یہ قوم انٹرنیشنل بلیک پاور گروپس سے حمایت اور الحاق کے طلب گار ہوئے۔ 1977ء میں ایب اوریجن وفد لاؤس میں دوسرے عالمی بلیک افریقن فیسٹیول آف آرٹس اینڈ کلچرل میں شامل ہوا۔

1982ء میں آسٹریلیا کے شہر برسبین میں کامن ویلتھ گیم ہوا تو یہاں بھی مظاہرین نے اپنے حقوق اور برابری سلوک کے حق کے لیے مظاہرے کیے۔ کئی وفود نے یونائیٹڈ نیشن کو یادداشتیں بھی پیش کیں۔

وقتاً فوقتاً حکومتی ادارے ایب اوریجن قوم کے مطالبے پورے کرنے کی کوششیں بھی کرتے رہے ہیں۔ 1972ء سے 1975ء تک فیڈرل لیبر پارٹی کی حکومت کے دوران اصلاحات ہوئی تھیں۔ حکومت نے فنڈ قائم کیے تھے۔ تاکہ ایب اوریجن پروجیکٹ پر کام ہو سکے۔ ذاتی اور نجی زمینوں کے مالکانہ حقوق دیے گئے۔ کمیونٹی جماعتوں کو تحفظ کی ضمانت دی گئی اور ایب اوریجن معاملات کا محکمہ قائم ہوا۔ 1973ء میں تعلیمی اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔ ان باشندوں کے علاقوں اور کمیونٹی سینٹر میں اسکول کھولے گئے جہاں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ اسی سال نیشنل ایب اوریجن کانفرنس قائم ہوا اور حکومت نے لانگ ٹرم ایب اوریجن ترقیاتی کام کا آغاز کیا۔ اس کانفرنس کے ممبر تمام ریاستوں سے منتخب کیے گئے۔ زمین، جائداد اور تجارت کے لیے قرض کی فراہمی کا فیصلہ کیا گیا۔ ایب اوریجن آرٹس اینڈ کرافٹس کے لیے فنڈ قائم ہوا جس کی نگہداشت ایب اوریجن آرٹس بورڈ کے سپرد کر دی گئی۔

یورپی باشندوں کی جکڑ میں سسکتی ہوئی اس قوم کے ساتھ جتنی ناانصافی ہوئی ہے اور ان کا پاکستانیوں کے ساتھ جو ان کے علاقوں میں آباد ہیں کیسا سلوک ہے، اس پر اگر کبھی موقع ملا تو مزید لکھوں گا، فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔

بھیڑ کھال

مختار آزاد

اون کی تجارت صدیوں سے جاری ہے اور اپنے اندر ایک دلچسپ تاریخ بھی رکھتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ماضی میں برصغیر کی اہم صنعت "ململ بافی" تھی۔ یہ واحد صنعت ہے جس پر "چرچ" نے اپنا حق جمایا اور اس صنعت کو اپنی تحویل میں لے کر اس کی آمدنی کو پوپ اور بشپ کے لیے مختص کر دیا۔

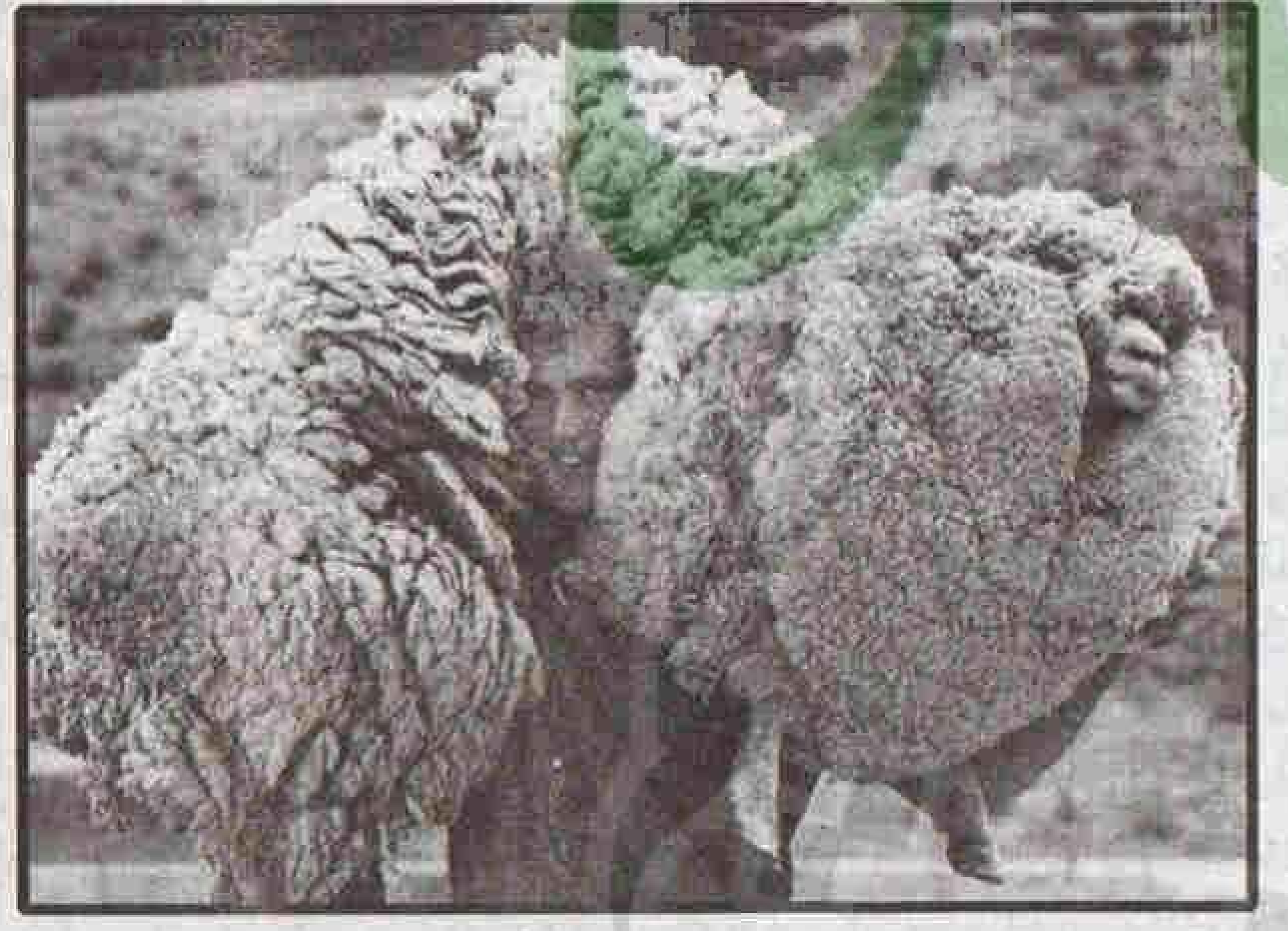

یہ نمازِ مغرب کا وقت تھا جب میں مسجد کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں نے برف میں اٹے اپنے جوتے وضو خانے کے قریب اتارے۔ جب اندر ہال میں داخل ہوا تو اس وقت مؤذن اذان دے رہا تھا۔ بھیڑ کی اون سے بنا ہوا اس کا اوور کوٹ دروازے کے قریب ایک ستون پر لگی کھونٹی سے لٹک رہا تھا۔

اُس وقت میں گبدین نامی گاؤں میں تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وسطِ ایشیا کی ریاستیں آنجہانی سوویت یونین کا حصہ تھیں اور گبدین کا چھوٹا سا پسماندہ گاؤں، دیو مالائی کوہ قاف کے بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں آباد ایک دور دراز واقع گاؤں خیال کیا جاتا تھا۔

گبدین گاؤں ریاست داغستان میں واقع ہے۔ میں اس گاؤں کی مسجد کے فرش اور سیڑھیوں پر بچھے، ہاتھوں سے تیار کردہ اُن قالینوں کو دیکھنے آیا تھا۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صدیوں پہلے بنائے گئے تھے۔ میں اس

بات کا بھی جائزہ لینا چاہتا تھا کہ اس وقت کے داغستان اور آج کے داغستان میں جو قالین بُنے گئے تھے اور اب تک بُنے جاتے ہیں، اُن کے ڈیزائن، خام مال اور بناوٹ میں قدرِ مشترک کیا کیا ہیں۔

مسجد کے ہال میں کچھ دیر تک اِدھر اُدھر نظریں گھمانے کے دوران ہی مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں موجود سب سے بہترین حالت میں موجود قالین وہ ہیں جو نماز کی ادائیگی اور دینی تعلیم کے لیے خواتین کے مخصوص حصے کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر بچھے ہوئے ہیں۔ یہ سیڑھیاں شاید بہت کم استعمال ہوتی تھیں۔ اسی لیے یہ قالین بہتر حالت میں تھے۔ مسجد کے فرش پر بھی قالین بچھے ہوئے تھے لیکن کثرتِ استعمال کے سبب ان کی اصل حالت قریب قریب غائب ہوچکی تھی۔ اس کے برعکس سیڑھیوں پر بچھے قالین پر بنے نمونوں میں استعمال ہونے والے رنگ.... ابھی تک اپنی اصلی حالت میں موجود تھے۔

”یہ یہاں زیادہ محفوظ ہیں۔“ سیڑھیوں پر بچھے قالین میں میرے انہماک کو دیکھتے ہوئے مسجد کے امام نے میرے قریب آکر آہستگی سے کہا۔ ”یہ بہت قدیم ہیں۔ ان قالینوں کے نمونوں میں داغستان کی قدیم ثقافت زندہ ہے۔“

جس وقت وہ نمازِ مغرب ادا کررہے تھے، اُس وقت میں نمازیوں سے خالی اس مسجد کے ہال میں بچھے قالینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ اتنی خاموشی سے میرے قریب آکر کھڑے ہوگئے کہ وہ اگر بولتے نہیں تو میں ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں کرپاتا۔ اس بے دھیانی کی وجہ شاید یہ تھی کہ جب میں اپنی تحقیق کے دوران یہاں پہنچا تو ان قالینوں نے ہی میری ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔

میں نے ہال میں ٹہلتے ہوئے فرش پر بچھے قالینوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ان کی حالت خاصی خراب تھی۔ کئی قالین تو اب صرف ٹکڑوں کی شکل میں ہی باقی بچے تھے۔ ان میں بھی جگہ جگہ پر سوراخ دکھائی دے رہے تھے۔

کبھی یہ قالین واقعی دلکش رنگوں سے مزین شاہکار کہلاتے ہوں گے مگر اب تو ان کی حالت قابلِ افسوس تھی۔ ان میں سب سے عمدہ حالت میں وہ طویل قالین تھا جو فرش کے مرکز میں بچھا ہوا تھا۔ اس پر ہشت پہلو ستارے اُبھارے گئے تھے۔ یہ ستارے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ یہ مہارت سے بُنا گیا تھا۔ نہایت نرم، اونی ریشوں سے پاک، ہموار سطح اور دلکش رنگ۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا خوبصورت قالین صدیوں پہلے داغستانی باشندوں نے لکڑی کی کھڈی پر بُنا تھا۔ اس جیسی دلکشی، نفاست اور مہارت کا عشرِ عشیر تو اب صرف مخمل کے ان قالینوں میں ہی نظر آتا ہے، جنہیں مشینوں پر کمپیوٹرائزڈ ڈیزائن کی مدد سے تیار کیا جاتا ہے۔

اس بات نے محققین کو اب تک اس الجھن میں ڈالا ہوا ہے کہ کوہ قاف کے خطے میں صدیوں پہلے ایسے قالین کس طرح بنائے جاتے تھے۔ جن کی بیرونی سطح اونی ریشوں سے بالکل پاک اور ہموار ہوتی تھی۔ ان قالینوں پر ہاتھ پھیرو تو ذرہ برابر بھی کہیں پر کوئی گانٹھ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ ایسے کوہ قافی قالینوں کی تیاری صدیوں پہلے کس تکنیک کی مدد سے شروع ہوئی تھی؟ ماہرین درست عہد اور تکنیک کا اب تک تعین نہیں کرسکے ہیں۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ گبدین کی اس مسجد میں کئی سو سال پہلے بُنے گئے ایسے قالین موجود ہیں جن کی تیاری کے اصل عہد کا تعین کرنے کی کوششیں اب تک جاری ہیں۔ یہی بات مجھے اس مسجد تک لے آئی تھی۔ جہاں میں طویل سفر اور متعدد سفری مشکلات کو جھیلتا ہوا اُس شام پہنچا تھا۔ واقعی، مسجد میں بچھے قالینوں کو دیکھ کر میں اپنے سفر کی تمام صعوبتوں کو بھول گیا تھا۔

اُن قالینوں میں واقعی ایک سحر پوشیدہ تھا، جو قدرداں کو کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر دنیا و مافیہا سے بے خبر کرسکتا تھا۔

یہ داغستانی قالین صرف دنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کے فن و ثقافت کے ہی نمائندہ نہیں۔ یہ قالین بھیڑ، اس کے پشمینے اور انسان کے درمیان ہزارہا برس قدیم ترین اُس رشتے کا بھی ثبوت ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تعلق لگ بھگ بارہ ہزار برس پہلے وسط ایشیا کے بلند ترین برفیلے پہاڑوں کی سرد ترین وادیوں کے میدانوں میں بسنے والوں نے قائم کیا تھا۔ بھیڑ اور انسان کے اس تعلق نے اون کو وجود بخشا۔ اون، جسے اُس دور کے لوگوں نے ٹھنڈ کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنایا اور پھر یہ تعلق اتنا خاص ہوگیا کہ دنیا بھر کی تہذیبوں کے ارتقا اور عروج میں یہ بالکل صاف اور حاوی دکھائی دیتا ہے۔

ہزاروں سال پہلے گوشت انسان کی بھوک مٹانے کے لیے تھا۔ جنگلی جانور اس کی یہ ضرورت بہ آسانی پوری کردیا کرتے تھے لیکن موسم کے سرد و گرم سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔

ماہرینِ بشریات و سماجیات کہتے ہیں کہ جب وسطِ ایشیا کے سرد ترین خطوں میں اُس دور کے انسان کو سرد ترین موسم سے بچاؤ کی سوجھی تو پھر بھیڑ اور انسان کے درمیان گوشت

کے سوا ایک اور نیا رشتہ قائم ہوا۔

انسان نے بھیڑ کو جنگلی خونخوار درندوں سے بچا کر پالتو جانور بنایا۔ یوں اسے شکار کی تلاش میں بھٹکنے کے بجائے بہ آسانی خوراک میسر آئی تو دوسری طرف اس کی کھال کو انسان نے خشک کرکے پہلے پہل اوڑھا اور پھر جوں جوں ارتقائی سفر آگے بڑھتا گیا، موسم کے سرد و گرم سے بچاؤ کے لیے اس کھال کے فوائد کے راز انسان پر کھلتے چلے گئے۔

کہاوت ہے ”انسان نے بھیڑ کو درندوں سے بچایا اور بھیڑ نے اسے سرد موسموں سے پناہ دی۔“ بھیڑ اور انسان کی یہ دوستی آج بھی قائم و دائم ہے۔

ماہرینِ حیات کہتے ہیں کہ زمانۂ قبل از تاریخ کی بھیڑ گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہر سال موسمِ بہار میں اس کے یہ گھنے بال جھڑ جاتے تھے اور پھر اگلے موسمِ سرما تک نئے بال اُگ آتے۔ یوں بالوں سے ڈھکا جسم اس کو سرد موسم کی سختیوں سے بچالیتا تھا۔ موسمِ بہار میں بھیڑ کے اونی ریشوں والے یہ بال اتنے نرم پڑ جاتے تھے کہ اگر اس کے اوپر ہاتھ پھیرو تو یہ بال انگلیوں میں پھنس کر ٹوٹ جایا کرتے تھے۔

زمانۂ قبل از تاریخ کے دور سے تعلق رکھنے والی اس بھیڑ کی نسل اب بھی دنیا میں محفوظ ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے مغربی ساحلی جزیرے کی سمت میں ایک جزیرہ واقع ہے۔ اسے سینٹ کائیلڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کہتے کہ انسان کے ابتدائی ادوار میں اس جزیرے پر یہ بھیڑیں پائی جاتی تھیں اور اب بھی ان کی نسل اپنے ابتدائی قدرتی مسکن کے فطری ماحول میں موجود ہیں۔ نہ تو ان کا دوسری نسل کی بھیڑوں سے اختلاط ہوا ہے اور نہ ہی ان کے قدرتی ماحول اور مسکن میں کوئی فرق آیا ہے۔ یہ بھیڑیں اب بھی اس جزیرے پر ویسے ہی ماحول میں زندہ ہیں، جیسا کہ ہزاروں برس پہلے موجود تھیں۔

انسان نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف نسل کی بھیڑوں کے باہم اختلاط سے ان کی کئی نسلوں کو وجود بخشا۔ آج دنیا بھر میں پشمینے کے لیے مشہور بھیڑوں کی نسلوں کی تعداد درجن سے بھی زائد ہے۔ جنگلی بھیڑوں کے مقابلے میں پالتو بھیڑوں کے بال ذرا سخت، چھوٹے، سفید اور زرد مائل ہوتے ہیں۔ ماہرینِ بشریات کا کہنا ہے کہ لوہے کا دور تاریخ کے عملِ ارتقا کا وہ دور ہے جب انسان نے بھیڑوں کے جھڑتے بالوں کے بجائے انہیں طریقے سے کاٹ کر کام میں لانے کا آغاز کیا۔ یوں ہاتھوں سے بھیڑوں کے بال اُکھاڑنے کا سلسلہ اپنے اختتام پر پہنچا۔

جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا۔ بھیڑ کی کھال، جو کبھی سرد موسم میں تن ڈھانپنے کے کام آتی تھی اور اس کے بالوں کو زمین پر بچھا کر جسم کو گرم رکھا جاتا تھا۔ ترقی کے ساتھ ساتھ اس سے نمدے، قالین اور سوئٹر بُنے جانے لگے۔

بھیڑ کے بالوں سے بنائے گئے اون میں ہوا کی نمی کو جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ حدت کو اپنے اندر ہی روک کر جسم کو گرم رکھتا ہے۔ اس کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ آگ کے مقابلے میں مدافعت کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اون کو جاننے کے سفر کے دوران میرا چین کے دور دراز علاقے کاشی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ریگستانی اور گرم علاقہ ہے۔ یہاں ایک پہاڑی غار میں برف کو ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ غار کے اندرونی حصے میں موجود برف کو بیرونی موسم کی حدت سے بچانے کے لیے، غار کے دروازوں پر اون سے بنے موٹے موٹے پردے لٹائے گئے تھے۔

یہی نہیں، صحرائی خانہ بدوش بھی اون سے بنے خیمے استعمال کرتے تھے، تاکہ وہ باہر کی گرمی کو اندر داخل ہونے سے روک سکیں۔ اس طرح کے اونی خیموں میں باہر کے مقابلے میں درجۂ حرارت خاصا کم ہوتا ہے۔ زمانۂ بائبل میں اون سے بنے مشکیزوں کو پانی لانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

انسان نے عملِ ارتقا کے دوران تن ڈھانپنے اور دیگر ضروریات کے لیے ہزارہا برس پہلے روئی کا استعمال بھی شروع کردیا تھا لیکن وہ اون کا مکمل متبادل ثابت نہیں ہوا۔ کم وزن ہونے کے علاوہ اون کے قابلِ استعمال رہنے کی عمر، سوت سے بنے کپڑے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔

فلاڈیلفیا کالج برائے ٹیکسٹائل و سائنس، امریکا کے ڈاکٹر فری فورٹریس کا کہنا ہے:

”بھیڑ کے بالوں میں پروٹین اور کیراٹین ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں آگ سے بچاؤ کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ اون، کسی بھی قسم کے کپڑے کے مقابلے میں کہیں دیر تک آگ سے بچاؤ کرسکتا ہے۔ اسی لیے آگ بجھانے والے عملے کے لیے جو خاص لباس تیار کیا جاتا ہے، اس میں اون خاص طریقے سے شامل کیا جاتا ہے۔ یہ آگ بجھانے کے عمل میں ایک طرف تو انسان کو آگ سے بچاتا ہے تو دوسری طرف آگ کی حدت کو جسم تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کو آگ لگ جائے تو اسے بچانے کے لیے سب سے پہلے اس پر کمبل پھینکتے ہیں۔ تاکہ اونی کمبل ایک طرف آگ کو آکسیجن کی فراہمی روکے تو

دوسری طرف آگ کو پھیلنے سے روکے۔"

ڈاکٹر فورٹریس کہتے ہیں "کبھی سوچا ہے کہ اگر کمبل کے بجائے کسی جلتے ہوئے شخص پر سوت سے بنی چادر پھینکی جائے تو کیا ہوگا؟ یقیناً آگ اور بھڑک جائے گی لیکن کمبل آگ کو بھڑکنے سے روک کر اسے بجھانے میں مدد دیتا ہے۔ اون، انسان کے جسم کو صرف گرم ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے سخت گرمی سے بھی بچا سکتا ہے۔"

بھیڑ کے بالوں سے نمدہ تیار کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے صحرائی اور سردترین خطوں کے خانہ بدوش ہزارہا برس سے نمدے کو بستر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں بھی بھیڑوں کی گلہ بانی عام ہے۔ بلوچی خانہ بدوش بھیڑ کی اون سے اپنے استعمال کے لیے ریشہ دار نمدے تیار کرتے ہیں۔ نمدوں کی تیاری کو بلوچی دستکاریوں میں اہم مقام حاصل ہے۔

وسط اور مغربی ایشیا کے خانہ بدوش بھیڑ کے بالوں سے لباس اور خیمے تیار کیا کرتے تھے۔ لوہے کے زرہ بکتر کی ایجاد سے قبل یونانی باشندے بھیڑ کے اونی ریشوں کو رسیوں کو بٹ کر اس سے اپنے سروں کی حفاظت کے لیے ہیلمٹ بنایا کرتے تھے۔

یونانی مؤرخ استرابو کے مطابق "اس دور میں جب یونانی افواج کسی جنگی مہم پر نکلتی تھیں تو اس کے ساتھ بڑی مقدار میں اون، کھڈیاں اور بڑی تعداد میں جولاہے ساتھ چلا کرتے تھے۔ تاکہ فوجی ضروریات کے لیے درکار اونی لباس فوج کو بوقتِ ضرورت ملنے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہونے پائے۔"

رومن سپاہی اون سے بنی پٹیوں سے ایسی شرٹ تیار کرتے تھے جسے وہ حالتِ جنگ میں پہنتے تھے۔ یہ شرٹ ان کے سینوں کو تیروں، تلواروں اور بھالوں کے جان لیوا زخموں سے بچاتی تھی۔ اگرچہ سپاہی کاٹ دار تلواروں اور نکیلے بھالوں سے زخمی تو ہوجاتے تھے لیکن یہ زخم جان لیوا نہیں رہتے تھے۔

ایلڈر، جن کی کتاب 'نیچرل ہسٹری' کو دنیا بھر میں انسانی ارتقا کے وسطی دور کی تاریخ کے حوالے سے مستند سمجھا جاتا ہے، کہتے ہیں:

"بھیڑ کے اون میں سرکہ کے قدرتی اجزا موجود ہوتے ہیں جو آگ سے بچانے کے علاوہ لوہے کے وار کی شدت کو بھی بڑی حد تک کم کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زرہ بکتر کی ایجاد سے قبل روم کے سپاہی سر کو بچانے کے لیے اونی خود اور سینے کو وار سے محفوظ رکھنے کے لیے نمدوں سے تیار کردہ شرٹ پہنا کرتے تھے۔"

"اون پانی کو اندر داخل نہیں ہونے دیتا۔" یہ بات میں نے بہت پہلے سنی تھی لیکن اس کا عملی تجربہ ہوا ترکی میں۔

اُس دن میں ترکی کے دورافتادہ علاقے میں ترک گلہ بان عمر اکار کے ساتھ چراگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کو چرانے کے لیے نکلا تھا۔ عمر خانہ بدوش ہے اور اس کی آمدنی اور زندگی کا بڑا انحصار...... بھیڑوں پر ہے۔ وہ مجھے بھیڑوں کے فوائد سے آگاہ کررہا تھا اور بتا رہا تھا کہ خانہ بدوشوں کی زندگیاں بھیڑوں پر ہی کیوں انحصار کرتی ہیں۔ اسی دوران باتوں باتوں میں آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔ روشنی تاریکی میں بدلنے لگی۔

"لگتا ہے کہ گھٹا جھوم کر برسے گی؟" عمر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے گدھے پر لدا ہوا ایک تھیلا اتار کر اسے کھولا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تھیلا کھول کر ایک برساتی نما لباس نکالا۔ یہ ہلکے زرد رنگ کا اور اون سے بنا ہوا تھا۔ اس نے یہ لباس نکال کر برساتی کی طرح سر سے پہن لیا۔ اس لباس نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک ڈھانپ لیا۔ صرف اس کے ہاتھ اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔

"اسے کپیے نیک کہتے ہیں۔ یہ نمدے کی ہی ایک شکل ہے۔" مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اس نے کہا۔

"یہ تم نے کیوں پہنا؟" میں نے پوچھا۔

"بارش ہونے دو۔ واپسی پر بتاؤں گا!" اس نے جواب دیا۔

اتنی دیر میں بادل زور سے گرجے اور ٹپاپٹ موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ میں نے اپنے تھیلے میں سے پیراشوٹ کی بنی ہوئی چھتری نکال کر سر پر تان لی۔ چند لمحوں میں ہی وہ موٹی موٹی بوندیں موسلا دھار بارش میں بدل گئیں۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب بارش میں بھیگتے ہوئے ہم اس کے ڈیرے پر پہنچے تو اندر داخل ہوکر اس نے اپنا کپیے نیک اتارا۔ وہ سر سے پاؤں تک مکمل طور پر خشک تھا اور میری پینٹ گھٹنوں تک پانی میں بھیگی ہوئی تھی۔

"اب تو سمجھ گئے ہو کہ یہ کیا ہے؟" اس نے مسکرا کر میرے گیلے کپڑوں کو دیکھا اور اپنے خشک لباس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہمیں تیز بارش میں بھیگنے سے صاف بچا لیتا ہے۔ یہ جو کام کرتا ہے وہ تمہاری یہ چھتری ہی نہیں، کوئی دوسری چیز بھی نہیں کرسکتی۔ یہ کام صرف کپیے نیک کرسکتا ہے۔"

"واقعی...... تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے جواب دیا تو

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

صدیوں پہلے ترک خانہ بدوشوں نے، اُس غیر ترقی یافتہ زمانے میں ہی اپنی بھیڑوں کے اونی ریشوں سے وہ چیز ایجاد کرلی تھی، جسے آج مغرب کا ترقی یافتہ انسان ستائش کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں کپیے نیک پہن کر اتنی دیر تک تیز بارش میں گھوم سکتا ہوں جب تک میں اپنے باہر کے کام نہ نمٹا لوں۔" عمر کہنے لگا۔ "کپیے نیک ہمیں برفباری میں ٹھنڈ سے بچاتا ہے اور بارش میں یہ کیسے کام کرتا ہے۔ وہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اگر کپیے نیک نہ ہو تو ہم لوگ اس تیز بارش میں تھوڑی دیر کے لیے بھی باہر نہیں رہ سکتے۔ یہ بارش سرد موسم میں ہمیں ٹھنڈ کا شکار بنادے لیکن کپیے نیک ہو تو میں بارش کی پروا کیے بغیر جب تک چاہوں، باہر رہ سکتا ہوں 'نہ بھیگنے کی پروا' نہ ٹھنڈ سے ہونے والی بیماریوں کا ڈر۔"

کپیے نیک صرف بارش سے بچاؤ کے ہی کام نہیں آتا بلکہ سخت سرد موسم میں جب چرواہے چراگاہوں میں گھومتے گھومتے تھک جاتے ہیں تو اسے زمین پر بچھا کر اس کے اندر گھس کر سو بھی جاتے ہیں۔ اب بارش ہو یا ژالہ باری۔ کپیے نیک کے اندر چرواہا بالکل محفوظ ہے۔

خانہ بدوش زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اون نے ان کی زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اون کے گرم لباس کی بدولت ہی وہ سردترین اور لہو جما دینے والے علاقوں سے گزرنے کے قابل بنے۔ اسی وجہ سے سردترین علاقوں کے خانہ بدوشوں نے اپنے لیے نئے نئے جہان تلاش کیے اور اپنی بھیڑوں کے لیے زیادہ سرسبز چراگاہوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

اون نے ان ایشیائی خانہ بدوشوں کی زندگیوں پر بہت اثر ڈالا ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں چینی جنگجو ان ایشیائی خانہ بدوشوں کے اس خطے کو 'سرزمینِ نمدہ' کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

زمانۂ قبل از مسیح میں چینی جنگجوؤں نے سخت برفباری میں پیروں کے بچاؤ کے لیے نمدے سے بنے جوتے اور جنگ میں سپاہی کے جسم کی حفاظت کے لیے نمدے کی ڈھال بنانے کا طریقہ انہی ایشیائی خانہ بدوشوں سے مستعار لیا تھا۔

قدیم ترکستان میں رواج تھا کہ نو منتخب قبائلی سردار نمدے پر بیٹھ کر اپنے عہدے کا حلف اٹھاتا تھا۔ جب کبھی کسی اور سردار کے ہاتھوں اس کو شکست ہوجاتی تو وہ نمدہ جس پر شکست خوردہ سردار نے بیٹھ کر حلف لیا ہوتا تھا۔ وہ فاتح سردار کو بطور 'یادگارِ فتح' پیش کیا جاتا تھا۔

خیر...... بات دوبارہ شروع کرتے ہیں ترک خانہ بدوش عمر اکار سے۔

"نمدے سے بنا کپیے نیک کیسے کام کرتا ہے۔ وہ تو مجھے پتا چل گیا۔ یہ خیمے بھی کیا اسی طرح بنے ہوئے ہیں؟" میں نے عمر سے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"ہمارے خیمے بالکل کپیے نیک کی طرح بنے ہوئے ہیں۔" وہ کہنے لگا۔ "ہم انہیں اون کے خالص ریشوں کے ذریعے تیار کرتے ہیں۔ ایک تو یہ بارش اور برفباری کے دوران اندر نمی اور پانی کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ دوسرا یہ اندر سے گرم رہتے ہیں۔ باہر کتنی بھی سردی کیوں نہ ہو۔ اندر کا موسم قابلِ برداشت ہوتا ہے۔"

عمر بتا رہا تھا "یہی نمدے ہم فرش پر بچھا کر، بستر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان نمدوں کی وجہ سے ہی ایک تو زمین کی ٹھنڈک ہمارے جسموں تک نہیں پہنچتی۔ دوسرا یہ کہ ہمارے جسم کی حرارت کو بھی وہ زمین تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اس لیے سخت ترین سردی میں بھی نمدے کا یہ بستر گرما گرم ہی رہتا ہے۔"

خانہ بدوشوں میں اون سے بنے نمدوں کی مقبولیت ایک تو ان کی قدرتی صلاحیت ہے اور دوسرا وزن۔ اون، کسی بھی قسم کے کپڑے کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ ہلکا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ کپڑوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پائیدار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خانہ بدوش ہزارہا برس سے اونی نمدوں اور خیموں کا استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔

"خانہ بدوش سال میں دوبار ہجرت کرتے ہیں۔ موسمِ گرما میں پہاڑوں کی طرف اور موسمِ سرما میں میدانی چراگاہوں کی جانب۔ بار برداری کے لیے پہلے تو صرف اونٹ، گھوڑے، خچر اور گدھے استعمال ہوتے تھے۔ اس لیے خانہ بدوش اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ان کے پاس جو بھی سامان ہو، وہ وزن میں ہلکا ہو۔ تاکہ نقل و حمل میں آسانی رہے۔ اس لیے اون سے بنے نمدے والے خیمے ہمیشہ سے خانہ بدوشوں میں مقبول رہے ہیں۔" عمر نے تفصیل سے اپنے خیموں کے بارے میں مجھے بتایا۔

"مگر اب تو تم لوگوں کے پاس مال برداری کے لیے چھوٹے ٹرک اور ٹریکٹر بھی ہیں۔ تو ایسے میں وزن کا لانا، لے جانا تو کوئی مسئلہ نہیں بنتا ہوگا۔ پھر بھی اونی خیمے کیوں مقبول ہیں اب تک؟" میں نے عمر کی بات سن کر سوال کیا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہمیں اب تک ایسا کم

قیمت اور بہ آسانی دستیاب فائبر نہیں مل سکا ہے، جو ان اونی خیموں کا متبادل ہو۔'' عمر نے میری بات کا جواب دیا۔

''تم جانتے ہی ہو کہ ہم خیموں کے اندر ہی کھانا پکاتے ہیں۔'' عمر نے کہا۔ ''لکڑی جلنے کے سبب پیدا ہونے والی چنگاریاں اندر اُڑتی رہتی ہیں لیکن ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ نمدے سے بنے ہمارے یہ خیمے جل نہیں سکتے۔ اب تم بتاؤ کم وزن، پائیدار، بھیگنے سے بچانے والا، سرد وگرم کو قدرتی طور پر قابو میں رکھنے اور آگ لگنے سے محفوظ ایسا خیمہ کوئی اور ہے، جسے ہم ان ہزاروں برس پرانے طریقے پر بنائے گئے خیموں کو خیرباد کہہ کر استعمال کرنا شروع کردیں؟'' عمر کی بات میں وزن تھا اور میں اس کے پیش کردہ دلائل سے مطمئن ہو چکا تھا۔

ویسے سچ کہوں تو عمر سے کیا گیا میرا سوال مکمل نہیں تھا۔

یہ درست ہے کہ نقل وحمل کے لیے ٹریکٹر اور چھوٹے ٹرکوں کے استعمال کا رواج خانہ بدوشوں میں موجود ہے لیکن اب بھی بڑی حد تک خانہ بدوش روایتی ذرائع نقل وحمل پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ مغربی چین اور وسط ایشیائی ریاستوں کے خانہ بدوش اب بھی مال برداری کے لیے گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں، یاک اور خچر پر ہی انحصار کرتے ہیں بالکل اپنے پُرکھوں کی طرح۔

یہ آٹھویں صدی قبل از مسیح کی بات ہے۔ اس وقت بھی خانہ بدوش بھیڑ کے بالوں سے بنے نمدوں اور اس کی کھال سے بنے غلاف کا استعمال جانتے تھے۔ اس زمانے میں بھی چین، وسط ایشیا اور سائبیریا کے خانہ بدوش جب سفر کرتے تھے تو نمدے سے بنے غلاف سے اپنے سامان کو ڈھانپ کر چلا کرتے تھے کہ مبادا راستے میں کہیں بارش ہو جائے تو ان کا اسباب اور زادِ راہ محفوظ رہے۔

یہ اُسی زمانے کا ذکر ہے جب منگولیا اور سائبیریا کے سرد ترین علاقوں کے خانہ بدوشوں نے نمدوں کے ذریعے ایک نئی طرز کا خیمہ ایجاد کیا۔ اسے انگریزی میں yurt کہتے ہیں۔

اس خیمے کی شکل اس طرح ہے کہ سب سے پہلے لکڑی کی بلیوں پر خیمے کا ڈھانچا کھڑا کیا جاتا ہے جس پر نمدے کو غلاف کی طرح ڈال کر رسیوں سے باندھ دیتے ہیں۔ یہ رسیاں بھی بھیڑوں اور دنبوں کے بالوں سے بٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ یوں بڑا سا گول خیمہ بن جاتا ہے، جس کی چھت گنبد کی شکل میں ہوتی ہے۔ چھت کے عین بیچوں بیچ ایک بڑا سا سوراخ ہوتا ہے۔ یہ روشن دان کا کام دیتا ہے۔ جب دن صاف ہو تو نیچے سے ایک لکڑی کی مدد سے اسے کھول دو، خیمہ اندر سے روشن ہو جائے گا۔ کھانا بناتے ہوئے خیمے میں بھرا دھواں اس کے ذریعے ہی خارج کیا جاتا ہے۔ بارش ہو یا برفباری، نیچے کھڑے کھڑے ایک لکڑی کی مدد سے نمدے کا غلاف کھینچ دو روشن دان بند۔ خیمہ اندر سے پانی اور برفباری سے محفوظ ہو گیا۔

نمدے سے بنا یہ خیمہ اندر سے بالکل کمرے کے مانند کشادہ ہوتا ہے۔ نمدے کے یہ خیمے آج بھی خانہ بدوش استعمال کرتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہزاروں سال کے باوجود آج بھی ان خیموں کی بناوٹ ویسی ہی ہے جیسے ہزاروں برس قبل ہوتی ہوگی۔

اگرچہ آج دنیا بھر کے متعدد ممالک میں خانہ بدوش زندگی متروک ہو چکی ہے۔ جس کا سبب حکومتوں کے وہ اقدامات ہیں جو انہوں نے ان آوارہ گردوں کو ساکت زندگی کا عادی بنانے کے لیے کیے، لیکن اب بھی دنیا کے متعدد ممالک میں خانہ بدوش اپنی ہزارہا برس قدیم زندگی کی ثقافت کو زندہ رکھے ہوئے نیلے فلک میں روز وشب بسر کر رہے ہیں۔ آج کی تیز رفتار اور ترقی یافتہ دنیا میں بھی بالکل اپنے بزرگوں کے قدیم انداز میں۔

نمدوں سے بنے گول خیمے آج بھی دنیا بھر کے لگ بھگ ایک تہائی خانہ بدوشوں کے زیر استعمال ہیں۔ ان میں وسط ایشیا اور چین کے کچھ حصوں کے علاوہ، مشرقی منگولیا، ترکی اور سائبیریا میں ان کا استعمال آج بھی واضح طور پر خانہ بدوش زندگی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

نمدے سے بنائے گئے ان خیموں میں اگر آپ ایک بار رہ جائیں تو پھر اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے کرغیزستان میں کچھ کسانوں کو دیکھا۔ حکومت نے ان خانہ بدوشوں کو آباد کر کے زمینیں دیں اور کاشتکاری سے لگادیا۔ رہنے کے لیے انہیں پختہ اور آرام دہ گھر دیے گئے جہاں انہیں بجلی اور ایندھن کی سہولتیں میسر تھیں لیکن ان سب سہولتوں کے باوجود نمدے کے خیمے ان کے دلوں سے اب تک دور نہیں ہوئے ہیں۔

اُنہی پُرسہولت گھروں میں رہنے اور اپنی زمین پر کاشتکاری کرنے والے، کل کے اُنہی خانہ بدوشوں میں سے ایک میخائل خروشیف تھے۔ اگرچہ یہ اب کاشتکاری کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایک بار پھر خانہ بدوش زندگی بسر کرنے کی آرزو ہے۔ ستر سالہ میخائل کہتے ہیں۔

''اب اس لگی بندھی زندگی سے پیچھا چھڑانا ممکن نظر نہیں آتا، لیکن نمدے کا خیمہ اب بھی ہماری زندگی میں موجود

ہے۔ فصل کی کٹائی، صفائی اور ترسیل کے بعد جب ہمیں فرصت کے چند روز میسر آتے ہیں تو یہ فارغ وقت ہم اپنے اُن خیموں میں بسر کرتے ہیں۔ جن میں ہم خانہ بدوش زندگی کے دوران رہا کرتے تھے۔ ہمارے لوگ اکثر فرصت کے وقت میں گھر سے چند میل دور، کبھی کبھی تو گھر سے صرف چند گز کے فاصلے پر ہی اپنا خیمہ گاڑتے ہیں اور چند روز تک ایسے زندگی بسر کرتے ہیں کہ جیسے ہم ایک بار پھر بندھنوں سے آزاد خانہ بدوش دنیا میں ہیں۔ جو سکون ہمیں ان خیموں میں ملتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ وہ سکون ہمیں کسی پُرتعیش محل میں بھی نہیں مل سکتا۔''

''گھر کو چھوڑ کر اس خیمے میں رہنے کا کیا فائدہ ہے اب تم لوگوں کو۔'' میں نے جب یہ سوال کیا تو میخائل نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

''من کو سکون میسر ہو تو اس سے کیا فائدہ مل سکتا ہے؟ اگر من کے سکون کا فائدہ جانتے ہو تو پھر سمجھ لو ہمیں وہی ملتا ہے لیکن اگر تم من کا سکون نہیں جانتے تو پھر ہمارے ساتھ آؤ۔ ہمارے خیمے میں رہو۔ مجھے یقین ہے تم جان جاؤ گے کہ من کا سکون کیا ہوتا ہے۔''

خانہ بدوش کا یہ فلسفہ...... میخائل باتوں باتوں میں بہت گہری بات کر گیا تھا۔ ابھی میں اس کی بات کے سحر میں ہی ڈوبا ہوا تھا کہ وہ کہنے لگا۔

''یہ سب کچھ ہمارے من کے سکون کے لیے ہے مگر اس کا ایک بہت بڑا فائدہ دوسرا بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے میخائل سے سوال کیا۔ اس نے قریب بیٹھے اپنے دو سالہ پوتے کو گود میں اٹھایا اور اسے پیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ ہماری زندگی، ہماری تاریخ اور ہمارے بزرگوں کا ہزاروں سال پرانا ورثہ ہے۔ ہم اپنے آپ کو اب تک ٹھہری ہوئی زندگی کا عادی نہیں بنا پائے ہیں۔ فرض کر لو کہ ہم اگر ایک بار اس زندگی کو مکمل طور پر قبول کر لیں تو پھر یہ ہماری ثقافتی موت بن جائے گا۔'' میخائل کی سادہ گفتگو میں گہرا فلسفہ پوشیدہ تھا۔

''جانتے ہو اب جب ہم جا کر اپنے نمدوں سے بنے خیمے میں کچھ دن گزارتے ہیں تو اس سے میرے بچوں کو پتا چل جاتا ہے کہ اُن کی اصل زندگی، اُن کی اصل ثقافت تو یہی ہے۔ ہم من کے سکون کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت کو ان نسلوں تک منتقل کر رہے ہیں، جن کی زندگی کبھی نا کبھی مستقل طور پر ٹھہری ہوئی زندگی کو قبول کر لے گی۔ یہ بچے جو چند دن خیمے میں گزارتے ہیں، وہ ان کے خون میں خانہ بدوش زندگی اور نمدے کے اس خیمے کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ جب تک یہ خیمہ ہے ہماری ثقافت زندہ رہے گی۔'' میخائل نے پوتے کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے پُرکھوں کی بود وباش پر فخر اور ہزروں برس قدیم اپنی خانہ بدوش ثقافت کے تادیر زندہ رہنے کی امید صاف نظر آرہی تھی۔

قزاقستان میں تیان شن کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں آباد ایک گاؤں فروزے ہے۔ اس گاؤں کے قبرستان کی اکثر قبروں پر ایسے چھجے بنائے گئے ہیں جو نمدے سے بنے خیمے کی شکل میں ہیں۔ یہ قزاق خانہ بدوشوں کی قبریں ہیں۔ میں نے اکثر قبروں کے سرہانے بھیڑ کے بالوں کے گچھے رکھے ہوئے دیکھے تھے۔ قزاق خانہ بدوشوں کا خیال ہے کہ بھیڑ کی اون کے یہ گچھے قبر میں سوئے ان کے اپنوں کو شیطانی قوتوں کے شر سے محفوظ رکھتے ہیں اور قبر پر بنے چھجے ان پر آسمانی بلاؤں کو نازل نہیں ہونے دیتے۔

بھیڑ، خیمہ، اون اور خانہ بدوش کا ساتھ زندگی میں ہی نہیں، مرنے کے بعد بھی قائم تھا۔ روایتوں اور ثقافتوں میں گندھی خانہ بدوش زندگی کی یہ بات نہ تو سمجھنے کی محتاج ہے اور نہ ہی سمجھانے کی۔ یہ وہ احساس ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے اور آنے والے وقتوں میں شاید؟...... نہیں، احساس اور ثقافت کا یہ ورثہ آنے والی نسلوں تک بھی منتقل ہوتا رہے گا۔ اس وقت مجھے میخائل کی آنکھوں کی چمک یاد آگئی تھی۔ جب تک نمدے کا خیمہ زندہ ہے، خانہ بدوش زندہ ہیں اپنی تمام تر روایات وثقافت کے ساتھ۔

تیان شن پہاڑی سلسلے کے دوسری جانب چین کا علاقہ کاشی موجود ہے۔ اس سفر کے دوران مجھے کاشی میں ایک بوڑھی قزاق عورت ملی۔ اس کا نام...... گر جان تھا۔ وہ خانہ بدوش ہے۔ اس کی عمر اڑتالیس سال تھی اور اس کے آٹھ بچے تھے۔ اس کے شوہر کے پاس دو سو بھیڑوں کا ریوڑ تھا جو ان کی معاشی اور اون کی تمام تر گھریلو ضروریات کو بحسن وخوبی پورا کر دیتا تھا۔

گر جان سے باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو پھر باتیں ہی باتیں تھیں۔ باتوں باتوں میں وہ کہنے لگی۔

''میں نمدے سے بنے اپنے خیمے کے سوا، کہیں بھی زندگی کا تصور تک نہیں کرسکتی۔ میں جانتی ہوں کہ میرے رہنے کے لیے سب سے مناسب جگہ میرا یہ خیمہ ہے۔ اس بارے میں میرے ذہن میں کوئی ابہام نہیں۔ میں اپنے خیمے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں اتنی پُرسکون نیند سوتی ہوں کہ خراٹے بھی نہیں بھرتی۔ اگر تم مجھے کسی کمرے میں سلا دو تو پہلے تو نیند ہی نہیں آئے گی۔ اگر نیند آ بھی گئی تو میرے خراٹے کسی دوسرے کو سونے نہیں دیں گے۔ ویسے وہ میرے خراٹے نہیں میرے اندر کی بے چینی ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے گُرجان ہنس دی۔

گُرجان بہت دلچسپ عورت تھی۔ اس نے مجھے اپنے خیمے میں چلنے کی دعوت دی۔ جہاں اس نے اونٹنی کے نمکین دودھ ملی گرما گرم چائے سے میری تواضع کی۔ محبت، میل ملاپ اور دوستی، ان خانہ بدوشوں کا وصف ہے۔ تبھی تو بھیڑ سے اُن کی وہ دوستی ہوئی جو ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود اب تک نبھتی چلی آرہی ہے۔

چین میں بعض جگہوں پر آج بھی نمدے سے خیمے بنائے جاتے ہیں بالکل اُسی طرح جیسے صدیوں پہلے بنائے جاتے تھے۔

تائی چن ایک خانہ بدوش چرواہا ہے اور یہ شنگھائی صوبہ کے قصبے ین ژین میں سا کا جھیل کے کنارے زردی مائل سفید نمدے سے بنے خیمے میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا تعلق چین کے خانہ بدوشوں کے ایک نسلی گروہ سے ہے۔ اسے اپنی خانہ بدوش زندگی پر فخر ہے۔ وہ اپنی بھیڑوں اور بچوں سے ایک جیسی محبت کرتا ہے۔

''ہم خانہ بدوش چرواہوں کے لیے اپنا خاندان اور پالتو بھیڑوں کا گلہ مساوی اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہم اپنی بھیڑوں سے جتنی محبت کرتے ہیں، اتنا ہی پیار ہمیں اپنے بچوں سے ہے اور میں اپنے بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔'' جس وقت تائی چن یہ بات کہہ رہا تھا، ہم اُس کے خیمے کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی تین سالہ نواسی لی اس کے کاندھوں پر سوار تھی اور گود میں چھوٹا سا بھیڑ کا نہایت خوبصورت بچہ موجود تھا۔ سادہ لوح تائی کے لہجے کی سچائی صرف محسوس ہی نہیں بلکہ دیکھی بھی جاسکتی تھی۔

''میں تمہیں دکھا سکتا ہوں کہ ہم لوگ اپنے خیموں کے لیے کس طرح نمدہ بناتے ہیں؟'' تائی کی پیشکش سُن کر میں کِھل اٹھا۔

''واقعی؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ بس ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے؟'' تائی نے میری حیرت کو محسوس کر کے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟''

''اس وقت میرے پاس اون نہیں ہے۔ البتہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ موسم بہار شروع ہوچکا ہے۔ بس چند ہفتے اور ٹھہر جاؤ۔ بھیڑوں کے بال تراشنے کا عمل دو تین دن میں شروع ہوجائے گا۔ بس پھر اون ہی اون ہوگا۔ تب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ نمدہ کیسے بناؤں گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی میں ابھی یہیں ہوں۔ میرے لیے یہ دیکھنا بہت دلچسپ ہوگا کہ صدیوں سے تمہارے اجداد کس طرح نمدہ بناتے رہے ہیں۔'' میں نے تائی چن سے کہا۔ بہ زبانِ غیر اپنے اجداد کی تعریف سُن کر اس کے چہرے پر فخر کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

ہم دونوں بیٹھے چینی خانہ بدوش زندگی کی باتیں کر رہے تھے کہ وہ مجھ سے اجازت لے کر کچھ دیر کے لیے بھیڑوں کے باڑے میں چلا گیا۔ میں وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ سامنے روڈ پر ایک لڑکا جاتا ہوا نظر آیا۔ اس کے سر پر گٹھڑی رکھی ہوئی تھی۔ میں جان گیا کہ وہ اون ہے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں تیزی سے اپنی جگہ پر سے اٹھا اور اس لڑکے کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

''بھیڑ کا اون ہے۔'' اس کے چہرے پر حیرانی تھی۔

''بیچو گے؟''

''بیچنے ہی جارہا ہوں۔'' وہ بدستور حیران تھا۔ شاید سوچ رہا ہو کہ کیمرا کندھے پر لٹکائے، حلیے سے معقول نظر آنے والا یہ شہری بابو کیا کہہ رہا ہے۔ اون اور یہ......

''کتنے میں دو گے؟''

لڑکے نے رقم بتائی۔ میں نے بٹوا کھولا اور رقم اس کے حوالے کر کے گٹھڑی اپنے سر پر لاد لی۔ واپس پہنچا تو تائی چن بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ کیا لے آئے؟'' اس نے گٹھڑی دیکھ کر کہا۔

''اون...... میرے خیال میں تم اس سے نمدہ بنا سکتے ہو۔'' میری بات سن کر وہ ہنسنے لگا۔

میں نے گٹھڑی اتار کر اس کے سامنے رکھی تو وہ اٹھ کر اون کا معائنہ کرنے لگا۔ ''ہاں چھوٹا نمدہ بنانے کے لیے تو کافی ہے مگر یہ مری ہوئی بھیڑ کا ہے۔ کتنے میں خریدا تم نے اسے۔'' اس نے سوال کیا۔ میں نے رقم بتائی تو تائی چن کا منہ بن گیا ''بہت مہنگا لے لیا۔''

''اب یہ بات چھوڑو۔ بتاؤ اس سے نمدہ بنالو گے؟''

''کیوں نہیں۔ مگر یہ مُردار بھیڑ......''

''میرے خیال میں تو یہ اون اتنا بھی بُرا نہیں۔ یہ دیکھو، ان ریشوں میں اب بھی قدرتی چکناہٹ موجود ہے۔ ویسے بھی تمہیں تو صرف نمدہ بنانے کا طریقہ دکھانا ہے مجھے۔'' میں نے بھیڑ کے اونی ریشوں کے گچھوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اس کام کے لیے تو ٹھیک ہے۔ ویسے ہم خانہ بدوش صرف زندہ بھیڑ سے اتارے گئے بالوں سے ہی نمدہ بناتے ہیں۔ ان کا معیار اچھا ہوتا ہے۔'' تائی چن نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... یہ بتاؤ اب نمدہ کب بنا رہے ہو؟'' میں نے تائی چن سے پوچھا۔

''کل بناتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے ہم کل مل رہے ہیں۔'' میں نے اجازت لی اور اٹھ کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔ مجھے بے چینی سے آنے والے دن کا انتظار تھا۔

دوسرے دن دوپہر سے کچھ پہلے ہی میں تائی چن کے پاس پہنچ گیا۔ یہ لوگ تیار بیٹھے ہوئے تھے۔

''تمہیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ہم پرانے نمدے کی مدد سے ہی نیا نمدہ تیار کرتے ہیں۔'' تائی چن نے کام شروع کرنے سے قبل کی تیاریوں کے دوران مجھ سے کہا۔

''واقعی......'' میں نے حیرت سے کہا۔ ویسے بھی یہ حیران کن بات تھی کہ پرانا نمدہ ہی نئے نمدے کے جنم کا سبب ہے۔ اگر جین کا سفر نمدے سے نمدے میں منتقل ہوتا (جو کہ شاید حقیقت نہیں) تو پھر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہزار ہا برس کے بعد بھی دنیا میں پہلے پہل بنائے گئے نمدے آج بھی موجود ہیں نئے نمدے کی صورت میں۔

نمدے سے بنے خیمے کے باہر تائی چن کے اہلِ خانہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں اس کی بیوی ماما، بیٹی، نواسی، داماد اور ایک دوست تھا۔ یہ سب منتظر تھے کہ کب نمدے کی تیاری کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ نمدے کی تیاری میں ان سب کو تائی چن کی مدد کرنا تھی۔

میرے آنے کے بعد تائی چن خاصا مصروف ہوگیا۔ اس نے میدان میں ایک پرانا نمدہ لا کر بچھایا۔ پھر اس نے کل خریدی گئی بالوں کی گٹھڑی اس کے برابر لا کر رکھی اور ان میں سے گہرے اور زردی مائل بالوں کے گچھے علیٰحدہ علیٰحدہ کر کے رکھنا شروع کر دیے۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ان ریشوں کو الگ الگ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد تائی چن نے دو لکڑیاں اٹھا کر ریشوں کو روئی کی طرح دُھننا شروع کر دیا۔ اس عمل سے فارغ ہو کر اس نے گہرے رنگ والے بالوں کے گچھے پرانے نمدے پر پھیلانے شروع کر دیے۔ اس کے اوپر اس نے ہلکے رنگ کے بالوں کے گچھوں کی تہ جمائی۔ جب وہ یہ کام کر چکا تو اس نے ایک بڑے سے گول لٹھے کو لے کر اس سے ریشوں کو ایسے بیلنا شروع کر دیا جس طرح چوکی پر بیلن سے آٹے کے گول پیڑے کو ہموار کیا جاتا ہے۔ اس دوران اس کا داماد ایک لوٹے سے متواتر لٹھے اور اون پر پانی چھڑکتا جارہا تھا۔ یہ عمل کوئی دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران اس کے سب گھر والے کام کرنے کے ساتھ ساتھ کوئی لوک گیت بھی زور زور سے گاتے رہے۔ اس گیت سے نمدے کی تیاری کے دوران جو ماحول پیدا ہوگیا تھا، وہ مجھے بہت لطف دے رہا تھا۔

کافی دیر یونہی گزر گئی۔

اس دوران تائی چن اور اس کا دوست تھوڑے فاصلے پر ایک یاک کو ذبح کر کے اس کی کھال اُتار چکے تھے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یاک کو کیوں ذبح کیا گیا ہے؟ پھر مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔

جب وہ دونوں ذبح کیے گئے یاک کی کھال کو لے کر وہاں پہنچے، جہاں تائی چن نمدہ کو مسلسل دبا دبا کر ہموار کرنے میں مصروف تھا۔ انہوں نے کھال زمین پر بچھائی اور پرانے نمدے کو چاروں جانب سے احتیاط سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے یاک کی کھال پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ بڑا سا بیلن جس سے ریشوں کو ہموار کر رہے تھے۔ اسے انہوں نے کنارے پر رکھا اور یاک کی کھال سمیت اسے گول شکل میں تہ در تہ لپیٹنے لگے۔ جب پورا نمدہ اور کھال لپٹ گئے تو انہوں نے اسے بھیڑ کے ریشوں سے بنی رسیوں کی مدد سے اچھی طرح باندھا۔ اس کے بعد ایک گھوڑا لایا گیا۔ جس پر ننگی زین کے دونوں جانب دو لمبے لمبے رسے لٹک رہے تھے۔ لکڑی کا بیلن لپیٹے ہوئے ریشوں کے بیچ میں رکھا گیا تھا، اس کے دونوں سرے باہر تھے۔ ان سروں سے زین کے دونوں جانب لٹکے رسوں کو باندھ کر گھوڑے کو دائرے میں دوڑانے لگے۔ یوں یاک کی کھال میدان میں گھوڑے کے پیچھے ایسے گھوم رہی تھی جیسے روڈ رولر کا اگلا گول حصہ زیر تعمیر سڑک پر پھرا کرتا ہے۔

گھنٹے بھر تک گھڑ سوار گھوڑے کو بڑے سے میدان میں گول گول گھماتا رہا۔ اس کے بعد یاک کی کھال پر بندھی رسی کی گرہیں کھولی گئیں اور اسے احتیاط سے زمین پر بچھا کر کھولا گیا۔

تائی چن نے بھیڑ کے اونی ریشوں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس پر مزید پانی چھڑکا گیا اور جس طرح پہلے تہ کر کے گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا، ایک بار پھر اُسی طرح باندھ دیا گیا۔ گھڑ سوار ایک بار پھر میدان میں اسے روڈ رولر کی طرح اپنے پیچھے گھماتا رہا۔ دو گھنٹوں کے بعد، اسے دوبارہ کھولا گیا۔ تائی چن نے معائنے کے بعد اس پر مزید

پانی چھڑکا اور پھر تہ کر کے تیسری مرتبہ گھوڑے کے پیچھے کوئی گھنٹا بھر گھمایا گیا۔

اتنی دیر میں سورج بھی مغرب میں چھپنے لگا۔ موسم بھی خاصا سرد ہونے لگا تھا۔ تب تائی چن نے اعلان کیا۔

"یہ کام ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ اس لیے ہم کل دوبارہ اسے شروع کریں گے۔"

دوسرے دن میں صبح کے آٹھ بجے کے قریب تائی چن کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔

"اوہ...... اچھا کیا جو تم جلدی آ گئے۔ تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" وہ خیمے کے باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کا گھڑ سوار دوست بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

اس کے بعد ایک بار پھر وہی سلسلہ شروع ہوا۔ تائی چن کا دوست اس تہ در تہ کھال کو ایک بار پھر کافی دیر تک میدان میں دائرے کی شکل میں گھماتا رہا۔

نمدہ بنانے کا یہ طریقہ بہت ہی پرانا ہے۔ تھوڑی سی شکل بدل کر یہ طریقہ آج بھی ٹیکسٹائل کی صنعت میں مروج ہے۔ میں نے بہت عرصے پہلے پومپائی میں دیوار پر بنی ایک قدیم پینٹنگ دیکھی تھی۔ جس میں نمدہ بنانے کا یہ طریقہ تصویر میں ڈھالا گیا تھا۔

جس طرح سے تائی چن نمدہ بنانے کا عمل کر رہا تھا، ویسا ہی برطانیہ میں ٹینس بال کی اوپری تہ بنانے کا... طریقہ تھا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس عمل سے ٹینس بال کی اوپری سطح ہموار، مضبوط اور لچکدار ہو جاتی ہے۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ وہاں کارخانوں میں یہ عمل مشینوں کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے اور یہاں ہاتھوں سے اسی انداز میں کام لیا جا رہا تھا۔

دوپہر کے قریب تائی چن نے اس عمل کو روک دیا۔

"میرے خیال میں اب نمدہ تیار ہو چکا ہے۔" اس نے یاک کی کھال پر بندھی رسیوں کو کھولتے ہوئے کہا۔

جب تہ در تہ یاک کی کھال کو کھولا گیا تو اندر سے نہایت ہموار، زرد مائل نمدہ برآمد ہوا۔ "بس اب ایک دو دن اسے خشک ہونے میں لگیں گے۔ اس کے بعد یہ قابلِ استعمال ہوگا۔"

وہ اونی ریشے جو دو دن پہلے مُردہ بھیڑ کی کھال پر موجود تھے۔ اب نمدے کی صورت ہمارے سامنے بچھے ہوئے تھا۔ میں نے پرانے نمدے پر بچھے اس نئے نمدے کی نچلی تہ کو تھوڑا سا اٹھا کر دیکھا۔ وہ ہلکی سرمئی رنگ کی تھی۔

"واہ واہ...... بہت خوب کام کیا ہے تم نے۔" میں نے توصیفی نظروں سے تائی چن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنے بزرگوں کی میراث کو سنبھال رکھا ہے۔" تائی چن نے سینے پر دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

یہ تو ہوئی بھیڑ کے خالص اونی ریشوں سے نمدہ بنانے کی بات لیکن ان ریشوں سے وہ نرم اور کم وزن اون کس طرح بنایا گیا جس سے گرم کپڑے بنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس سوال کا جواب دینا تو بہت مشکل ہے کہ انسان نے پہلی بار کب ان ریشوں سے اون کاتنا شروع کیا۔ البتہ ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ سلسلہ بہت زیادہ نیا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صدیوں، ہزاروں سال پہلے کسی شخص کو یہ خیال موسمِ بہار میں بھیڑ کے اونی ریشوں کو جھڑتا ہوا دیکھ کر آیا ہو کہ اس کے ذریعے تو اونی دھاگا بنایا جا سکتا ہے۔ جس سے ایسے لباس تیار کیے جا سکتے ہیں جو موسمِ سرما میں انسانی جسم کو گرم رکھنے کے کام آ سکیں۔

یہ ایک خیال ہے جسے ماہرین پیش کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو۔ ہاں ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اون کو بٹ کر، اور چرخے پر کات کر اس سے اونی ملبوسات صدیوں سے بنائے جا رہے ہیں۔

آج بھی وسطی چین میں شنگھائی جھیل کے کنارے سڑک کے کنارے بیٹھے خانہ بدوشوں سے لے کر، لداخ کے ضلع لیہہ تک...... اس پورے خطّے میں مرد و عورت جابجا چرخے پر بھیڑ کے اونی ریشوں کو کات کر خالص اون بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس سے بعد میں شال اور دیگر گرم ملبوسات تیار ہوتے ہیں۔

ماہرینِ بشریات کا کہنا ہے کہ چرخہ کات کر سوت بنانے کا رواج ہجری دور میں شروع ہوا اور اب تک یہ جاری و ساری ہے۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ چرخہ جتنا قدیم ہے۔ لگ بھگ اُتنا ہی قدیم بھیڑ کے ریشوں کو کات کر اون اور اس سے گرم لباس بنانے کا رواج بھی ہے۔

قدیم مخطوطات میں اتنا ذکر کسی اور جانور کا نہیں ملتا جتنا کہ بھیڑوں کا ہے۔ دنیا بھر میں ایسے درجنوں قدیم مخطوطات موجود ہیں جن کی قدامت قبل از مسیح دور سے جا ملتی ہے۔ ان مخطوطات میں کم و بیش تین سو حوالے ملتے ہیں جن میں بھیڑوں اور ان کے چرواہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ الہامی کتاب بائبل میں بھی بھیڑوں اور چرواہوں کا ذکر وضاحت سے موجود ہے۔

یونانی اور یورپی ادب میں قلوپطرہ کے فرار کا بھی تذکرہ

ملتا ہے۔ جس کے مطابق سیزر سے ملنے کے لیے ملکہ کو محل سے باہر نکلنا تھا لیکن سب کی نظروں سے چھپ کر باہر جانے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ پھر یوں ہوا کہ قلوپطرہ کے حکم پر غلاموں نے اسے قالین میں لپیٹا اور کندھوں پر اٹھا کر محل سے باہر لے گئے۔

واقعہ سچ ہے تو ملکہ کے ساتھ قالین کا تذکرہ اون کے نفاست سے استعمال کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ یقیناً شاہی محل میں جو قالین موجود ہوں گے۔ اُن کی نفاست، دلکشی اور انہیں بُننے والوں کی کاریگری پر تو کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتی ہیں۔ اس لیے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ قبل از مسیح عہد میں اون سے صرف گرم لباس اور سر ڈھانپنے کے لیے خانہ بدوشوں کے خیمے ہی نہیں بنتے تھے بلکہ ان سے قالینوں کی بُنائی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔

بھیڑ کی اون سے نفاست سے بُنے عمدہ قالین اگر ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی سلطنتِ یونان کے شہنشاہ کے محل کی زینت بن رہے تھے تو بھدے ہی سہی مگر ہاتھوں سے تیار کردہ بھیڑ کے اونی ریشوں کے نمدے خانہ بدوشوں کے لیے بستر اور فرش کا کام دے رہے تھے۔

اون قدرتی طور پر انحطاط پذیر حیاتیاتی عنصر ہے۔ رفتہ رفتہ ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ یہ مکمل طور پر گل سڑ کر مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے۔ صرف اون ہی نہیں، دیگر حیاتیاتی عناصر مثلاً چمڑا، سُوت اور لکڑی وغیرہ بھی انہی خصوصیات کی حامل ہیں۔ اسی لیے دنیا بھر کے عجائب خانوں میں پتھر اور دھاتی عناصر پر مشتمل آثارِ قدیمہ کی تو بھرمار ہے لیکن حیاتیاتی عناصر پر مشتمل بہت کم ایسی چیزیں موجود ہیں جو عجائب خانوں کی زینت بنی ہیں۔

دنیا بھر میں قدیم تہذیب سے تعلق رکھنے والی... اونی مصنوعات کی جو شے اب تک باقی ہے، وہ چار سو سال قبل از مسیح عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ اونی ریشوں سے بُنا ہوا وہ قالین ہے جو پیزری ریک کے ایک ذخیرۂ آثار میں موجود ہے۔ یہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو جنوبی سائبیریا کے سرد ترین اور برفیلے پہاڑی سلسلے کے ایک مقبرے میں دفن ممیائی گئی لاشوں کے ساتھ ملا تھا۔

کم و بیش ڈھائی ہزار برس قدیم اون سے بُنا ہوا یہ قالین اس بات کا غماز ہے کہ اُس دور میں اونی ریشوں کو دھاگے کی طرح کات کر اس سے قالین اور گرم کپڑے بنانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اسی طرح قالین کے ساتھ ساتھ جن لاشوں کی باقیات ملی ہیں، ان کے ساتھ بھیڑ کے بالوں کے تکیے بھی رکھے گئے تھے۔ یہ آثار پیزری کے عجائب خانہ کی زینت ہیں۔

پیزری کے عجائب گھر میں جو حیاتیاتی شے سب سے زیادہ بہتر حالت میں موجود ہے وہ اون سے بُنا ہوا یہی قالین ہے۔ اس قالین پر دلکش رنگوں میں کشیدہ ہوا قدرتی ماحول کا منظر نامہ سحر انگیز ہے۔ مستطیل قالین کے بیچوں بیچ کنول کے بڑے پھول ہیں اور کناروں پر ہرن، گھوڑے، درخت اور دیگر پھول بوٹے ماہرانہ انداز میں ابھارے گئے ہیں۔ گھوڑوں پر جس انداز میں گھڑ سوار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ان سوداگروں کی عکاسی کرتے ہیں، جو دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کرتے تھے اور قافلوں کی صورت سفر کیا کرتے تھے۔ قالین کو دیکھ کر یقین ہو جاتا کہ کئی صدیوں پہلے قالین باف نہایت مشاقی سے اپنی مصورانہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے مناظرِ فطرت کو قالین پر منتقل کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔

روس میں موجود پیزری ریک کے عجائب خانہ میں شاندار ماضی کے آثاروں کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد میں لڈمیلا برگووا کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ لڈمیلا پیزری ریک کے عجائب خانہ کی مہتمم ہیں۔ اس گول میز کے گرد رکھی ہوئی ایک اور کرسی پر ڈاکٹر اناطولے ایوانو بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کا تعلق لینن گراڈ میں قائم مشرقی معاشرت سے متعلق ایک تحقیقی ادارے سے ہے۔ جہاں وہ خانقاہوں اور ان کے قدیم معاشرتی کردار کے بارے میں تحقیق کا کام سر انجام دے رہی ہیں۔ اُس وقت وہ میرے اور لڈمیلا کے درمیان مترجم کا کام کر رہی تھیں۔

میں نے دلکش بیل بوٹوں سے مزین قالین کا بہت اچھی طرح معائنہ کیا تھا۔ صرف اس کی بناوٹ ہی نہیں، بلکہ اس میں استعمال شدہ خام مال کا بھی تنقیدی نگاہوں سے گہرا جائزہ لیا تھا۔

"میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ مقامی طور پر تیار کردہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قالین ایران میں بُنا گیا اور پھر وہاں وہ سوداگروں کے ہاتھوں پہنچا ہو۔ جسے کسی مالدار شخص نے خرید لیا ہوگا۔ ویسے بھی جس قبر سے یہ برآمد ہوا ہے، وہاں ممیائی گئی لاشیں دفن تھیں۔ ان علاقوں میں صرف سرداروں، راجوں اور شہزادوں کی ہی لاشیں ممیائی جاتی تھیں۔ اس لیے یقینی طور پر قالین بہت مہنگا ہوگا۔ جسے امیر آدمی ہی خرید سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اتنی قیمتی چیز لاش کے ساتھ دفن کرنے کا مقصد مر جانے والے کو ایک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

طرح سے خراجِ تحسین پیش کرنا بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے چارسو سال قبل از مسیح دور سے تعلق رکھنے والے اب تک دریافت شدہ دنیا کے سب سے قیمتی اونی آثارِ قدیمہ کے بارے میں اپنے خیالات تفصیل سے بیان کیے۔

ڈاکٹر اناطولے ایوانو کو بھی میری بات سے اتفاق تھا اور خود لڈمیلا کا سر بھی اثبات میں ہل رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس قالین پر جو نمونے ابھارے گئے ہیں وہ فارس اور اسیری تہذیب کے زیادہ قریب ہیں۔ جنوبی سائبیریا کے جس علاقے سے یہ قالین دریافت ہوا ہے، اُس زمانے میں وہاں اس طرح کی ہنرمندی موجود نہیں تھی۔'' لڈمیلا گزشتہ بیس برس سے مشرقی معاشرت کی درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ تجربہ اور اعتماد ان کے لہجے سے واضح تھا۔

برطانیہ سے تعلق رکھنے والے جان تھامپسن خانہ بدوش تہذیبوں کی تاریخ کے ماہر ہیں۔ وہ بھی اس قالین کو دیکھ چکے تھے۔ ان کا کہنا ہے۔''اس قالین کی بُنائی میں گیارہ لاکھ، پچیس ہزار گرہیں لگائی گئی ہیں اور یہ خانہ بدوشوں کے ہاتھوں نہایت نفاست سے تیار کردہ معلوم ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جن خانہ بدوشوں نے اسے تیار کیا تھا وہ ملکِ فارس سے تعلق رکھتے ہوں یا پھر اسیری تہذیب کی پیداوار ہوں۔''

اون کی تاریخ کے اس سب سے نادر آثار کی حقیقت کیا ہے؟ اب یہ جانے بنانے والا یا اُس کا رب۔ البتہ ایک حقیقت طے ہے۔ سائنسی تجزیے نے قالین کے مواد سے اس کے عہد کا درست ترین تعین کردیا ہے اور اس بارے میں کوئی دورائے موجود نہیں کہ یہ نفیس قالین حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے چارسو سال پہلے بُنا گیا تھا۔

بعد از مسیح دور کے تاریخی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں رومیوں نے ایک کارخانہ قائم کیا تھا جہاں پر تجارتی مقاصد کے تحت اونی کمبل اور لبادے بڑے پیمانے پر تیار کی جاتے تھے جنھیں دوسرے ممالک سے آئے ہوئے تاجر مالِ تجارت کے طور پر خرید کر اپنے اپنے ملکوں میں لے جاتے تھے۔ یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ تیسری صدی عیسوی تک بھیڑ کے خالص اونی ریشوں کو کات کر اس سے گرم لباس اور سردیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کمبل کی تیاری باقاعدہ صنعتی بنیادوں پر شروع ہوچکی تھی۔ بڑے پیمانے پر اس کام کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھیڑوں سے حاصل کردہ ریشوں کو بہت بڑے پیمانے پر بُنائی کے لیے دھاگوں میں تبدیل کرنے کے فن میں مہارت حاصل کرچکے تھے۔ یہی وہ دور ہے جب اون کو اس وقت کی دنیا میں بطور تجارتی جنس کے فروغ ملنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ فروغ جس میں آج تک کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ شاید اون، دنیا کی وہ قدرتی جنس ہے۔ جس نے تاریخ کے معلوم دور سے اب تک ہر دور میں ترقی کی۔ ہر دور میں اس کی طلب بڑھی ہے۔ اونی لباس، جو دنیا کے سرد ممالک میں فیشن نہیں بلکہ ضرورت ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے ابتدائی دور میں انگلستان میں بھیڑوں کا استعمال صرف گوشت کے حصول اور کھیتوں کے لیے کھاد کی فراہمی تک محدود تھا۔

تیرھویں صدی عیسوی تک انگلستان میں اون بہت مشہور ہوچکا تھا۔ یہ اون، راہبوں اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے دوردراز ملکوں کا سفر طے کرنے والے مبلغین کے ذریعے تک یہاں پہنچا۔ اُس دور میں اون کی تجارت سے اُن لوگوں نے بڑے پیمانے پر پیسہ کمایا۔ یہ سلسلہ بہت عرصے تک چلا۔ مالدار لوگ، عام تاجروں سے کم قیمت کے باوجود، راہبوں سے تین گنا زائد قیمت پر بھی اون خرید لیتے تھے۔ جس کا سبب صرف عمدہ معیار کا حصول تھا۔

اس دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ ان سے معاہدہ کرلیتے تھے کہ وہ اگلے سال اون انہیں فروخت کریں گے۔ یوں مستقبل کے یہ سودے ایک سے دس سال تک پر محیط ہوچکے تھے۔ کئی مبلغین نے تو بھیڑوں کے گلّہ بانوں سے معاہدے کرلیے تھے کہ موسمِ بہار میں بھیڑوں کے بالوں کی کٹائی کرکے یہ ریشے وہ صرف انہی کو فروخت کریں گے۔ جس کے لیے پیشگی رقوم ادا کی جاتی تھیں۔

اون کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ انگلستان کے سرد ترین موسم میں لوگوں کو اس سے عمدہ چیز ابھی تک میسر نہیں آئی تھی، جو ان کے جسموں کو سرد ترین ٹھنڈ سے بچانے میں اتنی زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہو۔

تیسری صلیبی جنگ سے واپسی پر جب 1192ء میں بادشاہ رچرڈ شیر دل کو آسٹریا میں گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا گیا تو اس کی رہائی کے عوض اعلیٰ معیار کا اون بہت بڑی مقدار میں بطور تاوان طلب کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس تاوان کا کچھ حصہ ادا تو کیا گیا تاہم گرفتار کنندگان کو ان کے مطالبے کے مطابق اون نہیں دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ صدیوں پہلے یورپ کی عیسائی دنیا میں جب اون کا استعمال شروع ہوا اور مبلغین اس کی تجارت میں ملوث ہوئے تو رواج پڑا کہ عام لوگ جب پہلی بار بھیڑ کے اونی ریشے اُتارتے تھے تو وہ اسے پادریوں کو تحفے میں دے

دیتے تھے، تاکہ ان پر خیر کا سایہ رہے۔

1400ء تک اون کی خرید کے لیے مستقبل کے سودوں نے امیر طبقے میں دولت کی ریل پیل کردی تھی۔ روم کے طاقتور عیسائی مبلغین نے اون کی دولت سے فلورنس میں ایک بینک قائم کیا۔ جس میں اون سے کمائی گئی دولت کو اون کی مزید تجارت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ روم ہی نہیں، بلکہ باہر کے دیگر ممالک سے بھی لوگ اس بینک کے ذریعے اون کی خریداری اور مستقبل کے سودوں کے حوالے سے ایڈوانس رقم کی ادائیگی وغیرہ کی لین دین کیا کرتے تھے۔ اس بینک کے سرپرستوں میں اس وقت کے بڑے بڑے عیسائی مبلغین اور معاشرے کی سرکردہ سماجی شخصیات شامل تھیں۔

آج دنیا بھر میں لیجنڈ تسلیم کی جانے والی اس وقت کے روم کے فنونِ لطیفہ کی اہم ترین شخصیات دانتے، لیونارڈو ڈاونچی اور مائیکل انجلو جیسی شخصیات نے اون کی تجارت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اشرافیہ کی اس تجارتی انجمن میں شامل ہوکر مالی فوائد حاصل کیے۔ یہ شخصیات اس مقصد کے لیے قائم کیے گئے بینک کے سرپرستوں میں بھی شامل تھیں۔

1000ء سے 1453ء تک کا زمانہ تاریخ میں وسطی دور کہلاتا ہے۔ وسطی دور کے تقریباً نصف بعد، اون انگلستان کی برآمدات کا سب سے بڑا حصہ بن گیا۔ یورپی ممالک اون کے حصول کے لیے انگلستان پر انحصار کرنے لگے تھے۔

اون کی پیداوار سے لے کر مقامی سطح پر اس کی تجارت اور برآمدات تک، مختلف مراحل پر کئی اقسام کے محصولات نافذ کیے گئے جس سے شاہی خزانے کو بھاری مقدار میں رقم حاصل ہونے لگی اور شاہی خزانہ دولت سے بھرنے لگا۔ خود شاہِ انگلستان کے اُمرا، وزرا اور درباری بھی اس آمدنی سے فیضیاب ہونے لگے تھے۔ انہی کی ہدایت پر علاقوں کو بھیڑوں کی پیداوار کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا۔ چراہ گاہیں مختص کی جاتی تھیں اور جن علاقوں کے لوگوں کی درخواست پر انہیں بھیڑوں کی پیداوار کے لیے 'خصوصی علاقہ' قرار دیا جاتا تھا ان سے اُمرا، وزرا اور درباریوں کو بھاری آمدنی بطور رشوت مل جاتی تھی۔ جیسے اون نہیں، گویا دولت کا بہتا دریا تھا۔ جس کا جتنا بس چلتا تھا وہ اتنی ہی دولت بہتے دریا سے نکال لیتا تھا۔ یوں اشرافیہ طبقے کو دولت کے حصول کا ایک ایسا رستہ میسر آگیا جو ان کی اگلی کئی نسلوں تک کو دولت کی فکر سے آزاد کرسکتا تھا۔

یہی نہیں، اون کی تجارت نے روزمرہ زندگی پر بھی اپنے اثرات دکھانے شروع کردیے تھے۔ چرواہوں، گلّہ بانوں اور بھیڑوں کے تاجر تک خوشحال ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بھیڑ کو انگلستانی معاشرے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اسی دور میں وہ مشہورِ زمانہ نظم لکھی گئی جو آج بھی بچوں کو نرسری میں پڑھائی جاتی ہے اور بچے بھی ذوق وشوق سے لہک لہک کر اسے پڑھتے ہیں...... بابا بلیک شیپ۔

اون کی تجارت میں سنجیدگی ظاہر کرنے اور اپنے اُمرا، وزرا اور مصاحبین کی عزت وتوقیر میں اضافے کے لیے انگلستانی شاہ ایڈورڈ سوئم نے اپنے ایوان کی نشستوں میں نرم و گرم اون بھروایا تھا۔ شاہ کی طرف سے یہ اقدام اپنے اُمرا کو عزت بخشنے کے مترادف تھا، تاہم بعد کے برسوں میں یہ روایت تبدیل ہوگئی۔ اس کی جگہ نشستوں کے غلاف کے اندر بال بھر دیے گئے، کیونکہ اون بہت قیمتی دولت تھا۔ 1938ء میں ایک بار پھر ان نشستوں کے غلافوں کے اندر بالوں کی جگہ، بھیڑوں کے خالص اونی ریشوں کو بھرا گیا۔ آج بھی لارڈ چانسلر جس شاہی نشست پر براجمان ہوکر ارکان کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے۔ اس کے غلاف پوش میں اونی ریشے بھرے ہوئے ہیں۔

اونی صنعت کی مقبولیت کا یہ دور صنعتی انقلاب کا ابتدائی دور تھا۔ اب تک اون کی صنعت پر مذہبی اور اشرافیہ طبقے کی اجارہ داری تھی لیکن پھر وہ وقت آیا جب صنعتی دور کی شروعات کے ساتھ ہی کئی مالدار تاجروں کو خیال سوجھا کہ شہروں میں تو اون کی آزادانہ تجارت پر پابندی عائد ہے تو کیوں نا اُن علاقوں تک رسائی حاصل کی جائے جہاں سے یہ خام مال فراہم کیا جاتا ہے۔

آہستہ آہستہ بھیڑ پروری کے... علاقوں تک دولتمند تاجروں نے رسائی حاصل کی تاکہ وہ بنیادی سطح پر ہی خام مال خرید سکیں۔ اس طرح مالدار تاجروں نے گاؤں اور قصبوں کی سطح پر اون خرید کر مقامی جولاہوں کو فی عدد کے حساب سے اونی لباس کی تیاری کا کام دینا شروع کردیا تاکہ وہ خام مال کے بجائے تیار شدہ مال برآمد کرکے زیادہ منافع کما سکیں۔ اس اقدام سے گاؤں اور قصبوں کی سطح پر اون سے مالی خوشحالی کے ثمرات اور زیادہ تیزی سے پھیلنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ کام گھریلو صنعت کے طور پر وسعت پانے لگا۔ اگرچہ اون کے گھریلو صنعت پر پھلنے پھولنے سے گاؤں اور قصبوں کی سطح پر مالی خوشحالی کے ثمرات نظر آنے لگے تھے تاہم اب بھی سپلائر اور تاجر کے مقابلے میں، اون پیدا کرنے والے غریب دیہاتی اور جولاہوں کو بہت کم مالی فوائد حاصل ہورہے تھے۔ اون کی خریداری سے لے کر لباس کی تیاری تک کا زیادہ تر

کام اُدھار پر چل رہا تھا۔ البتہ سپلائر کا کمیشن اور مال کی فروخت نقد کی بنیاد پر ہی کی جاتی تھی۔

سولہویں صدی تک انگلستان میں اون سے منسلک تجارت بڑے پیمانے پر پروان چڑھی۔ اس دوران اس شعبے کے مختلف مراحل میں بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع پیدا ہوئے۔ یوں اون نے انگلستان کی معیشت کو سب سے زیادہ سہارا بخشنا شروع کیا۔ اون کی بدولت یورپ میں انگلستانی معیشت مستحکم ترین معیشت سمجھی جانے لگی تھی۔

اٹھارویں صدی تک انگلستان میں تقریباً تین سو ایسے قوانین موجود تھے جو اون کے بارے میں تھے۔ ان قوانین کا مقصد اون کی پیداواری علاقوں سے لے کر برآمدات تک، ہر لحاظ سے اونی صنعت کو قانونی سہارا فراہم کرنے کے علاوہ اس معیشت کو مستحکم کرنے والے تمام اقدامات کو بھی تحفظ فراہم کرنا تھا۔

اونی ملبوسات کی انگلستان میں مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ 1571ء میں انگلستان کا ہر شخص اون سے بنی ٹوپی اوڑھتا تھا۔

1662ء تک انگلستان میں اونی ملبوسات سوگ اور تدفین کے لباس کا لازم جزو بن چکے تھے۔

1667ء میں شاہ انگلستان کی انتظامیہ کی طرف سے ایک حکم نامہ جاری ہوا جس کے مطابق مرنے والے ہر کس و ناکس کی تدفین اونی لباس میں کرنا لازم تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر بھیڑوں کا کوئی چرواہا انتقال کر جاتا تھا تو تابوت میں اس کے سینے پر مٹھی بھر خالص اونی ریشوں کا ایک گچھا رکھا جاتا تھا۔ اس بات کا مقصد یہ عذر پیش کرنا ہوتا تھا کہ چرواہا اتوار کو چرچ کیوں نہیں جاتا تھا۔ آخر بھیڑوں کا پیٹ بھرنے کے لیے چرواہے کو روزانہ ہی انہیں لے کر چراگاہ تک جانا جو ہوتا تھا۔

جن دنوں انگلستان میں اونی صنعت فروغ پا رہی تھی، انہی دنوں اون کا ایک اور استعمال کیا گیا۔

اُس زمانے میں آئرلینڈ کے زیادہ تر باشندے ماہی گیری سے وابستہ تھے۔ اکثر کھلے سمندروں میں انہیں حادثہ پیش آ جاتا تھا۔ حادثے کے بعد جن بدقسمت ماہی گیروں کی لاشیں مل جاتی تھیں، وہ کئی روز تک پانی میں رہنے کے سبب اکثر ناقابلِ شناخت ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ اس دور میں آئرش ماہی گیروں کے لیے ایسے مخصوص سوئیٹر بنائے گئے۔ جن پر بنے نمونے ہی ایک شناختی نشان تھے۔ ماہی گیری کرنے والے تمام ماہی گیروں کے ہر گاؤں کے لیے ایک مخصوص نمونہ مختص کیا گیا۔ اون پانی میں رہ کر خراب نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے جب کسی بدقسمت کشتی کو حادثہ پیش آ جاتا تو لاش ملنے کے بعد ماہی گیر کے پہنے ہوئے سوئیٹر کے مخصوص نمونے سے پتا چلا لیا جاتا تھا کہ اس کا تعلق کس علاقے سے ہے۔ جس کی بنیاد پر لاش ناقابلِ شناخت ہونے کے باوجود اس کے ورثا کی تلاش کر لی جاتی تھی۔

صرف یہی نہیں، ماہی گیروں کے لیے مخصوص یہ خاص نمونوں والے سوئیٹر ان کے لیے ریاستی محافظوں سے تحفظ کا بھی ذریعہ تھے۔ ساحلی محافظ انہی سوئیٹر کی بنیاد پر یہ جان جاتے تھے کہ یہ ماہی گیر ہے یا کوئی اور۔

کپڑا بُننے کے شعبے میں صنعتی انقلاب کے بعد مشینوں کو زیادہ تیزی سے قبول کر لیا گیا لیکن اونی لباس کی تیاری اب تک جولاہے کے ہاتھوں اور کھڈی کی محتاج تھی۔ اس روایتی صنعت نے مشینوں کے استعمال کو ابتدا میں خوش دلی اور جوش و خروش سے قبول کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا۔ اون کی صنعت سے وابستہ لوگوں کا کہنا تھا کہ اون، سُوت کے مقابلے میں نہایت نازک، نفیس اور قیمتی ہے۔ اس لیے اسے مشینوں کے بجائے صرف ہاتھوں سے ہی استعمال کیا جائے۔ تاکہ مصنوعات کی نفاست برقرار رہ سکے۔

اون کی صنعت تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی اور انگلستان میں اس کی مصنوعات کی تیاری کے کارخانوں کے قیام کا سلسلہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ایسے میں اون کی صنعت کب تک جولاہے اور کھڈی کی محتاج رہتی۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں آہستہ آہستہ اونی کپڑوں اور سوئیٹر وغیرہ کی بُنائی کا سلسلہ مشینوں پر منتقل ہونے لگا۔ مشینوں کی تیز رفتاری نے جہاں اونی کپڑے کی تیاری کو تیز تر کر دیا، وہیں حاصل شدہ پیداوار بھی پہلے کے مقابلے میں کچھ کم قیمت ہونے کے سبب تیزی سے کم آمدنی والے طبقوں میں بھی فروغ پانے لگی۔ آہستہ آہستہ اونی صنعت کے پھیلاؤ نے قوانین میں بھی اضافہ کیا اور 1830ء کی دہائی میں انگلستان نے مشینی دور کے مطابق نئے قوانین متعارف کروائے۔ ان میں سے ایک قانون کے تحت بچوں سے مشقت کا خاتمہ کیا گیا اور دس سے پندرہ سال کی عمر والے لڑکوں پر اون، بشمول کپڑا بُننے کے کارخانوں میں مزدوری کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔

قدیم جزیرہ نما آئبیریا (جس میں اب اسپین اور پُرتگال شامل ہیں) صدیوں تک اپنی بھیڑوں کے نفیس اون پر دولت کماتے رہے۔ یہاں پائی جانے والی بھیڑیں، جنہیں merino کے نام سے آج دنیا بھر میں جانا جاتا ہے، کے

بال نہایت لمبے، نرم اور نفیس ہوتے تھے۔ جن کی وجہ سے یورپ کے مختلف ممالک میں آئبیریا کی بھیڑوں سے حاصل شدہ اون کی نہ صرف بہت مانگ تھی بلکہ اس کی قیمت بھی بھیڑوں کی دیگر اقسام کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھی۔ یہ اون اپنے معیار میں کشمیری پشمینے جیسا تھا۔ اس سے بُنا ہوا کپڑا وزن میں نہایت ہلکا اور دیکھنے میں بہت پتلا ہوتا تھا لیکن جسم کو دیگر اونی ملبوسات کے مقابلے میں سب سے زیادہ حرارت فراہم کرتا تھا۔ ان خوبیوں کی وجہ سے یورپ کی اشرافیہ میں اس کی طلب بہت زیادہ تھی۔

آسٹریلیا کی معیشت کا آغاز اون سے ہوا اور آج بھی اس کا بڑا انحصار اون پر ہی ہے۔ 1788ء میں انگلستان سے خطرناک جرائم میں ملوث مجرموں کو ایک بحری جہاز پر سوار کروا کر آسٹریلیا کے غیر آباد ساحلوں پر بھیج دیا گیا تھا تاکہ ملک کو ان مجرموں کے وجود سے پاک کیا جائے۔ بھیڑیں ان کے ساتھ ہی آسٹریلیا پہنچی تھیں۔ ان جرائم پیشہ افراد کے ساتھ جو بھیڑیں انگلستان سے بحری جہازوں پر سوار کروائی گئیں، ان میں چکی دار دنبوں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔ راستے میں دیس بدر کیے جانے والے مجرموں نے ان بھیڑوں اور دنبوں کی بہت بڑی تعداد کو چٹ کر لیا لیکن جو آسٹریلیا کی چراگاہوں تک پہنچیں، ان کی نسل خوب پھلی پھولی۔

صدیوں پہلے اون کے معاملے پر آسٹریلیا اور جرمنوں میں جنگِ تجارت بھی ہو چکی تھی۔ معاملہ یہ تھا کہ جرمنی میں بھیڑوں کی جو نسلیں تھیں، وہ نہایت کم مقدار میں اون پیدا کرتی تھیں اور ان کا معیار بھی زیادہ بہتر نہیں تھا۔ آسٹریلیا والے اپنی واحد انمول جنس اون کی برآمد کیا کرتے تھے اور جرمنی ان کا بڑا خریدار تھا۔ آسٹریلیا اون کی قیمت پر نظریں مرکوز رکھتا تھا اور جرمن چاہتے تھے کہ وہ مناسب قیمت پر انہیں اعلیٰ معیار کا اون فروخت کریں۔ اس معاملے نے اتنا طول کھینچا کہ دونوں ممالک جنگ کے میدان میں کود گئے۔ آخر کافی ردوقدح کے بعد امن ہوا اور آسٹریلیا ایک بار پھر جرمنوں کو اون فروخت کرنے لگا۔ 1845ء تک جرمنی اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے آسٹریلیا سے ہی اون برآمد کیا کرتا تھا۔

انیسویں صدی میں اون کی تجارت سے آسٹریلیا کی شہرت اتنی بڑھی کہ اون برآمد کرنے والے ممالک کے تاجر آسٹریلیا پہنچ کر اون خریدنے لگے۔ جنہیں بعد ازاں بحری جہازوں پر لاد کر وہ اپنے اپنے ممالک کو بھیج دیتے۔

آج اکیسویں صدی میں بھی آسٹریلیا کی معیشت کا انحصار اون پر ہی ہے۔ اس کی وسیع و عریض چراگاہیں گلہ بانوں کے لیے قدرتی تحفہ ہیں۔ اسی لیے صدیوں بعد بھی اون آسٹریلوی معیشت کو سہارا دیے ہوئے ہے۔ یہی نہیں لگ بھگ دو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی یہاں پر اون کی نیلامی ہوتی ہے۔ سڈنی میں اون کی گانٹھوں کو ذخیرہ کرنے کے لیے 54 ایکڑ پر مشتمل گودام بنایا گیا ہے۔ یہ گودام دنیا بھر میں اون ذخیرہ کرنے والا سب سے بڑا گودام خیال کیا جاتا ہے۔ اون کی تجارت کی دیکھ بھال کے لیے آسٹریلین وولن کارپوریشن کا ادارہ قائم ہے۔

دو صدیوں سے یہاں اون کی نیلامی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ بڑے پیمانے پر جن گانٹھوں کا سودا کیا جاتا ہے، ان کے نمونے یہاں خریداروں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ جنہیں ایک ادارے کے تجزیے کے بعد معیار اور قیمت کے لحاظ سے مختلف درجہ بندیوں میں پہلے ہی سے تقسیم کیا جا چکا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بڑی تعداد میں ایسے پرانے زمانے کے تاجر بھی یہاں نیلامی میں حصہ لینے کے لیے آتے ہیں جو لیبارٹری کے ٹیسٹ کیے گئے اون کے بجائے اپنی ناک پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔ یہ خام اونی ریشوں کے گچھوں کو اپنی انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے پرکھتے ہیں، سونگھتے ہیں۔ جس کے بعد فیصلہ دیتے ہیں کہ اس اون کا معیار کیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان کا تجزیہ لیبارٹری کے ٹیسٹ کے نہایت ہی قریب ہوتا ہے۔

یورپ سے جُڑا ترکی بھی اون کی تاریخ کا اہم کردار ہے۔ اس کے خانہ بدوش چرواہوں نے یہاں بھیڑوں کی گلہ بانی کر کے اون کو پروان چڑھایا۔ ترک ہنرمندوں نے خانہ بدوشوں کے پیدا کردہ اون کو قدرتی اجزا کی مدد سے رنگا اور پھر اس سے قالین، نمدے اور اونی ملبوسات تیار کر کے یورپ کو فروخت کیے۔

1880ء میں جب یورپ میں کیمیائی طریقوں سے اون کو رنگا جا رہا تھا، اُس وقت بھی ترک اپنے اون کو درختوں، پودوں اور دیگر قدرتی اشیا کی مدد سے رنگ رہے تھے۔ قدرتی اجزا سے رنگے جانے کے باعث ان کے اون کی دلکشی رنگائی کے باوجود بھی ماند نہیں پڑتی تھی، البتہ یورپ کے کیمیائی رنگ اون کی ہئیت پر اثر انداز ہو کر اس کی قدرتی چمک کو واضح طور پر ماند کر دیا کرتے تھے۔ اس دور کے ترک قالینوں میں نارنجی اور گلابی رنگ کا استعمال زیادہ ہوا۔ قدرتی رنگوں کے استعمال کے سبب ان رنگوں کی شوخی قالین پر ایک چمکدار تہ کو اُبھار دیتی تھی۔ جس کی وجہ سے ترک قالین یورپ میں عمدہ خیال کیے جاتے

تھے اور ان کی قیمت بھی زیادہ ہوتی تھی۔

ڈاکٹر ہیرالڈ بوہمر جرمنی سے تعلق رکھنے والے سائنس کے استاد ہیں۔ وہ سرد جنگ کے زمانے میں جرمنی سے ترکی چلے آئے تھے۔ تب سے وہ مشغلے کے طور پر قدیم ترک قالینوں کا تجزیہ کررہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا۔ ”کیمیائی اجزا کے بجائے اگر ایک بار پھر قالین بافی میں قدرتی اجزا سے اون کی رنگائی کو فروغ دیا جائے تو یہ اقدام قدرتی ماحول کے لیے بہتر ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کیمیائی مادے کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ انسانی جسم کے لیے ان کے مضر اثرات بھی ختم نہیں ہوتے مگر قدرتی اجزا انسانی صحت کے لیے کسی بھی شکل میں مضر نہیں ہوتے۔“

اون نے نہ صرف معیشت اور ہمارے طرزِ زندگی پر اہم اثرات مرتب کیے ہیں بلکہ یہ انسانی صحت سے متعلق معاملات کو بھی چھو کر گزرا ہے۔ کیراٹین، اون کا ایک انتہائی اہم حیاتیاتی کیمیائی مادہ ہے۔ کیراٹین انسانی جسم کا بھی اہم کیمیائی عنصر ہے۔ یہ مادہ انسانی جسم میں ناخن اور بال کی نشوونما میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسانی جلد کو پروٹین حاصل ہوتا ہے۔ آج ہم جتنا کچھ انسانی جلد، بالوں اور ناخنوں کی نشوونما کے بارے میں جانتے ہیں۔ اس کا بہت بڑا حصہ اون پر کی گئی سائنسی تحقیق کے نتیجے میں ہمارے علم کا حصہ بنا ہے۔ ہے نا دلچسپ بات انسان اور بھیڑ کے رشتے میں پنہاں۔

اب ایک عجیب بات اور وہ یہ کہ بھیڑ کے اونی ریشوں میں موجود جس کیمیائی مادے نے انسانی جلد کے حوالے سے تحقیق میں مدد دی۔ وہی مادہ اونی کپڑوں پر لگ جانے والے کیڑوں کے سامنے اسے بے بس بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کیمیائی مادہ اکثر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قیمتی قالینوں کو بدنما اور سوراخ دار بنا دیتا ہے۔

بھیڑ کی اون میں ایک طرح کا چکنا مادہ بھی پایا جاتا ہے۔ اسے wool wax کہتے ہیں۔ کیمیائی طور پر اسے lanolin کا نام دیا گیا ہے۔ جو آرائشِ حسن کی مصنوعات اور ادویات سازی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

1974ء تک یارک شائر میں اس کیمیائی مادہ کو اون پروسیسنگ پلانٹ کے ذریعے باقاعدہ اجازت نامہ کے تحت حاصل کیا جاتا تھا۔ ایک عام بھیڑ کے جسم سے حاصل ہونے والے اون میں لگ بھگ پچاس فیصد یہ چکنا مادہ، دھول مٹی اور دیگر کچرا موجود ہوتا ہے جسے پراسیسنگ کے عمل میں صاف کیا جاتا ہے۔ یوں صفائی کے اس عمل کے بعد ایک عام بھیڑ سے حاصل شدہ اون کی مقدار صرف پچاس فیصد رہ جاتی ہے جسے اونی دھاگا بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

بھیڑ، چوبیس گھنٹے کام کرنے والا اون ساز کارخانہ ہے۔ اس کے اونی ریشوں کی روزانہ اوسط افزائش اعشاریہ 008 انچ ہے۔ بھیڑ کی کھال پر اونی ریشوں کو پیدا کرنے والے غدود میں فی مربع انچ ساٹھ ہزار اونی ریشوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

ایک اعلیٰ نسل کی بھیڑ کی کھال سے اتارے گئے اون میں فائبر کے ایک سوملین ریشے ہوتے ہیں۔ عمدہ نسل کی بھیڑ ایک سال میں پچپن سو میل طوالت پر مشتمل اونی ریشہ تیار کرتی ہے۔ اگر ایک بھیڑ کے اون پیدا کرنے کی رفتار کو اگر میل میں تبدیل کرکے حساب لگائیں تو عمدہ نسل کی ایک بھیڑ فی گھنٹا اوسطاً ایک میل لمبائی کا دو تہائی اونی ریشہ پیدا کرتی ہے۔ اگر بہترین نسل کی پانچ صحت مند بھیڑوں کے ایک سال میں پیدا کیے گئے اونی ریشوں کو ایک سرے سے، دوسرے سرے تک جوڑ کر لمبائی کی شکل دیں تو یہ اتنی ہوگی، جس سے زمین کے گرد ایک دائرہ بنایا جاسکتا ہے۔

عام طور پر ایک بھیڑ یا دنبے کے اون کا ریشہ سولہ انچ تک لمبا ہوسکتا ہے لیکن یہ اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی چراگاہیں کیسی تھیں اور اس کی صحت کیسی رہی ہے؟

اونی ریشوں کے قطر کو مائیکرون کے پیمانے میں جانچا جاتا ہے۔ ایک مائیکرون، ایک انچ کا چالیس ملین واں حصہ ہوتا ہے۔ عمدہ اونی ریشہ وہ ہوتا ہے جس کی موٹائی دس سے ستر مائیکرون کے درمیان ہوتی ہو۔

چراگاہیں، بھیڑوں کے اونی ریشوں کے معیار میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ جب بھیڑوں کے دانت چارا چبانے کے لیے جوں جوں کمزور پڑتے جاتے ہیں۔ ان کی اون پیدا کرنے کی صلاحیت ویسے ویسے کمزور پڑتی چلی جاتی ہے۔

یہ بات حقیقت ہے کہ کئی اور جانور بھی اونی ریشہ پیدا کرتے ہیں لیکن دنیا بھر میں جب بھی، کہیں پر بھی اون کا ذکر چلے گا بات بھیڑوں سے ہی شروع کی جائے گی۔

”اس وقت دنیا بھر میں بھیڑوں کی ایک ہزار سے زائد نسلیں موجود ہیں اور دنیا بھر کی چراگاہوں میں ایک ارب سے زائد بھیڑیں چرتی ہیں۔“ یہ بات ماہر حیوانات مائیکل ریڈر نے اس وقت کہی، جب میں ان سے بھیڑوں کی نسلوں کے بارے میں گفتگو کررہا تھا۔

مائیکل کے مطابق ”اس وقت انگلستان میں سب سے

زیادہ اون جنوبی ہمپشائر میں پیدا ہوتا جبکہ پراسیسنگ کے لیے اسے شمالی ہمپشائر بھیجا جاتا ہے۔ پیداوار کے لحاظ سے آسٹریلیا دنیا میں پہلے نمبر پر ہے جبکہ اون کی سب سے زیادہ کھپت جاپان میں ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں پیدا ہونے والے اون کا ایک چوتھائی حصہ merino نسل کی بھیڑوں سے حاصل ہوتا ہے جو معیار میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اس نسل کی سب سے زیادہ بھیڑیں اسپین میں ہیں۔“

ڈاکٹر تھامس ماہر دندان ہیں، وہ کہتے ہیں:

”بھیڑیں بھی انسانوں کی طرح اعصابی تناؤ کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ اعصابی تناؤ میں جس طرح انسانوں کے کام کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے۔ وہی اثر اعصابی تناؤ کا بھیڑوں پر بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ دانتوں کے علاوہ حاملہ ہونا اور اعصابی دباؤ، بھیڑوں کے اون پیدا کرنے کی قدرتی صلاحیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔“

بھیڑیں اون کی فراہمی کا سب سے بڑا ماخذ ہیں لیکن عمدہ اون صرف انہی سے نہیں ملتا۔ عمدہ معیار کا اون بلند پہاڑوں پر پائے جانے والے دوسرے کئی پھرتیلے جانوروں سے بھی حاصل ہوتا ہے۔

اس حوالے سے کشمیری بکری کا پشمینہ نہایت اعلیٰ معیار کا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کشمیر کے علاوہ تبت اور پامیر سلسلۂ کوہ میں پائی جاتی ہے۔ کوہ انڈیز کے سلسلے میں لاما نامی جانور سے ملتا جلتا ایک جانور پایا جاتا ہے، جسے vacuna کہتے ہیں۔ وہ بھی عمدہ معیار کے اون کی فراہمی کا ماخذ ہے۔

اون کی تمام اقسام میں سب سے عمدہ قسم ’شاہ توش‘ کہلاتی ہے۔ اس کا ریشہ نہایت نفیس، ریشم مائل اور اس سے بنی ہوئی شال نہایت گرم اور وزن میں بہت ہی ہلکی ہوتی ہے۔ شاہ توش اون سے عموماً خواتین کے لیے شالیں ہی بنی جاتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ شاہ توش سے بنی شال اتنی پتلی ہوتی ہے کہ لمبائی میں بل دے کر پوری شال کو ایک انگوٹھی کے اندر سے گزارا جاسکتا ہے۔ شاہ توش شال کی خریداری عام آدمی کے بس کی تو بات ہی نہیں۔ آج ایک شاہ توش شال کی قیمت کئی لاکھ روپوں میں ہے۔

شاہ توش اون ایک جنگلی پہاڑی بکرے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ اس کی گردن پر اُگا ہوا ریشہ ہوتا ہے۔ جسے کاٹنے کے بجائے گردن پر ہاتھ پھیر کر اُتارا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ توش اون کے لیے حاملہ مادہ جانور کو مار کر اس کے پیٹ میں موجود بچے کو باہر نکالتے ہیں اور اس کی کھال پر موجود اونی ریشے کو اُکھاڑ کر اس سے یہ اون حاصل ہوتا ہے۔

شاہ توش اون حاصل کرنے کے لیے مخصوص جنگلی جانور آئی بیکس چین کے علاقے اکسائی میں پایا جاتا ہے۔ چین سے گزرنے والے ہمالیائی پہاڑی سلسلے میں واقع یہ فوجی اہمیت کا علاقہ ہے۔ یہ مقام نہایت سرد اور بلند و بالا برفیلے پہاڑوں کا خطہ ہے۔ یہ علاقہ قدرتی طور پر اس جنگلی بکرے کا فطری مسکن ہے جو شاہ توش کے لیے مارا جاتا ہے۔

اکثر شاہ توش اون اُن جھاڑیوں میں اٹک جاتا ہے جہاں یہ اپنی گردن اُن سے رگڑتا ہے۔ جسے بعد میں کسان اور چرواہے اکٹھا کرلیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا حصول شکار سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ زیادہ تر منگول باشندے شاہ توش کے شکار میں ملوث ہوتے ہیں۔ اون کے لیے جانور کا بے دریغ شکار اس کی تعداد میں کمی کا بھی سبب بنا ہے۔ اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں یہ جنگلی حیات معدوم نہ ہوجائے۔ اس کے شکار پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ اس کے باوجود شکار کا سلسلہ بھی جاری ہے اور اس کے اون کی فروخت بھی ہوتی ہے لیکن چھپ چھپا کے۔

کہتے ہیں کہ شاہ توش کا اونی ریشہ چین سے بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی اسمگل ہوکر پہنچتا ہے۔ جہاں تیسرے درجے کے عامیانہ ہوٹل اس کی خرید و فروخت کے مرکز ہیں۔ اسمگلر ایسی عام جگہوں کا استعمال قانون کی نظروں میں آنے سے بچنے کے لیے کرتے ہیں۔ دہلی میں بڑے بڑے تاجروں کے نمائندے خام شاہ توش اونی ریشہ ان اسمگلروں سے خرید کر کشمیر کے جولاہوں کو بھجوا دیتے ہیں جو اس سے اون کات کر، کھڈی پر قیمتی شاہ توش شال تیار کرتے ہیں۔ شاہ توش شال کی تیاری مکمل طور پر ہاتھوں سے روایتی طریقوں کے مطابق انجام دی جاتی ہے۔

شاہ توش کا خام اونی ریشہ اتنا نرم و نازک ہوتا ہے کہ اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے سب سے پہلے اسے چاول کی پیچ سے کلف لگایا جاتا ہے تاکہ اسے کات کر دھاگا بنایا جاسکے۔ شاہ توش شال کی تیاری کشمیری جولاہے صدیوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ فن ان جولاہوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جہاں شاہ توش شال کا نام آتا ہے، وہیں کشمیری جولاہوں کی مہارت کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔

لندن میں مقیم اسٹیلے مارکوس کے پاس کئی شاہ توش شالیں اور اس سے بنے مفلر ہیں۔ ان کا کہنا ہے ”جس نے ایک بار شاہ توش شال یا اس سے بنا مفلر استعمال کرلیا۔ اس

کے بعد اگر وہ کسی بھی اعلیٰ ترین اون سے بنی یہ چیزیں استعمال کریگا تو اُسے ایسا محسوس ہوگا، جیسے پٹ سن کی رسیوں سے بنی ہوئی شال اوڑھ لی ہو۔ یہ ہے شاہ توش کا کمال۔''

جب سے بھیڑ اور اس کے اون کے فوائد انسان کے علم میں آئے ہیں۔ اس نے اس قیمتی خام مال کی حفاظت کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے۔ زمانہ قدیم میں بھیڑوں کے اونی ریشوں کو گرد و غبار سے پاک رکھنے کے لیے انہیں کپڑے سے بنا غلاف چڑھایا جاتا تھا، تاکہ ہر ممکن طور پر ان کے اونی ریشے صاف ستھرے رہیں۔

بھیڑوں کی حفاظت کے لیے انہیں کپڑا پہنانے کا رواج تاریخ کے وسطی دور میں اسپین سے شروع ہوا۔ بعد کے ادوار میں جیسے جیسے اون کی افادیت لوگوں پر آشکارا ہوتی گئی۔ ویسے ویسے اس کی حفاظت کے لیے ڈھانپنے کا یہ سلسلہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی متعارف ہوتا چلا گیا۔

اون کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں سب سے پہلے نمبر پر آسٹریلیا ہے۔ یہ دنیا بھر میں اون کی ستر فیصد ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اس وقت امریکا سمیت دنیا کے تمام ممالک میں بھیڑوں کی تجارتی بنیاد پر افزائش کر کے اونی پیداوار حاصل کرنے کی سرگرمیاں موجود ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اون کی کھپت کے حوالے سے دیکھا جائے تو 1990ء میں سوویت یونین کے خاتمے تک، امریکا اور جاپان کی کل کھپت کے برابر صرف اس ایک ملک کو اون کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہاں کا طویل موسم سرما اور دوسری طرف اس کی بہت بڑی فوج تھی۔ جس کا لباس روایتی طور پر زیادہ تر صرف اون سے بُنے کپڑے پر مشتمل ہوتا تھا۔

آسٹریلیا، جہاں دنیا بھر میں سب سے زیادہ اون پیدا کرتا ہے۔ وہیں دنیا بھر میں سب سے کم اون کی پیداوار شمالی امریکا میں ہوتی ہے۔ یہ علاقہ کبھی برطانوی نو آبادیاتی رہا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں اون کی صنعت جڑ نہیں پکڑ سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی 1699ء میں انگلستان نے اون کی پیداوار پر اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے اپنی تمام نو آبادیوں میں افزائشِ بھیڑ اور اون کی پیداوار سے لے کر اس سے مصنوعات سازی تک، کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر قانوناً پابندی عائد کر دی تھی۔

ماہرین سماجیات کا خیال ہے کہ انگلستان کی یہ معاشی پابندی ہی وہ سبب ہے جو امریکا میں انقلاب کا سبب بنی۔ واضح رہے کہ امریکی عہد انقلاب کے دوران سُوت کی کتائی اور بُنائی بوسٹن اور نیویارک میں حب الوطنی کا استعارہ بن چکی تھیں۔ خود جارج واشنگٹن نے ورجن پہاڑی سلسلے کے دامن میں آباد دیہی بستیوں میں بھیڑوں کی افزائش کے لیے کیے گئے اقدامات میں حصہ لیا۔ جہاں آزادی کی ان کوششوں کے نتیجے میں کی گئی بھیڑوں کی افزائش کے باعث اس وقت سالانہ چار سو گز اونی کپڑا تیار کیا جانے لگا تھا۔

امریکی اعلانِ آزادی کے بعد یہاں آنے والے ایسے غیر ملکی تارکینِ وطن جو اون کاتنے، اس سے کپڑا بُننے اور بھیڑوں کی افزائش وغیرہ کے حوالے سے ہنر مندانہ صلاحتیں رکھتے تھے۔ انہیں فوری طور پر امریکی شہریت دے دی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے امریکا میں اون کی صنعت کے فروغ میں تیزی آئی۔

شمالی امریکا میں بھیڑیں لانے والے 'ناواجو' نسل کے لوگ تھے جو ہسپانوی نوآبادیوں سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ وہ اپنے ساتھ بھیڑیں، اون کاتنے اور اونی لباس بُننے کی صلاحیتیں ساتھ لے کر یہاں آئے تھے۔ ان سے پہلے یہاں کے لوگ کپاس کات کر دھاگا بناتے اور اس سے کپڑا بُنتے تھے۔ ناواجو باشندوں نے ان روایتی کھڈیوں میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کیں اور ان پر قالین بافی کرنے لگے۔

قالین بافی اور اون سے کپڑا بُننا ناواجو عورتوں کا قدیم فن ہے۔ ناواجو نسل میں اون کاتنے سے لے کر لباس بُننے تک کی تمام ذمے داریاں عورتیں ہی نبھاتی تھیں، جبکہ مردوں کے ذمے صرف بھیڑیں پالنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا تھا۔

ناواجو باشندے بہت کم عرصے میں ہی شمالی امریکا میں اون سے بنائی گئی مصنوعات میں نیا انقلاب لے آئے۔ انہوں نے یہاں مروج کپڑوں کی بُنائی میں استعمال ہونے والے قدیم ڈیزائن کو بالکل ہی بدل ڈالا۔

ناواجو باشندوں نے بُنائی کے دوران قالین کو نت نئے نمونوں سے سجایا۔ اپنی تخلیقی فنکارانہ صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے شمالی امریکا میں بُنائی کی صنعت کو ایک نیا رُخ دے ڈالا۔ جس کے سبب ان کی مصنوعات کی قدر میں کئی سو گنا اضافہ ہوا اور ان کی تجارت پروان چڑھنے لگی۔

ناواجو باشندوں کی بُنائی پر ہسپانوی رنگ غالب تھا۔ انہوں نے شمالی امریکی میں روایتی ہسپانوی شال ''بیاتا'' کو نیا انداز عطا کیا۔ پہلے یہ شال سُوت کے کاتے گئے دھاگوں سے بنائی جاتی تھی۔ انہوں نے سُوت میں اونی ریشے شامل کر کے نقش و نگار کشیدہ کیے۔ جس کی وجہ سے وہ خواتین میں کافی مقبول ہونے لگیں اور ان کی شہرت پورے امریکا میں پھیل گئی۔ انہوں نے اون اور سُوت کو شوخ اور

دلکش رنگوں میں رنگ کر شال بنائی تو اس نے فیشن کی دلدادہ خواتین کے دل موہ لیے۔ اُس دور میں، امریکا میں یہ شالیں فیشن کی متوالی نسل کے لباس کا حصہ بن گئی تھیں۔

1860ء تک شمالی امریکا میں واقع نیو میکسیکو کا شہر فورٹ سیم نر، نواجو نسل کے ہُنر مندوں کی بدولت اون اور سوت کی صنعت کا معروف مرکز بن چکا تھا۔ جس کی وجہ سے یہاں معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں کو پروان چڑھنے کے شاندار مواقع حاصل ہوئے۔ نواجو لوگوں کے بنائے گئے قالینوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ مہنگے داموں کے باوجود ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے تھے۔ اُس دور میں ایک مثال مشہور ہوئی تھی ''ناواجو عورتوں کے بنائے ہوئے قالین، بینک کے وہ چیک ہیں جو کسی بھی وقت بھنائے جا سکتے ہیں۔''

نیو میکسیکو میں نواجو نسل سے تعلق رکھنے والی دو عمر رسیدہ بہنیں مسز باربرا جیمز اور نیلس اور ان کی بہن روزا این لی رہتی ہیں۔ دونوں روایتی ناواجو قالین بافی کے ہُنر کی دولت سے مالا مال ہیں۔ یہ دونوں بہنیں مل کر ایک کھڈی پر روایتی انداز میں ایک بڑا ناواجو قالین ڈھائی سال میں بُن لیتی ہیں۔

''بہت پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میرے شوہر کالج میں پڑھا کرتے تھے تو ایک بار انہیں فیس کی ادائیگی کے لیے بڑی رقم کی ضرورت پیش آئی۔'' مسز باربرا نے قالین سے جڑے ایک دلچسپ قصے کو سناتے ہوئے کہا۔

''اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں تھے اور میرے شوہر کو رقم کی ضرورت تھی۔ تب میں نے گھر کے اسٹور میں حفاظت سے رکھے ایک چھوٹے سے قالین کو نکالا۔ یہ قالین میں نے بہت پہلے بُنا تھا۔ میں بازار گئی۔ دکاندار نے قالین دیکھتے ہی اسے خرید لیا۔ یوں مجھے آٹھ سو ڈالرل گئے۔ جس سے فیس ہی نہیں گئی اور معاملات بھی نمٹ گئے۔'' مسز باربرا کے لہجے میں خواتین کی معاشی صلاحیتوں کو کھلے دل سے تسلیم کیے جانے کا مطالبہ بھی تھا۔

''ہمارے خاندان میں قالین بافی خواتین کے لیے سیکھنا لازم ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری ماں بھی قالین بُنا کرتی تھی۔'' اپنی بہن کی طرح روزا این لی کی بھی متعدد دلچسپ یادیں قالین بافی سے جُڑی ہوئی ہیں۔ انہی میں سے ایک واقعہ اُس روز وہ مجھے سنا رہی تھیں۔

''میں بہت چھوٹی تھی۔ اس وقت میری عمر شاید یہی کوئی سات آٹھ برس ہوگی، جب میری ماں مجھے کھڈی پر بٹھا کر قالین بُننا سکھاتی تھیں۔ میں روتی جاتی تھی اور ہاتھ چلاتی جاتی تھی۔ میری ماں کا کہنا تھا کہ تم جو چاہے کرلو۔ جب تک قالین بُننا نہیں سیکھو گی، میں تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔ یوں ایک وقت ایسا آیا کہ میری ماں ہی نہیں، دوسرے لوگ بھی میرے بُنے گئے قالین اور اس پر بنائے گئے نقش و نگار کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔''

روزا کا کہنا تھا ''جب بھی ہماری ماں کی سالگرہ قریب آتی تو وہ ہم سے یہی کہتی تھیں کہ مجھے سالگرہ پر پھول نہیں اون دینا۔''

ان ہسپانوی باشندوں کے لیے اپنی زندگی میں قدیم روایت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اجداد سے ورثے میں ملنے والی روایات پر عمل کرنا، اپنے اجداد کی ہُنر مندی کو زندہ رکھنا ان کے لیے سب سے اہم ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی ان کی یہ قدیم زندگی زندہ ہے، سانس لیتی ہے اور اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

شمالی امریکا میں ہسپانوی باشندوں کی بستی کی ایک دُکان کے اندر لٹکتا ہوا ایک عجیب سا لباس دیکھا۔ یہ اون سے بُنے ہوئے دو برابر کی لمبائی اور چوڑائی والے دو ٹکڑوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ جس کے بیچ میں گردن سے اسے پہننے کے لیے موجود حصے کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

''یہ لڑکیوں کی بلوغت کے موقع پر ہونے والی رسم کا مخصوص لباس ہے۔'' دکان دار ہسپانوی تھا۔ اس نے مجھے لباس کو حیرت سے تکتے ہوئے دیکھا تو قریب آ کر کہنے لگا۔

''یہ وہ لڑکیاں پہنتی ہیں جن کی بلوغت کی عمر ہونے پر رسم بلوغت ادا کی جا رہی ہو۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''کیا یہ رسم ہسپانوی ہے؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''جی ہاں...... یہ ہماری بہت قدیم روایت ہے۔''

''تو کیا یہ رسم اب بھی ہوتی ہے؟'' میرے لہجے میں بدستور حیرت تھی۔

''کیوں نہیں...... ہمارے اجداد نے اپنا ملک چھوڑ کر امریکا میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ اپنے رسم و روایات تو سرحد پار چھوڑ کر نہیں آئے تھے۔ تو پھر ہم اپنے بزرگوں کی روایت اور لوک ریت رواجوں کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں سچائی جھلک رہی تھی۔

اس وقت میرے ساتھ میری ہسپانوی ساتھی ڈیلوریا ایشلے بھی تھی لیکن جب میں دُکان میں داخل ہوا تو وہ باہر لگے خوانچے پر کچھ دیکھنے لگ گئی تھی۔ اس لیے میں اکیلا ہی دُکان کے اندر آ گیا تھا۔ جب میں ہسپانوی دکان دار سے باتیں کر رہا تھا تو ایشلے بھی اندر چلی آئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''کیا باتیں ہورہی ہیں؟'' اس نے خوشدلی سے کہا۔

''میں اس لباس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''اوہ یہ لباس...... ارے یہ تو ہمارا روایتی لباس ہے۔ میں بھی اپنی بلوغت کے وقت اسے پہن چکی ہوں۔'' ایشلے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے آج کے جدید دور میں بھی ہر ہسپانوی لڑکی کو زندگی میں کم از کم ایک بار یہ لباس ضرور پہننا پڑتا ہے۔ یہی تو وہ ہمارا روایتی لباس ہے جسے پہننے کے بعد ہی ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی بنے رہنے کی عمر ڈھل چکی۔ اب عورت بن چکی ہو۔'' ایشلے نے تفصیل سے مجھے لباس کے بارے میں بتایا۔

''ویسے یہ لباس صرف ایک بار ہی پہنا جاسکتا ہے۔ شاید ہی کوئی لڑکی ہو جس نے اسے دوبارہ پہنا ہو۔ میں نے تو جب اسے رسم میں پہنا تھا تو سچ پوچھو اس کے کھردرے اون سے تو مجھے اپنے جسم پر خارش ہونے لگی تھی۔'' ایشلے نے کہا اور پھر منہ بناتے ہوئے بولی ''پر کیا کریں ہم ہسپانوی لڑکیوں کو زندگی میں ایک بار تو اسے لازماً ہی پہننا ہوتا ہے ورنہ عورت کیسے کہلائیں گے۔'' اس کی باتوں اور لہجے میں شرارت جھلک رہی تھی۔

''مجھے بڑی حیرت ہورہی ہے یہ سن کر۔'' میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''یہ تقریب دیکھنا چاہو گے؟'' ایشلے نے میری بات سن کر کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''وہی جو تم نے سنا۔'' اس نے نہایت بھولپن سے کہا۔ ''چار دن بعد میری چھوٹی بہن کی رسمِ بلوغت ہورہی ہے۔ تم دیکھ لینا کہ لڑکی کے جوان ہونے کی ہسپانوی رسم کیسی ہوتی ہے اور اسے ہم لوگ کس طرح روایتی انداز میں مناتے ہیں۔''

''میرے لیے اس رسم میں شرکت کرنا نہایت دلچسپ، یادگار اور منفرد موقع تھا۔ ایشلے نے دعوت نامہ دے دیا تھا۔ جس کے مطابق میں اس رسم میں شرکت کرسکتا تھا۔

مجھے ایشلے کی زبانی ہسپانوی باشندوں کی اون سے منسلک روایات کا سن کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک اِنکا تہذیب بھی ہے۔ اِنکا تہذیب والے ملک پیرو میں اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ اُن کے ہاں پچھلے تین ہزار برس پہلے سے ہی اون مذہبی رسومات کا حصہ رہا ہے۔ ان کے اونی پیراہن شوخ رنگوں پر مشتمل ہوتے تھے جس پر بڑی تعداد میں نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اُس وقت ان نقش و نگار کے معنیٰ ہوا کرتے تھے لیکن صدیوں کے عملِ ارتقا کی دھند میں معنیٰ تو کہیں کھو گئے، البتہ بعض نقش و نگار اب تک چلے آرہے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ پیرو میں ایک جولاہے سے دریافت کیا تھا ''جو نقش تم نے شال پر بنایا ہے، اس کا کوئی مطلب بھی ہے یا بس یونہی بنادیا۔''

''مطلب وطلب کا تو مجھے پتا نہیں۔ یہ نقش و نگار تو ہم یونہی ہمیشہ سے بناتے چلے آئے ہیں۔ میرے باپ دادا بھی یہی کام کیا کرتے تھے۔ وہ بھی یہی نقش و نگار بناتے تھے۔ اس کے آگے کی بات کیا تھی، وہ مجھے پتا نہیں۔''

اُس جولاہے کو یقیناً پتا نہیں ہوگا لیکن جو جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اِنکا تہذیب میں بُنائی کا ہنر بہت ترقی کرچکا تھا۔ وہ سُوت سے کپڑا بُنا کرتے تھے اور اونی ریشوں کو کات کر اُسے لباس بنانے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کے کپڑوں کے نمونوں میں معنیٰ پوشیدہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے مُردوں کو بھی قیمتی اون سے کپڑوں میں لپیٹ کر دفن کیا کرتے تھے۔

اِنکا باشندے جس لباس میں اپنے مُردوں کو لپیٹ کر دفن کرتے تھے۔ ان پر کچھ خاص قسم کے نقش و نگار بنے ہوتے تھے۔ کپڑوں پر بنے وہ نمونے اِنکا والوں کی خفیہ یا مذہبی زبان ہوتی ہوگی۔ ویسے بھی اُس زمانے میں تو اون سے انسان کی آشنائی بہت محدود تھی اور اس کا استعمال بھی بہت ہی کم تھا۔

کپڑوں کی بُنائی کے علاوہ بھی اِنکا لوگوں نے جو ترقی کی تھی۔ آج آثارِ قدیمہ کے ماہرین اس کے معترف ہیں اور اس کی تشریح بھی کرتے ہیں۔ جسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اِنکا لوگوں نے اون کے زیادہ نفاست سے استعمال کا طریقہ جان لیا ہوگا۔ ویسے بھی اس عہد میں، اُن کے ہاں کپڑوں کی بُنائی اپنے عروج پر تھی۔ ایسے میں اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اِنکا باشندے اونی ریشوں کا استعمال لباس کے لیے کپڑے کی تیاری میں بھی کررہے تھے۔

اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اِنکا وہ لوگ تھے جنہوں نے ہزار قبل از مسیح میں نفیس طریقے سے اون سے سُوتی ملبوسات کا استعمال عام طور پر شروع کردیا تھا اور وہ اپنے مُردوں کو مہیا کرائی قیمتی لباس میں سپردِ خاک کیا کرتے تھے۔ جان لیں کہ اِنکا دور کی ملنے والی ممیائی گئی لاشوں پر موجود کپڑوں کے تجزیے سے اُن میں اونی ریشوں کی موجودگی کا پتا چلا ہے۔

آج بھی پیرو کے دیہاتوں میں خواتین قدیم انداز میں

بھیڑ کے اونی ریشوں کو ہاتھوں سے کات کر اون بناتی ہیں اور اس سے گرم کپڑے بنتی ہیں۔ پیرو میں اون کاتتے ہوئے یہ عورتیں اکثر لوک گیت گاتی ہیں۔ یہ پیرو کے وہ قدیم لوک گیت ہیں۔ جن میں بھیڑوں، اون، سردی اور گرم لباس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لوک گیتوں کی جڑیں کسی بھی تہذیب کی صدیوں اور ہزاروں برس کے تجربات سے جا کر ملتی ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ آج پیرو کی خواتین کے گائے جانے والے گیت شاید تب وجود پانا شروع ہوئے ہوں۔ جب ان کے اجداد نے سخت سردی میں بھیڑ کے ریشوں سے اپنے لیے ایسا لباس بنانے کا طریقہ جان لیا ہو جو اُن کے جسم کو حرارت بخش کر زندہ رکھنے کے لیے اُس وقت کا موثر ترین عنصر ہو۔ اس لیے انہوں نے بھیڑ، اس کے اونی بالوں اور سردیوں کا تذکرہ بطور کامیابی اپنے گیتوں میں شامل کردیا۔ اور اب وہی گیت اکیسویں صدی میں پیرو کے وہ دیہاتی عورتیں گارہی ہیں، جن کے بازوؤں پر بھیڑ کے اونی ریشے اور ہاتھوں میں کاتا گیا اون ہوتا ہے۔

بات نکلی ایشلے کی قدیم ہسپانوی روایات اور ہسپانوی دُکاندار کی دُکان میں لٹکتے ہوئے سادہ اونی لباس سے اور پہنچی اِنکا دور تک...... خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے ایشلے کی بہن کی رسمِ بلوغت میں شرکت کا دعوت نامہ مل گیا۔

ٹھیک چوتھے روز وقتِ مقررہ پر میں ایشلے کے گھر پہنچ گیا۔ یہ ایک بہت ہی بڑا گھر تھا۔ پورے گھر میں روایتی ہسپانوی ماحول نظر آرہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں جس ماحول کو دیکھ رہا ہوں وہ آج کے امریکا میں نہیں، کسی قدیم ہسپانوی باشندوں کے گاؤں میں واقع کسی گھر کا منظر ہے۔

لڑکی کے جشنِ بلوغت کی رسم چار دن تک جاری رہتی ہے۔ اس موقع پر پہلے دن اسے کھردرے اون کے دو ٹکڑوں سے بنا وہ لباس پہننا ہوتا ہے، جو میں پہلے ہی دُکان میں دیکھ چکا تھا۔ اس روایتی لباس کو دیکھ کر ہر مہمان جان جاتا ہے کہ جس لڑکی کی رسمِ بلوغت ادا کی جارہی ہے وہ کون سی ہے۔

چار دن تک جاری اس رسم میں تمام رشتے دار، دوست احباب اور ملنے جُلنے والوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ رسم کے پہلے دن لڑکی یہ لباس پہنتی ہے تو پھر چوتھے دن ہی اسے اتارتی ہے...... شاید پہلی اور آخری بار۔ جب میں ایشلے کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے جس لڑکی کو یہ لباس پہنے دیکھا، اس سے میرا تعارف نہیں تھا مگر یہ لباس داستان کہہ گیا کہ تقریب کی مہمانِ خاص وہی ہے۔

اس تقریب میں تین دن تک خوب ہلا گلا ہوتا ہے۔ چوتھے دن صبحِ صادق کے وقت اس تقریب کا اختتام ایک بہت بڑے کیک کی کٹائی کے بعد ہوتا ہے۔

اس کیک کی تیاری بھی بہت انوکھے انداز میں کی جاتی ہے۔ یہ کیک زمین میں گہرا گڑھا کھود کر اس میں بھٹی بنا کر تیار کیا جاتا ہے۔

جس انداز میں یہ کیک بنایا جاتا ہے۔ اس بارے میں ایشلے کا کہنا ہے کہ ''اس طرح صرف ناواجو باشندے ہی کیک بناتے ہیں۔ یہ کیک ہماری صدیوں پرانی روایت ہے۔ آج بھی ہم صدیوں پرانے طریقے پر ہی اسے تیار کرتے ہیں۔''

کیک کٹائی کی تقریب صبحِ صادق کو ادا ہوتی ہے۔ جس سے قبل تمام مہمان اور اہلِ خانہ گھر کے صحن میں جمع ہو کر کھلے آسمان تلے روایتی ہسپانوی موسیقی کی محفل سجاتے ہیں۔

تقریب کے اختتام کے لیے سب سے اہم چیز جھونپڑی بنانا ہے۔ جسے شمالی امریکا میں قدیم ریڈ انڈین باشندوں کی روایتی طرز کی جھونپڑی سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ روایتی جھونپڑی اس تقریب کا سب سے اہم عنصر ہے۔ یہ شش پہلو جھونپڑی گھر کے صحن میں بنائی جاتی ہے۔

جھونپڑی کے اندر ایک کونے میں تہ کیا ہوا بستر لگا ہوتا ہے۔ درمیان میں چولہا ہوتا ہے۔ جھونپڑی کے دروازے کا رُخ مشرق کی سمت ہوتا ہے۔ جس کے باہر قالین اور کمبل بُننے والی کھڈی لگی ہوتی ہے۔

اس محفل میں ایک شخص قبائل حکیم کا بہروپ دھارتا ہے۔

جب صبحِ صادق کا وقت ہوتا ہے، تب لڑکی اس جھونپڑی میں جا کر مشعل روشن کرتی ہے۔ تہ کیا ہوا بستر کھول کر لگاتی ہے۔ جس پر وہ بہروپیا حکیم جا کر لیٹ جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ لڑکی جھونپڑی میں روشن مشعل کو بجھا کر باہر چلی آتی ہے۔

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اب یہ لڑکی نہیں بلکہ گھر گرہستن سنبھالنے والی عورت بن چکی ہے۔ لڑکی کی جھونپڑی سے باہر آمد پر کیک کاٹا جاتا ہے۔ جسے وہ لڑکی مہمانوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اس کے بعد مہمان اس کے والدین کو بیٹی کی بلوغت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ یوں آسمان پر دن کی ہلکی سی روشنی کے پھیلتے ہی یہ تقریب اختتام پذیر ہوجاتی ہے۔

صبح دن چڑھے جب میں واپس جارہا تھا تو ایشلے مجھے لے کر باہر آئی، جہاں جھونپڑی کے سامنے بنی کھڈی پر اس کی وہی چھوٹی بہن سر جھکائے قالین بُن رہی تھی۔ جس کی رسمِ بلوغت میں، میں مہمان بن کر آیا تھا اور اب واپس جانے والا

تھا۔

''ارے یہ کیا کررہی ہے؟'' میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''ابھی تو اس کی تھکن بھی نہیں اتری ہوگی۔''

''اب یہ عورت بن چکی ہے۔ اسے اپنے عورت پن کا ثبوت دینا ہے۔'' ایشلے نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیسا ثبوت؟''

''اسے ایک قالین بُننا ہے۔ یہ بطور عورت اس کی زندگی کی پہلی صبح ہے۔ اس لیے آج صبح ہی اسے ایک نئے قالین کی بُنائی کا آغاز کرنا ہے۔ یہ ہماری روایت ہے کہ تقریب کے بعد اگلی صبح لڑکی سب سے پہلا کام اپنی کھڈی پر نئے قالین کی بُنائی شروع کرتی ہے۔ تاکہ جب وہ قالین تیار ہو تو سب جان لیں کہ یہ نئی عورت گھر گرہستن میں کیسی ہے؟'' ایشلے نے مجھ سے کہا۔

''جب میری رسم ہوئی تھی، تب میں نے بھی یہی کیا تھا۔ ویسے ایک بات کہوں۔ اس دن بہت تھکن طاری تھی مجھ پر۔ کسی بھی کام کے کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ کیسے نہیں کرتی۔ روایت کی تو پاسداری آخر کرنی ہی ہوتی ہے۔'' ایشلے کی باتیں سن کر مجھ پر عجیب سا سحر طاری ہوگیا تھا۔

کھڈی کے برابر میں ہی ایک میز پر اوپر تلے پندرہ کمبل رکھے ہوئے تھے۔ یہ نئے کمبل گھر کی خواتین نے مل جُل کر بنائے تھے اور انہیں تقریب کے دوران استعمال کیا گیا تھا۔ اب یہ کمبل مہمانوں میں بطور تحفہ تقسیم کیے جانے والے تھے۔

''تم بھی ایک کمبل لے لو۔ ہماری روایت کے مطابق اس تقریب میں استعمال ہونے والے کمبل کا گھر میں موجود ہونا نیک شگون اور باعثِ خیر و برکت ہوتا ہے۔'' ایشلے نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔

''بہت شکریہ ایشلے۔'' سب سے اوپر ہلکے زرد اور گہرے کتھئی رنگ کا کمبل رکھا ہوا تھا۔ وہ میں نے اٹھالیا۔

''تم جانتے ہو۔ جو مہمان خواتین اس تقریب میں آتی ہیں۔ ان سب کے پاس اون سے بنا ہوا ایک دستی تھیلا ہوتا ہے۔ جب وہ اس تقریب سے واپس اپنے گھروں کو جاتی ہیں تو پھر کبھی اس تھیلے کو نہیں کھولتی ہیں۔''

''کیوں؟'' یہ ایک اور انوکھی بات تھی جو ایشلے نے اس وقت کہی جب میں اپنی گاڑی کی طرف جارہا تھا اور وہ میرے برابر چل رہی تھی۔

''ہم ہسپانوی لوگوں کا ماننا ہے کہ اس تقریب کے اختتام پر خیر و برکت ان تھیلوں میں چلی جاتی ہے۔ اگر اس کے بعد ان کو کھولو گے تو یہ ہوا میں تحلیل ہوجائے گی۔ اس لیے خواتین تقریب میں ساتھ لائے گئے تھیلوں کو اپنے گھروں میں واپس جاکر الماریوں میں بند کرکے رکھ دیتی ہیں۔ جس کے باعث ان کے گھر میں خیر و برکت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔'' ایشلے نے تفصیل سے مجھے سمجھایا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''کہو...... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''تقریب میں شامل ہونے والی خواتین صرف اون سے بنے دستی تھیلے ہی کیوں اپنے ساتھ لے کر آتی ہیں۔ اب تو چمڑے، کینوس اور کاٹن کے بھی بہت اچھے اچھے اور خوشنما تھیلے بازار میں عام طور پر ملتے ہیں تو پھر اونی تھیلے ہی کیوں؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''اس لیے کہ اون ہماری قدیم روایت، تہذیب اور ہماری زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔ اگر اون ہماری لوک رسموں سے خارج ہوا تو سمجھو ہماری تہذیب بھی مرجائے گی۔'' ایشلے نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں ایشلے کی بات سن کر مطمئن انداز میں واپسی کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ امریکا میں ایشلے سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس تقریب کے ساتھ ہی اون، اس کی تاریخ اور تہذیب و تمدن پر اس کے اثرات کے حوالے سے میرا متعدد ملکوں کا تحقیقی سفر بھی ختم ہوا۔ اب مجھے اپنے وطن لندن واپس پہنچنا تھا۔

اون کی تاریخ جاننے کے لیے کیے گئے اس طویل سفر نے مجھ پر انکشافات کے نئے نئے دروازے کھولے۔ نئی نئی رسمیں دیکھیں اور اس سے منسلک عقیدت کے انوکھے انداز دیکھے۔ میرے لیے یہ سب استعارہ ہیں اون کی افادیت کے اعتراف اور اس قیمتی ریشے کی اُن خدمات کا جو اس نے بنی نوع انسانوں کے لیے ادا کی ہیں۔

عالمی سطح پر دیکھیں تو زمانہ نامعلوم کی تاریخ سے لے کر آج تک، اون نے انسانی ارتقا اور ترقی میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ اس نے موسم کے سرد اور گرم سے انسانوں کو بچانے کے لیے مناسب لباس ہی فراہم نہیں کیا بلکہ گزشتہ کئی صدیوں سے لے کر آج تک کئی ممالک کی معاشی ترقی کو بھی استحکام بخشا...... اور کچھ لوگوں کے لیے، جیسا کہ ناواجو عورتیں، جن کے لیے اون نہ صرف ان کی معاشرتی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ ان کے مکمل عورت کہلوانے کا سب سے بڑا ثبوت بھی۔

سرمئی بادلوں سے گھرا برمنگھم کا آسمان بس برسنے کو تیار تھا اور یہ دسمبر کی سرد دوپہر تھی۔ لیزا اپنے والدین اور بیٹے کے ہمراہ کرسمس کے لیے خریداری کررہی تھی۔ اچانک ایک دکان کے شوکیس میں سجا خوبصورت اسٹیریو سسٹم دیکھ کر لیزا رک گئی اور سرگوشی میں اپنی ماں سے بولی ''ریان کو یہ بہت پسند آئے گا۔'' اور پھر یہ تسلی کرنے کے لیے کہ کہیں ریان نے سن تو نہیں لیا، وہ مڑ کر ریان کو دیکھنے لگی ...... مگر یہ کیا......؟ ریان تو وہاں نہیں تھا۔

''اف میرے خدا، ریان کہاں گیا؟'' وہ خوفزدہ ہوکر چلائی۔ شدید گھبراہٹ کے عالم میں وہ تینوں اُلٹے قدموں واپس لوٹے۔ پندرہ میٹر دور انہیں فٹ پاتھ پر کوئی لیٹا نظر آیا۔ وہ اسی جانب دوڑے۔ ریان فٹ پاتھ پر پہلو کے بل لیٹا درد سے کراہ رہا تھا۔ لیزا ریان کو اپنے بازوؤں میں بھر کر اسے پیار سے تھپتھپانے لگی۔ روتے ہوئے ریان نے کہا ''ماں، میری ٹانگوں نے کام کرنا بند کردیا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' لیزا نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا ''تم گھبراؤ مت۔''

''بہت زیادہ درد ہورہا ہے ماں، مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا۔'' ریان درد سے کراہتے ہوئے بولا۔ اس کے نانا ڈیرک نے اسے گود میں اُٹھایا اور یوں وہ اسے گاڑی تک لے آئے۔

ریان کو درد کے یہ دورے اس وقت پڑنا شروع ہوئے تھے جب وہ صرف پانچ سال کا تھا۔ ریان اچانک ہی فرش پر گرجاتا اور چیخنا شروع کردیتا۔ لیزا خوف زدہ ہوکر اسے اسپتال لے کر بھاگتی۔ ریان کا مرض ایسا تھا کہ ڈاکٹر بھی کچھ نہ کرپاتے اور بس مارفین کے انجکشن اور ڈرپ لگا کر اس کے درد کو ختم کرنے کی کوشش کرتے۔ ریان صرف سات سال کا تھا جب لیزا نے پہلی بار شام کے وقت ٹی وی دیکھتے ہوئے ریان کی چیخیں سنی تھیں اور ہراساں ہوکر اس کے کمرے کی جانب دوڑی تھی۔

وہ منہ کے بل زمین پر گرا ہوا تھا اور اس کی کمر کو شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ ڈاکٹر اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرپائے سوائے اسے درد سے بچانے کے لیے مارفین کی ڈرپ لگانے کے۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ ریان اپنی تکلیف کو بڑھا چڑھا کر بیان کررہا ہے۔ مگر آخرکار ایک ماہر طبیب نے اس کا مرض تشخیص کرہی لیا۔ یہ فالج کی ایک بہت کم واقع ہونے والی قسم تھی جس میں پل بھر میں انسان نارمل ہوتا ہے اور پل بھر میں بالکل مفلوج۔ اگرچہ اس بیماری کی مکمل وجوہات کا ابھی تک پتا نہیں لگ سکا ہے مگر تحقیق کاروں کا کہنا ہے کہ یہ بیماری دماغ کے اس حصے میں خرابی کی وجہ سے جنم لیتی ہے جو حرکت کے متعلق پیغامات کی وصولی اور ترسیل کا کام انجام دیتا ہے۔

ریان کا مرض شدید تھا جس نے اس کے جسم کے بیشتر حصوں کو متاثر کیا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ، کمر، ہاتھ اور یہاں تک کہ اس کا چہرہ بھی اس بیماری کے اثرات سے نہیں بچ پایا تھا۔ بدقسمتی سے ابھی تک اس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہورہا تھا، اس کی بیماری بھی شدت اختیار کررہی تھی۔ وہ اکثر سیڑھیوں سے گرجاتا اور اس کی بائیں ٹانگ کام کرنا چھوڑ دیتی۔ لیزا اس کے گرنے کی آواز سن کر دوڑی آتی اور اسے فرش پر درد سے تڑپتا ہوا پاتی۔ بعض اوقات اس کے جبڑے آپس میں جڑ جاتے اور وہ بول بھی نہ پاتا تھا۔ وہ اپنے جوتوں کے تسمے خود نہیں باندھ سکتا

ایک باحوصلہ بچے کے عزم کی داستان

وہ طائر جرأت جو پروں کو قفس میں تولتا رہتا ہے اسی کی مثل اس نوعمر بچے نے بھی حوصلے کا وہ انداز دکھایا کہ سب دم بخود رہ گئے۔ اسے مائیلیٹس جیسی مفلوج کردینے والی موذی بیماری نے گھیر لیا تھا۔ ہاتھ پیر اکڑ گئے تھے مگر اس نے حوصلے سے کام لیا اور اولمپکس گیم میں بھی حصہ لیا۔ 2012ء میں بھی تمغہ حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔

چیمپئن

صبا شفیق

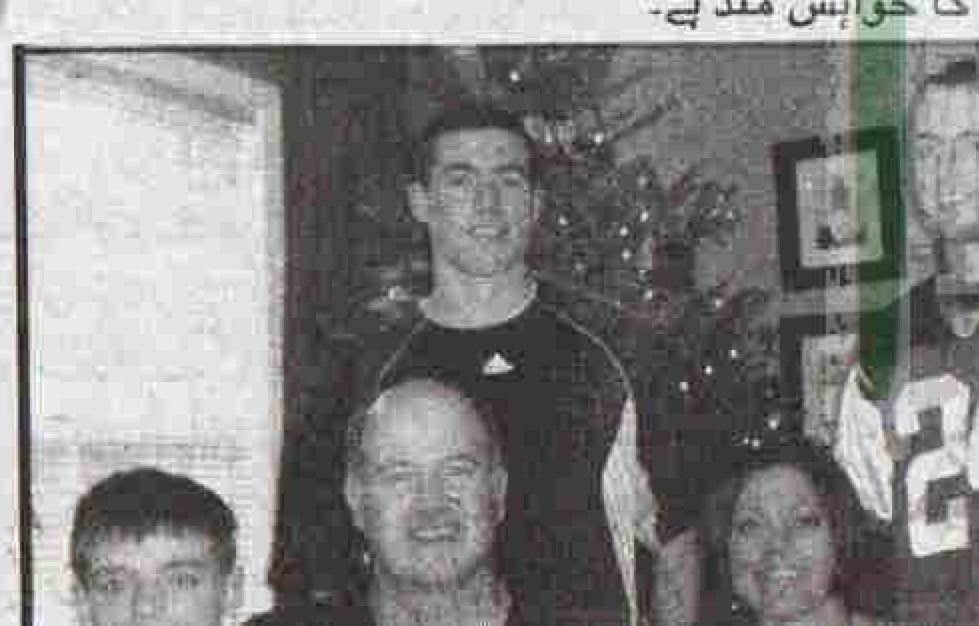

تھا۔ اس کی گرفت میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ چھری پکڑ کر اپنے لیے کوئی پھل کاٹ سکے۔ وہ کانٹا پکڑ کر اس سے کچھ کھا نہیں سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دوروں کی شدت اور تعداد بڑھنے لگی اور اسے مستقل اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔

یہ خزاں کی ایک زرد صبح تھی۔ ریان اور لیزا اسپتال کے ایک کمرے میں ڈاکٹر کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں ان مریضوں کی تصاویر دکھائیں جو شدید قسم کے فالج کا شکار تھے۔ ان کی بیماری کی علامات دماغی رعشہ سے بھی ملتی جلتی تھیں۔ ان میں سے کچھ کبڑے ہو چکے تھے اور کچھ معذور۔

ان ہولناک تصویروں نے لیزا اور ریان کو سخت خوف زدہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نے پھر کہا ”مجھے افسوس ہے کہ ہم ہر طریقہ آزما چکے ہیں مگر ریان کے دوروں اور درد کی شدت کو کم نہیں کر پائے۔ اب صرف ایک ہی حل بچا ہے کہ ہم اس کی نسوں کو سن کر دیں۔ اس کے لیے ہمیں اس کے حرام مغز میں ریڑھ کی ہڈی سے درد کو روکنے والی دوا داخل کرنی ہوگی۔ اس طرح یہ کوئی درد محسوس نہیں کرے گا مگر اس طرح وہ اپنی ٹانگیں بھی استعمال نہیں کر سکے گا۔ دوسرے الفاظ میں ریان وہیل چیئر تک محدود ہو جائے گا۔“

لیزا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور جب اس نے ریان کی طرف دیکھا تو وہ فوراً چلانے لگا ”نہیں...... نہیں...... آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کریں گے، بالکل نہیں کریں گے۔“

وہ اس وقت صرف نو سال کا تھا مگر اچانک ہی وہ اپنی عمر سے بڑا نظر آنے لگا تھا۔ گھر واپسی پر تمام راستے وہ لیزا کی منتیں کرتا رہا ”وعدہ کریں، آپ انہیں میرے ساتھ یہ سب نہیں کرنے دیں گی...... میں باقی لوگوں کی طرح اپنے قدموں پر چلنا چاہتا ہوں...... وعدہ کریں ماں، میرے ساتھ وعدہ کریں۔“

لیزا روتے ہوئے بولی ”میں وعدہ کرتی ہوں ریان، ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈ لیں گے۔“

ریان کی بیماری بہت بے رحم تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ کئی ہفتوں تک بالکل ٹھیک رہتا پھر اچانک ہی وہ بیماری زندہ ہو جاتی اور اسے معذور کر کے رکھ دیتی۔ کئی بار ایسا ہوا لیزا نے گھر کا دروازہ کھولا تو ریان کو تھامے ہوئے اس کے کلاس فیلو نظر آئے، وہ اسے اسکول سے گھر چھوڑنے آتے تھے۔ مگر جب بھی وہ اسپتال جاتا، لیزا کی منتیں کرتا رہتا کہ وہ ڈاکٹروں کو اسے معذور کرنے کی اجازت نہ دے۔ بعض اوقات جب اسے شدید دورہ پڑتا تو اس کے اثرات کئی ہفتوں تک باقی رہتے اور اسے مجبوراً وہیل چیئر استعمال کرنا پڑتی۔ وہ اس سے نفرت کرتا تھا اور کہتا تھا، میں معذور نہیں۔

اور جب اس کی ماں نے اسے دوسری منزل پر موجود اس کے کمرے تک پہنچنے کے لیے اسے سیڑھیوں کی زحمت سے بچانے کے لیے لفٹ کی تجویز پیش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ دونوں اطراف سے سیڑھیوں کی ریلنگ تھام کر اوپر چڑھتا، اکثر گر بھی جاتا تھا۔

اب درد مسلسل رہنے لگا تھا۔ ریان اپنی اس وقت کی ڈائری میں لکھتا ہے۔

”یہ درد بجلی کے زوردار جھٹکے کی طرح ہے، یوں لگتا ہے جیسے کوئی چھری سے مجھے کاٹ رہا ہے...... میں اپنا درد چھپا لیتا ہوں کیونکہ میں خوف زدہ ہوں، پریشان ہوں۔“

اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بیماری کی شدت کی وجہ سے اسے اسکول چھوڑنا پڑا اور دو سال تک اس نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی۔ بیماری نے ریان کو معذور کر دیا تھا مگر وہ بہت باہمت بچہ تھا۔ اسپتال میں ایک بار ایک ڈاکٹر نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی تو ریان نے کہا ”مجھے ایک فالتو ٹوکری کی طرح مت سمجھیں جس میں صرف دوائی کی گولیاں ڈالتے ہیں۔ میں انسان ہوں...... کوئی بے جان چیز نہیں۔“

اس کی زندگی میں اچھے وقت بھی آتے تھے، جب وہ اپنے باپ اور چچاؤں کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اس کے باپ اینڈی اور اس کی ماں لیزا میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ اس کے چچا اس کے ساتھ کھیلتے اور اسے بالکل بھی احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ بیمار ہے۔ جب وہ ان کے ساتھ ہوتا تو اسے درد کا احساس بہت کم ہوتا تھا اور وہ خود کو ایک نارمل لڑکا سمجھنے لگتا تھا۔ ایک اتوار کی شام جب وہ ساحل پر فٹ بال کھیل رہے تھے اور ریان تھوڑا تھوڑا درد محسوس کر رہا تھا تو اس کے باپ نے اس سے کہا ”ہم تمہیں وقفہ نہیں دیں گے ریان! تمہیں اور زیادہ محنت کرنی ہے اور زیادہ بہتر ہونا ہے۔“

اور ریان نے خود سے کہا ”ہاں، مجھے محنت کرنی ہے اور مجھے بہتر نہیں...... بلکہ بہت بہتر ہونا ہے۔“

ریان اب تیرہ سال کا ہو چکا تھا اور اب کی بار اسے اتنا شدید دورہ پڑا تھا کہ اسے دو ماہ تک اسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ یہاں فزیو تھراپسٹ سمینتھا نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ وہ روزانہ اس کا حوصلہ بڑھاتی۔ اسے یقین دلاتی کہ وہ نارمل لوگوں کی طرح بھاگ سکتا ہے۔ پہلے پہل اس نے اسے مشین کے ذریعے جاگنگ کروائی۔ وہ دونوں طرف

مشین کو پکڑ کر جاگنگ کرتا پھر آہستہ آہستہ وہ کسی بھی چیز کو تھامے بغیر جاگنگ کرنے لگا اور پھر رفتہ رفتہ وہ واقعی بھاگنے لگا اور خود اس کو یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ اگر چلتے وقت وہ لنگڑا کر چلتا تھا تو بھاگتے وقت اس کا درد بالکل ہی غائب ہو جاتا تھا اور لنگڑاہٹ بھی۔ اسے بالکل ایسا لگتا تھا جیسے اس کے بھاگنے سے اس کا درد بھی اس سے دور بھاگنے لگتا ہے۔ ایک دن جب وہ رننگ مشین پر پچاس میٹر سے دو سو میٹر اور سو سے دو سو میٹر تک بھاگ چکا تو لیزا نے اسے کہا ”محتاط رہو ریان!“

ریان مسکرایا اور اسپیڈ کا بٹن دبا دیا۔ دو سو سے تین سو میٹر...... پھر چار سو...... پھر پانچ سو...... ریان بس بھاگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”میں بھاگ سکتا ہوں...... میں بھاگ سکتا ہوں۔“

لیزا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ وہی ریان تھا جو چند ماہ قبل صرف چند قدم بھی مشکل ہی سے چل پاتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے آہستگی سے بھاگنے کا مشورہ دیا مگر ریان اپنا ذہن بنا چکا تھا۔ وہ گرتا مگر سنبھل جاتا۔ اس میں بہت اعتماد آ گیا تھا اور لیزا ابھی جان گئی تھی کہ اس کا بیٹا ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ریان نے کوچنگ کلب میں داخلہ لے لیا۔ یہ برمنگھم کا بہترین کوچنگ کلب تھا جہاں سے بڑے بڑے اور کامیاب ایتھلیٹ نکلے تھے۔ کوچ فرینک گارڈنر، ریان کی قابلیت اور اس کے سیکھنے کی صلاحیت سے بے حد متاثر ہوا۔ اسے اس کی آنکھوں میں وہ آگ نظر آئی جو ریس جیتنے کے لیے ضروری ہوتی ہے اور جو تمام چیمپئنز کی آنکھوں میں جلتی ہے۔ وہ تیز بھاگتا تھا مگر اس کے پاس ریس کی تکنیک نہیں تھی اور یہی کوچ فرینک کو اسے سکھانی تھی۔ بہت سی نئی مسکن ادویات ریان کو درد قابو میں رکھنے میں مدد دے رہی تھیں۔ ڈوپامین ہارمون سے ملتی جلتی کیمیکل ادویات بھی اس کے درد میں کمی اور اس کی شدت کم کرنے کا موجب بنیں مگر وہ بہت جلد تھک جاتا تھا اور پریکٹس کے بعد بستر پر گر جاتا اور بارہ سے چودہ گھنٹے تک سویا رہتا۔ ان گزرتے سالوں میں ریان اپنے درد سے لڑنا اور اسے چھپانا سیکھ چکا تھا۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ جب وہ بھاگتا تو رفتار بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا درد کم ہونے لگتا اور پھر جب ساٹھ میٹر کی ریس میں اس نے تمام ایتھلیٹس کو پیچھے چھوڑ دیا تو تمام کوچ کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے اور لڑکے اس کا نام پوچھنے لگے۔ ریان بے حد خوش تھا۔ زندگی میں پہلی بار بیماری کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی پہچان بنی تھی۔ کیونکہ ریان نے لیزا سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کلب میں اس کی بیماری کا ذکر کسی سے نہیں کرے گی اس لیے وہاں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس کے ریس جیتنے کے بعد جب ایک اخبار نے اس کی کہانی چھاپی تو اس کے دوستوں اور باقی لڑکوں نے اسے گھیر لیا۔ ان کے لیے یہ بات عقل سے ماورا تھی۔ ایک لڑکا کہنے لگا ”یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اخبار والوں نے خود ہی کوئی کہانی گھڑ لی ہے۔“

مگر جب ریان نے کہا ”یہ سچ ہے۔“

وہ ساکت رہ گئے پھر ایک بولا ”تم یہ ثابت کر سکتے ہو؟“

اگلے تین دن ریان نے اپنی ڈوپامین والی دوا لینا چھوڑ دی۔ چوتھے دن وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلب پہنچا تو اچانک اسے شدید دورہ پڑا، اس کے ہاتھ بری طرح لرزنے لگے اور اس کا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کا لرزتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا اور شرمندہ ہوتے ہوئے کہنے لگا ”ہمیں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔“

ریان اب سولہ سال کا ہو چکا تھا اور برمنگھم کی سالانہ کھیلوں میں اس نے پہلی بار شرکت کی تھی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ساٹھ میٹر دور فنشنگ لائن پر تھیں۔ ریس شروع ہوئی اور ریان دوڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور اس کی پیشانی بلند تھی، بالکل چیمپئنز کی طرح۔ اس کی ماں لیزا، اس کا باپ اینڈی اور چچا اس کی ہمت بندھا رہے تھے اور چلا چلا کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور پھر ریان سب لڑکوں کو پیچھے چھوڑ کر فنشنگ لائن پر پہنچ گیا۔ اس کے خاندان کے لیے یہ لمحہ بہت خوبصورت تھا۔ پھر ریان سیمی فائنل تک پہنچا اور سلور میڈل حاصل کیا۔ اب ریان اپنی عمر کے لڑکوں میں برطانیہ کے دس بہترین ایتھلیٹس میں شمار ہوتا ہے۔

آج بھی بہت سے دن ایسے آتے ہیں جب وہ اس قابل بھی نہیں ہوتا کہ بستر سے اٹھ پائے مگر جب وہ بھاگتا ہے تو ایک چیمپئن کی طرح بھاگتا ہے۔ اس کے ڈاکٹر اور کوچ حیران ہوتے ہیں کہ کس طرح اس نے اپنی بیماری کو معذوری نہیں بننے دیا۔ مگر اس کی ماں لیزا کو یقین ہے کہ اس کا بیٹا مزید کامیابیاں حاصل کرے گا اور اس نے 2012ء میں ہونے والے لندن اولمپکس کے لیے ابھی سے اپنے دفتر سے دو ہفتے کی چھٹیاں لے لی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہے کہ یقین سب سے بڑی طاقت ہے اور ریان کو یقین ہے کہ وہ ایک چیمپئن ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

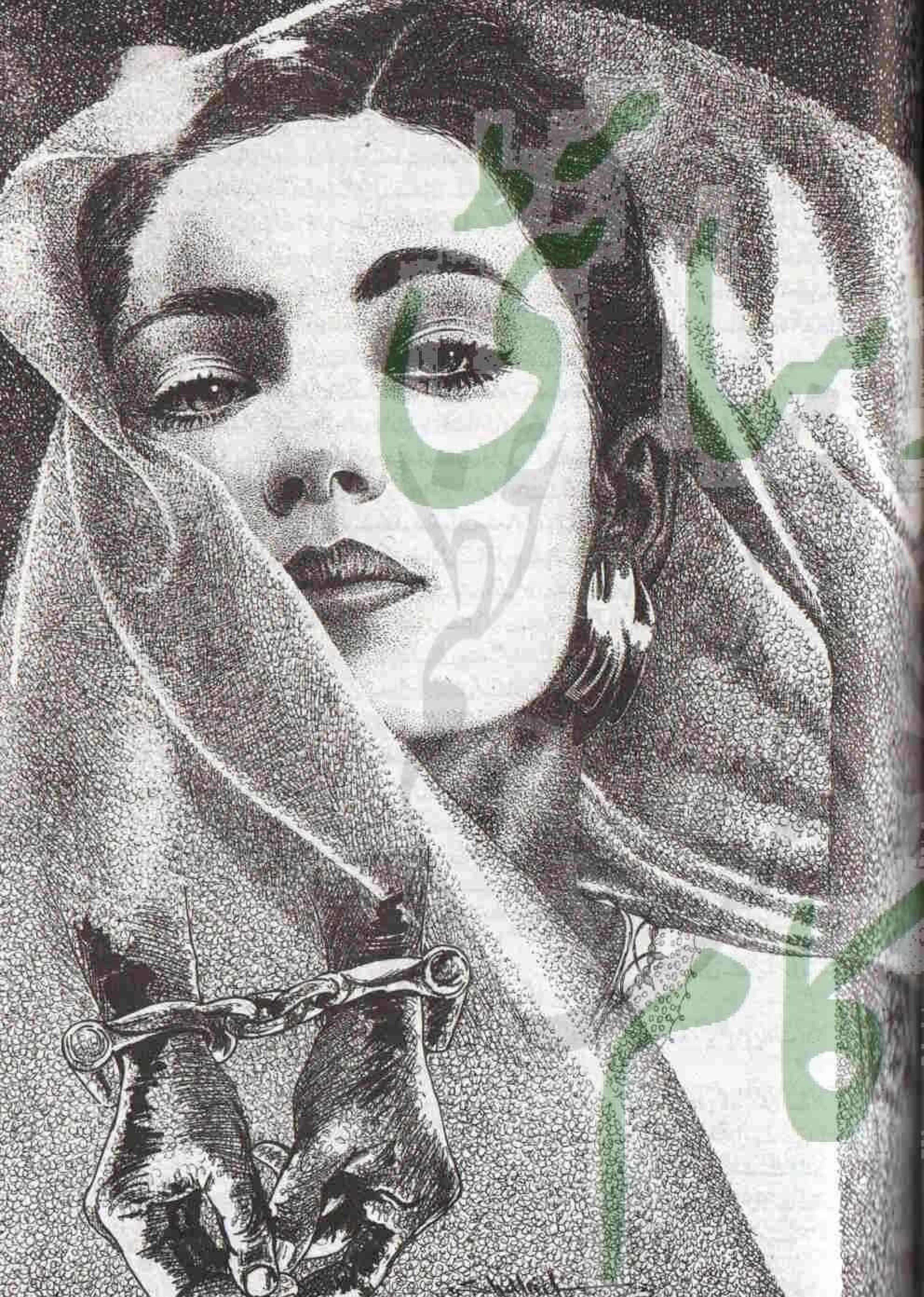

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط 58

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے ماں جی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا اپنے اوباش دوستوں سمیت ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ میری بھانجی شمی اپنے ددھیال جا رہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر بُری طرح زخمی ہو گیا۔ پھر ایک روز ہم سب عتیق کو اسپتال سے لانے پہنچے تا کہ اس کا علاج حکیم قاؤس سے کرا سکیں۔ حکیم قاؤس اس کا علاج کرنے لگا۔ زرین نے فرمائش کر دی کہ میں یہاں بند رہ کر خود کو قیدی محسوس کر رہی ہوں۔ میں اسے سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرا لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پُراسرار وادی تک پہنچا دو تو میں مرشد سے بھی گلو خلاصی کرا دوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے پھر اسلحہ وغیرہ پہنچانے کا انتظام کیا اور مونا وسادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس سے ہوٹل میں آ کر ملوں۔ میں اس سے ملنے پہنچا تھا بائیک کھڑی کر رہا تھا کہ نال کی چبھن محسوس ہوئی اور آواز آئی "ادھر سے چلو اس سے پہلے کہ یہ چل جائے۔" یہ آواز فتح خان کی تھی۔ وہ مجھے نزدیکی پارک میں لایا اور بولا کہ میں دشمنی ختم کر رہا ہوں۔ تمہیں ایمن کو پاکستان بلانا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایمن کو قبضے میں کر کے اس کے باپ سے ہیروں کے متعلق معلومات چاہتا ہے۔ ہم نے وسیم اور سعدیہ کی شادی کرا دی اور واپس آ رہے تھے کہ ایک لڑکی کو اغوا کرنے والے نظر آئے۔ ہم نے ان کے قبضے سے لڑکی کو برآمد کیا۔ گھر آئے تو رات کے وقت کچھ لوگ کتوں کو سونگھا کر لاتے نظر آئے۔ وہ فتح خان کے آدمی تھے اور شہلا کے کپڑوں کی بو سونگھ کر وہاں پہنچے تھے۔ ان سے نمٹنے کے بعد میں نے شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تا کہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ وہ مجھے لے کر اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاند کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ میں نے اسے قابو کیا اور راضی کر لیا کہ وہ بینک کا لاکر کھلوانے میں ہماری مدد کرے گی مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اس کے پیروں میں نقلی بم باندھ کر کہا کہ یہ ریموٹ سے پھٹ سکتا ہے اگر تم نے غلط حرکت کی۔ تبھی اس نے عجیب حرکت کی اور اپنا پیر میرے پیروں میں پھنسا کر بولی "میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔"

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

صورتِ حال کو سنگین تو نہیں لیکن ستم ظریفانہ ضرور کہا جا سکتا تھا۔ بم نقلی تھا اور اس کے بلاسٹ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن جو حربہ ہم نے شہلا کے لیے تیار کیا تھا وہ اسے ہم پر ہی آزمانے کو تیار ہو گئی تھی۔ اس کا پاؤں میرے دونوں پیروں کے درمیان تھا اور اگر بم سچ مچ کا ہوتا یقیناً اس کے ساتھ میرے پرخچے بھی اُڑ جاتے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں اس کی دھمکی کے جواب میں کیا ردِعمل ظاہر کرتا۔ اگر میں بے خوف رہتا تو شک میں پڑ جاتی کہ بم نقلی ہے اور ہمارا مقصد ہی فوت ہو جاتا اور نہ ڈرتا تو وہ اپنی بات منواتی۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "کیا خیال ہے تار کھینچ لوں؟"

"اگر تم مرنا چاہتی ہو تو شوق سے ایسا کرو۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیوں تم نہیں مرو گے، کیا تم بم پروف ہو؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"ظاہر ہے میں بھی مروں گا۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ یہ خودکش حملہ تمہارے لیے اتنا ناگزیر کیوں ہے۔ ظاہر ہے اس کے پیچھے جنت ملنے کا لالچ تو ہوگا نہیں، تمہارے جیسے لوگوں کے لیے دنیا ہی جنت ہے۔"

"مجھے اس بات کی خوشی ہوگی کہ میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔"

"او کے تار کھینچ دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم

کیا سمجھتی ہو بی بی ہم لوگ اس کھیل میں صرف مارنے کے قائل ہیں، نہیں ہم مرنا بھی جانتے ہیں۔ کم آن تار کھینچو۔"

شہلا کے پُراعتماد چہرے پر تذبذب نمودار ہوا۔ میرے سرد ردِعمل نے اسے دہلا دیا تھا۔ وسیم ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کے انداز سے بھی کوئی خوف و دہشت ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ شہلا نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔ "تم لوگ مجھے بے وقوف بنا رہے ہو اندر سے تم سب ڈرے ہوئے ہو۔"

"حالانکہ ڈر تم رہی ہو ہمت ہوتی تو دھمکی نہ دیتیں بلکہ تاریں کھینچ لیتیں۔" وسیم بولا۔ "ویسے تم بلاوجہ اتنا جذباتی ہو رہی ہو، اتنے دن ہمارے ساتھ رہ کر تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم جو زبان دیتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔ بے کردار تو تم ہو اس لیے تم سے کسی وقت بھی دھوکے کی توقع کی جا سکتی ہے اور اسی لیے تمہارے پاؤں کے ساتھ یہ بم باندھا ہے کہ تم بینک کے اندر جانے کے بعد ہمیں دھوکا نہ دے سکو۔"

میں نے نامحسوس انداز میں اسے سمجھایا۔ "شہلا یہ صرف ایک دفاعی حربہ ہے، تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں ہے لیکن تمہارا ردِعمل بتا رہا ہے کہ تمہارے اندر کوئی گڑبڑ ہے اور تم کچھ اور سوچے ہوئے ہو۔"

"یہ غلط ہے۔" اس نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔ "میں تمہارے ساتھ پوری طرح مخلص ہوں اور مجھے غصہ بھی اسی بات پر آیا ہے کہ تم جواب میں میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو۔"

"تم مخلص ہو؟" میں ہنسا۔ "شاید تم بھول رہی ہو، ابھی چند دن پہلے تم نے اپنے ٹھکانے پر مجھے کس طرح دھوکا دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بھی تم زبان دے چکی تھیں۔"

"وہ..... میں..." وہ ہکلا کر رہ گئی اور اس کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے گلابی لب کاٹنے لگی۔ میں نے نرمی سے کہا۔

"یا تو تاریں کھینچ لو یا پھر مہربانی کر کے پاؤں ہٹا لو اور چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے گہری سانس لے کر پاؤں پیچھے کر لیا اور کھڑی ہو گئی۔ "شہباز تم بہت مضبوط اعصاب کے آدمی ہو تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو....."

"مہربانی کر کے بم کی تاریں درست کرو اور اس پر پائنچہ درست کرو ایسا نہ ہو تاریں کسی چیز سے اُلجھ کر کھنچ جائیں اور ہم بلاوجہ ہی اللہ کو پیارے ہو جائیں۔"

اس کا شگفتہ موڈ بحال ہو گیا۔ وہ ہنسی اور بستر پر بیٹھ کر اس نے پینٹ کا پائنچہ بم کے اوپر کر دیا۔ یہ اگرچہ کسی قدر نمایاں ہو رہا تھا لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں کہ دیکھنے والا چونک جائے۔ غور سے دیکھنے پر ہی پتا چلتا تھا کہ پینٹ کے پائنچے تلے کچھ ہے۔ ویسے بھی شہلا کو عبایا پہننا تھا۔ اس نے ڈنر کر لیا تھا۔ میں نے دوپہر میں ڈٹ کر پائے کھائے تھے اس لیے رات کا کھانا گول کر دیا تھا۔ وسیم نے بھی کچھ ہلکا پھلکا لیا تھا تا کہ ہم پوری طرح چاق و چوبند رہیں۔ اب پروگرام یہ تھا کہ میں، وسیم، شہلا اور عبداللہ کے چار آدمی ایاز کے ساتھ اس کی جیپ میں جاتے، اس کا پچھلا حصہ اتنا کھلا تھا کہ سب آرام سے آ جاتے۔ عبداللہ اپنے سات آدمیوں اور تین عدد گاڑیوں کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا اور اس کا کام ہماری بینک آمد سے پہلے اس علاقے کی ریکی کر کے او کے کی رپورٹ دینا تھا اس کے بعد وہ لوگ پوزیشن سنبھال لیتے اور صرف کسی ہنگامی صورتِ حال میں ہماری مدد کے لیے آتے۔ عبداللہ کے چاروں آدمیوں نے گارڈز سے ملتی جلتی وردیاں پہن لی تھیں۔ جب بینک گارڈز دوا ملی کافی پی کر ٹن ہو جاتے تو یہ چاروں ان کی جگہ سنبھال لیتے۔

روانگی سے پہلے میں نے سوچا کہ اتنے لوگ ایک جیپ میں سوار ہوں گے اور پھر شہلا جیپ سے بینک کے سامنے اُترے گی تو ممکن ہے گارڈز اور اس سے زیادہ شاہد منظور کو یہ بات عجیب لگے اور وہ کھٹک جائے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم کار بھی لے لیں۔ شہلا اور میں کار میں جاتے۔ باقی پارٹی جیپ میں ہوتی۔ راستے میں عبایا لیتے اور بینک کے پاس پہنچ کر میں ڈرائیونگ شہلا کے حوالے کر دیتا اور وہ یوں بینک کے سامنے اُترتی جیسے اکیلی آئی ہو۔ میں نے وسیم سے مشورہ کیا تو اس نے بھی تائید کی۔ "مجھے بھی جیپ مناسب نہیں لگ رہی تھی۔"

اب تبدیل شدہ پلان یہ تھا کہ شہلا میرے ساتھ کار میں ہوتی۔ شہلا کو پتا چلا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ "مجھے بھی اس منحوس جیپ میں جانے کے نام سے کپکپی آ رہی تھی، اس میں ہوا چاروں طرف سے گھستی ہے اور پچھلا حصہ تو فریزر بن جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اس میں تمہارا فریزر بنتا تھا لیکن میرے ساتھ کار میں تمہیں مرغا بننا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے پوچھا۔

"مطلب تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

ہم باہر آئے جہاں بیتو نے کافی کا تھرماس تیار کر دیا تھا۔ سفیر کا اس میں شامل دوا کے بارے میں دعویٰ تھا کہ وہ

کسی بھی ہوش مند آدمی کو صرف دو منٹ میں ہوش وخرد سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ اس نے مزید ارشاد فرمایا۔

''اس سے زیادہ تیزی سے یہ کام صرف ایک حسین عورت کر سکتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے شہلا کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ''میرا خیال ہے شاہد منظور کو کافی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

وہ غرور سے مسکرائی۔ ''جو ہم کرنے جارہے ہیں اگر وہ نہ کرنا ہوتا تو یقیناً ضرورت نہیں پڑتی۔''

شہلا کا غرور جائز تھا، وہ بلاشبہ بہت دل کش عورت تھی اور کوئی بھی شخص اس کے حسن کے اثر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ سفیر اور بیتو مضطرب تھے کیونکہ انہیں پیچھے گھر میں رکنا تھا۔ سفیر نے کہا۔ ''یار ہمیں بھی لے چل۔''

''شوبی ہم بھی چلے گا۔'' بیتو نے منمنا کر کہا۔

''ہم تفریح کرنے نہیں جارہے ہیں۔'' میں نے انہیں سمجھایا۔ ''یہاں بھی کسی کا رہنا ضروری ہے۔ ان دو نمونوں کی دیکھ بھال کے لیے۔''

شہلا کو اوپر لانے سے پہلے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی لیکن اس حالت میں اسے کار میں نہیں لے جایا سکتا تھا۔ کوئی بھی دیکھ کر مشکوک ہو سکتا تھا کہ کار میں ایک آنکھوں پر پٹی بندھی عورت ہے اور اسے ایاز کی جیب میں بھی بٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ نازک عورت تھی اور اپنے کردار سے قطع نظر اس کی مستحق تھی کہ اسے مشکلوں سے محفوظ رکھا جائے۔ طے پایا تھا کہ میری کار آگے ہو گی اور ایاز کی جیپ پیچھے آئے گی۔ شہلا کو فرنٹ سیٹ پر بٹھانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''گھٹنوں پر جھک جاؤ۔''

''وہ کیوں؟''

''سوال مت کرو۔'' میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو جیپ میں سفر کرنا ہو گا۔''

وہ فوراً گھٹنوں پر جھک گئی۔ اپنے لچکدار جسم کی وجہ سے اسے آسانی ہوئی۔ اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو اس کے لیے یہ کام خاصا دشوار ہوتا۔ پھر بھی اسے کچھ نہ کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ اس نے شکایت کی۔ ''اس طرح میری کمر میں تکلیف ہو رہی ہے۔''

''کچھ دیر کی تکلیف ہے برداشت کر لو۔'' میں نے کار اسٹارٹ کر کے احاطے سے باہر لاتے ہوئے کہا۔ پیچھے ایاز کی جیپ آئی اور ہم اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔

''کتنی دیر؟''

''بس دس منٹ۔'' میں نے کار کی رفتار بڑھائی۔ سوا آٹھ بجے ہی سڑک پوری طرح ویران ہو گئی تھی۔ مگر دھند نہیں تھی۔ شہلا کو اب اپنے سامان اور خاص طور سے چرمی بیگ کی فکر لگ گئی تھی جس میں اس کی دولت تھی۔ ''شہباز اس کا کیا ہو گا کامیابی کی صورت میں؟''

''میری بات پر اعتبار کرو تم جہاں کہو گی میں پہنچا دوں گا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''میرے ساتھ رہ کر تم اتنا تو جان گئی ہو گی کہ میں وعدہ نبھانے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔''

''اس بریف کیس میں کیا ہے؟'' شہلا نے چینی حکومت کے اس خفیہ بریف کیس کے بارے میں پوچھا۔ ظاہر ہے میں اسے نہیں بتا سکتا تھا۔

''یہ میرے پاس کسی کی امانت ہے اور میں اسے واپس اس کے مالک تک پہنچانا چاہتا ہوں۔''

اسے غالباً میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے شک سے کہا۔ ''تم صرف بریف کیس کو اس کے مالک تک پہنچانے کے لیے یہ سب کر رہے ہو اور تمہارا اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے؟''

''ہاں ایسی ہی بات ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''آج کے دور میں کون ایسا کرتا ہے۔''

''تم اپنے ذہن کے لحاظ سے سوچ رہی ہو اس لیے تمہیں یقین نہیں آرہا ہے حالانکہ تمہیں چاہیے میری شخصیت کو سامنے رکھ کر اس پر سوچو۔ ویسے تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔''

''ہر انسان اپنے لحاظ سے ہی سوچتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''مرضی تمہاری۔'' میں نے کہا۔ ''اب پٹی اُتار کر سیدھی ہو جاؤ۔''

اس نے جلدی سے سیدھے ہو کر پٹی اُتار دی۔ ٹول پلازہ آنے والا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔ ''میرا اندازہ درست نکلا تم لوگوں نے مری جانے والے راستے پر کہیں ٹھکانا بنا رکھا ہے۔''

میں نے شانے اچکائے۔ ''تم اندازے لگانے کے لیے آزاد ہو۔''

بھارہ کہو کی مارکیٹ بند ہو گئی تھی اور اکا دکا ہوٹلز اور دکانیں کھلی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہم اسلام آباد میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک دیر تک کھلی رہنے والی مارکیٹ سے میں نے شہلا کے لیے عبایا لیا۔ عبایا اس نے وہیں پہن لیا۔ اس میں نقاب بھی تھا اور نقاب کرنے کے بعد اسے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔

اب ہماری مہم کا اصل مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ ساڑھے نو بجے ہم بینک کے علاقے میں داخل ہوئے۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ویسے ہمارے پاس ریڈیو بھی تھے لیکن ان کے بارے میں طے تھا کہ انہیں صرف بینک میں گھسنے کے وقت استعمال کیا جائے گا۔ یہ شارٹ رینج ریڈیو ایف ایم بینڈ پر کام کرتے تھے اور کوئی بھی شخص جس کے پاس ایف ایم ریڈیو ہوتا ٹیون کرنے پر ہماری باتیں سن سکتا تھا۔ اس لیے ریڈیو کا کم سے کم استعمال ہی بہتر تھا اس کے مقابلے میں موبائل بہتر مواصلاتی آلہ تھا۔

''عبداللہ ہم پہنچ گئے ہیں۔'' میں نے اسے اطلاع دی۔

''میں نے دیکھ لیا ہے آپ کی گاڑیوں کو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہاں سب او کے ہے۔ رات والی شفٹ تبدیل ہو چکی ہے۔''

''ماحول کیسا ہے؟''

''سنسان ہے، اتنی سردی کی وجہ سے لوگ گھروں سے نکلنے سے گریز کر رہے ہیں اور جو اکا دکا آجا رہے ہیں وہ بھی گاڑیوں میں ہیں۔''

''چوکیدار اور پولیس کی کیا پوزیشن ہے؟''

''چوکیدار یہاں گھروں میں ہوتے ہیں۔ پولیس کی یہ پوزیشن ہے کہ ان کی گاڑی آدھے گھنٹے میں ایک بار نظر آتی ہے۔ ہم نے اپنی گاڑیاں اس طرح کھڑی کی ہیں کہ وہ بظاہر علاقے کے مکینوں کی گاڑیاں لگ رہی ہیں۔''

''گڈ۔'' میں نے کہا۔ ''ہم پارک کی طرف جارہے ہیں۔''

''ایاز سے کہیں وہ جیپ روکے نہیں ورنہ وہ یہاں مس فٹ نظر آئے گی اور ممکن ہے پولیس اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ وہ سرکل کرتا رہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ کر ایاز کو کال کی۔ ''ایاز عبداللہ کا خیال ہے کہ تم کہیں رکنے کے بجائے علاقے میں گھومتے رہو۔ ممکن ہے جیپ پولیس والوں کو مشکوک لگے کیونکہ یہاں لوگ اس قسم کی گاڑی نہیں رکھتے ہیں۔''

''جیسا آپ کہیں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے ابھی خاصا وقت ہے آپ کہیں تو ہم اس جگہ سے ذرا دور چلے جائیں یہاں سے دو کلو میٹر دور ایک عام سی بستی ہے وہاں ساری رات کھلے رہنے والے ہوٹل ہیں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔''

''کسی کال کی صورت میں پانچ منٹ میں یہاں ہوں گے۔''

''ایسا کر لو۔'' میں نے اسے اجازت دے دی تو ایاز دوسروں کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے اپنی کار بینک سے ذرا دور ایک چھوٹے سے پارک کے ساتھ پارک کر دی۔ یہاں اور بھی کئی گاڑیاں پارک تھیں اس لیے کسی کے خصوصی طور پر متوجہ ہونے کا امکان کم تھا۔ شہلا خاموشی سے میری گفتگو سن رہی تھی۔ جب میں نے موبائل رکھا تو اس نے کہا۔ ''شہباز ساتھیوں کے معاملے میں تم بہت خوش نصیب ہو میں نے ایسے جاں نثار ساتھی کسی کے نہیں دیکھے۔ آج کل کوئی کسی کا ساتھ بھی دیتا ہے تو اس میں اس کا کوئی نہ کوئی مفاد ہوتا ہے۔ بے غرض کوئی ساتھ نہیں دیتا۔''

''تم نے ٹھیک کہا یہ خدا کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اتنے اچھے دوستوں سے نوازا ہے لیکن یہ تعلق یک طرفہ نہیں ہے اگر وہ میرے لیے جان دے سکتے ہیں تو وقت پڑنے پر میں بھی اپنی جان بلا جھجک ان پر قربان کر سکتا ہوں۔ تم اسے دوستی، خلوص اور محبت کا تعلق سمجھ سکتی ہو۔''

''مرشد بہت خطرناک آدمی ہے، وہ بہت طاقت ور ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں اس کے پاس ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہو گا۔''

''مرشد ایک خود غرض اور سفاک آدمی ہے جسے سوائے اپنی ذات کے... کسی سے پیار نہیں...... اس لیے قدرتی بات ہے اسے ساتھی بھی ایسے ہی ملے ہیں جو اس کی دولت اور طاقت کے غلام ہیں۔ اگر مرشد کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ رہیں تو وہ اسے پلٹ کر بھی نہ پوچھیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شہلا پارک میں جلتی لائٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے تم لوگ مرشد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے اصل نقصان اس کی جان کا ہے۔ تم اس کے آدمی مارو گے تو اس کے پاس حرام موت مرنے والوں کی کمی نہیں.... تم اسے مالی نقصان کرو گے تو اس کے پاس حرام دولت کی کمی نہیں ہے۔ تم کہہ چکے ہو کہ اسے سوائے اپنی ذات کے اور کسی سے پیار نہیں.... اس لیے اگر تم اس کے کسی رشتے کو نقصان کرو گے تو اسے اس سے بھی خاص فرق نہیں پڑے گا۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور تسلیم کیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن تمہارے کہنے کا مقصد کیا ہے؟''

''یہی کہ تم بے کار میں اتنی کوشش کر رہے ہو۔ مرشد کو نشانہ بناؤ اس کے مرتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

”وہ کیسے؟“

”تمہاری دشمنی مرشد سے ہے نا، کسی اور سے تو نہیں ہے؟“

”یہ تم نے کیسے جانا مس شہلا؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”تمہارے خیال میں کیا مرشد کسی ایک آدمی کا نام ہے؟“

”پھر کیا ہے وہ کوئی مافیا ہے جو ایک باس مر جائے تو دوسرا اس کی جگہ سنبھال کر کام وہیں سے شروع کر دیتا ہے؟“

”اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پیری مریدی مرشد کا خاندانی بزنس ہے۔ اگر وہ نہیں رہے گا تو جو بھی اس کی جگہ آئے گا اس کے لیے مجھ سے بدلہ لینا لازمی ہوگا کیونکہ اسی طرح وہ اپنے لوگوں کی نظروں میں اپنا وقار برقرار رکھ سکے گا۔ صرف مرشد کو ختم کرنے سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

”تب تو تمہارا مسئلہ کبھی بھی حل نہیں ہوگا۔“ اس نے یقین سے کہا۔

”مس شہلا یہ تمہارا خیال ہے۔ اس دنیا میں جو بھی مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس کا حل لازمی ہوتا ہے۔ ویسے تم میرے مسئلے کے بجائے اگر اپنے ممکنہ مسائل پر توجہ دو تو بہتر ہوگا۔“

”کون سے مسائل؟“

”تم شاہد منظور سے حلیہ بدل کر ملتی رہی ہو لیکن اس وقت تم اپنے اصل حلیے میں ہو اور کیا وہ تمہیں دیکھ کر چونکے گا نہیں۔“

”ہاں چونکے گا۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں اندر جانے کے بعد نقاب نہیں رکھ سکوں گی ورنہ وہ مشکوک ہو سکتا ہے۔“

”اس کا ایک حل ہو سکتا ہے تم اندر جاتے ہی اسے کافی نکال کر دینا اور کیونکہ تم گارڈز کے سامنے نہیں آتی ہو اس لیے نقاب میں رہنے کا ایک بہانہ مل جائے گا۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ شاید اس نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا اور کیونکہ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا اس لیے مجھے فکر نہیں تھی کہ بعد میں شاہد منظور اسے پہچانتا ہے یا نہیں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”مجھے یہی کرنا پڑے گا، میرا خیال ہے وہ بھی جلدی ان سارے معاملات کو نمٹانا چاہے گا تاکہ پھر گارڈز کے آنے جانے کا امکان نہ رہے۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموش رہا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ دس بجے اور پھر گیارہ بج گئے۔ اس طرح وقت گزارنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ اس طرح انتظار کرنے والے ہی جانتے ہیں۔ اس دوران میں خوش قسمتی سے کسی نے ہم پر غور نہیں کیا تھا۔ چند ایک گاڑیاں اور پیدل افراد وہاں سے گزرے تھے وہ بھی اپنے دھیان میں تھے۔ یہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے پولیس کا گزر بھی یہاں سے کم تھا اور اب تک مجھے ایک بھی پولیس کار نظر نہیں آئی تھی۔ شہلا نے کہا۔ ”مجھے شاہد منظور کو اپنے آنے کے بارے میں بتانا ہوگا۔“

میں نے اسے موبائل دیا اور اس نے شاہد کا نمبر ملایا۔ ”میں بات کر رہی ہوں۔“ اس نے اپنا نام لیے بغیر کہا۔ ”کچھ دیر میں آ رہی ہوں .... ہاں آج تمہارے لیے کافی بنا کر لا رہی ہوں .... ہشت۔“ شہلا نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس نے موبائل مجھے واپس کیا تو اس کا چہرہ کسی قدر سرخ ہو رہا تھا شاید شاہد نے کوئی رومانی بات کی تھی۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”شہلا ممکن ہے آج ہماری آخری ملاقات ہو۔ میں بہت دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں۔“

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”یہی کہ تمہارا تعلق ایک اچھے خاندان سے ہے۔ پھر تم ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بیوی رہی ہو۔ پھر تم اس لائن میں کہاں سے آ گئیں۔ دولت کی تمہاری پاس کمی نہیں ہے۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”جرم میری لائن نہیں ہے۔ مجھے اس ذلیل اور نام نہاد پروفیسر نے مجبور کیا۔ مجھے اعتراف ہے اور تم جانتے ہو میں کوئی اچھے کردار کی عورت نہیں ہوں۔ میں بندھی ٹکی زندگی کی قائل نہیں ہوں۔ پروفیسر نے اسی چیز کا فائدہ اٹھایا اور اس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے میری تصاویر حاصل کر لیں۔ پھر اس نے مجھے بلیک میل کیا اور مجھ سے بہت سارے کام ایسے لیے جو عملاً جرم ہوتے ہیں۔“

”اب اگر تمہیں اپنے تصاویر اور ان کے نیگیٹو مل جاتے ہیں تو تم اپنی نارمل زندگی کی طرف واپس لوٹ جاؤ گی؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”یقیناً میرا یہی ارادہ ہے۔“

وہ جھوٹ بول رہی تھی اگر اس کا ارادہ یہی ہوتا تو اسے لاکر کی دوسری چیزوں سے کیا مطلب ہو سکتا تھا اور اسے ان کو حاصل کرنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا لیکن وہ مجھ سے اسی شرط پر تعاون کر رہی تھی کہ ایک بار لاکر تک رسائی حاصل کرنے کے بعد میں اس میں سے صرف بریف کیس لوں گا اور باقی چیزیں اس کے حوالے کر دوں گا اور میں اس کی بات مان گیا تھا۔ مگر میرا ایسا کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں اس گھنا سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا تاکہ پروفیسر کے چنگل میں پھنسے دوسرے لوگ سکون کا سانس لے

سکیں۔ خطاؤں اور گناہوں سے کوئی انسان خالی نہیں ہے اس لیے کسی غلطی کو ثبوت بنا کر اسے بلیک میل کرنا میرے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ میں شہلا کو اس جرم کی اجازت نہیں دے سکتا تھا لیکن فی الحال میں اسے یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا پہلا مرحلہ لاکر تک رسائی کا تھا۔ اس کے بعد ہی ہم کچھ کر سکتے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے مجھے ایاز کی کال آئی۔

”جناب وقت کم رہ گیا ہے اب کیا حکم ہے؟“

”تم آ جاؤ اور بینک کے ساتھ والی گلی میں رک کر اگلے قدم کا انتظار کرو لیکن کوشش کرنا کسی کی نظروں میں نہ آؤ۔“

”آپ بے فکر رہیں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ ”وقت آ گیا ہے۔“

”ہم پوری طرح مستعد ہیں۔“

میں نے موبائل رکھ کر اپنی ٹوپی کے ساتھ کان سے ہیڈ سیٹ لگا لیا۔ ایسا ہی ایک ہیڈ سیٹ شہلا کو نقاب تلے اس کے کان میں لگایا اور اسے خبردار کیا۔ ”یہ آن پوزیشن میں اور اسے آن رہنا چاہیے اگر تمہاری آواز آنا بند ہوئی تو اس کا مطلب ہوگا کوئی گڑبڑ ہے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کسی گڑبڑ کی صورت میں ہم کیا کریں گے؟“

”دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر کار کی پچھلی نشست پر آیا اور شہلا کی طرف چابی بڑھا دی۔ ”اب ڈرائیو تم کرو گی اور میں پچھلی نشست پر موجود ہوں گا لیکن باہر سے کسی کو نظر نہیں آؤں گا تم گاڑی بینک کے سامنے لیکن اتنی دور روکو گی کہ کوئی گارڈ اس تک آنے کی زحمت نہ کرے۔“

”میں سمجھ گئی۔“ اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے ہیڈ سیٹ پر سب کو خبردار کیا۔

”ہم منزل کی طرف جا رہے ہیں۔“ میں نے احتیاطاً بینک کا نام لینے سے گریز کیا۔ باری باری ایاز، وسیم اور عبداللہ نے مجھے بتایا کہ وہ بھی تیار ہیں۔ دو منٹ بعد شہلا نے کار بینک کے سامنے لیکن سڑک کے دوسرے کنارے روکی۔ میں پچھلی نشست پر دراز تھا اور جب تک کوئی بالکل پاس آ کر کار میں نہ جھانکتا میری موجودگی کے بارے میں جاننا مشکل تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”چابی کار میں لگی رہنے دو۔“

شہلا نے ایسا ہی کیا اور ڈیش بورڈ پر رکھا درمیانے سائز کا تھرماس اٹھایا اور نیچے اتر گئی۔ عبایا میں بھی اس کا سراپا نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ دھیمی لیکن متوالی چال کے ساتھ بینک کی طرف بڑھی۔ میں نے ہینڈ سیٹ کانوں میں لگا لیا۔ اس کے عبایا میں ڈیکٹا فون چپکا دیا تھا تاکہ اندر ہونے والی باتیں سنتا رہوں۔

اس نے جہاں کار کھڑی کی تھی وہاں تاریکی تھی اس لیے میں نے ذرا سا سر اوپر کر کے دیکھ لینے میں حرج نہیں سمجھا۔ شہلا گارڈز کے پاس پہنچی اور اس نے کسی قدر بدلی آواز میں کہا۔ ”میں شاہد منظور سے ملنے آئی ہوں۔“

”جی جی ضرور ملو۔“ گارڈ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”انہوں نے بتا دیا ہے جی آپ اندر جا سکتی ہو۔“

گارڈ نے دروازہ کھول دیا اور شہلا اندر چلی گئی۔ اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی لیکن چند لمحے بعد مجھے شاہد منظور کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے شکوہ کر رہا تھا۔ ”تم تو انتظار میں جان لے لیتی ہو۔“

”جان دینے کی اتنی جلدی کیا ہے۔“ شہلا نے معنی خیزی سے کہا۔ ”آرام سے دینا۔“

”آرام سے تو نہیں دے سکتا۔“ شاہد نے فحش لہجے میں کہا۔ وہ جس قسم کا آدمی تھا اس سے اسی قسم کے جملوں کی توقع کی جا سکتی تھی۔ خاص طور پر شہلا اس سے تنہائی میں ملنے آئی تھی تو وہ انسانیت کا لبادہ اتار کر بالکل حیوان بن رہا تھا اس نے چند ناقابل بیان جملوں کے بعد پیش قدمی کرنی چاہی تو شہلا نے اسے روک دیا۔

”اتنی جلدی کیا ہے ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تمہارے لیے کافی لاؤں گی۔ پہلے یہ تو پی لیں۔“

”میں نے تو کچھ اور بندوبست بھی کر رکھا ہے۔“ شاہد بولا۔ ”لیکن تمہارے ہاتھوں کی کافی بھی کم نشیلی نہیں ہوگی لیکن چہرے سے یہ نقاب تو ہٹا دو۔“ وہ بالکل ریشہ خطمی ہو رہا تھا۔

”ابھی نہیں۔“ شہلا بولی۔ ”کافی خاصی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں ان بے چارے گارڈز کو بھی دے دوں۔ سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں۔“

شاہد کو یہ بات پسند نہیں آئی لیکن اس نے منع نہیں کیا۔ شہلا نے اسے ایک گارڈ کو بلانے کو کہا۔ اس نے انٹرکام پر کسی جبار کو بلایا۔ اس دوران میں شہلا یقیناً کپوں میں کافی نکال رہی تھی۔ جبار کے آنے پر اس نے کپ اسے تھما دیے اور بولی۔ ”ٹھنڈی ہو رہی ہے جلدی پی لو ورنہ مزہ نہیں آئے گا۔“

”سب ہوشیار ہو جائیں، تم لوگ آ جاؤ مگر سامنے مت آنا۔“ میں نے وسیم اور ایاز سے کہا۔ یہ طے تھا کہ کسی کا نام

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in. just visit www.paksociety.com for complaints and issues send mail at admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

[illegible] لیتا ہے۔

"ہم آ رہے ہیں۔" وسیم بولا۔

میں نے اپنا پستول نکال کر چیک کیا اور حرکت میں آنے کے لیے تیار ہو گیا۔ عین ممکن تھا کہ گارڈز میں سے کوئی کافی نہ پیتا یا اتنی تاخیر کر دیتا کہ اس کے دوسرے ساتھی بے ہوش ہو جاتے اور وہ ہوشیار ہو جاتا تو اس صورت میں ہمیں اسے قابو کرنا پڑتا۔ میرے کان شہلا اور شاہد کی باتوں پر مرکوز تھے۔ شہلا نے اس کے لیے کافی نکال دی تھی اور ابھی شراب اس نے چکھی بھی نہیں تھی لیکن وہ بہکنا شروع ہو گیا تھا۔ شہلا بڑی ہوشیاری سے اسے ہینڈل کر رہی تھی۔ اس نے پھر شہلا سے تقاضہ کیا کہ وہ رُخ سے نقاب ہٹا دے۔ جواب میں شہلا نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

"فکر مت کرو سارے نقاب ایک ساتھ ہی ہٹاؤں گی تم خوش ہو جاؤ گے۔"

شہلا کی اس بات پر شاہد منظور مارے جذبات کے لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ اس کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ شہلا نے اسے کافی پینے پر مجبور کیا۔ اسی دوران میں اندر موجود گارڈ باہر دونوں گارڈز کے لیے کافی لایا اور انہیں دے کر فوراً اندر چلا گیا۔ موسم سرد تھا اور کافی تیزی سے ٹھنڈی ہو جاتی اس لیے باہر والے فوراً ہی پینے لگے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا۔ "باہر والے کافی پی رہے ہیں ان کے لڑھکتے ہی تم حرکت میں آ جانا۔"

"اے..... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔" اچانک شاہد منظور کی گھبرائی آواز آئی۔ "میرا سر کیوں چکرا رہا ہے۔"

"شاید مجھے دیکھ کر۔" شہلا ہنسی۔ "کافی ختم کرو اس سے سارے چکر رک جائیں گے۔"

شاہد نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور فوراً ہی اس کے لڑھکنے اور کراہنے کی آواز آئی۔ شہلا دبی زبان میں بولی۔ "یہ گر گیا ہے۔"

"اندر والے گارڈز کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم وہ مجھے یہاں سے نظر نہیں آ رہے۔" شہلا بولی۔ اسی لمحے باہر موجود گارڈز پر کافی میں موجود دوا کا اثر ہونے لگا اور وہ لڑکھڑانے لگے۔ میں نے کہا۔

"ہری اپ وہ گرنے والے ہیں۔"

وسیم اور ایاز کے ساتھ گارڈز کی وردیوں میں ملبوس عبداللہ کے چاروں ساتھی تیزی سے گلی سے نکل کر بینک کی طرف آئے۔ اس دوران میں دونوں گارڈز لمبے ہو چکے تھے۔ عبداللہ کے ساتھیوں میں سے دو نے ان بے ہوش گارڈز کو اُٹھایا اور ان کو لے کر بینک کی عمارت میں گھس گئے دو باہر رہ گئے تھے۔ وسیم ان کے پیچھے تھا۔ فوراً ہی مجھے عبداللہ کے ایک ساتھی کے چلّانے کی آواز آئی۔ "خبردار گن رکھ دو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"تم..... ڈاکو..... ہو۔" بینک گارڈ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ شاید اس نے تاخیر سے کافی پی تھی اس لیے اب تک بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس سے ہتھیار رکھوانے کی نوبت نہیں آئی وہ اس سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ وسیم نے کہا۔ "راستہ صاف ہے جناب۔"

یہ اشارہ تھا کہ میں بینک میں تشریف لے آؤں۔ میں نے کہا۔ "عبداللہ میں اندر جا رہا ہوں۔"

"میں پوری طرح ہوشیار ہوں جناب۔" عبداللہ نے کہا۔

میں کار سے اُتر کر اندر بینک کی طرف بڑھا۔ عبداللہ کے دونوں آدمی باہر آ کر اپنی جگہ سنبھال چکے تھے۔ اب کسی بھی دیکھنے والے کو بینک میں سب معمول کے مطابق نظر آتا۔ جب میں اندر پہنچا تو وسیم بے ہوش گارڈز کے ہاتھ پاؤں، منہ اور آنکھیں ٹیپ سے بند کر رہا تھا۔ میں سیدھا سیف ایریا کی طرف بڑھا اور فولادی دروازے پر دستک دی۔ شہلا اندر سے بولی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسے تم سب ٹی وی پر دیکھ رہی ہو گی۔"

وہ ہنسی اور دروازہ کھول دیا۔ میں اندر آیا۔ شاہد منظور کرسی پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا عام صورت و شکل کا مرد تھا۔ بلکہ جسم ... قدرے بے ڈول تھا۔ عام حالات میں شہلا شاید اس پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتی لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ اس کی داشتہ تک بن چکی تھی۔ میرے اشارے پر عبداللہ کا ایک آدمی اسے بھی کور کر لے گیا۔ دوسرا آدمی جسے ڈرل اور برقی آری استعمال کرنا تھی اپنے اوزاروں سمیت اندر آ گیا۔ شہلا نے کوڈ لگا کر لاکر روم کا دروازہ کھولا۔ اندر دیوار کے ساتھ کوئی دو درجن لاکر تھے۔ شہلا نے دائیں طرف سے نیچے سے اوپر دوسری لائن میں چوتھے لاکر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ہے؟"

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

"بالکل۔" اس نے کہا۔ "میں بینک کے ریکارڈ

دیکھ چکی ہوں۔ یہ پروفیسر نفیس کے نام پر ہے۔"

"نجی بینک کی کارکردگی کا یہ عالم ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "پروفیسر کو مرے کئی مہینے ہونے کو آئے ہیں اور ان کو پتا ہی نہیں ہے۔"

"کیونکہ پولیس یا کسی اور کی طرف سے بینک کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی ہے۔" شہلا نے وضاحت کی۔ "بینک کے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اس کا کلائنٹ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔"

عبداللہ کا آدمی لاکر کا معائنہ کر رہا تھا اس نے ڈرل سے آغاز کرنے کا فیصلہ کیا اس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ لاکر کی فولادی چادر کتنی موٹی ہے۔ اس نے ڈرل کی تار ساکٹ بورڈ میں لگائی اور اپنا کام شروع کر دیا۔ وسیم شاہد اور بینک کے چاروں گارڈز کو واش روم میں منتقل کر کے ہمارے پاس آ گیا۔ اس محدود سی جگہ میں ڈرل کا بے پناہ شور گونجنے لگا اور فی الحال ہم کوئی بات کرنے کے قابل نہیں رہے تھے ویسے ہمیں لاکر کھلنے کی جلدی تھی۔ ڈرل کے برمے نے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں چادر میں سوراخ کر دیا۔ اس میں دھاتی ریزے بھر گئے تھے۔ عبداللہ کے آدمی نے سوراخ کو صاف کیا فولادی چادر کا معائنہ کیا۔

"یہ زیادہ موٹی نہیں ہے۔"

"لاکر کتنی دیر میں کھل جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اب برقی آری نکالی۔ "شاید بیس منٹ یا آدھا گھنٹا لگے۔ آپ باہر چلے جائیں اس کا شور بہت زیادہ ہوگا لاکر روم کا دروازہ بند کر دیں ورنہ آواز بینک کے باہر تک جائے گی۔"

"تم فکر مت کرو۔" وسیم نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "ہمیں شور کی عادت ہے تم اپنا کام کرو۔"

میں نے لاکر روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ عبداللہ کے آدمی نے برقی آری آن کر کے اس کا کٹر لاکر کے تالے والے حصے پر رکھا فوراً ہی مشین کے شور میں دھات کٹنے کی کریہہ آواز شامل ہو گئی اور اس بند جگہ یہ واقعی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ڈرل کے مقابلے میں آری سست روی سے کام کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کا استعمال بہت احتیاط سے کرنا پڑتا ہے، اگر کٹر کہیں پھنسے تو یہ پلٹ کر بہت قوت سے چلانے والے کی طرف آتا ہے اور اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے عبداللہ کا آدمی آرام سے کام کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شہلا کے لیے یہ شور ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"شہباز پلیز میں باہر جا رہی ہوں۔"

"میں بھی چل رہا ہوں۔" میں نے کہا اور شہلا کے ساتھ باہر آ گیا۔ اس نے عبایا کا نقاب ہٹا دیا تھا اور اس کے خدو خال تیکھے ہو رہے تھے۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ "تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔"

"کیا ہونا چاہیے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ وہ خاموش رہی اور اس کی خاموشی ہی میرے سوال کا جواب تھی۔ لاکر روم کا دروازہ بند ہونے سے باہر آنے والا شور بہت کم رہ گیا تھا۔ اس شور کا بینک کے باہر تک جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے سیف ایریا کا معائنہ کیا۔ دن میں اس جگہ کیش ہینڈلنگ کرنے والے بیٹھتے تھے اور یہاں سے ایک چھوٹی سی دراز کیشئر کاؤنٹر کی طرف کھل رہی تھی جس سے کیش لیا اور دیا جاتا ہوگا۔ عقبی حصے میں لاکر روم اور اسٹرنگ روم تھا۔ جہاں نقد رقم رکھی جاتی تھی۔ رات میں یہ سیکورٹی سپر وائزر کا دفتر بن جاتا تھا۔ شاہد منظور نے اپنی سہولت کے لیے ایک چرمی کوچ حاصل کر لی تھی اور وہ اسے شہلا سے ملاقاتوں میں استعمال کرتا تھا۔ شہلا خاموش اور کچھ فکر مند تھی۔

"تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "کیونکہ مجھے معلوم ہے تم مجھے لاکر کی دوسری چیزیں نہیں دو گے۔"

میں چونکا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

اس نے سرد آہ بھری۔ "اتنے دن تمہارے ساتھ رہ کر میں تمہیں اچھی طرح جان گئی ہوں۔ تم میری تصویریں اور نیگیو مجھے دے دو گے لیکن دوسروں سے متعلق اسٹف مجھے نہیں دو گے وہ تم ضائع کر دو گے۔"

شہلا میرے اندازے سے زیادہ چالاک ثابت ہوئی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ "تم نے درست اندازہ لگایا ہے لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "وعدہ تم نے کیا تھا۔ تمہارے کسی ساتھی نے تو نہیں کیا تھا وہ ان چیزوں پر قابض ہو جائے گا اور میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔"

"تم سچ مچ ذہین عورت ہو۔ میں واقعی اس بلیک میلنگ اسٹف کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے علاوہ لاکر سے جو رقم یا دوسری قیمتی اشیا نکلیں گی وہ تمہاری ہوں گی۔"

"مجھے رقم یا قیمتی اشیا کی پروا نہیں ہے۔"

"تم بلیک میلنگ اسٹف کے چکر میں ہو۔ کیا تمہارا ارادہ پروفیسر کا دھندہ جاری رکھنے کا ہے۔"

"اس چیز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔" وہ

سرد لہجے میں بولی۔ "جبکہ تم مجھے یہ چیزیں نہیں دے رہے ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اتنی پریشان نہیں تھی جتنا کہ ظاہر کر رہی تھی۔ ممکن ہے وہ صورتِ حال سے سمجھوتا کر چکی ہو۔ بہرحال اس وقت میں نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے ریڈیو پر عبداللہ سے باہر کی رپورٹ لی۔ اس نے جواب دیا۔ "یہاں سب ٹھیک ہے میں نے پوزیشن بدل لی ہے اور اب میں براہِ راست نگرانی کر رہا ہوں۔"

میں سمجھ گیا وہ بینک کے کہیں آس پاس آ گیا تھا اور اب براہِ راست بینک کی نگرانی کر رہا تھا۔ ایاز اپنی جیپ کی طرف واپس چلا گیا تھا اور کام مکمل ہونے کا منتظر تھا۔ یہاں ایک طرف واٹر ڈسپنسر لگا ہوا تھا جس سے حسبِ ضرورت ٹھنڈا اور گرم پانی حاصل کیا جا سکتا تھا میں نے اس سے پانی نکال کر پیا اور گھڑی دیکھی۔ لاکر کی کھولنے کی کوشش کو دس منٹ ہو چکے تھے۔ اب میں نے سیف ایریا میں موجود کیمروں کے ریکارڈنگ بکس کو کھولا اور اس میں چار عدد ویڈیو کیسٹس تھیں۔ ان میں بینک میں موجود پانچوں کیمروں کی ریکارڈنگ محفوظ ہو رہی تھی۔ شہلا نے کہا۔

"ان کیسٹوں کو نکال لو۔"

میں نے وہاں موجود واحد مانیٹر کی طرف دیکھا پانچوں کیمروں کو اسی سے دیکھا جاتا تھا اس کی اسکرین چار حصوں میں بٹی ہوئی تھی اور چار کیمروں کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ان میں ایک منظر بینک کے باہر کا بھی تھا۔ یہ وائیڈ لینس کیمرا تھا جو خاصے بڑے رقبے کو کور کر رہا تھا اور اس سے سڑک کے پار تک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ "اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے ہم جاتے ہوئے یہ کیسٹس لے جائیں گے۔"

شہلا کسی قدر مضطرب ہو گئی۔ "نہیں ان کو ابھی ضائع کر دینا مناسب ہوگا اگر کسی وجہ سے یہ رہ گئیں تو ہم سب پھنسیں گے۔"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "کس وجہ سے رہ جائیں گی؟"

اس نے بے پروائی سے امریکن انداز میں شانے اچکائے۔ "حالات کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب کیا رُخ اختیار کر جائیں؟"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ حالات واقعی کب کیا رُخ اختیار کر جائیں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے فی الحال کیمروں کو اپنا کام کرنے دو۔"

اس نے اچٹتے انداز میں دیوار پر لگی ڈیجیٹل کلاک کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے لاکر کھلنے والا ہوگا؟"

"تم فکر مت کرو وہ جیسے ہی کھلا ہمیں پتا چل جائے گا۔"

پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور میرا ابھی یہی خیال تھا کہ شاید کچھ ہی وقت باقی رہ گیا ہے۔ میں وسیم سے معلوم کرنے جا رہا تھا کہ اب کتنی دیر کا کام باقی ہے کہ عبداللہ کی مضطرب آواز آئی۔ "شہباز صاحب باہر گڑبڑ ہے۔"

"کیا ہوا؟" میں نے تیزی سے ریڈیو پر انگلی رکھ کر کہا۔

"میری ایک گاڑی کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ ایک مشکوک گاڑی گزر کر بینک کی طرف آ رہی ہے اور اس میں مسلح افراد موجود ہیں۔"

"چیک کرو اور کسی بھی صورت حال میں آسرا مت کرنا ممکن ہے آنے والے قاتلانہ عزائم کے ساتھ آ رہے ہوں۔"

شہلا گفتگو سن رہی تھی اس کے کان سے ریڈیو لگا ہوا تھا۔ اس ریڈیو کا مائیک مستقل آن کر دیا گیا تھا اسی وجہ سے ہمیں شہلا اور شاہد منظور کی گفتگو مستقل سنائی دے رہی تھی۔

اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ "شہباز یہ کون لوگ ہیں؟"

"کیا کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کس نے یہاں کے بارے میں بتایا ہے۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔ لاکر روم میں ریڈیو کام نہیں کر رہا تھا اور دوسرے وہاں شور بہت تھا اگر ریڈیو کام کر رہا ہوتا تب بھی وسیم کو اطلاع نہ ملتی۔ میں نے دروازہ کھولا اور وسیم سے پوچھا۔ "کتنا کام رہ گیا ہے؟"

"تقریباً پانچ منٹ کا۔" اس نے کہا اور میری صورت سے بھانپ گیا۔ "باہر سب ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں عبداللہ نے بتایا مسلح افراد سے بھری ایک گاڑی بینک کی طرف آ رہی ہے۔"

اسی لمحے باہر سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ یہ رائفل کا فائر تھا۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ "فائر کس نے کیا ہے؟"

"میرے ایک ساتھی نے... گاڑی والے ہماری طرف آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک گاڑی اور آ رہی ہے اور اس میں بھی مسلح افراد ہیں۔"

"اپنے تمام آدمیوں کو بینک کی طرف بلا لو اور انہیں ہر قیمت پر اس طرف آنے سے روکو۔ یہ ہمارے فرار کا راستہ نہ روکنے پائیں۔"

”میں یہی کر رہا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا اور اس کا آخری لفظ ایک تیز برسٹ کے شور میں گم گیا۔ اس کے فوراً بعد قیامت خیز فائرنگ شروع ہوگئی۔ آنے والے بھی پوری طرح مسلح تھے اور ان کے عزائم خطرناک تھے۔ بینک کے باہر موجود عبداللہ کے ساتھی اندر آگئے تھے اور انہوں نے یہاں مورچہ سنبھال لیا تھا۔ اسی لمحے بینک کا بیرونی شیشے کا دروازہ گولیوں کی زد میں آکر کرچی کرچی ہوگیا۔ میں نے چلّا کر عبداللہ سے کہا۔

”وہ لوگ یہاں تک آگئے ہیں۔“

”نہیں وہ سڑک کے پار ایک گلی میں ہیں اور وہاں سے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”دوسری گاڑی کہاں ہے؟“

”وہ بائیں طرف ایک گلی میں رکی ہے اور اس میں آنے والے کونے سے فائرنگ کر رہے ہیں۔“

”اپنے آدمیوں کو سمیٹ لو اور انہیں روکنے اور اپنا راستہ صاف رکھنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔ وسیم میرے پاس آگیا تھا اس نے کہا۔

”یہ مصیبت کہاں سے آگئی یقیناً اس نے کوئی چکر چلایا ہے۔“ اس نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ بکواس ہے۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔“

”شہلا اگر بعد میں یہ ثابت ہوگیا کہ تم نے یہ کام کیا ہے تو مجھ سے کسی رحم کی توقع مت رکھنا۔“ میں نے اسے خبردار کیا اور وسیم کو اس پر نظر رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بینک کے ہال میں آیا۔ جہاں عبداللہ کے تینوں آدمیوں نے مورچہ سنبھال رکھا تھا لیکن وہ فائرنگ سے گریز کر رہے تھے کیونکہ درمیان میں ہمارے لوگ بھی تھے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ دشمن کس پوزیشن پر ہے اور جب ہم یہاں سے نکلنے والے ہوں گے تو وہ ہمیں روکنے کے لیے کیا کرسکتا ہے۔

تاریکی میں واضح پتا نہیں چل رہا تھا لیکن سڑک کے پار کوئی سو گز کی دوری پر ایک بڑی گاڑی کے ساتھ چند افراد حرکت کر رہے تھے اور ان کی طرف سے شعلے سے چمک رہے تھے وہ عبداللہ کی گاڑی کی طرف فائر کر رہے تھے اور وہ اپنے ساتھیوں سمیت جواب دے رہا تھا۔ لیکن منظر واضح نہیں تھا۔ مجھے بینک کے باہر لگے کیمرے کا خیال آیا اور میں سیف ایریا کی طرف پلٹ آیا۔ مانیٹر پر باہر والے کیمرے کو زوم کیا تو سڑک کے پاس کا منظر زیادہ واضح نظر آنے لگا۔ یہ ایک بڑی گاڑی تھی اور اس کے عقب میں کم سے کم چار افراد موجود تھے۔ ان کے پاس خودکار ہتھیار تھے۔ میں نے عبداللہ سے کسی نقصان کا پوچھا۔ اس نے بتایا۔ ”اب تک سب ٹھیک ہے میرا خیال ہے دشمن کا بھی کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔“

مجھے تشویش ہونے لگی۔ ”ان کا انداز گھیرنے والا ہے جیسے یہ ہمیں یہاں روکنا چاہ رہے ہوں۔“

”مجھے بھی یہی لگ رہا ہے جناب۔“ عبداللہ.... بولا۔ ”اس لیے میں نے اپنے ساتھیوں کو پھیلا دیا ہے تاکہ فرار کی صورت میں زیادہ سے زیادہ جگہ مل سکے۔“

”پولیس پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائے گی ہمیں اس سے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ میں نے کہا اور ایاز کو مخاطب کیا۔ ”تمہاری کیا پوزیشن ہے؟“

”میری طرف کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ یہاں سے دور ہیں۔“

”گڈ اس صورت میں تم نکلنے والوں کو کور دو گے۔“ میں نے کہا اور لاکر روم میں جھانکا۔ عبداللہ کے آدمی نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”شہباز صاحب کام ہوگیا ہے۔“ اس نے برقی آری کو آخری بار چلایا اور لاکر کا بچ جانے والا حصہ بھی کاٹ دیا۔ لاکر کھل گیا تھا میں نے آگے آکر دیکھا۔ اس میں دو چیزیں تھیں ایک تو وہی چاندی جیسی دھات کا بنا ہوا بریف کیس تھا جو میں چین سے ساتھ لایا تھا اور یہ میرے پاس چینی حکومت کی امانت تھا۔ دوسرا ایک لیدر بریف کیس تھا اور یہ خاصا بڑا تھا میں نے دونوں کو باہر نکالا۔ ان کے علاوہ لاکر خالی تھا۔ میں نے باہر آتے ہوئے چرمی بریف کیس وسیم کی طرف اُچھال دیا اور دھات والا اپنے پاس رکھا تھا۔

”اب نکلنے کی کرو۔“ میں نے کہا اور عبداللہ سے کہا۔ ”ہم باہر آرہے ہیں ہمیں کور دو۔“

”آپ میری طرف آیئے گا۔“ اس نے کہا۔

”وسیم اور تمہارے آدمی ایاز کی طرف جائیں گے۔“ میں نے پلان بتایا۔ ”میں بریف کیس تمہارے پاس لا رہا ہوں تم اسے کوٹھی لے جاؤ گے۔“

”اوکے۔“ عبداللہ بولا اور اس کے فوراً بعد باہر فائرنگ کا ایک تیز مرحلہ شروع ہوا۔ عبداللہ اور اس کے ساتھی بیک وقت فائرنگ کر کے آنے والوں کو دفاعی پوزیشن لینے پر مجبور کر رہے تھے تاکہ ہم باحفاظت بینک سے نکل سکیں۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔

”ہمیں بہت تیزی سے نکلنا ہوگا۔ تم اور عبداللہ کے آدمی ایاز کی جیپ کی طرف جاؤ گے۔“

”اور آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اور شہلا عبداللہ کی طرف جائیں گے وہ سڑک کے درمیان والے حصے میں ہے وہیں میری گاڑی ہے ہم اسی میں نکلیں گے۔“

لیکن اس سے پہلے ہم اپنے پلان پر عمل کرتے اچانک وہ ہوا جو ہم نے سوچا نہیں تھا۔ شہلا نے عبایا سے ایک عدد پستول نکال کر وسیم کے سر پر اس کی نال رکھ دی۔ وسیم نے اپنا پستول جیب میں رکھ لیا تھا اس نے ضرورت محسوس نہیں کی کہ اسے ہاتھ میں رکھے۔ ہم دونوں بلکہ تینوں ساکت اور ششدر رہ گئے تھے۔ شہلا کے پاس پستول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پھر یہ اس نے کہاں سے حاصل کیا۔ اس نے وسیم کی جیب سے اس کا پستول نکال لیا اور آہستہ سے بولی۔ ”شہباز.... بریف کیس میرے ساتھ جائیں گے۔ اپنا پستول پھینک دو جلدی۔“

اس نے کہتے ہوئے وسیم کا پستول اس کی کمر سے لگا دیا۔ میں ہچکچایا تو اس نے پستول سختی سے کہا۔ ”شہباز اپنے ساتھی کی زندگی سے مت کھیلو میں اسے شوٹ کردوں گی۔“

شہلا کے لہجے سے لگ رہا تھا وہ اپنے کہے پر عمل کرے گی۔ اس وقت وہ بالکل بدلی ہوئی اور بہت ہوشیار نظر آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے پستول میز کی طرف اچھال دیا۔ ”یہ لو.... لیکن تمہارا کیا خیال ہے تم نے باہر جو جال پھیلایا ہے اس سے خود بھی بچ کر نکل جاؤ گی۔“

”ہاں۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”میں نے داؤ کھیلا ہے اور مجھے یقین ہے اس بار بازی میرے ہاتھ میں رہے گی۔“

”باہر کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”فتح خان کے آدمی ہیں۔“ اس نے بلا جھجک کہا۔ ”میں نے اسے اطلاع دی ہے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب واضح تھا۔ شاہد منظور کے بے ہوش ہونے کے بعد شہلا نے فائدہ اُٹھایا اور اس وقت جب اس کی آواز آئی تھی کہ شاہد میں باتھ روم میں ہوں۔ یقیناً وہ عبایا اُتار کر اندر گئی ہوگی اور وہاں سے کال کی ہوگی۔ میں نے تصدیق کے لیے کہا۔ ”تم نے شاہد کے موبائل سے کال کی ہے؟“

شہلا نے سر ہلایا۔ ”ہاں اور یہ پستول بھی اس کا ہے۔“

میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ مجھے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ شاہد منظور سیکورٹی سپروائزر تھا اور اس کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ہونا لازمی تھا۔ اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا جبکہ شہلا میدان مار چکی تھی۔ میں وسیم کی زندگی کا ذرا سا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ ”تمہارا فتح خان سے رابطہ تھا؟“

”ہاں ہم دشمن ہیں لیکن مشترکہ مفاد کے لیے ایک ساتھ ہوگئے۔ مجھے یہ چیزیں درکار ہیں“ اس نے وسیم کے پاس موجود بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ”فتح خان تمہیں چاہتا ہے۔“

”لیکن یہاں سے کیسے نکلو گی؟“

”یہاں سے تم مجھے نکالو گے۔“ اس نے کہا اور وسیم سے بولی۔ ”میرے پاؤں سے یہ لعنتی چیز نکالو۔“

”ہرگز نہیں۔“ وسیم نے انکار کردیا۔ ”اب تمہیں شاید ساری عمر اس کے ساتھ رہنا پڑے گا۔“

”مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمہیں شوٹ کردوں۔“ وہ غرّا کر بولی۔ ”کھولو اسے۔“

”وسیم کھول دو اسے۔“ میں نے وسیم سے کہا۔ مجبوراً اس نے نیچے بیٹھ کر شہلا کی پینٹ کا پائنچہ اوپر کیا اور بم کو کھولنے لگا۔ شہلا مضطرب ہوگئی۔

”یہ کیسے کھول رہے ہو؟“

”تو کیسے کھولوں؟“

”تم نے کہا تھا کسی نے بم ایسے ہی اُتارنے کی کوشش کی تو یہ پھٹ جائے گا۔“

”میں نے اسے ڈی ایکٹی ویٹ کردیا ہے۔“ وسیم نے اسے یقین دلایا اور اسے بم کا نقلی ریموٹ دکھایا۔ ”دیکھو اب اس کی روشنیاں جل بجھ نہیں رہی ہیں۔“

شہلا کو یقین آگیا ویسے بھی وسیم بم کے بالکل پاس بیٹھا اسے کھول رہا تھا اگر اس کے پھٹنے کا خطرہ ہوتا تو اس کے خیال میں وسیم بھی اس کے اتنے نزدیک نہ آتا۔ وسیم نے تاروں کی پروا کیے بغیر بم کھول کر اُتار دیا۔ وہ شہلا کے پاؤں سے نکلا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ ہماری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھی۔ اس دوران میں عبداللہ نے پوچھا۔ ”جناب آپ باہر کیوں نہیں آرہے ہیں ہم زیادہ دیر تک ان کو نہیں روک سکتے ہیں۔“

”یار مسئلہ ہوگیا ہے شہلا نے ہم پر قابو پالیا ہے اور باہر اسی کے بلائے فتح خان کے آدمی موجود ہیں۔“ میں نے کہا تو عبداللہ بھی ششدر رہ گیا تھا۔

”یہ کیسے ہوا؟“

”بس یار اپنی زندگی میں اس قسم کے اپ ڈاؤن آتے رہتے ہیں ابھی کچھ دیر پہلے تک یہ ہمارے قابو میں تھی اور

میری ذرا سی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر اس نے پانسا پلٹ دیا ہے اب ہم اس کے قابو میں ہیں۔''

شہلا سب سن رہی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ''کوئی گاڑی منگواؤ، تم میرے ساتھ جاؤ گے۔''

میں نے عبداللہ سے گاڑی کا کہا اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنی ایک گاڑی بھیج رہا ہوں۔ آپ اس میں نکلیں اس کے بعد ہم بھی یہاں سے نکلیں گے۔''

وسیم نے کیمرے والے کیسٹس نکالیں اور عبداللہ کے آدمی کو تھما دیں۔ یہ ہمارے ساتھ جاتیں۔ ہم سب نے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ شہلا کی دلچسپی صرف پروفیسر نفیس والے چرمی بریف کیس سے تھی۔ اس نے دھاتی بریف کیس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

ہم باہر آئے جہاں عبداللہ کے ساتھی بھی فتح خان کے آدمیوں کو دفاعی پوزیشن میں رکھنے کے لیے کارروائی میں حصہ لے رہے تھے۔ ریڈیو کی وجہ سے ان کو بھی پتا چل گیا۔ شہلا وسیم کی اوٹ میں تھی۔ یہ اس کے لیے آخری موقع والی بات تھی اس لیے وہ پوری طرح چوکنا تھی۔ اس نے پستول عین وسیم کی پشت پر رکھا تھا اور دوسرا اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک لمحے میں گولی چلانے کے لیے تیار تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''تم باہر اس طرح آرام سے نہیں جاسکو گی۔ تمہارے بلائے لوگ اندھا دھند فائرنگ کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے انہیں تمہاری پروا بھی نہیں ہوگی۔''

شہلا چالاک تھی میری بات سمجھ گئی۔ ''تم فکر مت کرو بس یہ سوچو کہ اگر مجھ پر قابو پانے کی کوشش کی تو میں وسیم کو لازمی شوٹ کر دوں گی۔''

''وسیم نہیں جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ صرف میں جاؤں گا۔''

''نہیں یہ مجھے لے جائے۔'' وسیم تیزی سے بولا۔

''سوری میرے ساتھ شہباز ہی جائے گا۔'' شہلا نے انکار کیا ''ہاں لیکن گاڑی تک میں اسے ہی ڈھال بنا کر لے جاؤں گی۔''

''جناب گاڑی بینک کے سامنے آگئی ہے۔'' عبداللہ نے کہا میں نے جھانک کر دیکھا۔ اے ٹی ایم والے حصے کے بالکل سامنے گاڑی موجود تھی ڈرائیور اسے فٹ پاتھ سے اوپر چڑھا لایا تھا۔ میں نے گارڈز کی وردیوں میں موجود ساتھیوں سے کہا۔ ''تم لوگ یہاں سے نکلو۔''

وہ ایک ایک کر کے نکلے اور دوڑتے ہوئے بینک کے ساتھ والی گلی میں چلے گئے یہ حصہ کسی قدر محفوظ تھا۔ اب ہال میں میرے ساتھ صرف وسیم اور شہلا رہ گئے تھے۔ میں نے شہلا سے کہا۔ ''یہاں سے نکلنا ہے گاڑی آگئی ہے۔''

''شاہد منظور کو کہاں قید کیا ہے؟''

وسیم نے ہال کے کونے میں موجود واش روم کی طرف اشارہ کیا تو وہ وسیم کو آڑ بنائے ہوئے بینک میں واش روم تک گئی اس کا دروازہ کھولا۔ شاہد منظور اور دوسرے گارڈز بے ہوش پڑے تھے۔ شہلا کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی اور پھر اچانک ہی شاہد منظور کو شوٹ کر دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور وہ بے ہوشی میں ذرا سا تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ میں اور وسیم دم بخود رہ گئے۔ میں چلایا۔ ''یہ کیا کیا تم؟''

''میں نے وہ کیا جو میری مرضی ہے۔'' وہ سکون سے بولی۔ ''میں اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ نہیں لے سکتی تھی اس نے مجھے بہت قریب سے دیکھا ہوا ہے۔'' اس نے دروازہ بند کر دیا۔

اس وقت ہم شہلا کے سامنے مجبور تھے۔ میں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ عین موقع پر ترپ کا پتا پھینک کر بازی اپنے نام کر لے گی۔ پہلے میں نکلا اور دوڑ کر گاڑی میں گھس گیا۔ عبداللہ کا آدمی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ پرانے ماڈل کی لگژری کار تھی لیکن بہت اچھی حالت میں تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور شہلا سے کہا۔ ''آجاؤ تم دونوں۔''

شہلا وسیم کی آڑ میں باہر نکلی۔ عبداللہ اور اس کے آدمیوں نے نہایت مہارت سے حملہ آوروں کو اُلجھا رکھا تھا اور وہ اب اس طرف فائرنگ نہیں کر پا رہے تھے اس وجہ سے ہمیں اور دوسرے لوگوں کو بینک سے آسانی سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ کار کے پاس آتے ہی شہلا وسیم سے الگ ہوئی اور تیزی سے فرنٹ سیٹ پر آگئی۔ چرمی بیگ اس نے وسیم سے فرنٹ سیٹ کے سامنے رکھوا دیا تھا۔ میں نے دھاتی بریف کیس وسیم کے حوالے کرنا چاہا کہ شہلا نے کہا۔ ''نہیں یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔''

''شہلا یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے۔'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے پستول میری پسلی سے لگا دیا۔

''یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ ناؤ گو۔''

شہلا کا انداز بتا رہا تھا وہ اس وقت ہماری کوئی بات نہیں سنے گی اور اگر ہم نے اس کی بات نہ مانی تو وہ سچ مچ گولی چلا دے گی۔ مجبوراً میں نے وسیم سے کہا۔ ''تم جاؤ۔''

''گاڑی چلاؤ اور اپنے آدمیوں سے کہنا ہمارے پیچھے

آنے کی کوشش نہ کریں۔'' شہلا نے اگلا حکم دیا۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی اور فی الحال پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ حد یہ کہ اس نے دونوں بریف کیس بھی لاپرواہی سے اپنے قدموں میں ڈال دیے تھے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے ریورس کر کے سڑک پر لایا۔ جیسے ہی گاڑی سڑک پر آئی دوسری طرف سے فائرنگ ہوئی تھی۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا لیکن وہ عبداللہ والی گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسٹیرنگ کاٹتے ہوئے گاڑی کو گھمایا اور پھر ایکسی لیٹر دبا دیا۔ گاڑی کا پک اپ بہت اچھا تھا اور وہ گولی کی طرح نکلی۔ جیسے ہی ہم خطرے کی حد سے ذرا باہر آئے شہلا نے میرے اور اپنے کان سے ہیڈ سیٹ کھینچا اور اسے گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ پھر اس نے میری تلاشی لی اور موبائل نکال لیا۔ آخر میں اس نے ہاتھ پھیر کر اطمینان کیا کہ میرے پاس اور کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔

''شہباز رفتار تیز کرو اور آگے آنے والے راؤنڈ اباؤٹ سے دائیں طرف مڑ جانا۔''

''اور کوئی حکم۔'' میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

شہلا عقبی آئینے پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ''میرا خیال ہے تمہارے آدمی ہمارے پیچھے ہیں۔''

''ظاہر ہے وہ اتنی آسانی سے تو تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تم نے واقعی ذہانت کا ثبوت دیا۔ تمہیں معلوم تھا کہ شاہد منظور مسلح ہوتا ہے لیکن تم نے اس بارے میں بات بھی نہیں نکالی اور اس کے موبائل فون کا ہمیں خیال نہیں آیا۔ تم نے اس سے فائدہ اُٹھا لیا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ فتح خان سے یہ تمہارا اچانک تعلق کہاں سے نکل آیا؟''

''اچانک تو نہیں نکلا پُرانا ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ جب تم میرے قبضے میں آئیں تو تمہاری اور اس کی دشمنی تھی۔''

''وہ بلف تھا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''فتح خان اور میرے درمیان دشمنی والا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔''

''تب ہی اس نے تمہیں اتنی آسانی سے چارے کی طرح میرے سامنے ڈال دیا۔'' میں نے طنز کیا۔ ''مس شہلا اگر تم مجھے اصل بات نہیں بتانا چاہتی ہو تو میں اس وقت تمہیں مجبور کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن مجھے بے وقوف مت بناؤ۔''

''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''یہی کہ تم نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے۔ اِدھر تم مجھے اور ان بریف کیسوں کو فتح خان کے حوالے کرو گی اور اُدھر تمہاری اور میری حیثیت میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔''

''تمہارے خیال میں میں اتنی بے وقوف ہوں کہ یہ معمولی سی بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں نے کب کہا کہ میں فتح خان پر بھروسا کرتی ہوں۔ میں اس پر ایک روپے کا بھروسا نہیں کر سکتی۔''

''پھر تم مجھے اور اس سامان کو اس کے پاس کیوں لے جارہی ہو؟''

وہ بولی تو اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''کیونکہ مجھے یقین ہے وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ فتح خان کسی لحاظ سے تمہارے سامنے مجبور ہے۔''

''مجبور نہیں ہے اب ہم دونوں برابر ہیں۔''

''کیا تم بھول گئی ہو کہ اس نے اور اس کے آدمیوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟'' میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔

''وہ ماضی کی بات ہو گئی ہے اور فتح خان کے جس آدمی نے میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی اسے میں نے اپنے ہاتھ سے مار دیا۔''

''فتح خان کا حساب کتاب؟''

''وہ میں بعد میں کبھی لوں گی۔'' اس نے مبہم انداز میں کہتے ہوئے عقبی آئینے میں دیکھا۔ میں نے اس کی بتائی چورنگی سے کار دائیں طرف گھما لی۔ کار کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ یہ چوری کی ہوگی۔ عبداللہ اپنی کوئی کار اس طرح شہلا کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اس منصوبے کے لیے اس نے یقیناً گاڑیاں اُٹھائی ہوں گی۔ یا اپنی گاڑیوں پر جعلی نمبر پلیٹ لگائی ہوں گی۔ میں گھوما تو ایک گاڑی بدستور پیچھے لگی رہی۔ یہ کوئی بڑی گاڑی تھی کیونکہ اس کی ہیڈ لائٹس اونچی تھیں۔ ممکنہ طور پر کوئی ہائی ایس تھی یا اسٹیشن ویگن تھی۔ پہلے اس قسم کی واکس ہال وین نظر آتی تھی اور یہ بڑی زبردست وین ہوتی تھی لیکن پھر یہ ماڈل آنا بند ہو گیا۔ مگر اب بھی راولپنڈی اور آس پاس کے دیہاتی علاقوں میں یہ نظر آتی ہے۔

''یہ میرا کوئی آدمی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارے پاس اس قسم کی کوئی گاڑی نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''اس

میں فتح خان کے آدمی ہیں۔"

فتح خان کا نام سن کر میں کسی قدر بے چین ہو گیا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ "شہلا تم اور فتح خان دونوں کو میں نے کبھی دشمن نہیں سمجھا ہاں تمہاری طرف سے محتاط ضرور رہا۔ لیکن تمہارے خلاف از خود کوئی کارروائی نہیں کی ہمیشہ اپنا دفاع کیا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ مجھے اس دیہاتی بریف کیس سمیت جانے دو۔ اس کے بعد میرا اور تمہارا کبھی سامنا نہیں ہوگا اور یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "سچ کہوں تو یہی خیال میرا بھی ہے تم سے اُلجھنا کسی صورت ہمارے مفاد میں نہیں ہے لیکن فتح خان کا خیال کچھ اور ہے۔"

"تم مجھے جانے کی اجازت دے سکتی ہو اور بعد میں فتح خان سے کہہ سکتی ہو کہ میں فرار ہو گیا۔"

"میں کہہ سکتی ہوں لیکن اب اس کا فائدہ نہیں ہے۔" اس نے عقب میں آتی گاڑی کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔ "فتح خان یا اس کے آدمی پوری طرح ہمیں نظر میں رکھے ہوئے ہیں۔"

"اگر تم موقع دو تو....."

"نہیں شہباز، اب وقت نہیں ہے اور میں کامیابی کے اتنے قریب آ کر ناکامی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" اس نے پستول میری طرف سیدھا کر لیا۔ "کار روک دو۔"

میں نے کار کی رفتار سست نہیں کی تھی۔ "اگر میں نہ روکوں تو؟"

"تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گی اس سے حادثے کا امکان ہوگا لیکن میں اسٹیرنگ فوراً قابو میں کر کے حادثے کو جان لیوا ہونے سے بچا سکتی ہوں لیکن تم یقینی طور پر اپنی جان سے جاؤ گے۔ میں کہہ چکی ہوں کامیابی کے اتنے پاس آ کر میں ناکامی کا ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لوں گی۔ اس کے لیے میں اتنے دن تمہاری قید میں صبر سے رہی ہوں۔ مجھے امید ہے تم بھی صبر سے کام لو گے۔ ناؤ اسٹاپ دی کار۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن ہو گیا۔ مجبوراً مجھے کار کی بریک پر دباؤ ڈالنا پڑا۔

شہلا اتنے دنوں سے ہماری قید میں تھی اور میں نے اس کا بہ غور مشاہدہ کیا تھا۔ وہ مجھے ذہین اور چالاک لگی تھی لیکن بس ایک حد تک، میرا خیال تھا کہ اس میں کمانڈ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ حالات کو اپنے قابو میں نہیں لے سکتی تھی۔ لیکن گزشتہ آدھے گھنٹے میں اس نے میرے خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بالکل بدلی ہوئی شہلا لگ رہی تھی جس کے انداز میں ایک فیصد ہچکچاہٹ بھی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کس صورتِ حال میں اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کار رکتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اگنیشن سے چابی نکال لی اور مجھے حکم دیا۔

"دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھو۔"

میں نے ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ لیے۔ اس دوران میں عقب سے آنے والی گاڑی آ کر ہمارے پیچھے رک گئی اور اس میں سے دو افراد اُتر کر آگے آئے۔ سردی کی مناسبت سے انہوں نے جیکٹیں اور اونی ٹوپے پہن رکھے تھے اور نیم تاریکی میں ان کی صورتیں واضح نظر نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن ایک شخص کے بارے میں مجھے شبہ ہوا کہ وہ فتح خان تھا۔ میرا شبہ درست ثابت ہوا اور جلد ہی اس کی منحوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "شہباز خانا۔" اس نے کھڑکی کے پاس جھکتے ہوئے کہا۔ "تم کو دیکھ کر کتنا خوشی ہو رہا ہے۔ یارا نیچے تو آؤ۔"

میں نیچے اُتر آیا اور سکون سے کہا۔ "خدا نہ کرے جو میں تمہارا یار ہوں اس کے بجائے میں کسی کتے کا یار بننا پسند کروں گا۔"

فتح خان کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور وہ کسی قدر مختلف لگ رہا تھا لیکن میری بات پر اس کی صورت کے بگڑتے زاویے صاف محسوس ہوئے تھے۔ اس نے چہکنا موقوف کیا اور سرد لہجے میں بولا۔ "شہباز خان اب تمہارا مہلت ختم ہو گیا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "کیا تم نے ملک الموت کا کام سنبھال لیا ہے اور دوسروں کی مہلت طے کرنے لگے ہو۔"

"تم بہت بولنے لگا ہے۔" اس بار فتح خان جھنجلا گیا۔

"یہ تو میری شروع سے عادت رہی ہے۔" میں ہنسا۔ اس دوران میں شہلا دونوں بریف کیس سنبھالے نیچے اُتر آئی اور اس نے فتح خان سے کہا۔

"تم وقت ضائع کر رہے ہو اس کے ساتھی اس علاقے میں موجود ہیں۔"

"فکر مت کرو۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "وہ پیچھے آنے کے قابل نہیں رہا ہے۔"

میرا دل دھڑک اُٹھا۔ "فتح خان تم نے کیا کیا ہے؟"

میری پریشانی پر وہ مسکرایا۔ "اچھا کیا ہے پروا مت کرو کوئی مرا نہیں ہے۔ میرے آدمیوں نے راستے میں گوکھرو ڈال دیے تھے گوکھرو سمجھتے ہو نا؟"

"وہ گولی جس پر چاروں طرف کانٹے نکلے ہوتے ہیں؟" میں نے کہا تو اس نے سر ہلایا۔

"وہی وہی۔" اس نے سر ہلایا۔ "تمام گاڑی فلیٹ ہو گیا اور ایک اُلٹ بھی گیا لیکن امید ہے کسی کو نقصان نہیں ہوگا۔"

"فتح خان۔" اس بار شہلا تیز لہجے میں بولی۔ "چلو یہاں سے باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

"چلو شہباز خانا۔" فتح خان نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کیا، میرا اندازہ درست نکلا تھا یہ ایک وین تھی جو کسی کو چھپا کر لے جانے کے لیے نہایت موزوں گاڑی ہے۔ گاڑی میں ایک ڈرائیور بھی تھا۔ فتح خان کے ساتھ اُترنے والا دوسرا آدمی آگے ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا۔ جبکہ فتح خان، میں اور شہلا پچھلے حصے میں آ گئے تھے۔ یہاں بڑی شاہانہ قسم کی صوفہ نما سیٹیں تھیں۔ شہلا اور فتح خان ایک سیٹ پر بیٹھ گئے اور مجھے ان کے سامنے بیٹھنا پڑا تھا۔ اس وقت شہلا اور فتح خان دونوں برابر ہی لگ رہے تھے، اگرچہ انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی وین روانہ ہو گئی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔

"فتح خان یہ سب کیا ہے؟"

"تمہارے سامنے ہے۔" وہ بولا۔

"میرے اور تمہارے درمیان طے ہوا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کاموں میں مداخلت نہیں کریں گے۔"

"ہوا تو تھا۔" اس نے داڑھی کھجائی۔ "لیکن ادھر یہ بینک والا معاملہ درمیان میں آ گیا اس لیے ہم کو مداخلت کرنا پڑا۔"

"اس میں سے ایک بریف کیس پروفیسر نفیس نے مجھ سے حاصل کیا تھا اور یہ میرے پاس کسی کی امانت ہے۔ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ تم اس سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔"

"یہ دیکھنا ہمارا کام ہے۔" شہلا اب بہت نپا تلا بول رہی تھی، اس نے پستول بدستور ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پھر اس نے میرا موبائل نکال کر اس پر عبداللہ کا نمبر ملایا اور موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ "اپنے آدمی کو بتاؤ کہ تم ٹھیک ہو اور چند دن میں واپس آ جاؤ گے اس لیے تمہیں تلاش کرنے میں بلاوجہ اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں۔"

"ہاں اپنا توانائی مرشد کے لیے بچا کر رکھے۔" شہباز خان نے دانت نکالے۔ "تم ہمارے پاس آرام سے رہے گا۔"

اس دوران میں رابطہ ہو گیا تھا اور میرا نمبر دیکھ کر عبداللہ بے تابی سے ہیلو ہیلو کر رہا تھا۔ "عبداللہ میں بات کر رہا ہوں۔"

"شہباز صاحب آپ کہاں ہیں ہم سب آپ کو تلاش کر رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں لیکن فی الحال تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم سب ٹھیک ہو کسی کو نقصان تو نہیں ہوا؟"

"ان حرامزادوں نے کیلیں بچھائی تھیں، ہماری تمام گاڑیوں کے ٹائر فلیٹ ہو گئے اور یہ نکل جانے میں کامیاب رہے۔ پولیس آ گئی تھی، اس لیے ہم پیدل منتشر ہو کر آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"بے کار ہے میں تم سے دور فتح خان کی قید میں ہوں، اب تم لوگ گھر جاؤ اور کوئی جذباتی حرکت مت کرنا۔"

شہلا نے ہاتھ بڑھا کر موبائل چھین لیا۔ اسے آف کر کے اپنے لباس میں رکھ لیا اور بولی۔ "تم نے بالکل ٹھیک طرح سے بات کی ہے۔"

"تم دونوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے اب مجھے اس طرح قید کر کے لے جانے کا جواز کیا ہے؟"

"جواز ہے۔" فتح خان پُرخیال انداز میں بولا۔ "ابھی نہیں لیکن جلد تم کو پتا چل جائے گا۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "فتح خان ممکن ہے تمہارے دماغ میں وہی ہیروں والا کیڑا کلبلا رہا ہو۔ لیکن میں بتا دوں میرا اس حماقت میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"بات تمہارے ارادے کا نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اس وقت تمہارے قبضے میں ہوں اس لیے تم جو چاہو گے مجھ سے منوا لو گے؟"

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔" شہلا بولی۔ "فی الحال تم اتنا سمجھ لو کہ تم ہماری قید میں ہو اور تمہیں اس وقت کوئی نقصان نہیں ہوگا جب تک تم خود کچھ غلط نہ کرو۔"

"مثلاً میں کیا غلط کر سکتا ہوں۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اگر میں تم پر عاشق ہو جاؤں تو کیا تم اسے بھی غلطی شمار کرو گی؟"

شہلا مسکرائی۔ "اسے میں غلطی نہیں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم فرار کی کوئی کوشش نہیں کرو گے۔"

شہلا کی بات پر فتح خان کا رنگ بدلا تھا۔ شاید اسے

شہلا کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ میں شہلا سے کہنے جارہا تھا کہ وہ جس بات کو اپنی خوش قسمتی سمجھ رہی ہے میں اسے اپنی بدترین بدنصیبی سمجھوں گا لیکن فتح خان کے تاثرات دیکھنے کے بعد میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ وین کے عقبی حصے سے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ ہم کہاں جارہے تھے اور کس علاقے میں تھے۔ ذرا سی دیر کے سفر میں وین نے کئی موڑ کاٹے تھے اور دائیں بائیں گھومتی رہی تھی۔ ایک گھنٹے میں حالات بدل گئے تھے۔ شہلا جو میری قیدی تھی اب وہ آزاد تھی اور میں اس کا قیدی تھا یہی نہیں میں اس کے سامان پر قبضے کی فکر میں تھا اور اب میرا بریف کیس بھی اس کے پاس جا چکا تھا۔

”شہلا جب تمہارے پاس مکمل پلان تھا تو تم نے فتح خان کی مدد سے اپنا کام کیوں نہیں کرلیا؟“

”اس نے مجھ سے کہا تھا لیکن میں نے سوچا جو کام تم سے لیا جاسکتا ہے اس کے لیے خود کچھ کرنے کا کیا ضرورت ہے؟“ فتح خان نے سیٹ پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرا اندازہ درست نکلا سارا کام تم نے کیا اور چیزیں ہمارا قبضے میں آگیا۔“

”تمہیں ان چیزوں سے کیا دلچسپی ہے؟“ میں نے حیرت سے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تمہیں بلیک میلر نہیں پایا۔“

”مجھ کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”یہ سارا مال شہلا کا ہے۔“

اس کا مطلب تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا تھا اور اب میری سمجھ میں آیا کہ فتح خان شہلا کو کیوں تلاش کروا رہا تھا اور میری قید سے نکالنے کے لیے بو سونگھنے والے کتے تک کی خدمات حاصل کی تھیں۔ فتح خان کے بارے میں مجھے سو فیصد یقین تھا، اس کا مطمح نظر وہ کروڑوں ڈالرز مالیت کے ہیرے تھے جو برٹ شا نے کہیں چھپائے تھے۔ یہ معمولی چیزیں اس کا مقصد نہیں ہو سکتی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے وہ میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میرے چکر میں اس کا کزن مارا گیا تھا اور وہ مرشد سے انتقام لینے پر اُتر آیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”مرشد سے تمہارا انتقام کہاں تک پہنچا۔ تم نے اس کی ایک کیمیکل فیکٹری برباد کر دی تھی؟“

وہ خفیف سا مسکرایا۔ ”اس کے بعد مرشد کو اپنے ایک کیٹل فارم کا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ نہ معلوم افراد نے وہاں موجود ملازموں کو باندھ کر تمام جانوروں کو زہر کے انجکشن لگا دیے اور جاتے جاتے فارم کو بھی آگ لگا گئے۔ فارم میں کئی سو اعلیٰ درجے کی بھینسیں اور گائیں تھیں۔ ان کی مالیت بھی کروڑوں میں تھی۔“

میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ ”فتح خان کی اس حرکت کو تم کیا کہو گی یہ بھی مرشد کو براہ راست کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا ہے۔“

”فتح خان بھی پتوں اور شاخوں پر وار کر رہا ہے۔“ اس نے اپنے بڑے ہوئے ناخنوں کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب معمولی اور عارضی نقصان ہیں مرشد انہیں آرام سے پورا کر سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے ایسا نقصان دیا جائے جس کی وہ تلافی نہ کر سکے۔“

”یعنی اس کی ذات کو نقصان؟“

”بالکل میں نے کہا نا مرشد کے نزدیک اس کی ذات کے علاوہ اور کسی چیز کی اہمیت نہیں۔“

شہلا ٹھیک کہتا ہے۔“ فتح خان بولا۔ ”ہم بھی اسے صرف جھٹکا دے رہا ہے۔ ابھی اس سے براہ راست بدلہ لینے کا وقت نہیں آیا ہے۔ جب آئے گا تو یقین کرو مرشد کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔“

”یہ تو تم نے وہی بات کی کہ جب کسی شخص کے مرنے کا وقت آئے گا تو کوئی اسے بچا نہیں سکے گا۔“ میں ہنسا۔

فتح خان دھاتی بریف کیس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے غالباً ایسی چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ نمبروں سے کھلنے والا یہ بریف کیس بہت جدید ساخت کا تھا۔ فتح خان اس کے لاک کا نمبر چھیڑنے جارہا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کوئی بٹن دبانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ غلط نمبر ملانے کی صورت میں بریف کیس دھماکے سے پھٹ سکتا ہے۔“

فتح خان کا ہاتھ رک گیا اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم فتح خان کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے؟“

”نہیں میں تمہیں بلاوجہ فوت ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے خلوص سے کہا۔ ”میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ بریف کیس کس کا ہے لیکن جس کا بھی ہے اس کے لیے ایسا انتظام کرنا بالکل ممکن اور ضروری ہے کہ کوئی غلط طریقے سے اس بریف کیس کو کھولنے کی کوشش کرے تو یہ دھماکے سے تباہ ہو جائے اور ظاہر ہے جو اس کے آس پاس ہوگا وہ بھی مارا جائے گا۔“

خلافِ توقع شہلا نے میری تائید کی۔ ”فتح یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں کوئی اندھا قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔“

فتح خان نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”یہ تم کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ بریف کیس اسی کا ہے اور یہ اس کے نمبر جانتا ہے۔“

”یہ اس کا نہیں ہے۔“ شہلا بولی۔ ”اس نے مجھے اس وقت بتایا تھا جب میں اس کی قید میں تھی اور اس وقت اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

فتح خان نے شانے ہلائے اور بریف کیس واپس سیٹ پر رکھ دیا۔ ”جیسا تمہارا مرضی۔“

”ہم بعد میں آرام سے اسے چیک کر کے کھول سکتے ہیں۔“ شہلا نے کہا۔ ”میں ایک شخص کو جانتی ہوں جو اس قسم کی چیزوں کا ماہر ہے اور معاوضے پر کام کرتا ہے، مجھے یقین ہے وہ اس بریف کیس کو کھول لے گا اس لیے عجلت دکھانے کی ضرورت نہیں۔“

فتح خان کا موڈ مزید خراب ہوگیا اور اس نے پشتو میں چلا کر اپنے آدمیوں کو گالی دی۔ ”تیز چلاؤ.... کیا مردار کی طرح ٹہلتا ہے۔“

حالانکہ وین ٹھیک رفتار سے جارہی تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ فتح خان مجھے کہاں لے جارہا تھا لیکن اس کا ٹھکانا یقیناً کسی باقاعدہ آبادی میں ممکن نہیں تھا اس کا راول ڈیم سے آگے والا ٹھکانا میں نے دیکھا تھا۔ جہاں سے اس نے مجھے بے ہوش کر کے حویلی پہنچایا تھا۔ اب وہ ٹھکانا یقیناً فتح خان چھوڑ چکا تھا۔ وہ ان دنوں مرشد سے بھی بچتا پھر رہا تھا جو اسے اپنے قابو میں لینے کے لیے بے تاب تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد وین کو یوں جھٹکے لگنے لگے جیسے وہ کچے راستے پر آگئی ہو اور یہ جھٹکے دار سفر تقریباً بیس منٹ جاری رہے تھے۔ پھر وین رک گئی۔ فتح خان کے دونوں آدمی نیچے اُترے اور انہوں نے پیچھے کا سلائیڈنگ ڈور کھولا۔ پہلے فتح خان نیچے اُترا اور پھر اس نے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نیچے آیا۔ رات گہری تھی اور چاند بھی نہیں تھا لیکن آسمان بہت صاف تھا اور تاروں کی روشنی کسی حد تک تاریکی دور کر رہی تھی۔

یہ کسی جنگل کا ایک حصہ تھا۔ چاروں طرف سفیدے کے دیو قامت اور گھنے درخت تھے۔ عام طور سے سفیدے کے درخت اونچے تو بہت ہو جاتے ہیں لیکن یہ ایک خاص حد سے زیادہ گھنے نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں موجود درخت خاصے گھنے تھے۔ انہوں نے اس خالی جگہ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا جس کے درمیان میں پتھر اور لکڑی سے بنی یہ چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس کی بنیادیں اور دیواریں پتھروں کی بنی تھیں جبکہ چھت لکڑی کی تھی۔ چاروں طرف خالی زمین تھی اور پھر پتھر سے بنایا ہوا ایک پانچ فٹ اونچا احاطہ تھا جس میں گیٹ نہیں تھا اور آنے جانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ عمارت بہ ظاہر ویران نظر آرہی تھی۔

فتح خان کے ایک آدمی نے عمارت کے واحد دروازے پر لگا ہوا تالا کھولا اور اندر چلا گیا فوراً ہی اندر روشنی نظر آنے لگی۔ یہاں بجلی نہیں تھی اور یہ روشنی آگ کی تھی۔ فتح خان نے پستول نکال لیا اور مجھے اشارہ کیا تو میں بادل ناخواستہ اندر کی طرف بڑھا۔ پہلا کمرا ایک نشست گاہ تھی جس میں پُرانا مگر قابلِ استعمال صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ فرش پر پُرانا لیکن بہت دبیز قالین تھا۔ فتح خان کے آدمی نے دیوار پر لگا کیروسین لیمپ جلایا تھا اور وہ کمرے اور عمارت میں موجود دوسرے لیمپ بھی جلانے لگا۔ دوسرا آدمی باہر ہی رک گیا تھا۔ کچھ دیر میں شہلا بھی دونوں بریف کیس سنبھالے اندر آگئی۔ دروازہ اندر سے بند کیا تو سردی کا احساس کم ہوا تھا۔ فتح خان ایک صوفے پر براجمان ہوگیا۔ اس بڑی سی نشست گاہ سے آگے ایک گیلری نظر آرہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس جگہ دو تین کمرے اور ہوں گے۔ کیونکہ باہر سے یہ عمارت بہت بڑی نہیں لگ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ تمہارا کوئی عارضی ٹھکانا ہے؟“ میں نے کہا۔

”تم نے ٹھیک پہچانا۔“ فتح خان بولا۔ ”آج کل میں ان تمام جگہوں سے دور ہوں جن کے بارے میں مجھے ذرا سا شبہ ہے کہ مرشد ان کے بارے میں جانتا ہے۔“

”تمہارے خیال میں یہ جگہ محفوظ ہے؟“

”سو فیصد تو نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے جواب دیا۔ اس دوران میں شہلا دونوں بریف کیس لے کر اندر چلی گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فتح خان کو ان دونوں بریف کیسوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ راستے میں اس نے دھاتی بریف کیس کھولنے کی کوشش بھی اس لیے کی تھی کہ وہ اسے ذرا مختلف لگا تھا۔ یہ معاملہ اس نے کلی طور پر شہلا کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس کا رویّہ حیرت انگیز طور پر میری توقع کے بالکل خلاف اور شہلا کے کہے کے عین مطابق تھا۔ فتح خان کے آدمی نے مکان میں موجود آتش دان جلا دیے تھے اور ان کی حرارت رفتہ رفتہ سردی کے احساس کو کم کر رہی تھی۔ فتح خان سکون سے بیٹھا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے فی الحال مجھے بھی فراموش کر دیا ہے۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

شہلا اور فتح خان کے اس غیر متوقع گٹھ جوڑ سے مجھے دھچکا لگا تھا۔ دشمن کے بارے میں میری ناقص معلومات اور اندازوں کا نتیجہ تھا کہ میں اس وقت اس کی قید میں تھا۔ مرشد اور ڈیوڈ شا کے مقابلے میں فتح خان اور اب شہلا کو میں ہمیشہ کمتر درجے کا حریف سمجھا تھا۔ یہی وجہ تھی ان سے میں اکثر

مات کھا جاتا تھا۔ فتح خان ہر گزرتے دن زیادہ چالاک اور زیادہ خطرناک ہوتا جارہا تھا۔ اگرچہ اس سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو جان کا خطرہ نہیں تھا لیکن اپنے مخصوص مفادات کی خاطر وہ ہمارے پیچھے ضرور تھا۔ پہلے اس نے میرے ساتھی کو اُٹھانے کی کوشش کی اور بالآخر مجھے اپنے قبضے میں لینے میں کامیاب رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھیوں کا کیا ردِعمل ہوگا۔ وہ بے چارے ایک بار پھر مجھے تلاش کرنے پر مجبور ہوگئے ہوں گے۔ میں نے ان کو منع کیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا وہ اپنی کوشش سے باز نہیں آئیں گے۔ مجھے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

"شہباز خان۔" فتح خان نے اچانک کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم ایمن شا کو پاکستان بلاؤ گے۔"

"اگر تم سمجھ رہے ہو کہ تم مجھ سے یہ کام کرالو گے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ مجھے ایمن شا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میں عورتوں کے سہارے آگے بڑھنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"میں تو ہے۔" اس نے گرامر کا بیڑا غرق کرتے ہوئے کہا۔ وہ اچھی خاصی اردو بولتے بولتے اچانک اس کی ٹانگ توڑ دیا کرتا تھا۔

"وہ تو شہلا سے اشتراک سے پتا چل رہا ہے۔ لیکن فتح خان یاد رکھو دوسروں اور خاص طور سے عورتوں کے سہارے آگے بڑھنے والے کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتے...... تمہیں اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

"میں اپنے اوپر ہی بھروسا کرتا ہے۔"

"غلط تم اصل میں کسی پر اعتماد نہیں کرتے ہو۔ اعتماد کرنا الگ بات ہے اور اپنے بازو پر بھروسا کرنا الگ بات ہے۔" میں نے تردید کی۔ "ویسے کیا یہاں تمہارے صرف یہی دو ساتھی ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ اس طرح تمہیں بھاگنے کا کوئی موقع ملے گا۔"

"میں ایسا کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں...." میں نے کہا۔ "لیکن جب مجھے موقع ملے گا تو تم یا تمہارا پورا دستہ بھی مجھے نہیں روک سکے گا۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" عقب سے شہلا کی آواز آئی۔ "لیکن مجھے امید ہے تم ایسی کوشش نہیں کروگے شہباز۔ میرے ساتھ آؤ۔"

شہلا نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور وہ اس وقت سیاہ رنگ کی پینٹ اور اسی رنگ کی ہائی نیک اور پوری آستین کی گرم جرسی میں تھی لیکن یہ جرسی کھال کی طرح اس کے جسم پر فٹ تھی اور اس کے خدوخال کی پوری وضاحت کر رہی تھی۔ فتح خان کی نظر اس پر جم کر رہ گئی تھی اور اس کا ساتھی بھی چور نظروں سے شہلا کا معائنہ کر رہا تھا مگر وہ ان کی نظروں سے بے نیاز لگ رہی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" شہلا بولی اور مڑ کر اندر کی طرف جانے لگی۔

فتح خان شاید اس پر کوئی اعتراض کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے کیا نہیں۔ میں شہلا کے پیچھے اس چھوٹے سے لیکن فرنیچر سے آراستہ کمرے میں پہنچا۔ یہ سارا فرنیچر نیا اور بہترین قسم کا تھا۔ بیڈروم سیٹ کے ساتھ اسی کے لیے ڈیزائن کردہ ایک چھوٹا ٹوسیٹر صوفہ بھی وہاں موجود تھا۔ شہلا نے پستول کہیں رکھ دیے تھے اور اس وقت وہ خالی ہاتھ تھی اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ "شہباز میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کمرے کے آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور باہر کے مقابلے میں یہاں گرمی خوشگوار تھی۔ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "تم پورے اعتماد سے یہاں میرے ساتھ اکیلی آئی ہو۔"

"ہاں کیونکہ اگر تم میرے خلاف کچھ کرو گے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور تم بلا فائدہ کوئی کام کرنے والے شخص نہیں ہو۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "فائدہ کیوں نہیں ہوگا؟"

"تم مجھے قابو کر لو تب بھی فتح خان تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے گا، بے شک تم مجھے اس کے سامنے قتل کردو۔ فتح خان تمہیں ہر صورت اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتا ہے۔"

شہلا نے ڈرائی فروٹ کی ایک چھوٹی سی ٹرے نکالی جس میں مختلف قسم کے ڈرائی فروٹ موجود تھے وہ اس نے میرے سامنے چھوٹی تپائی پر رکھ دی۔ میں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میں نے ڈرائی فروٹ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ شہلا بستر پر بیٹھ گئی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "تم جانتے ہو فتح خان تم سے کیا چاہتا ہے؟"

"ہاں یہ بات پہلے بھی کئی بار ڈسکس ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ برٹ شا کے چھپائے ہیرے چاہتا ہے اور اس کی کوشش ہے کہ میں اس احمقانہ کام میں شامل ہو جاؤں۔"

"تم نے ٹھیک کہا لیکن یہ کام احمقانہ کیسے ہوا؟" شہلا بولی۔ "کئی کروڑ ڈالرز مالیت کے وہ ہیرے ایک حقیقت ہیں۔"

"میں کب اس سے انکار کر رہا ہوں۔ لیکن وہ ہیرے ایک ایسی وادی میں کہیں چھپائے گئے ہیں جو ایک مربع میل سے زیادہ رقبے پر پھیلی ہے۔ اس میں پہاڑ بھی ہیں اور جنگل بھی، چشمے بھی ہیں اور غار بھی ہیں۔ تم سوچ سکتی ہو اتنی بڑی جگہ میں مٹھی بھر ہیرے تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے اور اگر کوئی پھر بھی انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرے تو میرے نزدیک وہ حماقت کرے گا۔"

"تم نے تقریباً کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی امکان ہے کہ وہ ہیرے تلاش کیے جاسکیں۔"

"اتنا ہی امکان ہے جتنا ٹرک بھر بھوسے میں ایک سوئی تلاش کرنا۔ کیا تم اس کام کو ہوش مندی کہو گی۔"

شہلا کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کسی قدر متفق ہے لیکن شاید فتح خان سے اس کی ڈیل ان ہیروں کے بارے میں تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور سر ہلایا۔ "شہباز فتح خان سے میرا معاہدہ ہے میں ہیروں کی تلاش اور ان کی فروخت میں اس کی مدد کروں گی۔"

"تلاش تو سمجھ میں آتی ہے لیکن تم فروخت میں مدد کس طرح کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے مڈل ایسٹ میں کونٹیکٹس ہیں۔ میں بہت آسانی سے ان ہیروں کو اچھی قیمت پر بکوا سکتی ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ اگر فتح خان خود کوشش کرے تو اسے جو قیمت ملے گی میں اس سے دوگنی قیمت پر سودا کرا سکتی ہوں۔"

تو یہ وجہ تھی کہ فتح خان شہلا سے گٹھ جوڑ کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ فتح خان پڑھا لکھا نہیں تھا وہ چالاک تھا لیکن اسے بزنس نہیں آتا تھا۔ شہلا یقیناً اس کام میں ماہر تھی۔ وہ تعلیم یافتہ اور ایلیٹ کلاس کی پروردہ تھی۔ ملک میں اور بیرونِ ملک اس کے تعلقات وسیع تھے اور وہ ان سے فائدہ اُٹھانے کا ہنر جانتی تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک خوب صورت عورت تھی اس لیے کسی بھی ڈیل میں اس کی کامیابی کے امکانات فتح خان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ "فتح خان کا دعویٰ ہے کہ ہیروں کی قیمت ڈھائی سو ملین ڈالرز سے زیادہ ہے۔"

"یہ اس کا اندازہ ہے میرے خیال میں ان کی قیمت اور زیادہ ہو چکی ہے۔ کیونکہ پچھلے پانچ برسوں میں سونے اور دوسری قیمتی چیزوں کی مالیت دوگنی ہو گئی ہے۔"

"چلو اسے بھی ڈبل کر لو لیکن سوال تو یہی ہے کہ نو من تیل کہاں سے آئے گا جس کے لیے رادھا ناچے گی۔"

شہلا مسکرائی۔ "شہباز ہم اسی کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ دراصل میں اور فتح خان ایک بات پر متفق ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ تم خوش قسمت شخص ہو۔"

میں بے ساختہ ہنسا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ "اچھا.....؟"

"طنز مت کرو غور کرو۔ بے شک تم مشکلات میں ہو، لیکن دنیا میں لاکھوں لوگ اس سے زیادہ مشکل میں ہوتے ہیں اور ان کی کوئی مدد نہیں کرتا ہے اور نہ قدرت ان کی مدد کو آتی ہے۔ وہ بے بسی سے اس مصیبت کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن تمہاری مدد قدرت بھی کرتی ہے اور تمہیں دوسروں کی مدد بھی بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔"

"یہ میری قسمت نہیں صرف اللہ کا فضل ہے۔"

"وہی کہہ رہی ہوں یعنی تمہارا کام رکتا نہیں ہے، کسی نہ کسی طرح پورا ہو جاتا ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"ٹھیک ہے تمہاری بات تسلیم ہے۔" میں نے بحث ختم کرنے کے لیے کہا تاکہ بات آگے بڑھے۔

"اگر تم کسی کام میں شامل ہو تو اس کے ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے....." وہ بولی تو میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ہر ناممکن کام اس امید پر کرنے لگوں۔"

وہ مسکرائی۔ "مجھے معلوم ہے تم وہی کام کرتے ہو جس کی کامیابی کی تمہیں امید ہو اور ہم اسی لیے تمہیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ شہلا کی باتوں میں کہیں دور ایک معنی چھپا ہوا ہے لیکن فی الحال میں اس معنی تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اُکتا کر کہا۔ "شہلا تم جو کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔"

"چھوڑو اس موضوع کو۔" اچانک اس نے بات بدل دی۔ "شہباز ایک سوال ہے۔"

"پوچھو بی بی۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "تمہارے ہاتھ میں ہوں تم جو چاہے پوچھ سکتی ہو۔"

"جب میں تمہیں اپنے ٹھکانے پر لے گئی تھی اور وہاں تم سے بھرا ہوا پستول حاصل کر لیا تھا لیکن تم نے اس وقت چانس لیا اور مجھ پر دوبارہ قابو پا لیا۔ لیکن ابھی جب میں نے تمہیں قابو کیا تو تم نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے میرے ساتھ چلے آئے۔ میں اس کی وجہ نہیں سمجھی۔"

"اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے۔ اس وقت رسک میری زندگی کا تھا اور اپنی زندگی پر میں ننانوے فیصد چانس لیتا ہوں لیکن یہاں تم نے میرے ساتھی کو یرغمال بنالیا تھا اور میں اپنے کسی ساتھی کے لیے ایک فیصد چانس بھی نہیں لے سکتا۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "صرف یہی وجہ ہے؟"

"اور کیا وجہ ہو سکتی ہے شہلا یقین کرو ان میں سے ہر ایک میرے لیے دنیا جہاں کی دولت سے بڑھ کر ہے۔"

اس نے رشک سے مجھے دیکھا۔ "شہباز تم اور تمہارے ساتھی خوش قسمت ہو۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے لیکن مخلص ساتھی ایک بھی نہیں۔"

"اگر تم قدرت سے شکوہ کر رہی ہو تو یہ بیکار ہے تم نے قدرت سے جو چیز چاہی وہ تمہیں مل گئی ہے۔ اگر تم مخلص ساتھی چاہتیں تو وہ مل جاتے لیکن تم نے صرف دولت چاہی۔"

"تو تم نے مخلص ساتھی چاہے تھے؟"

"ظاہر ہے ورنہ مجھے ایسے اچھے دوست کیوں ملتے۔"

میں شہلا سے بات کر رہا تھا اور اس کے سوالوں کا جواب بھی دے رہا تھا لیکن میرے اندر کہیں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے شہلا مجھ سے جو باتیں کر رہی تھی اس کا ایک تو ظاہری مفہوم تھا لیکن اس کے پیچھے بھی ایک مفہوم تھا اور وہ میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ آخر وہ کیا کہنا یا مجھے سمجھانا چاہ رہی تھی۔ شہلا نے گہری سانس لی۔ "تم خوش قسمت ہو اور شاید تمہاری خوش قسمتی ہمارے کام بھی آسکے۔ تم نے ڈرائی فروٹ تو لیا ہی نہیں۔"

اس کے توجہ دلانے پر میں نے کچھ کاجو لیے اور انہیں ٹونگنے لگا۔ اس نے اخروٹ کی ایک گری اٹھالی۔ "میری خوش قسمتی تمہارے کام کیسے آئے گی؟"

"آسکتی ہے اگر تم دل وجان سے ہمارے لیے کام کرنے پر راضی ہو جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں......" میں نے چند بادام لیے۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں......" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن جو تم چاہتی ہو وہ ممکن نہیں ہے۔"

"یہ تو تم ابھی کہہ رہے ہو۔" وہ بستر پر یوں نیم دراز ہو گئی کہ اس کی جسمانی دل کشی واضح ہونے لگی۔ ایک لمحے کو میری نظر بھٹکی اور میں نے دل میں لاحول پڑھی۔ "ممکن ہے کل تمہارا خیال بدل جائے۔"

"جب خیال بدلے گا تو دیکھا جائے گا۔" میں نے جماہی لی۔ میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔

"شہباز تم نے غور کیا کہ جب میں اور فتح خان بینک لاکر تک خود رسائی حاصل کر سکتے تھے تو ہم نے تمہیں کیوں استعمال کیا؟"

"میں اب تک یہ بات نہیں سمجھ سکا۔" میں نے جواب دیا۔

"حالانکہ سامنے کی بات ہے اس طرح تم اپنی ساری قوت ایک سمت میں استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے اور تم نے کسی دوسری طرف سوچا ہی نہیں۔"

اس کی بات نے مجھے الجھا دیا تھا لیکن میری ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ میں زیادہ سوچ سکتا۔ "شہلا تم کیا کہنا چاہ رہی ہو کھل کر بات کرو۔"

"تم نے سوچا نہیں کہ ہم تمہاری توجہ اس طرف لگا کر اپنا کوئی اور مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔" شہلا بولی تو یک لخت میرے اندر اندیشے سے سرسرانے لگے تھے۔

"شہلا تم کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "شہباز ممکن ہے کل تک تم اپنے سامنے کسی ایسی ہستی کو دیکھو جو تمہیں بہت پیاری ہو۔"

"شہلا۔" میں نے کھڑا ہونا چاہا تو بہت مشکل سے اور سستی سے کھڑا ہوا تھا۔ جسم وجان پر طاری ہوتی تھکن میں اچانک ہی بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ "یہ.... یہ مجھے.....کیا ہو رہا ہے؟" میں نے مشکل سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بولی۔ "تم نے کاجو کھائے ہیں۔ اب تم آرام سے سو جاؤ گے۔"

میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا اور بہت مشکل سے بڑھایا، میرے حواس پر دھند طاری ہونے لگی تھی۔ شہلا اطمینان سے مسکرا رہی تھی۔ اس نے اٹھنے یا کسی کو بلانے کی کوشش نہیں کی اسے اعتماد تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ اس کا اعتماد درست تھا کیونکہ دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے میں لڑھک کر بیڈ پر گرا اور پھر مزید لڑھک کر نیچے آ گیا۔ میرا سر بیڈ پر ہی تھا اور شہلا میری نظروں کے عین سامنے قاتلانہ پوز میں مسکرا رہی تھی پھر اس کی مسکراہٹ اس منظر پر حاوی ہو گئی اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ شہلا اور فتح خان نے میرے ساتھ صحیح معنوں میں بلی چوہے والا کھیل کھیلا تھا۔ بلکہ چوہا بھی بلی کے مقابلے میں کم سے کم اس کے عزائم

سے تو واقف ہوتا ہے۔ میں اس معاملے میں چوہے سے بھی گیا گزرا تھا۔ شہلا اتنے دن میری قید میں رہی اور میں اس کے عزائم کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا۔ اب انکشاف ہوا تھا کہ میں ان کے ہاتھوں کس طرح بے وقوف بنا تھا اور شہلا کی آخری بات نے مجھے تشویش زدہ کر دیا تھا۔ کل وہ میرے کسی ساتھی کو بھی یہاں لانے والے تھے اور اس سے توجہ ہٹانے کے لیے انہوں نے بینک والا کام میرے حوالے کر دیا تھا۔ گویا انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ اگر شہلا کا دعویٰ درست تھا تو میں یقیناً شہلا اور فتح خان کی ہر بات ماننے پر مجبور ہو جاتا۔

مجھے بے ہوشی کی دوا کاجو میں دی گئی تھی۔ شہلا نے کاجو نہیں لیے تھے اس نے صرف اخروٹ لیے تھے۔ ان میں دوا نہیں تھی۔ دوا نہ صرف بے بو اور بے ذائقہ تھی بلکہ بہت پُر اثر بھی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے چند منٹ سے بھی پہلے میرے ہوش چھین لیے تھے۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا کیونکہ جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھ سے گھڑی اتار لی گئی تھی یہی نہیں بلکہ میرا پرس اور چند دوسری چیزیں جو جیب میں تھیں وہ بھی غائب تھیں میرے جسم پر صرف لباس اور پاؤں میں جوتے چھوڑ دیے تھے۔ مجھے جہاں ہوش آیا وہ جگہ تاریک اور سرد تھی۔ اگر میرے نیچے نرم بستر اور اوپر ایک موٹا کمبل نہ ہوتا تو میں بے ہوشی میں ٹھٹھر کر رہ جاتا۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی دوا کے اثر سے ذہن کچھ دیر سن رہا تھا۔ پھر میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ تاریکی میں جگہ کا اندازہ کرنا دشوار تھا۔ میں نے کمبل ہٹاتے ہوئے پاؤں زمین پر رکھے۔ میرے پیروں تلے پختہ فرش تھا۔ پھر میں نے آس پاس کسی چیز کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور ہاتھ پھیلا کر اور پاؤں گھسیٹ کر چلنے لگا۔ جلد میرے ہاتھ سیمنٹ کی دیوار سے ٹکرائے اور اس کے ساتھ مجھے لکڑی کی ایک سیڑھی ملی جو اوپر جا رہی تھی اس سیڑھی کے ساتھ اوپر جاتے ہوئے میرا سر ایک تختے سے ٹکرایا۔ یہ چوبی تختہ تھا اور اس کی درزوں سے بہت ہی معمولی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ گویا میں کسی تہ خانے میں قید تھا اور امکان تھا کہ یہ اسی مکان کے نیچے تھا جہاں رات کو مجھے لایا گیا تھا۔ میں واپس نیچے آیا اور بقیہ تہ خانے کا جائزہ لیا۔ یہ چھوٹا سا تھا مشکل سے بارہ بائی بارہ فٹ کا اور اس میں سوائے ایک چارپائی کے اور کچھ نہیں تھا۔ چارپائی کے تلے پانی کی ایک بوتل ملی اور اس میں پانی بھی تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے پہلے پانی چکھا اور پھر چند گھونٹ لیے۔ پانی صاف ہی محسوس ہو رہا تھا اور اگر انہیں مجھے بے ہوش ہی کرنا تھا تو اس کے لیے دوسرے طریقے بھی تھے۔ پیاس شدت کی تھی پھر بھی میں نے اتنا پانی پیا جتنا کہ مسئلہ نہ بنے۔ یہاں رفع حاجت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

پہلے مجھے خیال آیا کہ میں شور مچاؤں اور ان لوگوں کو متوجہ کروں لیکن پھر میں نے خود پر قابو رکھا۔ یہ اعصاب کا کھیل تھا اور اس میں وہ فریق زیادہ کامیاب ہوتا جو خود پر قابو رکھتا۔ اگر ان لوگوں نے مجھے اسی طرح رکھنا تھا تو میرے شور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں کیوں نہ خاموش رہتا، ممکن ہے اس سے مجھے فائدہ ہوتا۔ جلد یا بدیر انہیں میری طرف آنا تھا۔ میں دوبارہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ یہ صاف ستھرا تھا لیکن اس سے ہلکی سی بو بھی آ رہی تھی جیسے اسے بہت دنوں سے دھوپ نہ دکھائی گئی ہو۔ میں نے لیٹتے ہوئے خود سے کہا۔

"لو شہباز میاں تم ایک بار پھر دشمن کے جال میں آ گئے۔"

میرے لیے یہ پہلا اور آخری موقع نہیں تھا جب دشمن نے مجھ پر قابو پایا ہو اس لیے میں پُرسکون تھا۔ البتہ پیٹ میں بھوک اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ بھوک بتا رہی تھی کہ میں کم سے کم آٹھ گھنٹے بے ہوش رہا تھا اس کا مطلب ہے دوا نہایت زود اثر تھی۔ دنیا کی کوئی دوا انسان کو آٹھ گھنٹے سے زیادہ بے ہوش نہیں رکھ سکتی ...... جسم آٹھ گھنٹے بعد اس کے اثر سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ مسلسل بے ہوش رکھنے کے لیے دوبارہ دوا دینا لازمی ہوتا ہے۔ میں شاید رات دو بجے کے قریب بے ہوش ہوا تھا۔ یعنی اس وقت صبح دس تو بج چکے تھے۔ ممکن ہے دن اور نکل آیا ہو۔ اس لحاظ سے اوپر موجود افراد کو بھی جاگ جانا چاہیے تھا۔ مگر اوپر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

جیسے جیسے میرے حواس زیادہ بحال ہو رہے تھے۔ میری تشویش بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ شہلا اور فتح خان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ میرے اندازوں سے کہیں آگے تھے اور اس صورت میں شہلا کا دعویٰ تقریباً درست لگ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بینک کی طرف لگا کر دوسرے معاملات سے غافل کر دیا تھا۔ سوچتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں فتح خان نے عبداللہ کی کوٹھی کا سراغ تو نہیں لگا لیا تھا۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔ عبداللہ والی کوٹھی میں آمد ورفت بہت زیادہ ہو گئی تھی اور اس کا نظروں میں آنے کا خطرہ بھی بڑھ گیا تھا۔ دشمن کو کمزور یا بے خبر سمجھنا حماقت ہوتی ہے اور شاید ہم بہت خود اعتماد ہو گئے تھے۔ اس

کے نتیجے میں ہمارا اہم ترین پلان ناکام ہوا۔ دھاتی بریف کیس اور پروفیسر کے بلیک میلنگ اسٹف سمیت میں فتح خان اور شہلا کی قید میں تھا اور ابھی میرا کوئی ساتھی بھی ان کی قید میں آنے والا تھا۔

تاریکی اور سردی میں کمبل میں دبکے ہوئے مجھے خاصی دیر ہوگئی تھی لیکن ابھی تک اوپر سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ میں ایک بار اُٹھ کر سیڑھیوں سے اوپر گیا اور سن گن لیتا رہا لیکن اوپر سناٹا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ میں اس جگہ بالکل اکیلا ہوں۔ فتح خان اور شہلا مجھے یہاں بند کر کے کہیں چلے گئے تھے۔ میں نے تختے پر زور لگا کر اسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اتنی مضبوطی سے بند تھا کہ اس میں خفیف سی لرزش بھی نہیں ہوئی تھی۔ تہ خانے کی دیواریں ٹھوس تھیں اور ان میں کہیں کوئی رخنہ نہیں تھا۔ تھک ہار کر میں واپس نیچے آیا اور چارپائی پر دراز ہوگیا۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ آرام کر چکا تھا۔ اس لیے لیٹا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ پھر وقت گزاری اور اپنی توانائی بحال کرنے کے لیے سانس کی ایک مشق کرنے لگا۔ اس سے میرے منتشر ہوتے اعصاب کو سکون ملا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد جا کر اوپر آہٹیں شروع ہوئیں اور پھر چند افراد کے قدموں کی دھمک اوپر لکڑی کے تختوں پر سنائی دی۔ تہ خانے کی ساری چھت لکڑی سے بنی ہوئی تھی۔ ایک غیر واضح مردانہ آواز آئی اور پھر اوپر کا تختہ کھلا۔ فتح خان کے آدمی نے نیچے جھانکا اور بولا۔ ''اُٹھ کر باہر آؤ۔''

تختہ کھلنے سے معمولی سی روشنی اندر آئی تھی لیکن مجھے مسلسل تاریکی میں رہنے کی وجہ سے یہ بھی بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ میں اوپر آیا تو فتح خان کے دونوں آدمی مسلح حالت میں موجود تھے اور میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ ایک کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی اور دوسرا پستول سے مسلح تھا۔ تہ خانہ اس راہداری کے آخری حصے میں واقع کمرا نما جگہ پر تھا۔ اس راہداری کے ایک طرف گھر کی نشست گاہ تھی اور دوسری طرف شہلا والا کمرا اور ایک اور کمرا تھا۔ وہ مجھے اسی کمرے میں لائے یہاں فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں کچھ نہیں تھا۔ راہداری کے آخر میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا اور یہ شہلا والے کمرے کے برابر میں تھا اور بائیں جانب کھلا حصہ تھا یہ شاید کچن تھا۔ چھوٹے دروازے کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ باتھ روم ہوگا۔ ایسا ہی ایک چھوٹا دروازہ میں نے شہلا والے کمرے میں دیکھا تھا۔ یعنی ایک باتھ روم کمرے کے ساتھ اٹیچ تھا اور دوسرا باہر راہداری میں تھا۔ ویسے دونوں برا. ی تھے۔

فتح خان کے آدمی مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے اور انہوں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ نہ انہوں نے مجھے کچھ بتایا، نہ میں نے پوچھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لائے تھے۔ جو ہونا تھا وہ کچھ دیر میں سامنے آجاتا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور شہلا ہاتھ میں ایک ٹرے لیے اندر آئی۔ اس میں ناشتا تھا۔ توس تھے اور تلے ہوئے انڈے تھے، ساتھ میں بھاپ اُڑاتا چائے کا مگ تھا۔ وہ بدستور رات والے لباس میں تھی اور دن کی روشنی میں مزید نمایاں لگ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے اپنی اتنی زیادہ نمائش کر کے کیا تسکین ملتی تھی حالانکہ وہ فتح خان اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں زک بھی اُٹھا چکی تھی۔ اس کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی تھی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی تو میں نے کہا۔ ''بندے کو کھانے پینے کے علاوہ بھی کچھ حاجات ہیں۔''

''حاجات؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کال آف نیچر۔'' میں نے اسے اس زبان میں سمجھایا جو وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب انگریز یہاں نہیں آئے تھے تب طبقات کی زبان الگ الگ ہوتی تھی۔ شاہ خاندان اور ان کے مصاحب و امرا فارسی بولتے تھے۔ شہروں میں بسنے والا درمیانہ طبقہ اردو بولتا تھا اور دیہاتوں میں رہنے والے اپنی اپنی مقامی زبان بولتے تھے۔ اب بھی وہی تقسیم ہے۔ ہمارے حکمران اور ان کا مصاحب طبقہ عرف ایلیٹ کلاس انگریزی بولتا ہے۔ شہروں میں بسنے والے درمیانی طبقے کی زبان اردو ہے اور دیہاتوں میں لوگ اپنی زبان بولتے ہیں۔ یعنی زمانے میں نہ پہنچنے کی وہی باتیں ہیں۔ یقین کریں جس دن ہماری حکمران کلاس اور مڈل کلاس کی زبان ایک ہوگئی اس دن ہمیں ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ کسی ملک اور قوم کی ترقی کے لیے یہ بنیادی شرط ہے۔

شہلا نے سر ہلایا۔ ''اوکے میں سمجھ گئی، ایک منٹ رکو۔''

شہلا نے ایک آدمی کو بلایا اور وہ مجھے راہداری کے آخری حصے میں بنے باتھ روم میں لے گیا۔ یہ چھوٹا لیکن صاف ستھرا پُرانے طرز کا باتھ روم تھا۔ بدبو بھی نہیں تھی۔ مگر پانی ... نہایت سرد تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے جسم کے کچھ خاص حصے اور منہ ہاتھ دھویا تھا۔ پانی برف کی پگھلی ہوئی شکل میں تھا۔ یہاں تولیہ بھی نہیں تھا جس سے منہ ہاتھ صاف کر لیتا

اور رومال تھا نہیں۔ اس لیے مجبوراً ایسے ہی واپس آنا پڑا۔ جس کمرے میں ناشتا رکھا تھا وہاں آتش دان نہیں تھا اور مجھے تہ خانے سے نکل کر اندازہ ہوا کہ وہاں اتنی ٹھنڈ نہیں تھی جتنی کہ باہر تھی۔ چائے تقریباً ٹھنڈی ہو چکی تھی اور میں نے پہلے اسے پی لینا مناسب سمجھا ورنہ چند منٹ بعد مجھے شاید آئس ٹی پینا پڑتی۔ پھر میں ناشتے کی طرف متوجہ ہوا تو شہلا نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''اس جگہ اس سے زیادہ ملنا دشوار ہے اس لیے تمہیں اسی ناشتے پر گزارا کرنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں مس شہلا میں نخرے کرنے والا آدمی نہیں ہوں گزارا کرنا جانتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم جب تک ناشتا کرو میں تمہارے لیے دوبارہ چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' اس نے مہربان لہجے میں کہا اور مگ اٹھا کر چلی گئی۔ رات کے مقابلے اس.... وقت اس کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ توس اچھی خاصی مقدار میں تھے اور انڈے بھی کئی عدد تلے گئے تھے اس لیے میرا پیٹ بھر گیا۔ ہاتھ کی چکناہٹ میں نے بلا تکلف قالین سے صاف کی اور ایک طرف رکھے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ شہلا کچھ دیر بعد آئی اور اس نے جرسی کے اوپر ایک ڈھیلا سا بیگی سوئٹر لے لیا تھا۔ میں نے اس سے چائے لی۔

''شکر ہے تم نے کچھ تو پہنا۔ فتح خان کے آدمی تمہیں کس بُری طرح گھور رہے تھے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''تمہیں تو نہیں لیکن مجھے اس سے بہت کوفت ہوتی ہے۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔ ''ان کم بختوں کی وجہ سے تو پہنا ہے ایسا لگتا ہے انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی۔''

''تم جیسی شاید ہی دیکھی ہو پھر وہ جس قسم کے لوگ ہیں عورت کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اپنی ماں بہنوں کے علاوہ ان کے لیے ہر عورت بس عورت ہوتی ہے۔ خیر چھوڑو یہ الگ موضوع ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے ابھی تک مجھے سرپرائز نہیں دیا۔''

وہ بولی۔ ''اتنی جلدی کیا ہے اور پھر تمہیں پسند نہیں آئے گا اس لیے جتنی دیر سرپرائز کے بغیر رہو تمہارے لیے بہتر ہے۔''

''شہلا فتح خان ایک دیوانہ قسم کا شخص ہے اور جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ جائے اس پر ایمان کی حد تک یقین کر لیتا ہے لیکن تم ایک ذہین اور معقول عورت ہو تم اس کی دیوانگی میں کیوں شامل ہو؟''

''تمہارے نزدیک یہ دیوانگی ہے؟''

''ہاں مجھے یقین ہے وہ ہیرے تمہیں یا فتح خان کو نہیں ملیں گے ان کو تلاش کرنا فضول ہے۔''

''دنیا میں لاکھوں لوگ کروڑوں فضول کام کرتے ہیں دوسروں کے نزدیک وہ وقت کا نقصان کرتے ہیں لیکن جب ان میں سے کچھ کامیاب ہو جاتے ہیں تو دنیا انہیں لیجنڈ تسلیم کر لیتی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ لیجنڈ بنو۔'' میں نے فریادی لہجے میں کہا۔ ''لیکن میری اور میرے ساتھیوں کی شامت کیوں آئی ہوئی ہے؟''

شہلا ہنسی۔ ''آدمی اتنی آسانی سے لیجنڈ نہیں بنتا ..... اسے بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔''

''دوسروں کی۔'' میں نے سادگی سے کہا تو اس کی ہنسی رک گئی۔ پھر اس نے سرد آہ بھری۔

''کاش کہ تم پہلے مان جاتے۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ میں آسانی سے مان جاتا تو انہیں میرے کسی پیارے کو اُٹھانے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔ میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''شہلا تم نے کس پر ہاتھ ڈالا ہے؟''

''تم دیکھ لو گے۔'' وہ نرمی سے بولی۔ ''فتح خان اسے لینے گیا ہے۔''

''فتح خان۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''میں آج تک اس شخص کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔ کبھی یہ مجھے انتہائی خطرناک لگتا ہے اور کبھی مجھے اس سے ذرا بھی خطرہ محسوس نہیں ہوتا ہے۔ کبھی یہ ڈیوڈ شا سے بھی زیادہ ہوشیار لگتا ہے اور کبھی مرشد سے بھی زیادہ احمق۔''

''مرشد احمق نہیں ہے۔''

''وہ احمق ہے۔ لیکن ایسا احمق جو خود کو بہت عقل مند بلکہ عقلِ کل سمجھتا ہو۔ اس کے مقابلے میں فتح خان ایسا عقل مند ہے جو خود کو زیادہ عقل مند نہیں سمجھتا ہے۔ مگر عورت کے معاملے میں وہ بہت چالاک ہے۔ اسے عورتوں کو قابو میں کرنے کے گر آتے ہیں۔''

شہلا کا چہرہ سرخ ہوگیا وہ سمجھی کہ میں اس پر رکھ کر بات کر رہا ہوں اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اسے قابو کرنے کے گر نہیں آتے..... اس معاملے میں وہ اور اس کے ساتھی درندے ہیں۔ صرف پھاڑ کھانا جانتے ہیں۔''

''اور آفرین ہے تم پر، ان درندوں کے درمیان اتنے

”کھلے ڈلے انداز میں رہ رہی ہو۔“ میں نے اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔

”میں کیسے رہ رہی ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ..... اصل بات یہ ہے کہ یہاں میری حیثیت کیا ہے۔ اگر میرا فتح خان سے معاہدہ نہ ہوتا تو میں یہاں شٹل کاک برقع میں بھی محفوظ نہیں ہوتی لیکن اب میں بے شک کپڑے اُتار کر پھروں یہ مجھے دیکھ تو سکتے ہیں لیکن کوئی ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔“

”یہ تمہاری خام خیالی ہے اگر ان میں سے کسی کا اشتیاق حد سے بڑھ گیا تو وہ اس بات کی پروا نہیں کرے گا کہ فتح خان سے تمہارا کس نوعیت کا معاہدہ ہے۔ بہتر ہے ان کے جذبات سے کھیلنے سے گریز کرو اور یہاں ذرا ڈھک چھپ کر رہا کرو۔“ میں نے چائے ختم کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

”مشورے کا شکریہ۔“ اس نے کہا اور کپ اُٹھا کر چلی گئی۔ یہ کمرا پتھروں سے بنا تھا باہر کی طرف والی دیوار کو چھوڑ کر اندر کی تین دیواروں پر پلاسٹر تھا اور اس پر اعلیٰ قسم کا ڈسٹمپر کیا گیا تھا۔ کمرے میں صرف ایک دروازہ اور باہر کی سمت کھلنے والا ایک بڑا روشن دان تھا لیکن اس کے شیشے کے پٹوں سے فولادی گرل صاف نظر آرہی تھی۔ دروازہ بھی مضبوط قسم کا تھا یعنی میں اس کمرے سے آسانی سے فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ میرے لیے یہ اطلاع اہم تھی کہ فتح خان میرے اس ساتھی کو لینے گیا ہے جسے ان لوگوں نے اغوا کرلیا تھا۔ اب یہاں پر شہلا کے ساتھ اس کے دو آدمی تھے۔ میں نے سوچا کیا یہ میرے لیے موقع ہے۔ اگر میں فرار کی کوشش کرتا تو اس کے کامیاب ہونے کے کتنے امکانات تھے۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ فتح خان کی غیر موجودگی میں امکانات بڑھ گئے تھے لیکن کتنے بڑھے تھے اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا جب میں فرار کی کوشش کرتا۔ فتح خان کے دونوں ساتھی دیکھنے میں قبائلی لگتے تھے لیکن وہ اپنے کام میں ماہر تھے۔ پھر شہلا بھی آتشیں ہتھیاروں کے استعمال میں کسی سے کم نہیں تھی اس لیے مجھے فرار کے لیے ان تینوں سے نمٹنا پڑتا۔

روشن دان سے آنے والی روشنی بتا رہی تھی کہ دن مکمل ہوکر اب زوال کی طرف گامزن تھا۔ روشنی میں کمی واقع ہو رہی تھی یعنی کم سے کم دو بج گئے تھے۔ سردیوں میں سورج پانچ بجے کے آس پاس غروب ہو جاتا۔ میں قالین پر دراز ہوکر فرار کے امکانات پر غور کرنے لگا اور غور کرتا کرتا سو گیا۔ شہلا نے نہایت چالاکی سے مجھے پھر خواب آور دوا دی تھی لیکن اس کے لیے اس نے پہلے میرا اعتماد بحال کیا تھا۔ مجھے تہ خانے سے نکالا اور اس کمرے میں رکھا پھر مجھے ناشتا مہیا کیا اور باتھ روم جانے کا موقع دیا۔ اس کے مہربان رویے سے میرے ذہن کا الرٹ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے دوسری بار چائے میں دوا شامل کی اور اسے ہلکا رکھا تھا تاکہ مجھے فوری احساس نہ ہو اور میں چونکے بغیر آرام سے سو جاؤں اور ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کب میں سوچتے سوچتے خوابوں کی وادی میں کھو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو روشن دان کے باہر تاریکی تھی البتہ کمرے میں دیوار پر ایک کیروسین لیمپ روشن تھا۔ سونے کے دوران مجھ پر کمبل ڈال دیا گیا تھا تاکہ مجھے سردی نہ لگے۔ میں کمبل ایک طرف کرکے اُٹھ بیٹھا۔ میں نے چہرہ پر ہاتھ پھیرا اور خود سے کہا۔ ”شہباز ملک اچھے مسلمان ہو ایک سوراخ سے دوسری بار ڈس لیے گئے۔“ پھر مجھے یاد آیا کہ یہ بات ایک مومن کے لیے کہی گئی ہے اور میں نے کبھی خود کو ایمان کے اس درجے پر نہیں سمجھا تھا۔

دروازہ باہر سے بند تھا لیکن باہر سے چلنے پھرنے کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ شہلا مجھے دوا دے کر اور کمرے میں بند کرکے مطمئن نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے ایک آدمی کو باہر مستقل پہرے پر لگایا ہوا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا لیکن ایسی کوئی آواز نہیں آئی جس سے پتا چلتا کہ فتح خان واپس آگیا ہے اور اس کے ساتھ کوئی ہے۔ سن گن لینے کے دوران مجھے ایسی خوشبو محسوس ہوئی جیسے کہیں گوشت کے پارچے بھونے جا رہے ہوں۔ شاید ڈنر کی تیاری کی جا رہی تھی۔ میرے پیٹ میں ہلچل مچ گئی کیونکہ ناشتا سونے کے دوران میں ہی ہضم ہو چکا تھا۔ میں واپس آکر بیٹھ گیا۔ کچھ کرنے کا وقت تو سو کر گزار دیا تھا اب آگے نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

میرے ساتھ رہ کر شہلا مجھے بہت اچھی طرح جان گئی تھی اور مجھ سے اسی طرح پیش آرہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں سکون سے نہیں بیٹھوں گا اور میرے پاس دشمن کی قید سے فرار کا ایک قابلِ رشک ریکارڈ موجود تھا۔ اس نے پہلے سے پیش بندی کرلی تھی اور مجھے فرار سے باز رکھنے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ اگر فتح خان ابھی تک نہیں آیا تھا تو وہ کہاں اور کتنی دور گیا تھا جو اس کی ابھی تک واپسی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سوچ کر ایک بار پھر میری تشویش بڑھنے لگی تھی۔ ابھی میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ دروازہ کھلا اور شہلا کھانے کی ٹرے اُٹھائے اندر آئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور

لہجے میں کہا۔ ”تم بہت زحمت کر رہی ہو، کھلا بھی رہی ہو اور سلا بھی رہی ہو۔ حالانکہ مجھے نیند کا کوئی مسئلہ نہیں ہے میں جب چاہتا ہوں سو جاتا ہوں۔“

وہ ڈھٹائی سے مسکرائی۔ ”بعض اوقات دشمن کی قید میں نیند نہیں آتی..... تم بلاوجہ جاگتے اور سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہوگے۔ اس لیے مجھے اس کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔“

ٹرے میں گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑے تھے جن پر ہلکا سا نمک اور کالی مرچ چھڑکی ہوئی تھی اس کے ساتھ تندوری نان تھے جو اگرچہ باسی تھے لیکن ان کو گرم کرکے قابلِ استعمال بنا لیا گیا تھا۔ میں نے اشارہ کیا۔ ”اسے کھا کر میں یقیناً صبح تک کے لیے سو جاؤں گا؟“

”نہیں۔“ وہ سکون سے بولی۔ ”اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ تم نے غور نہیں کیا یہ دو افراد کا کھانا ہے اور میں بھی تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔“

”فتح خان نہیں آیا ہے؟“

”نہیں..... اسے ذرا دیر ہوگئی ہے امید ہے کل صبح تک آجائے گا۔“

شہلا کی بات سے مجھے امید ہوئی کہ شاید فتح خان جس کام کے لیے گیا تھا وہ نہیں ہو سکا تھا۔ ظاہر ہے میرے ساتھی تر نوالہ نہیں تھے جو اتنی آسانی سے فتح خان کے ہاتھ آجاتے۔ شہلا ٹرے رکھ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر اسے یاد آیا۔ ”پانی تو لائی نہیں ایک منٹ ابھی لاتی ہوں۔“

وہ جلدی پانی کی بوتل اور گلاس سمیت واپس آئی۔ میں اس کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بہ ظاہر وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آرہی تھی اور میرا پورا خیال بھی رکھ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بڑی ہوشیاری سے مجھ پر اپنی گرفت رکھتے ہوئے کسی حرکت سے بھی باز رکھے ہوئے تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اب میں یہاں کچھ کھانے سے گریز کروں گا لیکن اس بار اس نے یہ حربہ استعمال کیا کہ مجھے یقین دلانے کے لیے خود کھانے میں شامل ہوگئی تھی۔ گوشت ایک ڈونگے میں تھا اور اس میں دوا ملانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تندوری نان میں یہ حرکت کی جا سکتی تھی لیکن میں نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے کے بعد ایک نان آدھا کیا اور ایک حصہ شہلا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ہنسی۔

”تمہارے خیال میں نان میں دوا ہو سکتی ہے؟“

”جب واسطہ تم جیسے دشمنوں سے ہو تو انسان کسی چیز کی بھی توقع کرسکتا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”سچ کہہ رہا ہوں کل سے تم نے مجھے حیران کر دیا ہے میں تمہیں اس کلیبر کی نہیں سمجھ رہا تھا۔“

”میرا کوئی کلیبر نہیں ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا اور کھانا شروع کردیا۔ میں بھی شامل ہو گیا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا تھا اور پھر وہ ٹرے اُٹھا کر لے گئی۔ میرا دل چائے یا کافی پینے کو چاہ رہا تھا لیکن مجھے گوارا نہیں ہوا کہ اس سے کہوں۔ کھانے کی طرح پانی بھی ایک ہی بوتل اور گلاس سے پیا تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔ وہ پانی کی بوتل اور گلاس یہیں چھوڑ گئی تھی۔ اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب وہ آدھے گھنٹے بعد دو کپ چائے لے آئی۔ یعنی ایک کپ اس کا تھا اور دوسرا میرا تھا۔ اس نے ٹرے نیچے رکھی اور معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

”سوری مجھے معلوم ہے تم کافی زیادہ شوق سے پیتے ہو لیکن یہاں صرف چائے کا سامان ہے۔“

”شکر ہے چائے تو ہے۔“ میں نے خلوص سے کہا۔

”اس میں سے جو مرضی کپ لے لو۔“ اس نے پیش کش کی۔ اس بار بھی مجھے شبہ نہیں ہوا کہ چائے میں کچھ ملایا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک کپ اُٹھا لیا اور سپ لے کر اس سے پوچھا۔

”یہ ویرانہ ہے یہاں سامان وغیرہ کہاں سے لاتے ہو؟“

”یہ جگہ ویرانہ ہے لیکن آبادی یہاں سے بہت دور نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہمیں سامان کی پریشانی نہیں ہے لیکن گاڑی ایک ہی ہے اس لیے کم سے کم یہاں سے نکلتے ہیں۔“

ہم یہاں ایک ہی گاڑی پر پہنچے تھے لیکن فتح خان یہاں سے کسی نہ کسی گاڑی پر تو گیا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا اس کے مزید آدمی آئے تھے اور اپنے ساتھ کوئی دوسری گاڑی لائے تھے۔ فتح خان اس میں یا یہاں پہلے سے موجود وین میں گیا تھا اور ایک گاڑی کو یہاں چھوڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تمہیں خطرہ نہیں ہے کہ میرے ساتھی مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آسکتے ہیں؟“

”یہاں تک ان کی سوچ بھی نہیں آسکتی.....“ وہ بولی۔

”ایسا مت کہو جو تم نے کیا وہ بھی ہماری سوچ میں نہیں آیا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ممکن ہے تم بعد میں حیران ہو کہ یہ ہوا کس طرح؟“

”جب ایسا وقت آئے تو دیکھ لیں گے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”ابھی تو ہمیں اطمینان ہے۔“

وہ اُٹھنے لگی تو میں نے اس سے کہا۔ ”ایک بات اور ہے۔“

وہ رک گئی۔ ”کون سی بات؟“

”کیا تمہیں فتح خان کے آدمیوں پر بھروسا ہے کہ وہ فتح خان کی غیر موجودگی کا فائدہ نہیں اُٹھائیں گے؟“

”کس طرح کا فائدہ؟“

”میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔“ میں نے ذرا گول مول انداز میں کہا تو وہ مسکرائی۔

”تم اس فکر میں دبلے مت ہو اوّل تو میں کوئی تر نوالہ نہیں ہوں جسے یہ آرام سے کھا جائیں اور دوسرے وہ اس کی جرأت نہیں کریں گے، انہیں معلوم ہے فتح خان سے پہلے میں خود انہیں سزا دے سکتی ہوں۔ ان کے ایک ساتھی کا انجام ان سے چھپا نہیں ہے۔“

وہ اس معاملے میں خوش فہم لگ رہی تھی۔ گناہ میں ایسی کشش ہے کہ انسان سب جانتے ہوئے بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ جو گناہ کرتے ہوئے اللہ سے نہ ڈرے وہ کسی انسان سے کیوں ڈرنے لگا۔ بہر حال یہ اس کا مسئلہ تھا۔ شہلا چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے جماہیاں آنے لگیں اور جسم میں ویسی ہی تھکن آمیز سستی محسوس ہونے لگی تو مجھے پتا چلا شہلا ایک بار پھر میرے ساتھ ہاتھ کر گئی ہے۔ کھانے میں تو نہیں لیکن چائے میں کچھ شامل تھا اور شاید وہ دونوں کپوں میں کچھ ڈال کر لائی تھی۔ سونے سے پہلے میرا ذہن اس میں اُلجھتا رہا کہ اس نے خود بھی تو چائے پی تھی تو کیا اس پر اثر نہیں ہوا ہوگا؟ اس سوال کا جواب میرے ذہن نے سونے سے پہلے دیا۔ وہ میری طرح مجبور نہیں تھی اور اس دوا کا توڑ کر سکتی تھی جس طرح انسان کو سلانے والی دوائیں ہیں اسی طرح انسان کی نیند اُڑانے والی دوائیں بھی ہیں۔ جن دنوں بزنس پیک پر ہوتا تھا اور میرے دفتر پر دن رات سیاحوں کی یلغار جاری رہتی تھی تو میں رات کو دیر تک کام کرنے کے لیے نیند بھگانے والی گولی استعمال کرتا تھا۔ یقیناً شہلا نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مجھے سلا کر وہ خود جاگتی رہی ہوگی۔

میری آنکھ کھلی تو حسبِ توقع صبح ہو چکی تھی اور روشن دان سے دن کی روشنی جھلک رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر پہلی بار روشن دان سے باہر دیکھا۔ اس کا نچلا سرا بھی کوئی آٹھ فٹ اونچا تھا اور مجھے اس کا کنارہ تھامنے کے لیے اُچھلنا پڑا تھا۔ پھر ہاتھوں کے بل پر خود کو اوپر اُٹھایا اور باہر جھانکا۔ یہ مکان کا پچھلا حصہ تھا اور یہاں احاطہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ اندر گھاس پھوس اور چھوٹی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جبکہ باہر سفیدے کا گھنا اور اونچا جنگل تھا۔ اس عمارت کو یہ جنگل بھی تحفظ دیتا ہوگا اور بہت کم لوگ اس جگہ سے واقف ہوں گے۔ گھنے درختوں کی وجہ سے عمارت بالکل قریب آئے بغیر ظاہر نہیں ہوتی ہوگی۔ اسی وجہ سے شہلا اس جگہ کے محفوظ ہونے کے بارے پُریقین تھی۔ جب میرا ہاتھ دکھنے لگا تو میں نیچے اُتر آیا اس دوران میں، میں نے دیکھ لیا تھا کہ فولادی گرل روشن دان کے باہر سے دیوار میں فکس کی گئی تھی یعنی اگر میں کوشش کرتا تب بھی اسے نہیں اُکھاڑ سکتا تھا۔ یہ انتظام عمارت کی پُرانی تعمیر سے ہٹ کر تھا۔ گرل جدید ساخت کی تھی اگر یہ عمارت کی تعمیر کے ساتھ ہی لگی ہوتی تو پُرانے انداز کی روایتی گول سلاخوں سے بنی ہوتی۔

رات کو یقیناً سردی ہو جاتی ہوگی لیکن کمبل اور پھر... بے ہوشی کی دوا کی وجہ سے مجھے اس کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ دن نکلنے کے بعد جب دھوپ پھیلی تو سردی کی شدت میں کسی قدر کمی آئی تھی۔ میں شہلا کا کھیل سمجھ گیا تھا۔ وہ میری طرف سے فرار کے خطرے کو کم سے کم رکھنے کے لیے مجھے نہایت ہوشیاری سے خواب آور دوا دے رہی تھی۔ پہلی بار اس نے مجھے کاجو میں دوا دی تھی اس کے بعد وہ مقدار کے معاملے میں محتاط ہو گئی تھی اور بس اتنی دوا دیتی تھی کہ میں شک نہ کروں۔ دوا کے لینے کے کوئی بیس منٹ بعد مجھے نیند آنا شروع ہو جاتی تھی جیسا کہ عام طور سے پرخوری کی صورت میں بھی ہوتا ہے اور وہ مجھے کھانا بھی مرغن اور زیادہ مقدار میں دے رہی تھی۔ اب اگر میں سو جاتا تو میں اسے الزام نہیں دے سکتا تھا۔ دوسرے وہ چوبیس گھنٹے میں مجھے صرف دو بار کھانا دے رہی تھی۔ یعنی جب میری بھوک چمک اُٹھتی اور کھانا نہ کھانے کے بارے میں میری قوت مزاحمت کمزور ہو جاتی۔ اس طرح اسے موقع ملتا رہتا کہ وہ مجھے دوا دے کر سلاتی رہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا جب تک فتح خان واپس نہ آ جاتا۔

جاگنے کے کئی گھنٹے بعد تک اس نے میری کوئی خیر خبر نہیں لی تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ میری بھوک چمک اُٹھے۔ میرا اندازہ درست نکلا، جب گیارہ بجے کے قریب دروازہ کھلا اور شہلا کی صورت دکھائی۔ وہ تر و تازہ دکھائی دے رہی تھی اور خلافِ معمول اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ مشرقی ملبوسات میں اسے صرف ساڑی پسند تھی جس میں اسے اپنے جسم کی نمائش کرنے کا بھرپور موقع ملتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اسے زیادہ تر مغربی لباس میں دیکھا تھا۔ مگر آج اس نے شلوار قمیص پہنی تھی۔ سوٹ ویلوٹ کا تھا اور حسبِ معمول قمیص اس کے وجود پر چسپاں تھی ساتھ ہی گریبان نظر نواز حد تک

کشادہ تھا۔ مجھے جاگتے دیکھ کر وہ دل کش انداز میں مسکرائی اور سادہ سے انداز میں بولی۔ ”اُٹھ گئے بڑی گہری نیند میں ہوتے ہو۔“

وہ چالاکی سے میری توجہ دوا والے معاملے سے ہٹا رہی تھی اس لیے میں نے بھی توجہ نہیں دی اور انگڑائی لی۔ ”ہاں آج کل نیند بہت آ رہی ہے، شاید گزشتہ دنوں کی نیند کی کمی پوری ہو رہی ہے۔“

”تم واش روم سے ہو آؤ پھر میں ناشتا لاتی ہوں۔“ وہ بولی تو میں باہر آ گیا جہاں فتح خان کا آدمی عقب سے شہلا کا بہ غور معائنہ کر رہا تھا۔ اس میں اس بے چارے کا قصور نہیں تھا۔ چست قمیص میں شہلا کی کمر اور اس کے آس پاس کے بھاری متعلقات کچھ زیادہ ہی واضح تھے۔ میرے باہر آنے پر وہ گڑبڑا کر میری طرف متوجہ ہوا اور اپنی شاٹ گن کا رُخ میری طرف کر لیا۔ ”چلو۔“

میں مسکرایا۔ ”مجھے باتھ روم جانا ہے اس دنیا سے نہیں جانا، اس بندوق کا رُخ دوسری طرف رکھو۔“

لیکن فتح خان کا آدمی حسِ مزاح سے عاری تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”چلو خدائی خوار۔“

میں واش روم سے فارغ ہو کر آیا تو شہلا ناشتا لے آئی تھی۔ وہ کمرے کے باہر میری منتظر تھی، اندر آنے سے پہلے اس نے فتح خان کے آدمی سے پوچھا۔ ”امیر مقام کہاں ہے.... صبح سے نظر نہیں آیا۔“

”پتا نہیں باہر ہوگا۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”تم لوگوں کی ڈیوٹی یہاں ہے۔“ شہلا دبی زبان میں بولی۔ شاید وہ میری وجہ سے اسے زیادہ لتھاڑ نہیں سکی تھی لیکن وہ اندر آئی تو اس کا موڈ خراب تھا۔ ناشتا صرف میرا تھا۔ مگر اس بار میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جب وہ مجھے بے وقوف بنا رہی تھی تو میں اسے کیوں نہ بے وقوف بناتا۔ ٹرے میں انڈوں کے خاگینے کے ساتھ پراٹھے تھے۔ مکھن اور اس کے ساتھ شہد تھا۔ خاگینے میں نمک ملانے کے لیے نمک دانی بھی موجود تھی۔ یہ خاصا لگژری قسم کا ناشتا تھا جو عام طور سے قیدیوں کو فراہم نہیں کیا جاتا..... میں نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا اور ڈٹ کر کھایا۔ اس بار وہ چائے نہیں لائی تھی۔ چائے ناشتے کے بعد لائی تاکہ مجھے ٹھنڈی چائے پینے کی کوفت نہ برداشت کرنی پڑے اور میں چائے پی کر راضی خوشی سو جاؤں۔ چائے کے بعد میں نے شہلا سے کہا۔

”مجھے واش روم جانا ہے۔“

وہ ہچکچائی پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن زیادہ دیر مت لگانا۔ ان لوگوں کو اور بھی کام ہوتے ہیں۔“

”چھوٹا سا کام ہے۔“ میں نے کہا۔ فتح خان کا آدمی بادلِ ناخواستہ مجھے لے کر واش روم تک آیا کیونکہ یہاں اسے شہلا کو گھورنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شہلا کے حکم پر عمل ضرور کر رہے تھے مگر ان کے انداز میں شہلا کے لیے کوئی وقعت نہیں تھی۔ میں چند منٹ بعد ہی واپس آ گیا۔ شہلا کمرے کے باہر میری منتظر تھی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا تو میں نے جماہی لے کر کہا۔ ”لگتا ہے رات کو نیند صحیح سے پوری نہیں ہوئی تھی پھر سستی چھا رہی ہے۔“

”تم آرام کرو۔“ اس نے خلوص سے کہا۔ ”چاہو تو سو جاؤ کیونکہ فتح خان کے اتنی جلدی آنے کا امکان نہیں ہے۔“

میں اس کے مشورے کے پیچھے چھپا اصل مقصد اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور کمرے میں آ کر میں نے اپنا بایاں ہاتھ سامنے کیا۔ اس ہتھیلی پر کٹ لگا ہوا تھا اور خون نکل رہا تھا۔ خون کو گرنے سے روکنے کے لیے میں نے مٹھی کس کر بھینچی ہوئی تھی۔ کٹ واش روم میں لگے شیشے کے کنارے سے لگایا تھا۔ خوش قسمتی سے شیشے کا کنارہ نکلا ہوا تھا اس لیے مجھے شیشہ نہیں توڑنا پڑا۔ اگر میں شیشہ توڑتا تو شہلا اس کے بارے میں جان کر مشکوک ہو جاتی۔ قالین کے ایک طرف تھوڑا سا نمک پڑا ہوا تھا۔ قالین کا یہ حصہ سفیدی مائل تھا اس لیے شہلا کو پڑا ہوا نمک بھی نظر نہیں آیا اور نمک بھی میں نے یہاں ڈالا تھا۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن کٹ چوڑا تھا۔

اب مجھے انتظار تھا کہ کب دوا اثر کرنا شروع کرتی ہے۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہلکی سی غنودگی میرے حواسوں پر طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے نمک کے چند ذرے اُٹھا کر زخم پر ڈالے۔ خون رک گیا تھا لیکن زخم ابھی تازہ ہی تھا۔ نمک کی تیزی نے مجھے چند لمحے کے لیے تڑپا دیا تھا۔ مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ غنودگی غائب ہو گئی اور میرا ذہن پہلے کی طرح چاق و چوبند ہو گیا۔ اس کامیاب تجربے کے بعد میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اب شہلا یا فتح خان کا آدمی کسی طرح سے اندر جھانکتے تو میں ان کو خوابِ خرگوش میں مگن دکھائی دیتا۔ پندرہ بیس منٹ بعد پھر غنودگی نے حملہ کیا جسے میں نے زخم پر نمک چھڑک کر پسپا کر دیا۔ اس کے بعد کھیل شروع ہو گیا۔ دوا اتنی آسانی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی غنودگی رہ رہ کر پلٹ رہی تھی اور بعض دفعہ تو یہ اتنی خاموشی سے آتی تھی کہ اگر میں شعوری طور پر ہوشیار نہ ہوتا تو مجھے پتا ہی نہیں چلتا کہ میں کب سو گیا ہوں۔

دو گھنٹے بہت سخت گزرے تھے۔ نمک پاشی سے زخم

میں تکلیف بڑھ گئی تھی اسی تناسب سے غنودگی کی کیفیت بھی بڑھی تھی لیکن دو گھنٹے بعد غنودگی کا حملہ کم اور کمزور ہونے لگا۔ لیکن میں اب بھی اس کی طرف سے ہوشیار تھا ذرا سی نیند کی کیفیت محسوس کرتے ہی زخم پر نمک لگاتا تھا۔ یہ تجربہ کرنے سے پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ اپنے زخم پر خود نمک چھڑکنا مشکل کام ثابت ہوگا لیکن پتا چلا کہ اس سے زیادہ مشکل کام پیٹ بھر کر کھانے کے بعد گرم کمبل میں لیٹ کر اور نیند آنے کے باوجود جاگتے رہنے کی کوشش کرنا ہے۔ عام حالات میں اگر میں پیٹ بھر کر اس طرح لیٹوں تو نیند آنا ایک فطری بات... ہوگی۔ دوا کے ساتھ تو اثر دوگنا ہو گیا تھا اور میں اس وقت کس طرح خود کو نیند سے بچائے رہا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ آدمی ساری دنیا سے لڑ سکتا ہے لیکن سب سے مشکل جنگ خود سے ہوتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے دین میں نفس سے جنگ کو افضل جہاد قرار دیا گیا ہے۔ افسوس کہ اس جہاد کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں۔

میں نے گیارہ بجے ناشتا کیا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ اس بات کو تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ نیند کا حملہ اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ دوا کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ ابھی تک شہلا یا کسی اور نے کمرے میں نہیں جھانکا تھا۔ شاید وہ میری طرف سے بے فکر تھے یا انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس وقت تک خاموشی تھی۔ اچانک مجھے لگا جیسے کہیں کوئی عجیب سی آواز نکال رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کا منہ بند ہو اور وہ بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نہ جانے مجھے کیوں لگا کہ آواز عورت کی ہے۔ پہلے میں سمجھا کہ یہ شہلا ہے اور اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ لیکن جلد شہلا کی آواز الگ سے سنائی دی وہ برس پڑنے والے انداز میں امیر مقام سے کہہ رہی تھی۔

"امیر مقام یہ کون ہے اسے یہاں کیوں لائے ہو؟"

کمرے کا اکلوتا دروازہ پرانی طرز کا تھا اور اس میں پٹ کے اوپر نیم دائرے میں شیشے لگے تھے۔ میں اٹھ کر دبے قدموں دروازے تک آیا اور چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر اوپر ہوا۔ یہاں سے نشست گاہ کا منظر کسی قدر واضح تھا مجھے بالکل سامنے ایک نوجوان اور خوب صورت عورت اس حال میں نظر آئی کہ اس کے ہاتھ پشت سے بندھے اور کپڑے سے اس کا منہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ وہ آواز نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اسی کی آواز سن کر چونکا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر چونکا اس کا لباس مختلف مقامات سے پھٹا ہوا تھا۔ خاص طور سے گریبان پیٹ تک پھاڑ دیا گیا تھا اور اس کا دودھیا جسم اور اس پر خراشوں کے نشانات صاف جھلک رہے تھے۔ اس کے پیچھے امیر مقام کھڑا تھا۔ وہ بڑھی ہوئی داڑھی مونچھوں والا تنومند شخص تھا جس کی آنکھوں میں ہمہ وقت سرخی رہتی تھی۔ اس کا ساتھی لڑکی کے سامنے تھا اور اسے کھا جانے والے انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"یہ ہم کو جنگل میں ملا تھا۔" امیر مقام نے سکون سے کہا۔

"اور تم اسے یہاں لے آئے۔" شہلا چلائی۔ "تمہارا دماغ درست ہے تم نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے؟"

یہ بتانے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی کہ امیر مقام نے اس اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا لباس اور خراش زدہ جسم بتانے کے لیے کافی تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں جیسے شرارے لپک رہے تھے۔ شہلا نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ فوراً ہی اس کے منہ سے گالیاں اُبل پڑی تھیں۔ اس کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ خانہ بدوش تھی۔ لیکن اس وقت پنجابی بول رہی تھی۔ اس نے امیر مقام کو گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "اس حرامی نے مجھے لوٹ لیا ہے..... میں اپنے مرد کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ میرا بچہ ہے..... اس کے پاس کیسے جاؤں گی۔"

مجھے افسوس ہونے لگا۔ فتح خان کا ساتھی ایک درندہ نکلا تھا۔ شہلا چلائی۔ "تم بولتے کیوں نہیں ہو؟"

"یہ بد زبان عورت ادھر جنگل میں لکڑیاں لینے آیا تھا۔" امیر مقام نے مشتعل لہجے میں کہا۔ یقیناً اسے لڑکی یا عورت کی گالیاں گراں گزر رہی تھیں حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ کا مستحق تھا۔ عورت مسلسل بول رہی تھی۔ شہلا، عورت اور امیر مقام کی دس پندرہ منٹ کی گفتگو سے صورت حال سامنے آئی وہ یوں تھی کہ فتح خان کے اس منہ زور ساتھی نے جب جنگل میں اس اکیلی اور جوان عورت کو دیکھا تو اس کی نیت خراب ہوگئی اور اس نے اسے پکڑ لیا۔ اس ویران جگہ اس عورت کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اپنی من مانی کر لینے کے بعد امیر مقام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ ابھی عورت واپس جا کر اپنے گھر والوں اور قبیلے کو خود پر گزری...... سنائے گی تو وہ اس جگہ چڑھ دوڑیں گے۔ اس لیے امیر مقام گن پوائنٹ پر عورت کو یہاں لے آیا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا، لڑکی کا تعلق ایک خانہ بدوش قبیلے سے تھا۔ یہ خانہ بدوش جو اپنے مویشی چرانے کے لیے مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ اوپر کشمیر کے

پہاڑوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور سردیوں میں یہاں نیچے پوٹھوہار کی طرف آ جاتے ہیں۔ نسلاً یہ کشمیری ہی ہوتے ہیں، اس کی تصدیق اس لڑکی کے خوب صورت خدوخال اور دمکتی رنگت بھی کر رہی تھی۔ بے آبرو ہونے کے باوجود وہ عام لڑکیوں کی طرح غم سے نڈھال ہونے کے بجائے غصے سے بے تاب تھی اور اگر اس کے ہاتھ نہ بندھے ہوتے تو وہ فتح خان کے ساتھی پر چڑھ دوڑتی۔ میں نے خانہ بدوشوں کو..... بے باک اور جذبات کا تیز دیکھا ہے، یہ لڑکی بھی ویسی ہی تھی۔

سب جاننے کے بعد شہلا اس پر برس پڑی تھی اور اسے بے نقط سنائی تھی لیکن اس سے نہ تو اس لڑکی کی لٹی عزت واپس آ سکتی تھی اور نہ ہی وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکتی تھی۔ امیر مقام اور اس کے ساتھی ایک نمبر کے ڈھیٹ اور بے حیا تھے۔ لڑکی کی گالیوں کے بعد شہلا کی باتیں بھی ان پر بے اثر رہی تھیں۔ اب وہ چپ ہو کر سوچ میں پڑ گئی تھی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی کہ اس لڑکی کا کیا کیا جائے۔ اس کے ذہن میں بھی وہی خدشہ ہوگا جس کی وجہ سے امیر مقام اس عورت کو پکڑ کر لے آیا تھا۔ اگر اسے آزاد کر دیا گیا تو وہ کچھ دیر میں اپنے سارے قبیلے کو یہاں لے آئے گی۔

خانہ بدوش امن پسند ہوتے ہیں اور عام طور سے کسی سے جھگڑا کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن یہ اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں اور کوئی ان کے ساتھ زیادتی کرے تو وہ اسے کسی صورت معاف نہیں کرتے..... امن پسند ہونے کے باوجود وہ ہتھیار رکھتے ہیں اور انہیں استعمال کرنا بھی جانتے ہیں۔ ان کا قافلہ یہاں سے کچھ ہی دور کسی چشمے کے ساتھ رکا ہوا تھا۔ خانہ بدوش وہیں پڑاؤ ڈالتے ہیں جہاں انہیں پانی آسانی کے ساتھ مل جائے۔ لڑکی شادی شدہ تھی اور چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کرنے آئی تھی کہ امیر مقام کے ہتھے چڑھ گئی۔ مجھے لگا کہ شہلا اس عورت کو واپس جانے نہیں دے گی اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے فتح خان کے آدمیوں سے کہا۔ "ابھی اسے لے جا کر تہ خانے میں بند کر دو۔ اس کا فیصلہ فتح خان آ کر کرے گا۔"

یہ سن کر فتح خان کے آدمیوں کی باچھیں کھل گئی تھیں کیونکہ انہیں ایک تفریح ہاتھ آ گئی تھی۔ لڑکی یہاں رہتی تو وہ موقع بہ موقع اس کے ساتھ من مانی کر سکتے تھے۔ امیر مقام کے ساتھی نے لڑکی کا بازو پکڑا تو وہ بھڑک گئی اور انہیں دوبارہ گالیاں دینے لگی۔ امیر مقام نے دوبارہ اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور وہ دونوں اسے کھینچ کر تہ خانے کی طرف لے گئے۔ وہ بُری طرح مچل رہی تھی اور پچھاڑیں کھا رہی تھی لیکن دو ہٹے کٹے مردوں کے سامنے اس کا زور نہیں چلا تھا وہ اسے آرام سے کھینچ کر لے گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ابھی موقع سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں تھے۔ یہ بات شہلا نے بھی محسوس کر لی تھی، وہ ان کے پیچھے گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی اور فتح خان کے آدمیوں کی تیز تیز بولنے کی آواز آئی تھی۔ پھر وہ نشست گاہ کی طرف آئے۔

امیر مقام کا مشتعل ساتھی اس کے پیچھے آیا اور چلا کر بولا۔ "تم نے تالا کیوں لگایا ہے؟"

"تاکہ تم اس بے چاری کے ساتھ مزید ظلم نہ کر سکو۔" شہلا چیخ کر بولی۔ "میرے خدا تم لوگ انسانیت سے بالکل عاری ہو۔ درندوں کی طرح کمزوروں پر ٹوٹ پڑتے ہو۔"

"ہم کسی سے نہیں ڈرتا ہے۔" امیر مقام نے ڈھٹائی سے کہا۔

"بڑے سورما ہو تم؟" شہلا کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "اب اگر اس کے گھر یا قبیلے والے اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے تو ان سے نمٹنا، تم کسی سے ڈرتے نہیں ہو نا؟"

شہلا ان کو سناتی ہوئی وہاں سے لے گئی تھی۔ فتح خان کے آدمی واقعی انسانیت سے عاری درندے تھے۔ ایسے درندے جنہیں صرف گوشت کھانے سے دلچسپی تھی۔ لیکن شہلا کے لیے یہ پریشانی کی بات تھی۔ اس نے فتح خان کے ساتھ مل کر مجھے اس جگہ قید کیا تھا تاکہ کوئی مجھ تک نہ پہنچ سکے لیکن اب اس بات کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ اس عورت کی تلاش میں اس کے لوگ جلد یا بدیر اس جگہ کا رُخ کریں گے۔ عورت یہیں جنگل سے لکڑیاں چننے آئی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اسے تلاش کرنے والے اس عمارت تک نہ آئیں۔ وہ لوگ آتے اور یقیناً زیادہ تعداد میں آتے اور انہیں شبہ ہو جاتا تو شہلا اور یہ دو مسلح افراد انہیں نہیں روک سکتے تھے۔

میں جیسے جیسے اس معاملے پر غور کر رہا تھا میرے اندر سے شدید خواہش اُبھر رہی تھی کہ کاش ایسا ہی ہو۔ مجھے اس عورت پر ہونے والے ظلم کا افسوس تھا لیکن اس کی وجہ سے یہاں سے میری رہائی کی سبیل پیدا ہوئی تھی۔ اگر اس عورت کے قبیلے والے اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ جاتے اور شہلا اور اس کے ساتھیوں پر قابو پا لیتے تو میری رہائی کا امکان تھا۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ ایسا ہی ہوتا۔ یہ امکان بھی تھا کہ عورت کا شوہر بدنامی کے ڈر سے بات کو چھپا جاتا یا اگر وہ اسے غائب پاتا تو اسے کسی اور معنوں میں لیتا اور عین ممکن ہے یہ فرض کر لیا جاتا کہ عورت اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار...

ہوگئی ہے۔ خانہ بدوش قبیلوں میں ایسی باتیں عام ہیں۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ان کی نئی نسل بھی اب شہروں میں آباد ہونا چاہتی ہے اور وہ دربدر مارے مارے پھرنے سے اُکتاتے... جارہے ہیں یہی وجہ ہے کہ خانہ بدوش قبیلے مسلسل کم ہوتے جارہے ہیں۔

فتح خان کے ساتھی باہر چلے گئے تھے اور ان دونوں کا موڈ واضح طور پر خراب تھا۔ شہلا اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں واپس کمبل میں آگیا۔ ایک چانس یہ بھی ہوسکتا تھا کہ شہلا یا اس کا ساتھی مجھے دیکھنے آئیں کہ میں سورہا ہوں اور میں ان کو قابو کرلوں۔ ایک بار میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار آجاتا تو مجھے یہاں روکنا مشکل تھا۔ تہ خانے میں بند عورت اگر شور کر بھی رہی تھی تب بھی اس کی آواز باہر تک نہیں آرہی تھی۔ تہ خانے کا دروازہ اس کمرے کے پاس ہی تھا۔ مجھے کمبل میں دبکے ہوئے خاصی دیر ہونے کو آئی تھی لیکن میری توقعات پوری نہیں ہوئی تھیں۔ نہ تو اس عورت کے لیے کوئی آیا اور نہ ہی شہلا یا فتح خان کے کسی آدمی نے آکر مجھے دیکھنے کی زحمت کی۔ شاید وہ مطمئن تھے کہ میں بے ہوش پڑا ہوں اور ان کے لیے کسی قسم کی مشکل نہیں کھڑی کرسکتا تھا۔ وہ اس مشکل پر غور کررہے تھے جو ممکنہ طور پر آسکتی تھی۔ شام قریب تھی اور دن ڈھل رہا تھا۔ فتح خان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ابھی تک خاموشی تھی۔ پھر پہلے ہلکا سا شور سنائی دیا جو رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی افراد بول رہے ہوں۔ پھر آوازیں قریب آنے لگیں۔ مجھے شہلا کی آواز سنائی دی۔

''تم لوگ اندر نہیں آسکتے یہ میرا گھر ہے۔ کسی کے گھر میں زبردستی گھسنا جرم ہے۔''

''ہمارے قبیلے کی ایک عورت غائب ہے۔'' کوئی آدمی چلایا۔ ''وہ اِدھر ہی آئی تھی۔ ہمیں شبہ ہے وہ اس مکان میں موجود ہے۔''

''یہاں کوئی عورت نہیں ہے۔'' امیر مقام کا ساتھی بولا لیکن اس کے لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عورت یہاں سے نکل آئی تو ان کا کیا انجام ہوگا کیونکہ بولنے کی آوازوں سے لگ رہا تھا آنے والے تعداد میں خاصے زیادہ تھے اور وہ مکان کی نشست گاہ تک آگئے تھے۔ میں نے دروازے کے اوپر سے جھانکا۔ آنے والے واقعی خانہ بدوش تھے۔ ان کے رنگ برنگ لباس اور منفرد حلیہ اس کی گواہی دے رہا تھا۔ ان میں سے اکثر ڈنڈوں اور نیزوں سے مسلح تھے جبکہ کچھ افراد کے پاس آتشیں ہتھیار بھی نظر آرہے تھے۔ ان کی تعداد کسی طرح دو درجن سے کم نہیں تھی۔ ممکن ہے مکان سے باہر اس سے بھی زیادہ موجود ہوتے اور اس کا پورا امکان تھا۔

''یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں۔'' شہلا کہہ رہی تھی۔ ''اگر تم لوگوں کو کوئی مسئلہ بھی ہے تو کچھ معزز لوگ میرے پاس آتے۔ اس طرح یہ ہجوم یہاں کیوں آیا ہے۔''

''اس کی وجہ ہے۔'' ایک لمبا آدمی گرج دار آواز میں بولا۔ ''ہمارے ایک چھوکرے نے ہماری عورت کو ایک آدمی کے ساتھ اس طرف آتے دیکھا تھا جس کے پاس بندوق تھی۔''

''ایک بچے کی بات سن کر تم یہاں چڑھ دوڑے۔'' شہلا نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ دونوں میرے ملازم ہیں اور رائفل رکھنا ہماری مجبوری ہے۔ ہم اس ویران علاقے میں رہتے ہیں۔ میں تم لوگوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھواؤں گی۔''

''ضرور لکھوانا۔'' آدمی نے کہا۔ ''لیکن ہم یہاں کی تلاشی ضرور لیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' امیر مقام بولا۔

اس پر دونوں پارٹیوں میں جھگڑا ہوا اور شور کی آواز بلند ہوئی۔ آنے والے غصے سے بے قابو ہورہے تھے۔ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اس لیے انہوں نے جلد شہلا اور اس کے ساتھیوں پر قابو پالیا۔ شہلا چیخ چیخ کر انہیں بُرا بھلا کہہ رہی تھی پھر فتح خان کے آدمیوں سے اسلحہ چھین لیا گیا۔ ان کے پاس سے پستول نکل آئے اور اس پر بھی شور ہوا تھا۔ فتح خان کے آدمیوں کا اتنا مسلح ہونا بھی آنے والوں کو مشکوک کرگیا تھا۔ کوئی بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ تینوں جھوٹے ہیں، مہرو یہیں ہے۔''

''مکان کی تلاشی لو۔'' لمبے آدمی نے کہا وہ ان لوگوں کا سردار لگ رہا تھا۔ اس کا حکم ملتے ہی آنے والے گھر میں پھیل گئے تھے۔ شہلا اور فتح خان کے آدمی چلاتے رہ گئے لیکن وہ بے بس تھے۔ جیسے ہی کچھ آدمی میرے کمرے کی طرف آئے میں جلدی سے کمبل میں گھس کر ساکت ہوگیا۔ فوراً ہی چند آدمی میرے کمرے میں گھس آئے اور مجھے دریافت کرلیا۔ ایک نے فوراً چلا کر باقیوں کو اطلاع دی کہ یہاں بھی ایک بندہ موجود ہے۔ کسی نے میری پشت پر لات ماری۔ ''اٹھ اوئے نواب دی اولاد۔''

نواب کی اولاد یعنی میں بڑی مشکل سے اُٹھا اور غنودگی میں ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ میں دیوار سے ٹیک کر بیٹھ گیا تھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ ایک نے پوچھا۔ ''اوئے تو کون ہے؟''

''میرا نام شہباز ملک ہے۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''انہوں نے مجھے یہاں بند کررکھا ہے۔''

تین افراد مجھے بھی کھینچ کر نشست گاہ میں لے آئے جہاں شہلا ایک طرف کھڑی تھی لیکن فتح خان کے دونوں آدمی فرش پر بندھے پڑے تھے۔ صوفے پر اب لمبا آدمی اور ایک نوجوان براجمان تھے۔ نوجوان کے خدوخال بتارہے تھے کہ وہ سردار کا ولی عہد بہادر تھا اور اس نے جینز پر ایک لیڈیز لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ تقریباً درجن بھر خانہ بدوش کھڑے ہوئے تھے اور اتنے ہی مکان کے دوسرے حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ صوفے پر بیٹھے لمبے آدمی نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

''تو کون ہے؟''

''میرا نام شہباز ملک ہے۔'' میں نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں نے مجھے قید کررکھا ہے۔''

''یہ جھوٹ کہتا ہے۔'' شہلا اطمینان سے بولی۔ ''یہ ہمارا ساتھی ہے۔''

''یہ عورت غلط کہہ رہی ہے میں ایک کمرے میں قید تھا اور تمہارے لوگ مجھے وہاں سے نکال کر لائے ہیں۔'' میں نے سوال کرنے والے سے کہا۔ ''ان سے پوچھ لو میں وہاں سورہا تھا۔''

''شاباش ہے تو اتنے ہنگامے میں بھی سورہا تھا۔'' ولی عہد بہادر نے مجھے گھورا۔

''میرا خیال ہے یہ لوگ مجھے کھانے میں کچھ دیتے ہیں کیونکہ کھانا کھاتے ہی میں سو جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی بھی تمہارے.... آدمیوں نے مجھے مار پیٹ کر کے بیدار کیا ہے۔''

''تمہیں کیوں قید کیا ہوا ہے؟'' سردار نے پوچھا۔

''یہ فتح خان کے لوگ ہیں۔'' میں نے آرام سے بتا دیا۔ ''وہ میرا دشمن ہے مجھے اغوا کرکے یہاں لاکر رکھا ہوا ہے۔''

''فتح خان کہاں ہے؟'' سردار نے شہلا سے پوچھا۔ ''وہ تیرا کیا لگتا ہے؟''

''میرا شوہر ہے اور یہ بکواس کرتا ہے۔'' شہلا مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''یہ فتح خان کا دوست ہے اور یہاں رُکنے آیا ہے۔ فتح خان کام سے شہر گیا ہوا ہے۔''

مکان کی تلاشی لینے والے آکر بتارہے تھے کہ عورت مکان میں کہیں نہیں ہے۔ یہ سن کر سردار فکرمند نظر آنے لگا وہ اپنے آدمیوں سمیت اس مکان پر چڑھ دوڑا تھا اس نے شہلا اور فتح خان کے آدمیوں کے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا اور اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ معمولی لوگ نہیں تھے۔ اگر اس کا الزام غلط نکلتا تو اسے لینے کے دینے بھی پڑسکتے تھے۔ میں نے بتایا کہ خانہ بدوش عام طور سے تنازعات میں اُلجھنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ یہ دوسروں کی زمینوں سے گزرتے ہیں۔ اگر یہ جھگڑے کرنے لگیں تو ان کے راستے بند ہوجائیں اس لیے یہ چھوٹی موٹی بے عزتی بھی برداشت کرلیتے ہیں۔ میں نے شہلا سے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر ہے یہ لوگ کون ہیں اور کس عورت کو تلاش کررہے ہیں، کیا تم لوگوں نے کسی عورت کو بھی اغوا کیا ہے؟''

شہلا مجھے گھور رہی تھی اور شاید چاہتی تھی کہ میں تہ خانے کا ذکر نہ کروں۔ اس نے تنبیہ کرنے والے لہجے میں کہا۔ ''تم خاموش رہو۔ اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں انجان بنا ہوا تھا۔ اگرچہ میں کھل سکتا تھا کہ میں نے سب سنا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ عورت تہ خانے میں بند ہے اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ لیکن میں نے کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے شہلا سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا تھا اور میں نے ان لوگوں کا بھانڈا پھوڑنے سے گریز کیا۔ میری خاموشی پر شہلا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس نے سردار سے کہا۔ ''تمہارا اطمینان ہوگیا اب تم شرافت سے چلے جاؤ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گی۔ ورنہ تم لوگوں نے جو کیا ہے اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ تم سب کو پولیس لے جائے اور کچھ دن حوالات میں رکھے۔''

صوفے پر براجمان دونوں باپ بیٹا ہماری گفتگو غور سے سن رہے تھے۔ اگر ان لوگوں نے یہاں پڑاؤ ڈالا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ یہ جگہ اسلام آباد اور راولپنڈی سے دور تھی۔ خانہ بدوشوں کا سردار بوڑھا لیکن ہوشیار اور شاید پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس نے مجھے لانے والوں سے پوچھا۔ ''کیا یہ کمرے میں قید تھا؟''

''پتا نہیں جی۔'' ایک احمق بولا۔ ''یہ تو مزے سے پڑا سورہا تھا۔''

میں نے اسے دل ہی دل میں سنائیں اور منہ سے بولا۔ ''بھائی کیا اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند نہیں تھا؟''

''دروازہ میں نے نہیں کھولا تھا۔'' اس نے انکار

کیا۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ ان میں سے کس نے دروازہ کھولا تھا اسے یاد نہیں رہا تھا سب یہی کہہ رہے تھے کہ انہیں دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔ وہ شک میں پڑ گئے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا نہیں۔ شہلا فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا تو میں نے دل میں کہا۔ ”ابھی تم مسکرانا بھول جاؤ گی جب ان لوگوں کو تہ خانہ ملے گا۔“

خانہ بدوش گھر میں پھیلے تھے اور موقع سے فائدہ اُٹھا کر چھوٹی موٹی چیزیں بھی پار کر رہے تھے۔ ایسی آوازیں آ رہی تھیں اور بعض چیزوں پر دو افراد میں دبی ہوئی تکرار بھی ہو جاتی تھی۔ مجھے امید تھی اور شہلا کو خدشہ تھا کہ اس تلاشی کے دوران کہیں تہ خانے کا دروازہ نہ دریافت ہو جائے۔ اس نے بے چینی سے سردار سے کہا۔ ”تمہارے لوگ میرے گھر میں گھسے ہوئے ہیں اگر کوئی چیز غائب ہوئی تو اس کی ذمے داری تم پر ہوگی۔ میں پولیس میں رپورٹ لکھوا دوں گی۔“

پولیس کے ذکر نے سردار کو مجبور کر دیا اور اس نے گرج کر اپنی عوام سے کہا۔ ”کیا کر رہے ہو تم لوگ ایک ایک چیز اپنی جگہ واپس رکھ دو ورنہ تمہاری کھالیں گرا دوں گا۔“

مجھے مایوسی ہوئی اور شہلا کے چہرے پر اطمینان آیا تھا۔ خانہ بدوش لڑکی مہرو کا منہ بند تھا اور شاید ہاتھ کے ساتھ اس کے پیر بھی باندھ دیے گئے تھے اس لیے وہ اوپر موجود لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پا رہی تھی۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں شروع میں ہی انکار کر چکا تھا اور انجان بنا ہوا تھا اس لیے اب میں لڑکی کی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔ سردار کھڑا... ہو گیا۔ اس نے گرج دار آواز میں اپنے لوگوں کو واپسی کا حکم دیا۔ پھر اس نے شہلا سے کہا۔ ”بی بی ہم ابھی یہیں ہیں اور اپنی عورت کو تلاش کر رہے ہیں اگر پتا چل گیا کہ وہ تیرے پاس ہے یا تو نے اسے غائب کیا ہے تو ہم دوبارہ یہاں آئیں گے۔“

”ضرور آنا۔“ شہلا بدمزگی سے بولی۔ ”تم نے میرے آدمیوں کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔“

”بُرا مت ماننا بی بی اگر یہ تیرے محافظ ہیں تو بے کار ہیں بہتر ہے انہیں نکال دے اور کچھ اچھے لوگ رکھ جو بُرے وقت میں تیرے کام آئیں۔ یہ کسی کام کے نہیں ہیں۔“

فتح خان کے آدمیوں کے بارے میں سردار کی رائے درست تھی۔ وہ مسلح تھے لیکن جب ہجوم دیکھا تو بھیگی بلی بن گئے۔ انہوں نے خاموشی سے اپنے ہتھیار ان لوگوں کے حوالے کر دیے تھے۔ خانہ بدوشوں کی اس طرح واپسی میرے لیے اچھی خبر نہیں تھی۔ کیونکہ اس طرح میری رہائی کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے سردار سے کہا۔ ”مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہارے قبیلے کی ایک عورت غائب ہے۔ یہ اس علاقے کا مسئلہ بھی ہے کیونکہ یہاں کوئی عورت غائب ہو تو ہماری بدنامی بھی ہوگی۔ کیا میں تمہارے آدمیوں کے ساتھ مل کر تمہاری عورت کو تلاش کر سکتا ہوں۔“

شہلا اُچھل پڑی تھی اور فوراً میرا مقصد سمجھ گئی۔ ”تم ان کی کیا مدد کرو گے تم خود یہاں اجنبی ہو۔“

”اجنبی ہوں لیکن ویسے تو مدد کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں کیا اعتراض ہے تم نے خود کہا ہے میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔“

لیکن شہلا کسی صورت میں مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ”شہباز تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔“

”کیوں نہیں جا سکتا؟“ میں نے کہا اور دھیمے لہجے میں انگریزی میں کہا۔ ”اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارا بھانڈا نہ پھوڑوں تو مجھے جانے دو۔“

شہلا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ہوشیار سردار چونک گیا۔ ”کیا.... کیا کہا ہے تو نے؟“

”کچھ نہیں عادت کی وجہ سے بول گیا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں تمہاری مدد کرنے کے لیے۔“

شہلا خون کے گھونٹ پی کر خاموش تھی۔ وہ جانتی تھی اگر خانہ بدوش عورت یہاں دریافت کر لی گئی تو وہ لوگ کتنی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ لیکن اس نے سردار سے اپنے اسلحے کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ ”ہمارا اسلحہ دو اور یہاں سے جاؤ۔“

لمبا سردار باہر کی طرف بڑھا اس کی پبلک بھی ایک ایک کر کے مایوس واپس آ رہی تھی کیونکہ ایک تو ان کو اپنی عورت نہیں ملی تھی اور اس سے بھی زیادہ مایوس کن بات یہ تھی کہ انہیں لوٹ مار کا موقع نہیں ملا تھا۔ سردار کے حکم پر جس نے جو چیز اُٹھائی تھی وہ بھی اسے واپس کرنا پڑی تھی۔ اندر موجود افراد بھی باہر آ گئے تھے۔ مگر سب باہر نہیں آئے تھے۔ ایک نوجوان اندر ہی تھا اور اس میں جاسوسی کی [illegible] صلاحیتیں تھیں اس لیے جو چیز دوسروں کی نظر میں نہ آئی وہ اس نے دیکھ لی۔ اس نے تہ خانہ دریافت کر لیا اور باہر دوڑا آیا۔ نوجوان نے ہانپتے ہوئے سردار سے کہا۔ ”اُدھر جی زمین کے نیچے بھی ایک کمرا ہے۔“

سردار چونکا۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

”اس پر تالا لگا ہے جی۔“

سردار نے اسے تھپڑ رسید کیا۔ ”تالے کا مطلب ہے کہ وہاں زمین کے نیچے کمرا ہے۔“

نوجوان تھپڑ کھا کر ذرا بھی بے مزہ نہیں ہوا اور اس نے قسم کھائی۔ ”اُدھر نیچے کچھ ہے۔“

سردار نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”ہاں اس مکان میں ایک تہ خانہ ہے تو۔“

سردار فوراً واپس آیا اور اس نے شہلا سے کہا۔ ”تم نے بتایا نہیں یہاں ایک تہ خانہ بھی ہے؟“

شہلا کے چہرے پر بارہ بج گئے تھے وہ کسمسائی۔ ”مجھے نہیں معلوم میں کبھی اس جگہ نہیں گئی۔“

وہ سفید جھوٹ بول کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ تہ خانہ کھلتے ہی اس کا جھوٹ سامنے آ جاتا۔ سردار نے کہا۔ ”اس کا ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ اس نے تہ خانہ دریافت کرنے والے نوجوان کو ملبس کی طرف دیکھا۔

”کہاں ہے؟“

نوجوان اسے دکھانے لے گیا۔ صورتِ حال بدلتے ہی سردار کے آدمیوں کے تیور بھی بدل گئے تھے۔ فتح خان کے دونوں آدمی ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔ اس کا اسلحہ بھی خانہ بدوشوں کے پاس تھا۔ شہلا نے دیکھ لیا تھا کہ تہ خانہ کسی اور نے دریافت کیا ہے اس لیے وہ اس کا الزام مجھے نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن اس نے آہستہ سے انگریزی میں کہا۔ ”شہباز تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں بتایا ہے تمہاری ایک اہم شخصیت جلد یہاں آنے والی ہے۔“

”تم جھوٹ کہہ رہی ہو اگر وہ اہم شخصیت تمہارے قبضے میں ہوتی تو اب تک یہاں آ چکی ہوتی۔“ میں نے جواب دیا۔

شہلا جھنجلا گئی۔ ”مرضی تمہاری اگر بعد میں تمہارا کوئی نقصان ہو تو مجھے الزام مت دینا۔“

”میں دشمن کو الزام دینے کا قائل بھی نہیں ہوں، میں تو سیدھا سا اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا ہوں۔“

سردار لوٹ آیا اور اس نے شہلا سے کہا۔ ”تالے کی چابی کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم اس کے پاس ہوگی۔“ اس نے جل کر میری طرف اشارہ کیا۔ ”ممکن ہے اسی نے تمہاری عورت کو غائب کیا ہو؟“

”میری تلاشی لے لو اگر میرے پاس سے نکل آئے تو مجھے قصور وار سمجھنا۔“ اس بار میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔ ”میں صبح گیارہ بجے سے سو رہا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہو رہا ہے لیکن یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بھی اغوا کر کے لائے ہیں اور ممکن ہے اس عورت کو بھی انہوں نے اغوا کیا ہو۔“

”شہباز تم انہیں اس طرح بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“ شہلا بولی۔

”میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں ایک کمرے میں قید تھا۔“

”یہ جھوٹ ہے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا پھر تم قید کیسے ہوئے؟“

”دوسرے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم لوگ چاہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو۔“

ایک آدمی نے سر سے پاؤں تک میرے لباس کی تلاشی لی اور اعلان کیا۔ ”اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔“

سردار پھر مشکوک ہو گیا تھا۔ شہلا نے چابی دینے سے انکار کر کے اس کے شک کو ہوا دی تھی اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ تالا توڑ دیں۔ فوراً ہی کچھ لوگ اندر کی طرف دوڑے۔ چند لمحے بعد دو آدمی باہر گئے اور بڑے پتھر لے آئے۔ وہ پتھروں سے تالا توڑ رہے تھے۔ امیر مقام اور اس کے ساتھی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ ایک قبائلی معاشرے کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک عورت پر دست درازی کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جبکہ وہ عورت شادی شدہ بھی ہو۔ شہلا بھی متفکر نظر آ رہی تھی لیکن اب اس نے چپ سادھ لی تھی۔ شاید وہ میری حکمتِ عملی بھانپ گئی تھی کہ انجان بنے رہو اور وہ بول کر پھنس گئی تھی اس لیے اب خاموش تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مکان میں دو درجن افراد کے علاوہ باہر بھی کئی لوگ موجود تھے ان کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے سردار سے پوچھا۔ ”تم لوگ اکثر یہاں آتے رہتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اب سے نہیں صدیوں سے ہم اس علاقے میں سفر کر رہے ہیں۔ گرمیوں میں کشمیر کے پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں پہلے کارگل تک جاتے تھے پر جب انڈیا پاکستان بنا تو ہم یہیں تک آتے ہیں۔ سردیوں میں یہاں آتے ہیں راولپنڈی میں اپنے مویشی بیچ کر گرمیاں شروع ہوتے ہی واپس چلے جاتے ہیں۔“

”یہ علاقہ کون سا ہے؟“

”یہ علاقہ راولپنڈی کا ہے۔ ادھر موٹر وے سے کچھ

دور ہے۔“

موٹر وے پر ہونے کا مطلب تھا کہ یہ پنڈی کا نچلا علاقہ تھا۔ فتح خان اور شہلا مجھے شہر سے خاصا دور لے آئے تھے۔ اس دوران میں وہ لوگ تالا توڑنے میں کامیاب رہے تھے ایک دھماکے سے تہ خانے کا دروازہ کھولا گیا اور پھر فوراً ہی کوئی چلّایا۔ ”یہاں مہرو بندھی پڑی ہے۔“

اس اعلان نے شہلا کا چہرہ سفید کر دیا تھا اور فتح خان کے آدمی تو خوف سے ادھ موئے ہو رہے تھے۔ مہرو کے ملنے کا مطلب تھا کہ ان کی خیر نہیں تھی۔ آناً فاناً مہرو کے ملنے کی خبر مکان کے اندر باہر پھیل گئی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر اور تنومند شخص بھاگتا ہوا مکان میں آیا اور تہ خانے کی طرف لپکا تھا۔ باقی سب بھی کھڑے ہو گئے تھے اور وہ سخت مشتعل تھے۔ میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ ”عورت یہاں کیسے آئی؟“

”میں نہیں جانتی۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”یہ لوگ مل کر ڈراما کر رہے ہیں۔“ ایک آدمی چلّایا اور اس نے امیر مقام کی کمر پر لات ماری۔ یہ لات بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد انہوں نے فتح خان کے دونوں آدمیوں کو بے دریغ مارنا شروع کر دیا۔ شہلا سہم کر ایک طرف ہو گئی تھی۔ درجن بھر سے زیادہ افراد ان دونوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے اور وہ چلّا رہے تھے۔ ابھی تک کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی لیکن پھر کوئی چلّایا۔

”یہ حرامی بھی شامل ہے مار دو اسے۔“

بولنے والے نے عقب سے میری کمر پر مکّا مارا۔ میں نے سردار سے کہا۔ ”ان لوگوں کو روکو اس طرح بغیر حقیقت جانے مار پیٹ ٹھیک نہیں ہے۔“

”مہرو کے ملنے کے بعد اور کس حقیقت کی ضرورت ہے۔“ نوجوان ولی عہد غرّایا۔

”دیکھو مہرو اسی مکان سے ملی ہے مگر اس کے اغوا میں کون لوگ ملوث ہیں؟ یہ تمہیں جاننا ہے۔ تمہارا اصل مجرم کون ہے یہ جانے بغیر تم سب کو کس طرح سزا دے سکتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”یہ عورت شہلا اعتراف کر چکی ہے کہ مکان فتح خان نامی شخص کا ہے اور یہ مجھے اس کا ساتھی بتاتی ہے اگر میں اس کا ساتھی بھی ہوں تب بھی میں ان لوگوں کے علم میں لائے بغیر ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں کہ ایک عورت کو یہاں لا کر قید کر دوں۔“

”بکواس کرتا ہے جی یہ۔“ مجھے مکّا مارنے والا چلّایا اور اس نے دوبارہ میری پشت پر حملہ کیا۔ اس کے اشتعال دلانے پر چار پانچ افراد مجھ پر بھی چڑھ دوڑے تھے اور انہوں نے مجھے بے دریغ لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میں مار کھاتے ہوئے ایک طرف دیوار سے ٹک گیا اور پھر اپنا دفاع کرنے لگا۔ اگرچہ چار پانچ افراد کے چلتے ہاتھ پیروں کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا اور مجھے ضربیں لگ رہی تھیں لیکن میں چہرہ اور جسم کے نازک حصوں کا دفاع کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ان کو سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اب تک میں نے دفاع کیا تھا یا ان کو پیچھے دھکیلا تھا۔ میں نے کسی کو مارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسی کوئی کوشش ان کو مزید مشتعل کر سکتی تھی اور وہ زیادہ ہو جاتے تو میرے لیے کیا کسی رستم زمان کے لیے بھی دفاع کرنا ناممکن ہو جاتا۔

ہجوم کی طاقت بڑی خوف ناک ہوتی ہے درجنوں کمزور اور پسے ہوئے انسان جب ہجوم کی صورت میں جمع ہوتے ہیں تو کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا...... اس میں طاقت سے زیادہ نفسیات کارفرما ہوتی ہے، کمزور کو اجتماعیت کا احساس تقویت دیتا ہے تو طاقت ور کو اکیلا ہونے کا خوف کمزور کر دیتا ہے۔ میں اس خوف کو اپنے اوپر حاوی ہونے سے روک رہا تھا۔ ورنہ میرے لیے اپنا دفاع کرنا بھی دشوار ہو جاتا۔ اتنی دیر میں فتح خان کے دونوں آدمیوں کی چٹنی بن گئی تھی اور ان کے منہ کے آگے پیچھے کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ تہ خانے کی طرف سے اسی ادھیڑ عمر شخص کی چلّانے کی آواز آئی۔ وہ شاید مہرو کا شوہر یا کوئی قریبی رشتے دار تھا اور مہرو کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا پتا چل گیا تھا۔ ابھی یہ اطلاع اوپر نہیں آئی تھی اس کی آمد سے پہلے ہی سردار نے اچانک مداخلت کی اور ان لوگوں کو روکا جو مجھے مار پیٹ رہے تھے۔

”رکو اسے مت مارو لیکن نظر میں رکھنا۔“ اس نے حکم دیا اور اپنے ولی عہد کے ساتھ تہ خانے کی طرف چلا گیا۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا، ایک مکّے نے میرے چہرے تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ میں نے ہانپتے ہوئے ہونٹ صاف کیا اور شہلا سے کہا۔

”یہ سب تم لوگوں کا کیا دھرا ہے۔“

شہلا کچھ نہیں بولی۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہی۔ مجھے مارنے والے اب گھیرے کھڑے تھے اور کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ فتح خان کے ساتھی بے ہوش ہو چکے تھے۔ اس لیے فی الحال ان کی بھی جان بچ گئی تھی لیکن یہ عارضی صورت حال تھی۔ اب ہمارے ساتھ کیا ہونا تھا اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ امیر مقام نے مہرو کی عزت برباد کی تھی اور یہ خانہ بدوش اس کا انتقام ہم سے کس

طرح لیتے یہ کہنا مشکل تھا۔ مگر مجھے لگ رہا تھا ہم کسی بڑی مشکل میں پڑنے والے ہیں۔ اگرچہ مہرو اپنے لوگوں کو حقیقت بتا سکتی تھی کہ اس کا اصل مجرم کون تھا لیکن جب انتقام اندھا ہو جائے تو مجرموں کے ساتھ بے گناہ بھی اس کے رگڑے میں آ جاتے ہیں۔

میں دیکھ چکا تھا مہرو کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور جسم پر زخموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ یہ امیر مقام کی درندگی کا ثبوت تھے۔ اس کی ہوس نے نہ صرف ایک عورت اور اس کے گھر کو اجاڑ دیا تھا بلکہ ہمیں بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ جب مجھے اس کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا تھا تو اس کے شوہر اور دوسرے رشتے داروں کے غم و غصے کا عالم ہی الگ ہو گا۔ عین ممکن تھا ہمیں کسی قسم کی کارروائی کے بغیر یہیں مار مار کر جاں بہ حق کر دیا جاتا۔ کچھ دیر بعد سردار اور دوسرے لوگ نشست گاہ تک آئے۔ مہرو کے ادھیڑ عمر شوہر نے اسے اپنی چادر میں لپیٹ دیا تھا کیونکہ اس کا لباس اس کی پردہ پوشی سے قاصر تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں انتقام کی آگ روشن تھی۔ مہرو نے نشست گاہ میں آتے ہی امیر مقام کی طرف اشارہ کیا اور اس کا شوہر کسی بھیڑیے کی طرح اس کی طرف لپکا۔ امیر مقام کسی قدر ہوش میں آ گیا اور اس نے مہرو کے شوہر کے انداز میں اپنے لیے موت دیکھ لی تھی۔ وہ چلّانے لگا۔

”خدا کے لیے ہم کو معاف کر دو۔“

آدمی نے اپنی زبان میں کچھ کہا اور امیر مقام کی گردن دبوچ لی۔ وہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دوسرے اسے روک لیں گے اور امیر مقام کی جان فی الحال بچ جائے گی لیکن کسی نے مداخلت نہیں کی۔ سردار اور دوسرے آرام سے کھڑے رہے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے امیر مقام کی آنکھیں اُبل آئیں اور اس کے گلے سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ شہلا نے سردار کی طرف دیکھا۔ ”تم اچھا نہیں کر رہے ہو اسے پولیس کے حوالے کر دو۔“

”تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔“ سردار نے اسے مشورہ دیا تو میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ان لوگوں کے عزائم ٹھیک نہیں لگ رہے تھے لڑکی نے بتا دیا تھا کہ اس کی آبرو کا مجرم کون تھا اس کے باوجود وہ ہمیں چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن پہلے اپنے اصل مجرم سے نمٹ لینا چاہتے تھے۔ سردار اور اس کے قبیلے والوں کا رویّہ دیکھتے ہوئے میں نے بھی مداخلت سے گریز کیا۔ میرے خیال میں امیر مقام اس سے بھی زیادہ سخت سزا کا مستحق تھا جو اس وقت اسے دی جا رہی تھی۔ لیکن وہ مستحق نہ بھی ہوتا تو میں اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دو منٹ کے اندر اس نے جان دے دی تھی۔ اس کی زبان باہر نکل آئی تھی۔ مہرو کا شوہر مضبوط اور غضبناک...... آدمی تھا اس لیے اس نے پوری قوت صرف کر دی تھی۔ امیر مقام کے ساتھی کی حالت یہ منظر دیکھ کر خراب ہو گئی تھی، وہ گھگیا کر کہہ رہا تھا کہ وہ اس کام میں شامل نہیں تھا۔ امیر مقام کو یوں مرتے دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی اور اطمینان مہرو کے چہرے پر نظر آیا۔ سردار نے اسے فوری انصاف مہیا کرنے کے لیے یہ سزا تجویز کی تھی اور اس پر فوری عمل درآمد بھی ہوا تھا۔

امیر مقام کو اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ سردار اور اس کے آدمیوں کے عزائم شہلا کے بارے میں بھی ٹھیک نہیں تھے لیکن فی الحال مجھے اپنی زیادہ فکر تھی کہ اس سزا میں بلاوجہ میں بھی شامل نہ ہو جاؤں۔ مہرو کے ساتھ ہونے والے ظلم نے اس کے لوگوں کو مشتعل کر دیا تھا۔ امیر مقام کے مرنے پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور پھر اس کی لاش کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ میں نے سردار کی طرف دیکھا۔ ”تم لوگوں نے اپنے مجرم سے بدلہ لے لیا ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی بدلہ پورا کہاں ہوا ہے؟“

سردار کے اشارے پر اس کے آدمی ہمیں مکان کے احاطے میں لے آئے۔ سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا اور شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ شہلا خوف زدہ تھی۔ امیر مقام کی عبرت ناک موت نے اسے سہما دیا تھا۔ خود میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا ہے تبھی انہوں نے امیر مقام کو آرام سے ہمارے سامنے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ بے شک وہ ان کا مجرم سہی لیکن اس کا قتل قانون کی نظر میں جرم تھا اور وہ پکڑے جاتے تو ان کو قانون کے مطابق سزا ملتی اس لیے وہ گواہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

احاطے میں ان لوگوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں اور وہ اندر سے ایک صوفہ نکال لائے۔ سردار بڑے اہتمام سے صوفے پر براجمان ہوا، اس کا ولی عہد بہادر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ شاید سردار کے کچھ خاص مصاحب تھے۔ باقی افراد میں سے کچھ تو ہمارے سروں پر تھے اور باقی سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ خاص سیٹ اپ لگ رہا تھا۔ شہلا نے سہمے انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں؟“

”میرا خیال ہے یہ پنچایت بٹھا رہے ہیں۔“

”پنچائیت، وہ کیوں؟“ وہ مزید سہم گئی۔

”تم نہیں جانتی ہو پنچایتیں کیوں بٹھائی جاتی ہیں۔ ہمارے اور تمہارے بزرگ یہ کام کرتے آئے ہیں؟“

سردار نے پہلے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ وہ اپنی زبان میں بات کر رہا تھا اس لیے میری سمجھ میں زیادہ نہیں آیا بس اتنا پتا چلا کہ وہ اپنے قبیلے کے نظامِ انصاف پر بات کر رہا تھا اور شاید مہرو کے مہیا کیے جانے والے فوری انصاف کا حوالہ بھی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ پنچایت نہیں بلکہ عدالت تھی کیونکہ اس کا جج خود سردار تھا۔ تقریر کرنے کے بعد وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا اور مہرو کا شوہر سامنے آیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

”سردار مجھے انصاف چاہیے۔ میری بیوی کی بے عزتی ہوئی ہے مجھے عزت کا بدلہ عزت سے چاہیے۔“

”تجھے عزت کا بدلہ کس سے چاہیے تیری بیوی کا مجرم تیرے ہاتھ سے اپنی سزا پا چکا ہے؟“ سردار نے دریافت کیا۔

”اس عورت سے۔“ مہرو کے شوہر نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ اس کا ملازم تھا اس لیے یہ بھی ذمے دار ہے۔“

میں اور شہلا ساتھ کھڑے تھے جبکہ فتح خان کا آدمی بندھی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ مہرو کے شوہر کا مطالبہ سن کر شہلا کا چہرہ فق ہو گیا اور میں چپ نہیں رہ سکا۔ ”سردار تم نے اپنے مجرم کو سزا دے دی۔ لیکن اب تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔ شہلا اس کی کس طرح ذمے دار ہو سکتی ہے۔ جبکہ یہ جرم اس کی لاعلمی اور مرضی کے بغیر ہوا ہے۔“

”یہ ذمے دار ہے۔“ سردار اپنی مخصوص گرج دار آواز میں بولا۔ ”وہ اس کا ملازم تھا۔“

”لیکن....“

”انصاف پورا ہوگا۔“ سردار نے نام نہاد جج کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا اور مہرو کے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”تجھے اختیار ہے اس عورت سے اپنی بیوی کی عزت کا بدلہ لے۔“

”تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔“ شہلا چلّائی۔ ”اگر کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں کسی کو چھوڑوں گی نہیں۔“

فتح خان کے آدمیوں کے خودکار ہتھیار اور شاٹ گن جوان لوگوں کے پاس تھیں ہم پر تان لی تھیں۔ مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ ہمیں فوراً مار دیتے۔ مہرو کا شوہر آگے آیا اور شہلا کو کھینچ کر مکان کے اندر لے جانے لگا۔ ”سنو! اگر ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو ہمیں پولیس کے حوالے کر دو۔“ شہلا مزاحمت کرتے ہوئے بولی۔ ”تم خود کوئی سزا نہیں دے سکتے ہو۔“

سردار نے اسے گھورا۔ ”ہم اپنے مجرم کو خود سزا دیتے ہیں۔“

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”سردار تم لوگ غلط کر رہے ہو۔ تم نے ایک آدمی مار دیا ہے اور شاید ہمیں بھی مار دو۔ لیکن ہم لاوارث نہیں ہیں۔ جلد یہ بات پولیس تک جائے گی اور پولیس تم لوگوں کو تلاش کرے گی تم پورا قبیلہ لے کر نہیں چھپ سکتے ہو۔“

اپنی بات پوری کر کے مجھے احساس ہوا کہ میں نے جھک ماری تھی وہ میری بات نہیں سن رہے تھے بلکہ مہرو کے شوہر کو شہلا کو کھینچ کر لے جاتے دیکھ رہے تھے اور اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شہلا چلّا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہرو کے شوہر نے اسے نیچے گرا دیا اور قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بے شک میری دشمن تھی اور کوئی پاکباز عورت بھی نہیں تھی کہ اسے آبرو کا خوف ہوتا۔ لیکن اسے یوں سرِعام زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا یہ بات میری برداشت سے باہر تھی۔ میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ عقب سے کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی اور میں چکرا کر نیچے گر گیا۔ ضرب سخت تھی اور تاریکی میرے حواس پر طاری ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے شہلا مزاحمت کر رہی تھی لیکن اس کی یہ مزاحمت زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتی تھی۔

اچانک ایک بڑی جیپ احاطے میں درانہ وار داخل ہوئی اور اس نے راہ میں آنے والوں کو دور اُچھال دیا۔ ان کی چیخیں بڑی بھیانک تھیں۔ جیپ کی آمد سے احاطے میں افراتفری پھیل گئی تھی اور لوگ جان بچانے کے لیے اٹھ کر بھاگے۔ جیپ عین شہلا اور مہرو کے شوہر کے پاس رکی اور اس سے فتح خان کود کر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ اس نے مشین گن کا رُخ بھاگنے والوں کی طرف کر کے ایک برسٹ مارا تھا۔ اسی لمحے میری نظر جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ایک ہستی کی طرف گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا شاید میں غلط دیکھ رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ اُٹھنا چاہا مگر نہ اُٹھ سکا اور تاریکی گہری ہوتی چلی گئی۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(سید خضر عباس بخاری، شجاع آباد کا جواب)

نصرت شاہین..........سرگودھا

یہ میرا شہر ہے شہرِ تمنّا
کہاں تک میں اسے آباد کرتا

پروین صبا..........حافظ آباد

یہ دیوانے جسارت دستِ وحشت کی گنوا بیٹھے
کسی سے اب نقابِ حسن سرکایا نہیں جاتا

اکبر حیات مخدوم..........ملتان

یوں تو قدم قدم پر تھی گردشِ زمانہ
اِک بے زباں محبت بھی اپنے درمیاں تھی

(اختر جوکھیو، ٹنڈو آدم کا جواب)

مرزا فرحال بیگ..........حیدرآباد

دوستوں کے ہجوم میں ناصؔر
میرے اندر کا شخص تنہا ہے

راجا ثاقب نواز ثاقب..........رتی ٹبی ساہیوال

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
ایک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

(نزہت پروین، شہباز پور کا جواب)

پروفیسر فوزیہ انصاری..........کراچی

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشاں ہوں میں
روز ایک موت نئے طرز کی ایجاد کرتا ہے

نوخیز خان..........حیات آباد

آج سچ بولتے رہنا کوئی آسان نہیں
لوگ تو لوگ ہیں آئینے مکر جاتے ہیں

(اقرا بانو ناگوری، کراچی کا جواب)

نصرت جاوید..........اوکاڑہ

یہ جو ہم خود میں پلٹ آئے ہیں
وقت نے ہم سے رعایت کی ہے

فریحہ ادریس..........لاہور

یوں گلے مل شمع تو بھی اپنے پروانوں کے ساتھ
عید ملتی ہے صراحی جیسے پیمانوں کے ساتھ

حکیم سید محمد رضا شاہ..........نورنگہ میانوالی

یہ جو اُتری ہے شام ساحل پر
اس کی زلفوں کا نرم سایہ ہے

ناصر بیگ چغتائی..........العین، یو اے ای

یارب خطا معاف کوئی زندگی ہے یہ
رکھا ہے جس میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

(حسنین عباس بلوچ، سرگودھا کا جواب)

نجمہ شیخ..........چنیوٹ

یا انہیں آتی نہیں بزمِ سخن آرائی
یا ہمیں بزم کے آداب نہیں آتے ہیں

امداد علی..........ساہیوال

یہ کیسی رت پلٹ آئی ہے مجھ میں
کہ سب منظر بکھرتے جا رہے ہیں

منزہ توقیر..........حاصل پور

یہ رت ہے نوحۂ مرگِ امید کی گلزار
دکھائے کیوں کوئی راہ غزل سرائی ہمیں

نوید اشرف..........وہاڑی

یہ مہرباں سی نگاہیں سپردگی کی وعید
میں جانتا ہوں یہ اسی کی ادا ودا ہے سب

(طٰہٰ یاسین، حیدرآباد کا جواب)

ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی..........برہ زئی

نہ منہ چھپا کے جئے ہم نہ سر جھکا کے جئے
ستم گروں کی نظر سے نظر ملا کے جئے

(سعید احمد چاند، کراچی کا جواب)

اختر حسین..........ملتان

یوں ہی چپ چاپ سلگتے رہے ہم
خون تھوکا ہے نہ وحشت کی ہے

محمد فہیم..........کراچی

یہی بس دو اذانوں کا ہے وقفہ
یہ لمحاتِ حیاتِ مختصر کیا

بشریٰ بلوچ..........کراچی

یہ مایوسی یہ سیلِ اشک، یہ وحشت، یہ بیتابی
دلِ برباد یہ رختِ سفر کس کام آئے گا

نسرین عارف..........تلہ گنگ

یہ نہ ہو خود کو ہی منانے میں
زندگی روٹھ کر چلی جائے

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in. just visit www.paksociety.com for complaints and issues send mail at admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

(ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، برہ زئی کا جواب)

احمد ملک..........لڈن وہاڑی

نگاہِ منصفی جن کو تلاش کر نہ سکی
وہ خوفناک درندے مری نظر میں ہیں

حمزہ یوسف..........جھنگ

نہیں دیوانہ پن جیسی جسارت
تو پھر کس کام کی دانائیاں

رضا احمد توسیفی..........مظفر گڑھ

نہ چلا کام محبت کا محبت کے سوا
چاہوں کس طرح تجھے تو ہی بتا آج مجھے

(نغمہ عباس، ہالہ نمو کا جواب)

عقیل الرحمٰن..........کھاناں

ہیں داغ ہائے دل کی شباہت لیے ہوئے
شاید یہی وہ باغِ محبت کے پھول ہیں

علی شاہد شاہ..........اسکردو

یہ خندہ لبی ایک اعجاز ہے
یقینِ وفا دل کو آجائے ہے

سلیم رضا..........خانیوال

یہاں میں ذکر نہیں کررہا مکینوں کا
کبھی کبھی در و دیوار مرنے لگتے ہیں

(فریحہ ادریس، لاہور کا جواب)

شکیل گوندل..........لاہور

یہ اضطراب مسلسل عذاب ہے امجد
مرا نہیں تو کسی اور ہی کا ہوجائے

فریدالدین عطاری..........شیخوپورہ

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہوجا

فہیم الدین..........کراچی

یہ آتشِ ہمسایہ کہیں گھر نہ جلادے
کی ہے دلِ سوزاں نے میرے پہلو میں جا گرم

نصرت مرزا..........خانیوال

یہ لگ رہا ہے ستاروں کی چال سے کہ فلک
کوئی عذاب میری خاک پر اُتارے گا

(فاخرہ ابدالی، بھمبر آزاد کشمیر کا جواب)

محمد سعید قاسمی..........ڈلوال چکوال

وگرنہ آنکھوں کا ہونا تو رائیگاں گیا تھا
حسینؓ ہم پہ ترے غم نے مہربانی کی

فصیحہ ارشاد..........سرگودھا

وہ جو آتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

(راجا ثاقب نواز ثاقب، ساہیوال کا جواب)

ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی (ٹوکن 2)..........برہ زئی

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

انیس احمد..........فیصل آباد

یوں وہ ہم سے تعلق بڑھاتے رہے
یاد کرتے رہے یاد آتے رہے

دردانہ کوثر..........جہلم

یہی تو درد ہے دل کو جو دھڑکاتا ہے سینے میں
یہی تو ایک دولت ہے جو انسانوں کے ہاتھ آئی

شکیل احمد ترمذی..........ملتان

یہی ہوا ہے مرا دل کے ساتھ سمجھوتا
کہ پاس ہی رہے اس کے مگر بدل جائے

محمد یاسین طفیل..........دواکھری

یادِ ایام کہ جب بیٹھتے مل کر احباب
جمع ہوجاتے تھے اِک جشنِ طرب کے اسباب

(شازیہ کمال، گوجرانوالہ کا جواب)

فرزانہ سلیم..........رام نگر ننکانہ

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

عرفان بشیر..........ساہیوال

ہنس بھی لیتا کبھی خود پہ محسن
ہر گھڑی آنکھ کو نم کیا رکھنا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 77

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک علمی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں اُبھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 فروری 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

علمی آزمائش 75 کا جواب

ہر بار کی طرح اس بار بھی علمی آزمائش 75 میں دیے گئے اشارے کو سرگزشت کے ذہین قارئین نے بہت بڑی تعداد میں پہچان لیا۔ جواب شمارہ جنوری میں آنا تھا مگر خاص نمبر کی وجہ سے جواب شائع نہیں ہو سکا اس لیے مکمل نتیجہ نہ دے کر صرف انعام یافتہ احباب کا نام دیا جا رہا ہے۔ صحیح جواب ملکہ الزبتھ دوم ہے۔

انعام یافتگان

1- مومن خان (شجاع آباد) -2 اطہر حسین (کراچی) -3 شوکت ملک (لاہور)

4- صاحب جان (اٹک) 5- وصی الحسن (بہاولپور)

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1898ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ آل انڈیا ریڈیو کے کلیدی عہدے پر فائز رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سفارتی امور انجام دینے لگے۔ 1950ء سے وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس رہے۔ لسانیات کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے بے شمار نثر پارے کلاسک میں شمار ہوتے ہیں۔

علمی آزمائش 76 کا جواب

رضا شاہ پہلوی سابق شہنشاہ ایران کے دادا فوج کے افسر تھے۔ 21 فروری 1921ء کو اس کے باپ نے اپنے ملک کی کمزور حکومت کو گرا دیا اور اپنے ایک دوست کو وزیراعظم بنا کر خود کمانڈر انچیف بن گیا۔ پھر بادشاہ کا تاج بھی سر پر رکھ لیا۔ مگر جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی اور اتحادیوں نے اس کی حکومت پر دباؤ بڑھا دیا تو 16 ستمبر 1941ء کو اس نے تخت سے دستبردار ہو کر اپنی جگہ اپنے یعنی بیٹے کو بٹھا دیا۔ بادشاہت حاصل کرنے سے پہلے ہی اس کی شادی مصر کی شہزادی فوزیہ سے ہوئی۔ اس سے ایک بیٹی شہناز ہوئی۔ بادشاہت کے لیے ولی عہد ضروری ہے۔ اس نے فوزیہ کو طلاق دے دی۔ 1950ء میں اس نے ثریا نامی لڑکی سے شادی کی۔ اس سے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی تو 1958ء میں اسے بھی طلاق دے دی۔ 21 دسمبر 1959ء کو ایک 22 سالہ لڑکی فرح سے شادی کی جو اس کی بیٹی شہناز کی سہیلی تھی۔ 31 اکتوبر 1960ء کو اس کے بطن سے ایک بیٹا تولد ہوا۔ عوام کا غیظ جو اُٹھا تو سب کچھ بہا لے گیا اور تخت پر بٹھانے کے لیے جس وارث کی خاطر اس نے دو دو عورتوں کو طلاق دی اسی وارث کو سینے سے لگائے وہ ملک سے بے سروسامانی کے عالم میں فرار ہوا

اور پردیس میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر موت کی گود میں جا سویا۔

انعام یافتگان

1- منظر ڈڈیال، راولپنڈی -2 صنم قریشی، حیدرآباد -3 نصرت جاوید سیال، شادی پور

4- اختر بسمل، کوئٹہ 5- رازی خان، فیصل آباد

(علمی آزمائش نمبر 76 کے وہ قارئین جن کے جوابات درست تھے)

کراچی سے: محمد باشر، اسما جہانزیب، معتز اکبر حسین، محمد مناف، فاضلانی، سعید احمد چاند، نعمت مرزا، محمد فیضان، آفتاب منصور، عمار اسلام الدین شیخ، فرمودہ فاطمہ، زبیر احسن، نوید الحسن مرزا، جمیل عثمانی، عامر زبیر چوہدری، زبیر ملک، امیر الدین، نوید احسن، فرید حسن، زبیر اختر، ثانیہ احسن، عامر اسلام، حسن خان اچکزئی، اطہر حسین، اختر عباس، سنجیدہ احمد، جاوید اقبال، سلمان مشتاق، سید عزیز الدین، طارق حبیب، بابر توفیق، سید عباس رضا رضوی تنویر، فرزانہ پروین، سید عزیز الدین، بشریٰ بانو ناگوری، محسن اختر بلوچ۔ لاہور سے: شاہ انوار شاہ، شازیہ اکرم، بہادر خان اچکزئی، شاہینہ بتول، انوار علی شاہ، شوکت ملک، مہوش جان، اکبر حیات خان، ناہید رحمٰن، شکیل گوندل، الحاج کرم الٰہی اعوان، ڈاکٹر منور اقبال، شاد ور علی، صاحب جان، کلیم وٹو، احسان الحسن، احتشام لاہوری، شاہینہ بتول، مہناز عرفان، صلاح الدین، عشرت حسین۔ ملتان سے: محمد معین چشتی، محمد شفیق بھٹی آڈیٹر، احمد شفیق، ناصر الحسن، ارشاد لاشاری، نوازش الٰہی، عباس خان، زریاب آفریدی، ملک اشفاق، حسین رند، کاشف حسین، صدیق احمد صدیقی، کاشان اللہ، خاقان عباسی، زہرا نوید، فلک شیر میو، راؤ ارشاد حسین، نذر حسین، ملک انور ممتاز، نور جہاں خلیق، خلیق الزماں۔ رحیم یار خان سے: زاہد بخش، کرم علی، شاہد خان، نیابت خان، ملک سرفراز، کلیم اللہ۔ اسلام آباد سے: ممتاز احمد، انور یوسف زئی، ثمین جاوید، رضیہ ضمیر سید، عالیہ فاطمہ، وجاہت علی، سید احسن محمود، اختر خان، تہمینہ سلیم، زبیر اسلم زنجانی، اقبال اختر، اطہر ممتاز خان، عمر خان آفریدی، سونیا فرحت، فرحت حسین۔ راولپنڈی سے: عمر احمد صدیقی، حافظ محمد اقبال، اختر علی صدیقی، منظر ڈڈیال، نگار بانو، محمد سہیل، نزہت فردوس، سلیم اللہ، عرفان اللہ قادری، نورین نوری، بے بی اسلام شیخ، چوہدری ممتاز الدین، یاسمین اختر ناز، نوید اسلم، فرحان مصطفیٰ۔ جیکب آباد سے: نازش سلطانہ، اقبال گوندل، ممتاز اختر، رحمٰن شاہ، اطہر جونیجو، فرحت اللہ بابر، نصیر الدین، فیصل بابر، ثمینہ جونیجو۔ سرگودھا سے: شریف الرحمٰن خان، آفرین ارشاد، سندس فرید، انور علی ترمذی، مہوش صدیق۔ چکوال سے: ندا ملک، ماہا ملک، ارباب صدر الدین، تنویر احسن، غلام حسین زیدی۔ کمالیہ سے: اشرف سلطانی، ملک اشفاق۔ بہاولنگر سے: شفیق الرحمٰن، جنید سلطان، ارشاد حسین جعفری، ماہا ملک، فرحت خان، حباب چنگیزی، نصرت جاوید، وصی الحسن، ابرار الحق۔ بہاولپور سے: محمد ظفر اقبال، مہناز اکرم ملک، نعمان اللہ خان، زبیر احمد، نعمانہ فرحت، کمال احسن۔ میانوالی سے: نوازش علی خان۔ اقبال فرحت اعجازی، شمیم اختر، حبیب احسن، فہیم اختر، شمیم اختر۔ ٹنڈو جان محمد سے: تھری امولکھ، زریاب جوکھیو، عمر الطاف۔ ڈیرہ غازی خان سے: ڈاکٹر ایس اے اختر، ممتاز ملک۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: غزالہ شاہ، زہیب لغاری، حضرت شاہ، عائشہ فرحت، نصیر خان۔ حیدرآباد سے: ذیشان اختر عطاری، بیگم شمیم النسا، ممتاز الدین قادری، اکبر علی جوکھیو، کوکب قریشی، ناصر رند، فرحان مرتضیٰ، رفیع اللہ انصاری، اظہار الحق خان صالح خیل، مرزا فرحال بیگ، وسیمہ یوسف، آمنہ کریم۔ بھکر سے: محمد عارف قریشی، حافظ گل عمر ولد دار اللہ یار، فرحت لغاری، اسلم جنید، نیر مصطفیٰ۔ شجاع آباد، ملتان سے: ڈاکٹر سید محمد عالمگیر جاوید، ناصر حسین۔ لاڑکانہ سے: حاجی مدد علی زنگیجہ جتوئی، فرحت جوکھیو۔ دھنڈر کلا، بھمبر آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ مظفر گڑھ سے: رانا محمد سجاد (شاہ جمال) زبیر احسن۔ پشاور سے: شیر نواز گل، عائشہ ابدالی، الطاف سعید، فاخر قمر، بشریٰ مجید، سعید الدین، دروغہ خان، وحید طوری بنگش، نصرت فتح علی، سعید الحسن، ظہیر الحسن، اسد اللہ، زبیر احمد۔ ہری پور ہزارہ سے: خورشید احمد، صفدر حسین جعفری۔ کنڈیاری سانگھڑ سے: آصف علی۔ حافظ آباد سے: عنایت محمد انسٹرکٹر الیکٹرانکس، عباس سید۔ کھاتاں سے: سلیم کامریڈ۔ عیسیٰ خیل میانوالی سے: عبدالخالق۔ کمالیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے: ایم اشرف خان فاروقی۔ پاک پتن سے: نوید احمد۔ مارٹن پور ننکانہ صاحب سے: فرانسس جیمز۔ تورنگہ میانوالی سے: حکیم سید محمد رضا شاہ۔ لیہ سے: حمیدہ بیگم۔ جہانیاں ضلع خانیوال سے: سید ابتسام اشرف مشہدی۔ چوآسیدن شاہ ضلع چکوال سے: فرحان سعید قاسمی۔ بوریوالہ وہاڑی سے: محمد عمران الحق، محمد ریاض، بالے خان۔ شیخوپورہ سے: امجد علی، نصر خان، نازش احمد، سلطان نصیر۔ حضرو اٹک سے: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، علی اصغر علی۔ جھنگ سے: عطا المصطفیٰ، سعید الدین، ناصر حسین، فرحت اللہ لغاری، کمال حسین۔ نوشہرہ سے: فضل محمد۔ نور پور سے: خواجہ عبدالعزیز۔ حسن ابدال، ضلع اٹک سے: اعجاز امجد بھٹی، فرحت بٹ۔

ممالک غیر سے: سید انصار بن قطبی (الجبل، سعودیہ) زہیب علی کمالی (دوحہ، قطر) نواز شیخ (فرینکفرٹ، جرمنی) ارشد شیراز، ارشد علی ارشد (دبئی) نصرت فاروقی، ممتاز دانش، زینب فیروزی (اوسلو، ناروے) ناصر توقیر عثمانی (العین، یو اے ای) فرحت شاہ (جرمنی) شاکر حسین شاکر (عمان، سعودیہ)

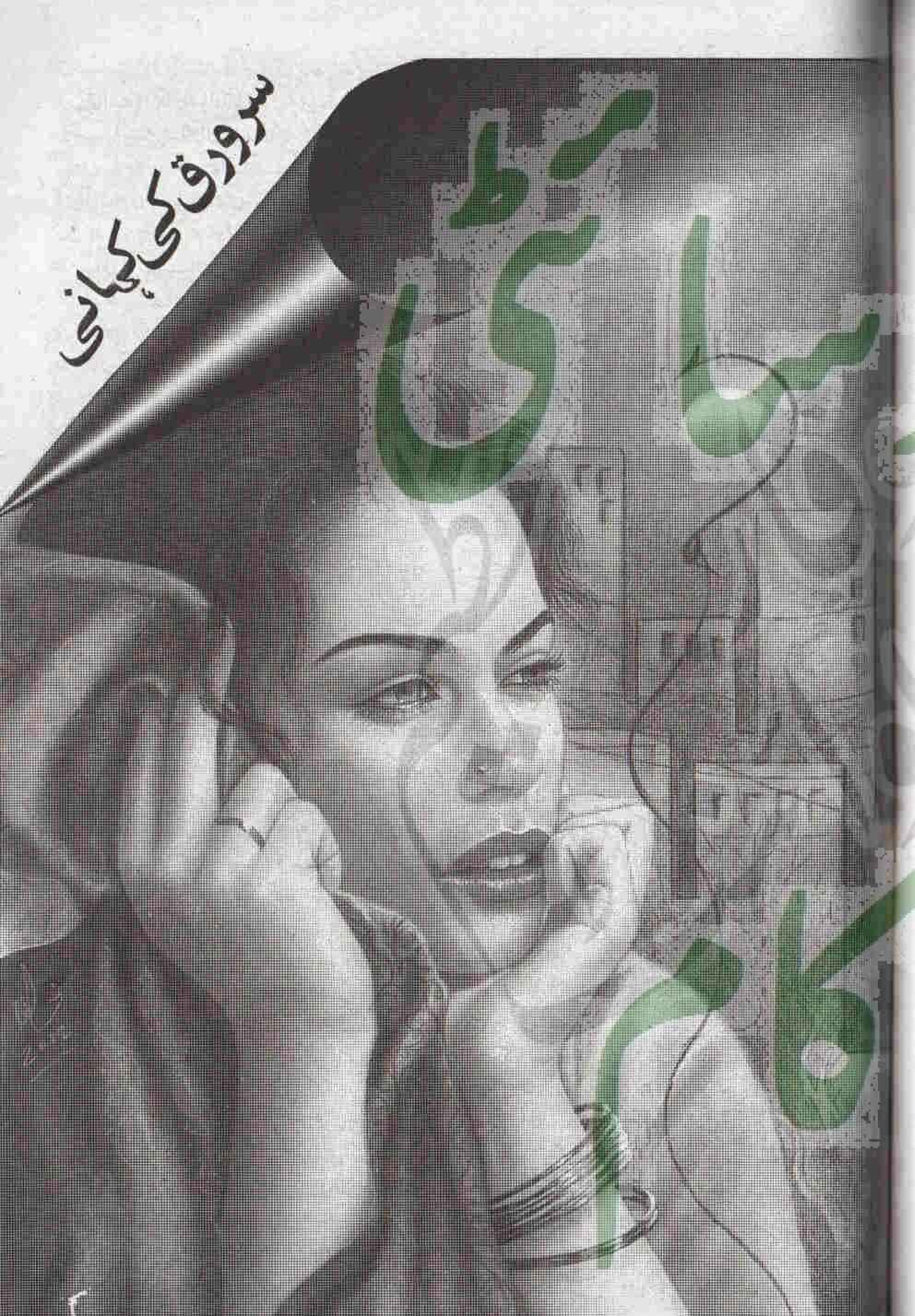

معراجِ محبت

عذرا رسول صاحبہ!
مودبانہ آداب۔
آپ کے ڈائجسٹ میں طرح طرح کی آپ بیتیاں ، جگ بیتیاں شائع ہوتی ہیں۔ میں نے بھی ایک سہیلی کی آپ بیتی قلم بند کی ہے۔ رائٹر نہیں ہوں اس وجہ سے اس طرح الفاظ سے کھیل نہیں پارہی ہوں جیسے دیگر رائٹر حضرات کھیلتے ہیں۔ اپنی کہانی کو خوشنما بنالیتے ہیں۔ بس سیدھے سیدھے انداز میں آپ بیتی بیان کرتی چلی گئی ہوں۔ اگر پسند آجائے تو کسی نزدیکی اشاعت میں شامل کرلیں۔

ریحانہ
(حال مقیم دبئی ، یو اے ای)

مرد اور عورت کے درمیان پسندیدگی اور چاہت کے کسی جذبے کو اگر واقعی سچی محبت کا نام دیا جاسکتا ہے تو اس کی بنیاد ظاہری خوبصورتی اور خوش جمالی پر نہیں بلکہ باطنی خوب سیرتی اور خوش خصالی پر ہوتی ہے۔ یہ جو ہم کسی کو دیکھتے ہیں اور اس کی کوئی بات ، کوئی ادا پسند آجانے پر چاہت کے دعوے کرنے لگتے ہیں تو حقیقت میں اس پسندیدگی کا تمام تر انحصار صنفی کشش پر ہوتا ہے۔ اگر کسی بھی وجہ سے دوسرا فریق اپنے حسن وجمال سے محروم ہوجائے یا اس کی جسمانی خوبصورتی میں کوئی داغ لگ جائے تو آن کی آن میں ہماری محبت دودھ کے اُبال کی طرح بیٹھ جاتی ہے اور ہم دامن جھٹک کر اس تیزی سے دور بھاگتے ہیں جتنی شدت سے بھی اس کی رفاقت کے خواہش مند رہے تھے۔ محبت اور جسمانی حسن پرستی کے اس نازک فرق کو واضح کرنے کے لیے آج میں سرگزشت کے قارئین کے سامنے اپنی ایک پیاری سہیلی کی آپ بیتی پیش کرتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ آپ بیتی محبت کے دعوے دار افراد کو یہ فیصلہ کرنے میں مدد دے گی کہ انہوں نے محبت کے نام پر اپنی زندگی کو جن بے شمار اُلجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرلیا ہے، آیا وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں یا نہیں؟

چونکہ میری حیثیت ایک راوی کی ہے اس لیے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھتی ہوں کہ میرا نام ریحانہ ہے، ایک نسبتاً خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اور حسن اتفاق سے مجھے رضیہ کی زندگی اور اس کے واقعات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ خود وہ بھی مجھ پر بے حد اعتماد کرتی تھی۔ (اب بھی کرتی ہے) اس لیے اس کی زندگی کی بہت سی ایسی باتیں جنہیں وہ دوسروں سے چھپا کر رکھتی تھی، مجھے نہ صرف تفصیل سے بتادیا کرتی تھی بلکہ گاہے گاہے مشورہ بھی کرتی رہتی تھی کہ اب یہ مسئلہ درپیش ہے، اسے کیا کرنا چاہیے۔ جی ہاں، رضیہ میری اسی سہیلی کا نام ہے جس کی داستان میں آج اس کی اجازت سے قارئین کی نذر کرنے لگی ہوں۔

رضیہ کے والد سلطان احمد صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ سیدھے سادے مخلص اور شریف النفس انسان تھے۔ ہمارے ہی محلے میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ مکان ذاتی اور آبائی تھا اس لیے کم آمدنی کے باوجود سفید پوشی سے گزراوقات کرلیتے تھے۔ ان کے چار بچے تھے۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ رضیہ سب سے بڑی تھی اور بیٹا سب سے چھوٹا۔ تقریباً دس گیارہ برس کی ملازمت کے بعد بدقسمتی سے تپ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے۔ تین چار برس بیمار رہنے کی وجہ سے ملازمت جاتی رہی۔ پھر قدرے صحت یاب ہوئے تو ریلوے سے ملنے والے فنڈز وغیرہ کی رقم سے گھر کے ہی ایک کمرے میں پرچون کی دکان کھول لی۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے ان کے لیے دکان چلانا کافی مشکل تھا مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح مزید آٹھ نو برس اپنے کنبے کی کفالت کرتے رہے۔

رضیہ میٹرک تک میرے ساتھ ہی پڑھتی رہی۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا مگر میٹرک کے بعد اس کے گھر کے حالات اس قابل نہ رہے کہ وہ باقاعدہ کالج جوائن کرسکتی لیکن

اس نے اپنے شوق و محنت سے گھر پر ہی پڑھ پڑھ کر کسی نہ کسی طرح بی اے کا امتحان دیا اور پاس بھی کرلیا۔ تب سلطان احمد صاحب پر ایک مرتبہ پھر ان کی پُرانی بیماری کا حملہ ہوا۔ چھوٹی لڑکیوں نے دکان سنبھالنے اور چلانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور ایک دو برس میں دکان کا تمام اثاثہ گھر میں خرچ ہوتے ہوتے ختم ہوگیا اور دکان بند ہوگئی۔ سلطان صاحب کی بیماری نے ان لوگوں کو حد سے زیادہ مقروض بھی کردیا۔ حد یہ کہ مکان بھی رہن رکھ دیا گیا۔ سلطان صاحب بیماری کے دوسرے حملے سے جانبر نہ ہو سکے اور تین سال کے بعد انتقال کر گئے۔ رضیہ اور اس کی بیوہ ماں صغرا نے یہ غم بڑے حوصلے سے سہا۔ رضیہ گھر پر بچوں کو پڑھا کر اور تھوڑی بہت سلائی کرکے گھر کی کفالت کا بوجھ اُٹھانے کی جدوجہد کرتی رہی لیکن جو ہزاروں کا قرض چڑھ گیا تھا اس کے اُترنے کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوسکی۔

ہمارا محلہ خاصا بڑا اور طبقات کے اعتبار سے ملی جلی آبادی پر مشتمل تھا۔ اس میں اگر سلطان صاحب جیسے غریب لوگ رہتے تھے تو مرزا اشفاق بیگ جیسے دولت مند افراد بھی رہتے تھے۔ ان ہی گھرانوں میں ایک متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والا خاندان علی احمد خان کا بھی تھا جو ٹھیکے داری کرتے تھے۔ طارق ان کے بڑے لڑکے کا نام تھا۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابتدا کیسے ہوئی، کس طرف سے ہوئی لیکن میٹرک کے بعد دو چار برس کے اندر رضیہ اور طارق ایک دوسرے کے بے حد قریب آچکے تھے۔ ان کے درمیان زیادہ تر خط و کتابت ہی ہوئی تھی یا کبھی کبھار محلّے کے کسی گھر میں کوئی تقریب ہونے پر وہ ایک دوسرے سے چند لمحوں کے لیے مل کر دو چار باتیں کرلیا کرتے تھے۔

طارق بی کام پاس کرچکا تھا۔ اس کے والد اسے ٹھیکے داری کی طرف لانا چاہتے تھے مگر خود انہوں نے زندگی بھر اس لائن میں جدوجہد کرکے کوئی ایسی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی اس لیے طارق کا رجحان ملازمت کی طرف زیادہ تھا۔ باپ نے زبردستی اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کی مگر طارق کے تعاون کے باوجود ٹھیکیداری میں کچھ ترقی کے آثار پیدا ہوتے نہ دیکھ کر طارق بددل ہوگیا۔ دراصل علی احمد خان کی بنیادی کمزوری ضروری سرمائے کی کمی تھی۔ ٹھیکے داری ایک ایسا کام ہے جس میں عام طور پر دوسرے محکموں سے وقت پر بلوں کی ادائیگی نہیں ہوا کرتی اور ایسے دنوں میں علی احمد خان کے گھر کی حالت بڑی پتلی ہوجاتی تھی۔ نہ ہی وہ کوئی بڑا ٹھیکا لے کر زیادہ منافع کما سکتے تھے کہ بڑے ٹھیکے کے لیے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے پاس نہیں تھی اور چونکہ خاصے بڑے کنبے کے سرپرست تھے اس لیے کبھی آمدنی سے بچت کی صورت بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ کبھی کچھ بچتا بھی تھا تو ان دنوں میں خرچ ہوجاتا تھا جن دنوں ان کے بل رک جایا کرتے تھے۔

بہ ظاہر طارق اور رضیہ کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ طارق کو یقین تھا کہ ملازمت ملنے اور خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بعد وہ اپنے والدین پر اپنی خواہش کا اظہار کرکے رضیہ کے گھر پیام لے جانے پر آمادہ کرلے گا اور بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ رضیہ کی ماں کو اس رشتے پر کوئی اعتراض ہو۔ رکاوٹیں صرف دو تھیں۔ اوّل تو رضیہ کو اس بات کا انتظار تھا کہ اس سے چھوٹی بہن بی اے پاس کرلے اور پھر اس کی جگہ گھر کا خرچ چلانے کی ذمّے داری لے۔ چھوٹا بھائی ابھی بہت چھوٹا یعنی صرف دس برس کا تھا، اسے کسی قابل بننے کے لیے دس بارہ برس مسلسل محنت کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے کہ رضیہ اتنی مدت دراز کے منصوبے کے انتظار میں بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اگر آمادہ بھی ہوجاتی تو اس کی ماں، جنہیں دن رات بیٹی کے جوان اور بن بیاہی ہونے کا غم کھا رہا تھا، کسی نہ کسی طرح اس کے ہاتھ پیلے کرہی دیتیں اور جب شادی ہی کرنا ہے تو طارق کو قسمت آزمائی سے روکنا نامناسب تھا۔

دوسری رکاوٹ طارق کو کوئی موزوں ملازمت کا نہ ملنا تھا۔ وہ بی کام تھا، چاہتا تھا کہ کسی سرکاری یا نجی ادارے میں اسے اکاؤنٹ کے شعبے میں جگہ مل جائے جہاں وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی حاصل کرتا رہے اور اگر حالات اجازت دیں تو ایم کام یا اکاؤنٹنٹ کی کوئی بڑی ڈگری لینے کی کوشش کرے۔ اسے کلرکی کی پیش کش تو دو تین مرتبہ ہوچکی تھی مگر چونکہ جاب کا تعلق اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ سے نہیں تھا اس لیے اس نے انکار کرکے مزید انتظار کرنے کو ترجیح دی۔

مجھے طارق اور رضیہ کی چاہت پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بظاہر طارق ایک خوبصورت، جامہ زیب اور اچھے اخلاق و کردار کا مالک تھا اس لیے میں نے رضیہ سے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی طارق کا پیام آیا تو اس کی ہر ممکن مدد کروں گی۔ اگرچہ صغرا خالہ سے کسی مخالفت یا انکار کی توقع نہیں تھی لیکن انہیں کوئی اعتراض ہوا بھی تو میں انہیں آمادہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گی اور اسی طرح اگر طارق سے پہلے کوئی پیام آگیا تو بھی کوشش کروں گی کہ صغرا خالہ اس پیام کو منظور نہ کریں۔

لیکن محلّے میں ایسا کون سا گھر تھا جو سلطان صاحب

مرحوم کے گھر کی مالی حالت، ان کی غریبی اور خاص طور پر ان کے انتہائی مقروض ہونے سے واقف نہ ہو۔ غریب سے غریب لڑکے کے والدین بھی کچھ نہ کچھ جہیز تو چاہتے ہیں اور چلو جہیز نہ بھی چاہیں تو یہ اندیشہ تو سب ہی کو تھا کہ رضیہ سے شادی کے بعد جملہ قرض کی ادائیگی کا بوجھ بڑے داماد پر آجائے گا اور اس کی ساری زندگی سسرال والوں کا قرض اُتارتے اُتارتے ہی بیت جائے گی اور بالفرض قرض خواہوں نے اتنے صبر و تحمل کا مظاہرہ نہ کیا تو یقینی بات تھی کہ قرض کی ادائیگی میں مکان ہاتھ سے نکل جائے گا اور پھر دو سالیاں، ایک سالا مع بیوہ ساس کے بڑے داماد کے سر کا بوجھ بن جائیں گے۔ چنانچہ یہ سب کچھ سوچ کر دوسرے لوگ رضیہ کو اپنی بہو بنانے سے جھجکتے تھے حالانکہ رضیہ بہت حسین و جمیل ہونے کے علاوہ سینے پرونے، کھانے پکانے اور پوری گھرداری سنبھالنے میں انتہائی مستعد اور سلیقہ شعار تھی۔ مزاجی خوبیوں کے اعتبار سے بھی محلّے کی اپنی ہم عمر لڑکیوں میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بڑی حوصلہ مند، محنتی، بردبار، متحمل اور بڑے خلوص سے سب کے کام آنے والی لڑکی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ رضیہ اتنی اچھی لڑکی تھی کہ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ وہ طارق کو پسند کرتی ہے تو میں خود اسے اپنے منجھلے بھائی کی بیوی اور اپنی بھابی بنا کر گھر لے آتی یا کم از کم اس کی جان توڑ کوشش ضرور ہوتی۔

☆☆☆

حالات ابھی اس نہج پر تھے کہ میری اور رضیہ کی ایک مشترکہ سہیلی عابدہ کی شادی کی تقریب منعقد ہوئی۔ عابدہ مرزا اشفاق بیگ کی بیٹی تھی۔ ان کے کل پانچ بچے تھے، دو لڑکیاں اور تین لڑکے۔ بڑے لڑکے کا نام آفاق تھا اور اس نے تین برس قبل ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔ ایک سال ہاؤس جاب اور ایک سال ایک پرائیویٹ اسپتال میں سروس کرنے کے بعد اس نے خود اپنا کلینک کھول لیا تھا۔ خدا نے اس کے ہاتھ میں شفا دی تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اس کا کلینک بہت اچھی طرح چلنے لگا تھا۔ آفاق سے چھوٹی عابدہ تھی اور پھر اس سے چھوٹے باقی دونوں لڑکے اور آخر میں سب سے چھوٹی ایک اور بیٹی۔ میں نے، رضیہ نے اور عابدہ نے ایک ہی اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا۔ جس کے بعد اس نے ہوم اکنامکس کالج میں داخلہ لے لیا اور میں نے ایک دوسرے کالج میں۔ یہاں سے ہماری راہیں قدرے جدا ہوگئیں مگر اس کے باوجود ہم گاہے گاہے ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کا موقع ضرور نکال لیتے تھے۔

عابدہ کی شادی ہوئی تو اس نے بڑے اصرار سے مجھے اور رضیہ کو مدعو کیا۔ رضیہ اتنے بڑے گھر کی تقریب میں جانا نہیں چاہتی تھی مگر عابدہ کے محبت بھرے اصرار اور نہ شریک ہونے پر اس کی خفگی کے خیال نے اسے مجبور کردیا۔ یہاں یہ بتاتی چلوں کہ میں نے کہا رضیہ بڑی حوصلہ مند لڑکی تھی۔ اسے کسی قسم کا احساس کمتری نہیں تھا۔ جس لڑکی کے بارے میں بھی اسے اندازہ ہوجاتا کہ وہ اس سے ملنا کسرِ شان سمجھتی ہے تو پھر پلٹ کر اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ اپنے طبقے سے ہٹ کر عابدہ کے ساتھ اس کی دوستی اس لیے برقرار تھی کہ عابدہ نے کبھی اسے غربت اور امارت کے ترازو میں نہیں تولا تھا۔ وہ کبھی رضیہ کے گھر جاتی تو صغرا خالہ سے ضد کرکے لہسن کی چٹنی اور بیسنی روٹی پکواتی اور اگر کھانے کے لیے روکا جاتا تو بڑی رغبت سے ہر وہ کھانا کھاتی تھی جو رضیہ کے گھر میں پکا ہوتا تھا۔ اسی طرح تحفے تحائف کے سلسلے میں اس نے ہمیشہ رضیہ کے ایک معمولی سے کڑھے ہوئے رومال کو کسی دوسری سہیلی کے پُرتکلف اور قیمتی تحفے سے کہیں زیادہ سراہا اور خلوص سے وصول کیا تھا۔ چنانچہ رضیہ کی ہچکچاہٹ اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنے معمولی لباس میں شریک ہوتے ہوئے کوئی شرمندگی محسوس کرتی تھی بلکہ اس لیے تھی کہ کہیں اس کی وجہ سے عابدہ کے معزز مہمان خود عابدہ کے بارے میں کوئی کم تر رائے نہ قائم کریں مگر جب عابدہ نے کہا کہ اگر تم نہیں آئیں تو میں رخصت ہونے سے انکار کردوں گی اور اگر کسی مہمان نے تمہاری توہین کی تو میں اسے تم سے معافی مانگنے پر مجبور کردوں گی تو بالآخر رضیہ کو آنے کا وعدہ کرنا ہی پڑا۔

وہ اپنے اسی گھریلو سادہ مگر سلیقے سے سلے ہوئے صاف ستھرے لباس میں شادی کی تقریب میں شریک ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنی سادگی سے بہت سے مالدار گھرانوں کی بھڑکیلے ملبوسات اور بیوٹی پارلر سے میک اپ

شمارہ جنوری 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: عامل ...... پروفیسر یوسف عطاری (کراچی)

☆ دوم: جن گزیدہ ...... شمیم (کراچی)

☆ سوم: ایمان فروش ...... محمد اکرم چوہدری (جہلم)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in. just visit www.paksociety.com for complaints and issues send mail at admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

کرا کے آئی ہوئی لڑکیوں کو مات دے دی۔ وہ پوری محفل میں منفرد نظر آرہی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ عابدہ کے بھائی آفاق کی نظروں میں سما گئی۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر آفاق بار بار کسی نہ کسی بہانے سے خواتین کے حصے میں آجاتے اور ان کی نظریں رضیہ کا تعاقب کرتی رہتیں۔ ممکن ہے خود رضیہ نے اسے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن مجھے اچھی طرح یقین ہوگیا کہ آفاق میری سیدھی سادی سادگی پسند حسین وجمیل سہیلی پر بُری طرح لٹو ہو چکے ہیں۔ اس کا ثبوت بھی مجھے جلد ہی مل گیا۔ شادی تو بہ خیروخوبی اپنے انجام کو پہنچی۔ عابدہ رخصت ہوگئی تو اس کے بعد میں اور رضیہ بھی اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ میں نے دانستہ آفاق کی دلچسپی کا کوئی ذکر رضیہ سے نہیں کیا مگر آفاق سے خود ضبط نہیں ہوسکا۔ شادی کے ہنگامے ذرا سرد ہوئے تو ایک دن عابدہ غیر متوقع طور پر میرے گھر آئی۔

"میں اور امی کل رضیہ کے گھر جارہے ہیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا "تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

میرے اپنے ذہن میں یہ امکان شادی کے دن ہی پیدا ہوگیا تھا۔ پھر عابدہ کا لہجہ اپنی جگہ خود چغلی کھا رہا تھا مگر میں نے دانستہ انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں خیریت، تمہاری تو خیر وہ سہیلی ہے۔ شادی کے بعد میکے آئی ہو تو اس سے ملنے ضرور جاسکتی ہو مگر تمہاری امی کس لیے جارہی ہیں؟"

"ہم آفاق بھائی کا پیغام لے کر جارہے ہیں۔"

"کیا!" میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا "یہ کیسے ممکن ہوا؟"

"شادی میں آفاق بھائی نے رضیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا اور وہ اپنے منفرد وسادہ انداز میں انہیں اتنی پسند آئی کہ اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔"

"خیر یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔" میں نے جواب دیا "لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہورہی ہے کہ تمہارے والدین اس رشتے پر کیسے آمادہ ہوئے؟"

"میرے ابو اور امی میری ہی طرح ہیں۔" عابدہ نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا "وہ آدمی کی شرافت اور ذاتی خوبیوں کو دولت وامارت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی خواہش ایک اور جگہ کے لیے تھی لیکن جب انہیں آفاق بھائی کی پسند معلوم ہوئی تو بڑی خوشی سے آمادہ ہوگئے۔ تمہارا کیا خیال ہے صغرا خالہ ہمیں مایوس تو واپس نہیں کریں گی؟"

"خیر ان کی جانب سے تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے جواب دیا "وہ اتنے اچھے رشتے کی توقع ہی نہیں کرسکتی تھیں لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ تم آفاق بھائی کو سمجھاؤ۔ شاید یہ رشتہ مناسب نہ ثابت ہو۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔ رضیہ کو مجھ سے زیادہ تم اچھی طرح جانتی ہو اور جتنا میں جانتی ہوں اس کے پیشِ نظر وہ کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوگی۔ سچ پوچھو تو مجھے آفاق بھائی کی پسند جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

"سوال رضیہ کی خوبیوں کا نہیں ہے۔" میں نے کہا "مگر تم ان لوگوں کے حالات بہ خوبی جانتی ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں بعد میں یہ حالات تم لوگوں کے لیے دردِ سر نہ بن جائیں۔"

اب ظاہر ہے کہ میں عابدہ سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ رضیہ طارق سے محبت کرتی ہے۔

"تم ان حالات کی فکر مت کرو۔" عابدہ نے جواب دیا "خدا کے فضل سے ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ بعد میں اس کا کوئی مناسب حل تلاش کرلیں۔ مگر میں تمہارے پاس کسی بحث ومباحثہ کے لیے نہیں آئی ہوں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ کل تمہیں بھی ہمارے ساتھ رضیہ کے گھر چلنا ہے۔"

میں خاموش ہوگئی کہ زیادہ بحث کرنے سے عابدہ کے بُرا ماننے کا امکان تھا۔ مگر دل ہی دل میں مجھے رضیہ پر اس خبر کے ردِعمل کا احساس کرکے افسوس ضرور ہورہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صغرا خالہ اس قدر اچھے رشتے سے انکار نہیں کرسکتیں اور اگر انہوں نے منظور کرلیا تو پھر رضیہ اور طارق کا کیا ہوگا؟ مجھے یہ فکر ستا رہی تھی، عابدہ تو آکر چلی گئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ آفاق نے اپنے طور پر کچھ اور بھی سوچ رکھا تھا۔ سہ پہر کو ایک لڑکی میرے لیے ایک خط لائی۔ خط آفاق کی جانب سے تھا۔ جس میں آفاق نے مجھے مخاطب کرکے تعاون کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میں ان کے گھر والوں کے جانے سے پہلے یا بعد میں، جیسا مناسب سمجھوں رضیہ کی والدہ سے ملوں اور ان کی طرف سے پیشکش کروں کہ وہ اپنی تنگ دامنی کو انکار کی وجہ نہ بنائیں۔ انہیں عابدہ کی معرفت پہلی مرتبہ سلطان صاحب مرحوم کے گھریلو حالات کا علم ہوا ہے اور ان کے پیام سے قطع نظر وہ ایک شریف انسان کے لواحقین کی ضرورت کے وقت ان کی مدد کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ رضیہ کی امی پیام منظور کریں یا نہ کریں، وہ ان کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے لیکن وہ انہیں (آفاق کو) اتنی اجازت ضرور دیں کہ وہ سلطان صاحب مرحوم کا تمام قرض ادا کردیں، خواہ وہ

نقدی صورت میں علیحدہ سے لیا گیا ہو یا مکان کو رہن رکھ کر۔ آفاق نے مجھ سے بڑے التجائیہ لہجے میں کہا تھا کہ میں یہ پیشکش اس طرح کروں کہ رضیہ کی امی کو ناگوار نہ گزرے۔

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اس خط کو پڑھ کر پہلا خیال میرے دل میں یہی پیدا ہوا کہ اس طرح آفاق صغرا خالہ کو اپنا ممنونِ احسان بنانا چاہتے ہیں تا کہ ان کی خواہش پوری ہونے کے راستے میں اگر کوئی رکاوٹ بھی ہے تو وہ دور ہو جائے۔ رضیہ کی امی اس کی اور طارق کی وابستگی سے لاعلم ہیں۔ ان کے لیے تو آفاق کا پیغام ہی رحمت خداوندی کے ہم معنی ہوگا اور اگر انہیں یہ بھی بتا دیا جائے کہ آفاق تمام قرض کی ادائیگی کی ذمے داری بھی لے رہے ہیں تب تو وہ فوراً رشتہ منظور کرلیں گی جو میرے خیال میں طارق اور رضیہ کے ساتھ زیادتی ہوگی اس لیے میں نے سوچ لیا کہ میں انہیں آفاق کی اس پیشکش کے بارے میں بتا دوں گی مگر ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گی کہ وہ اسے قبول بھی کرلیں۔

لیکن میرے کچھ زیادہ کہنے سننے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ معلوم ہوا کہ آفاق جس انداز سے سوچ رہے تھے، ان کی والدہ کا ذہن بھی اسی نہج سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ رشتہ لے کر گئیں تو باتوں ہی باتوں...... اور اتنے اچھے پیرائے میں کہ اس سے ان کے خلوص کے علاوہ کسی اور جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، رضیہ کی والدہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے مالی حالات کی تنگ دامنی کو کوئی رکاوٹ خیال نہ کریں۔ ہمسائے کے ہمسائے پر بڑے حقوق ہوتے ہیں، ان کا تمام قرض شادی سے قبل ہی ادا کر دیا جائے گا اور یہ کسی احسان کے طور پر یا کسی دباؤ کی صورت میں نہیں، وہ چاہیں تو پھر بھی رشتہ کو قبول یا مسترد کرنے میں اپنی آزادانہ رائے استعمال کرسکتی ہیں۔ ظاہر تھا کہ رضیہ کی والدہ کو خواب میں بھی کسی ایسے رشتے کی توقع نہیں ہوسکتی تھی جو نہ صرف ان کی بیٹی کے مستقبل کو خوشگوار بنانے والا ہو بلکہ انہیں بھی آئے دن کے قرض خواہوں کے تقاضوں سے نجات دلانے والا بھی ہو۔ انہوں نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سے بیگم اشفاق کا شکریہ ادا کیا اور رشتہ منظور کرلیا۔

☆☆☆

یہ فیصلہ رضیہ اور طارق پر بجلی بن کر گرنا چاہیے تھا اور وہ گرا۔ رضیہ دوسرے دن ہی بوکھلائی ہوئی میرے پاس آئی۔ وہ مجھ سے کچھ ناراض بھی تھی۔

"تمہیں معلوم تھا کہ میں اور طارق ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" وہ خفگی سے بولی "پھر بھی تم آفاق کی طرف سے رشتہ لے کر آ گئیں؟"

"رشتہ لے کر میں نہیں، آفاق کی والدہ آئی تھیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر تمہیں ان کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی، اس طرح جیسے تم خود بھی اس رشتے کے حق میں ہو؟"

"عابدہ تمہاری سہیلی بھی ہے اور میری بھی۔" میں نے کہا "وہ میرے پاس آئی کہ تمہیں میرے بھائی کا رشتہ لے کر میری امی کے ساتھ رضیہ کے گھر جانا ہوگا تو کیا میں یہ کہہ کر انکار کر دیتی اور تمہاری رسوائی کا سبب بنتی کہ نہ بہن، میں نہیں جاؤں گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ رضیہ اور طارق ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ میں مجبوراً خاموش رہی اور جب تک میں انکار کی کوئی وجہ بیان نہ کرتی، عابدہ میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی چنانچہ مجھے آنا پڑا۔"

"شاید تم نے ٹھیک ہی کیا۔" رضیہ نرم پڑ گئی "مگر اب مجھے بتا، میں کیا کروں؟ ان لوگوں نے بڑی چالاکی سے قرض ادا کرنے کی پیشکش بھی کی ہے۔ امی ایسے رشتے سے انکار کر ہی نہیں سکتی تھیں۔"

"میرا خیال ہے کہ جذبات کو الگ رکھ کر اگر عقلی طور پر جائزہ لو تو آفاق کا رشتہ طارق سے کہیں بہتر ہے۔ تم وہاں زیادہ چین و آرام سے رہو گی۔"

"دوبارہ تم نے ایسی بات کہی تو میری تمہاری لڑائی ہو جائے گی۔" رضیہ نے تیزی سے جواب دیا "میں طارق سے محبت کرتی ہوں اور اس کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر بھی زیادہ سکون سے رہوں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ مگر سوال یہ ہے کہ تم یا میں کیا کرسکتے ہیں؟"

"میں نے طارق کو خط لکھا ہے کہ وہ فوراً اپنی ماں کو رشتہ کے لیے بھیجے۔" رضیہ نے کہا "رشتہ آنے کے بعد یہ تمہارا کام ہوگا کہ تم میری امی کو سمجھاؤ کہ وہ طارق کے رشتے کو ترجیح دیں۔"

"مگر میں انہیں کس بنیاد پر سمجھانے کی کوشش کروں؟ طارق ہنوز بیکار ہے۔"

"تم کہہ سکتی ہو کہ امارت میں غربت کا پیوند کبھی اچھا نہیں لگتا۔" رضیہ نے جواب دیا "یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ قرض کی ادائیگی کے بعد ان لوگوں کے احسان کے سامنے ہماری گردن جھک جائے گی اور پھر وہ میرے ساتھ جو سلوک بھی کریں، ہمیں برداشت کرنا ہوگا۔ ہم کبھی ان کے مقابلے میں زبان نہیں کھول سکیں گے، وغیرہ وغیرہ۔"

"اور اگر صغرا خالہ ان دلائل سے مطمئن نہ ہوئیں تب......؟"

"تب تم ان سے یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ میں طارق کو پسند کرتی ہوں۔"

"اس کا جواب اگر انہوں نے یہ دیا کہ یہ محض جذباتی باتیں ہیں جن کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی۔ شادی کے بعد رضیہ آفاق کو پسند کرنے لگے گی۔"

"ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

"مان لیا...... مگر خالہ کو کون سمجھائے گا؟"

"پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟" رضیہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ طارق کے گھر سے رشتہ آنے دو پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے؟" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

تیسرے دن طارق کے گھر سے بھی رشتہ آ گیا۔ اگرچہ مجھے معلوم ہوا کہ طارق کو اپنے والدین کو راضی کرنے کے لیے گھر چھوڑنے تک کی دھمکی دینا پڑی۔ مالی طور پر طارق کے گھر والے بھی کچھ ایسی بہتر پوزیشن میں نہیں تھے مگر ان کے پیشِ نظر بھی وہی خدشات تھے جو دوسرے لڑکوں کی ماؤں کو سلطان صاحب کے گھر میں قدم رکھنے سے روک رہے تھے کہ شادی کے بعد ان کے بیٹے کی ساری زندگی سسرال والوں کا قرض اُتارتے ہی گزر جائے گی۔ لیکن پھر وہ اپنے بیٹے کی ضد سے مجبور ہو گئے لیکن آفاق کا رشتہ آنے اور تقریباً طے ہو جانے کے بعد صغرا خالہ کسی اور رشتے پر کس طرح غور کرسکتی تھیں۔ انہوں نے طارق کی ماں بہنوں کی آمد اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انہیں آنے میں تاخیر ہو گئی، وہ رضیہ کے لیے ایک اور رشتہ منظور کرچکی ہیں۔ اس انکار کو طارق کے والد نے اپنی توہین سمجھا کیونکہ وہ تو اپنے خیال میں سلطان صاحب مرحوم کی بیوہ پر احسان کرنے گئے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ طارق کا جو جی چاہے کرے مگر وہ اب اس لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

مگر یہ گھر کی بات تھی، گھر میں ہی رکھی گئی۔ طارق، رضیہ سے ملا اور کہا کہ اب جو کچھ کرنا ہے، اسے کرنا ہے۔ اگر وہ اپنی والدہ کو رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئی تو وہ اپنے والدین کو ایک بار پھر رشتہ لے کر آنے پر مجبور کر دے گا مگر اس کی شرط یہی ہوتی کہ آئندہ ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک نہ کیا جائے اور رشتہ قبول کرنے کی یقین دہانی کرائی جائے۔

رضیہ پھر مجھ سے ملی۔ ان دنوں وہ واقعی بے حد پریشان اور بے قرار تھی۔

"اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے۔" وہ بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کہ میں خود آفاق سے ملوں اسے بتاؤں کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ پر کیا ایسی صورت میں بھی وہ مجھ سے شادی کرنا چاہے گا۔"

میرے خیال میں یہ ایک انتہائی اقدام تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر فیصلہ تبدیل نہ ہوا۔ جس کا بہ ظاہر کوئی اور امکان بھی نہیں تھا۔ تو رضیہ کو چار و ناچار آفاق سے شادی کرنا پڑے گی۔ محبت میں اتنی شدت محسوس کرنے کے باوجود اس میں یہ حوصلہ نہیں ہوگا کہ وہ ماں سے بغاوت کر کے طارق کے ساتھ فرار ہو جائے اور نہ ہی طارق اپنے اور رضیہ کے خاندان کی اس ذلت و رسوائی پر آمادہ ہوگا...... اور جب نتیجہ ہی نکلنا ہے تو ہونے والے شوہر کو ازدواجی تعلقات کا آغاز ہونے سے پہلے ہی اپنی طرف سے بدگمان کر لینا کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ بھی برآمد ہوسکتا تھا کہ پھر شادی کے بعد رضیہ خواہ آفاق کی وفاداری اور محبت کا کتنا ہی دم بھرے اس کے دعوے مشکوک ٹھہر سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے رضیہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی۔ آفاق کو خط لکھ دیا کہ وہ شادی سے قبل اس سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔

اس ملاقات کا احوال دوسرے دن مجھے رضیہ کی زبانی ہی معلوم ہوا۔ اس کے بقول یہ ملاقات ایک پبلک پارک میں ہوئی تھی اور عجیب بات تھی کہ ملاقات کے بعد رضیہ آفاق کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ لے کر واپس لوٹی تھی۔

"آفاق صاحب کے بارے میں میری رائے بالکل غلط تھی۔" اس نے بتایا۔ وہ انتہائی بُردبار، متحمل، انصاف پسند اور مخلص نوجوان ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی لڑکی انہیں پا کر اپنی قسمت پر ناز کرسکتی ہے۔"

"تو وہ لڑکی تم ہی کیوں نہیں بن جاتیں؟" میں نے مذاقاً کہا۔

"تم نے تو شاید مذاق میں کہا ہے۔" رضیہ بولی "مگر میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں کہ اگر میرے دل میں طارق پہلے سے اپنی جگہ نہ بنا چکے ہوتے تو میں آفاق جیسے شریف، ہمدرد اور مخلص نوجوان کو پا کر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی۔"

''گویا تم نے آفاق کو اپنے اور طارق کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... سب کچھ۔''

''پھر آفاق نے کیا جواب دیا؟''

''وہ...... جس کی مجھے کوئی توقع نہیں تھی۔'' رضیہ نے بتایا ''انہوں نے کہا کہ اگر انہیں پہلے سے اس بات کا علم ہوتا تو وہ کبھی میری طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہیں کرتے اور اب جبکہ ان کو میری پسند معلوم ہو چکی ہے تو وہ اپنی امیدواری سے دستبردار ہوتے ہیں لیکن میں اس کا یہ مطلب نہ سمجھوں کہ انہوں نے ہمارے قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں جس تعاون کا وعدہ کیا تھا، وہ رشتہ کی منظوری سے منسلک تھا۔ وہ پہلے بھی واضح کر چکے تھے اور اب بھی کہتے ہیں کہ ہماری مدد کرنا وہ حقوق ہمسائیگی کا فرض خیال کرتے ہیں اور جو پیشکش کر چکے ہیں اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے، ان کے یہ الفاظ سن کر میں سکتے میں رہ گئی اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنے عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک دو دن میں خود میری ماں سے ملنے آئیں گے اور ان سے اس انداز میں بات کریں گے کہ وہ طارق سے میری شادی پر راضی ہو جائیں۔''

☆☆☆

رضیہ کی زبانی یہ سب سن کر مجھے بھی اپنے دل میں شرمندگی کا احساس پیدا ہوا۔ رضیہ نے ہی نہیں، میں نے بھی آفاق کے خلوصِ نیت کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا اور ایسا بھی نہیں تھا کہ آفاق نے صرف باتیں ہی باتیں کی ہوں۔ مجھے بعد میں رضیہ سے معلوم ہوا کہ وہ حسبِ وعدہ صغرا خالہ سے ملنے آئے تھے اور پھر انہوں نے بڑے نرم اور سنجیدہ لب و لہجے میں کہا کہ شادی زندگی بھر ساتھ نباہنے کا ایک مقدس عہد ہے۔ اسی لیے ہمارے دین اور شریعت نے یہ تاکید کی ہے کہ شادی کے وقت فریقین کی مرضی اور پسند کا پورا خیال رکھا جائے۔ پھر جب شریعت نے انتخاب کی آزادی دی ہے تو اس کے استعمال کو بھی بُرا نہیں سمجھنا چاہیے۔ انہوں نے عابدہ کی شادی میں رضیہ کو دیکھ اور پسند کر کے ہی شادی کا پیغام دیا تھا۔ مگر وہ یہ بات بھول گئے کہ پسند کا حق صرف انہیں ہی نہیں، رضیہ کو بھی حاصل ہے اور اب انہیں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ رضیہ کی پسند اس رشتے میں ہے جو ان کے پیام کے بعد آیا تھا۔ اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ اس رشتے کو منظور کر لیں۔

اتنا ہی نہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ اس دوسرے رشتے کو پذیرائی بخشیں تو وہ تمام قرض کی ادائیگی ہی نہیں بلکہ شادی کے جملہ اخراجات کی ذمّے داری بھی لیتے ہیں اور یہ بات انہوں نے مصلحتاً اس انداز میں کہی جیسے وہ قرض کی ادائیگی کو طارق کے رشتے کی منظوری کے ساتھ مشروط کر رہے ہیں حالانکہ وہ رضیہ سے ہر صورت میں قرضہ ادا کرنے کا وعدہ کر چکے تھے۔

حالات میں یہ ڈرامائی تبدیلی ہوئی اور رضیہ نے اس خوش خبری سے طارق کو آگاہ کیا تو طارق نے ایک بار پھر اپنی والدہ کو رشتہ لے کر جانے پر مجبور کر دیا اور اس مرتبہ صغرا خالہ نے رشتہ منظور کر لیا۔ اس طرح رضیہ اور طارق کی شادی طے پاگئی۔ شادی کے بعد طارق اور اس کی گھر والوں کو زیرِ بار نہ ہونا پڑے اس کے لیے آفاق نے اپنے تعاون کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں کیا بلکہ ذاتی کوشش کر کے طارق کو اپنے ایک دوست کی کمپنی میں اچھی خاصی ملازمت بھی دلوا دی۔

مجھے نہیں معلوم کہ آفاق نے اپنے گھر والوں سے کیا کہا اور انہیں کس طرح آمادہ کیا مگر بہ ظاہر ان کے گھر والوں کی طرف سے بھی کوئی مخالفانہ ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ سلطان صاحب مرحوم کے تمام قرض ادا کر دیے گئے۔ ان کا رہن شدہ مکان بھی آزاد کرا لیا گیا۔ فطری بات تھی کہ حالات کی اس تبدیلی سے رضیہ اور طارق کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے خوش نصیب ترین افراد خیال کر رہے تھے لیکن تقدیر کوئی اور ہی کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔ طارق اور رضیہ کی شادی طے ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ غیر متوقع طور پر حالات میں ایک انقلاب انگیز تبدیلی آئی۔

☆☆☆

محلّے میں جہاں زیادہ تر آبادی شریف اور پڑھے لکھے افراد پر مشتمل تھی، وہیں دو چار غنڈے ٹائپ کے آوارہ اور بدمعاش نوجوان بھی محلّے کا امن و سکون تباہ کرتے رہتے تھے۔ ان کا سرغنہ دلاور نام کا ایک آوارہ لڑکا تھا۔ اس بدقماش کے جو دوسرے گن تھے، وہ تو تھے ہی ان کے علاوہ محلّے کی نوجوان لڑکیوں کو چھیڑنا اور ان پر آوازے کسنا بھی اس کا اور اس کے دوستوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ محلّے کے شرفا شکایات کے باوجود ان سے اُلجھنا اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان لڑکوں کا تعلق جرائم پیشہ افراد سے بھی تھا بلکہ خود ان میں سے کئی لڑکے چھوٹے موٹے جرائم میں سزائیں بھی پا چکے تھے۔

دوسری لڑکیوں کے ساتھ رضیہ بھی دلاور کی بدنظری اور بدنیتی سے بچی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے بارہا رضیہ کا راستہ چلتے پیچھا کیا تھا۔ اس کو خط بھی لکھے تھے جنہیں رضیہ نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ رضیہ کچھ ضروری چیزیں خرید کر بازار سے گھر واپس آ رہی تھی کہ دلاور نے پہلے اس سے بات کرنے کی کوشش کی اور جب رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو دلاور نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، رضیہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے بڑی ہمت دکھائی اور وہیں پیر سے چپل اُتار کر دلاور کو مارنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس وقت دلاور اکیلا تھا۔ اس کا کوئی بدمعاش ساتھی اس کے ہمراہ نہیں تھا۔ سڑک پر کھلے عام اس کی تاج پوشی ہوتے دیکھ کر لوگ جمع ہو گئے اور جب انہیں حقیقت معلوم ہوئی تو وہ سب دلاور پر پل پڑے۔ اسے نہ صرف مارا پیٹا بلکہ پکڑ کر پولیس اسٹیشن بھی لے گئے۔

دلاور چند گھنٹوں سے زیادہ حوالات میں نہیں رہا۔ شام تک چھوٹ کر واپس آ گیا اور اس نے کھلے عام دھمکی دی کہ وہ رضیہ سے اپنی اس توہین کا انتقام لے کر رہے گا۔ ایک غریب بیوہ اور اس کی بیٹی اپنی حفاظت کا کیا بندوبست کر سکتی تھیں۔ صغرا خالہ پہلے ہی رضیہ کو دلاور سے اُلجھنے پر بُرا بھلا کہہ چکی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اسے چاہیے تھا کہ ہاتھ چھڑا کر چپ چاپ گھر آ جاتی۔ مگر اس نے دلاور کی مرمت کر کے اسے اپنا دشمن بنا لیا اور ہم جیسے مجبور و بے سہارا انسان غنڈا عناصر کی دشمنی برداشت نہیں کر سکتے۔ اگرچہ اس دھمکی کے بعد رضیہ نے تقریباً گھر سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا تھا مگر صغرا خالہ بیمار رہتی تھیں اور گھر میں ہزار ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ کئی دن تک صغرا خالہ بیٹی کے بجائے خود بازار جاتی رہیں لیکن جب دس پندرہ دن گزر گئے اور دلاور کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو ان کی احتیاط پسندی کچھ سست پڑ گئی۔ پھر اس دن تو ان کی طبیعت بھی خراب تھی۔ مجبوراً گوشت ترکاری خریدنے کے لیے رضیہ کو باہر نکلنا پڑا۔

دلاور جیسے تاک میں ہی بیٹھا تھا۔ رضیہ بازار میں گوشت کی دکان سے نکل رہی تھی کہ ایک ٹیکسی اس کے قریب آ کر رکی۔ دلاور اور اس کے دو ساتھی نیچے اُترے اور انہوں نے بڑی پھرتی سے رضیہ کو پکڑ کر ٹیکسی میں ڈالا، جب تک لوگ اس کے چیخنے چلّانے پر اس طرف متوجہ ہوتے ٹیکسی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

دلاور کی قید میں رضیہ پر کیا گزری، یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی لیکن واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے میں انہیں اسی ترتیب سے لکھ رہی ہوں جس طرح وہ پیش آئے تھے۔ ٹیکسی جب تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہی اور کوئی رضیہ کی چیخیں سن کر مدد کے لیے نہیں آیا تو اس نے بھی کشمکش ترک کر دی اور آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگی کہ اسے اپنا اور اپنی عزت کا دفاع کرنے کے لیے کیا طریقِ کار استعمال کرنا چاہیے۔ اس کی مزاحمت ختم ہوئی تو دلاور کے ساتھیوں نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور بہ ظاہر اطمینان کی سانس لی، شاید وہ خیال کر رہے تھے کہ رضیہ نے مقابلہ بے سود سمجھ کر خود کو قسمت کے سپرد کر دیا ہے۔

ٹیکسی تھوڑی ہی دیر میں ایک نسبتاً غیر آباد علاقے میں ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ دلاور نے جا کر دروازے کا قفل کھولا۔ رضیہ چپ چاپ ٹیکسی سے اُتر کر گھر میں چلی گئی۔ دلاور اسے ایک کمرے میں لے گیا۔

اتنی دیر میں رضیہ سوچ چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

''تم کسی بھی شریف لڑکی کے ساتھ سرِ راہ وہ حرکت کرو گے جو تم نے میرے ساتھ کی تھی تو تمہیں اس کا یہی جواب ملے گا۔'' اس نے کہا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' دلاور نے کہا۔

''بڑی عجیب محبت ہے تمہاری کہ راہ چلتے اپنے محبوب کو چھیڑ کر اور اس پر آوازے کس کر تسکین پاتے ہو؟''

''یہ مجھے مجبوراً اس وقت کرنا پڑا جب تم نے میرے خطوط کا جواب نہیں دیا۔''

''تم محلّے میں اپنی شہرت سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں کیسے یقین کر لیتی کہ تم مجھ سے محبت کرنے میں سنجیدہ ہو یا محض ایک خوبصورت کھلونے کی طرح مجھ سے کھیلنا چاہتے ہو۔''

اب ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے سوال و جواب میں دلاور نے وہی جواب دیا جو ایک نوجوان دے سکتا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ حقیقت میں اس کی نیت کیا ہے؟

''تب پھر میں کیا کروں کہ تمہیں میری محبت کا یقین آ جائے؟'' دلاور نے کہا۔

''تم نے مجھے راہ چلتے اغوا کر لیا۔ اب میں تمہارے بس میں ہوں، جو چاہو میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہو۔'' رضیہ بولی ''میری جو رسوائی ہونا تھی، ہو چکی لیکن اب بھی اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو مجھے اور اپنے آپ کو ایک عظیم گناہ اور بدنامی سے بچا سکتے ہو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں؟''

''نہیں، میں تمہاری محبت کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔'' رضیہ نے جواب دیا ''جیسا کہ میں نے کہا، میں تمہارے بس

میں ہوں اور تم میری بے بسی سے ہر قسم کا فائدہ اُٹھا سکتے ہو لیکن اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو زبردستی کرنے کے بجائے میرے ساتھ شادی کرلو۔''

''تم...... تم مجھ سے شادی کروگی؟'' دلاور کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔

''ضرور کروں گی کیونکہ اب سوال میری پسند ناپسند کا نہیں۔ گناہ سے بچنے نہ بچنے کا ہے۔ جب تقدیر کا لکھا سامنے نظر آرہا ہو تو آدمی یہی کرسکتا کہ وہ راستہ اختیار کرے جو نسبتاً کم نقصان دہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھی بلاوجہ تم پر کوئی زیادتی کرنا نہیں چاہتا۔'' دلاور نے خوش ہوتے ہوئے کہا ''میں ابھی قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرتا ہوں۔''

''نہیں دلاور، یہ کام ابھی دو تین دن تک نہیں ہوسکتا۔'' رضیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں جس حالت میں ہوں اس سے چھٹکارا پانے میں تین دن لگ جائیں گے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس حالت میں کیا ہوا نکاح بھی جائز نہیں ہوتا۔''

ہر چند یہ بات رضیہ نے ایک بلف کے طور پر ہی کہی تھی، اسے یقینی طور پر معلوم نہیں تھا کہ یہ سچ ہے یا غلط۔ لیکن اوّل تو وہ خود کو دلاور کی دست برد سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی، دوسرے تھوڑی مہلت بھی حاصل کرنا چاہتی تھی کہ خود فرار ہونے کی کوشش کرسکے یا اس کا مفاد اور سلامتی چاہنے والے اسے دلاور کی قید سے آزاد کرانے کی سعی کرسکیں۔ ویسے سچ یہ تھا کہ ایسی کوئی مجبوری رضیہ کو لاحق نہیں تھی۔ دلاور ابتدا میں اس کا مطلب نہیں سمجھا لیکن جب رضیہ نے دو تین مرتبہ معنی خیز لہجے میں اپنی بات دُہرائی تو وہ بھی سمجھ گیا۔

''اچھی بات ہے، تین دن کے بعد سہی۔'' وہ بولا ''تب تک تم اسی مکان میں رہوگی۔ میں تمہاری آسانی کے لیے ایک ملازمہ کا بندوبست بھی کردوں گا۔ جو دن رات تمہارے ساتھ رہے گی اور میرے ساتھی ہمہ وقت مکان کی نگرانی کرتے رہیں گے اس لیے اگر تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تم میری قید سے آزاد ہوجاؤ گی تو اسے ذہن سے نکال پھینکو۔ اگر تم نے کوئی ذرا سی حرکت بھی کی تو پھر انجام کی ذمے دار تم خود ہوگی۔ میں بلاوجہ تم پر کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا اس لیے تمہاری بات پر یقین کررہا ہوں لیکن مجھے شبہ بھی ہوا کہ تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے تو صرف میں ہی نہیں، میرے تمام دوست بھی تمہارا وہ حال کریں گے کہ تم زندہ رہنے کے بجائے مرجانا پسند کروگی۔''

''میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' رضیہ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی تھی ''تم بالکل مطمئن رہو۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے تمہیں شکایت کا موقع ملے۔''

لیکن یہ محض الفاظ تھے جو اس کی زبان سے ادا ہورہے تھے، دل ہی دل میں تو وہ یہی دعا کررہی تھی کہ پروردگار، اپنی رحمت سے ان تین دنوں میں کوئی ایسا معجزہ دکھادے کہ میں برباد ہونے سے بچ جاؤں۔

☆☆☆

دوسری جانب رضیہ کے اغوا نے پورے محلے میں عام طور پر اور دو تین گھروں میں خاص طور پر ایک ہلچل پیدا کردی تھی۔ صغرا خالہ کی حالت غیر تھی، انہیں مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ آفاق بھائی نے انہیں ایک بہترین پرائیویٹ اسپتال میں داخل کردیا اور خود رضیہ کو بازیاب کرانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ محلے میں کسی کو اس بات میں شک وشبہ نہیں تھا کہ یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے، آفاق نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی اور شبے میں دلاور اور اس کے ساتھیوں کے نام لکھوادیے۔ اتنا ہی نہیں، پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک انسپکٹر جمشید سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان سے مل کر ذاتی طور پر درخواست کی کہ وہ پولیس کی روایتی کارروائی کے ساتھ ساتھ خود اس کیس میں دلچسپی لیں کیونکہ گزرنے والے وقت کا ہر لمحہ رضیہ کی سلامتی کو مزید خطرے میں مبتلا کررہا ہے۔

اور سچ یہ ہے کہ اگر بات صرف محلے کے پولیس اسٹیشن اور اس کے ایس ایچ او تک رہتی تب یقیناً رضیہ کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رہتی لیکن انسپکٹر جمشید نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی پولیس سے دلاور اور اس کے ساتھیوں کا تمام ریکارڈ معلوم کیا اور پھر اس معلومات کے نتیجے میں اس کے جس جس اڈے کا پتا چلا، وہاں پر چھاپا مارا۔ ایک ایسے ہی چھاپے میں انسپکٹر جمشید کے ہاتھ دلاور کا ایک ایسا ساتھی لگ گیا جو رضیہ کے اغوا کے پلان سے واقف اور اس میں شریک تھا۔ پولیس کی ذرا سی تھرڈ ڈگری کے نتیجے میں اس نے سب کچھ اُگل دیا۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے مگر انسپکٹر جمشید نے وقت کی پروانہ کرتے ہوئے فوراً اس مکان پر چھاپا مارا جس میں رضیہ کو قید رکھا گیا تھا۔ دلاور اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ معمولی سے مقابلے کے بعد زخمی ہوکر بھاگنے کی کوشش میں گرفتار کرلیا گیا اور یوں رضیہ کم وبیش ساٹھ گھنٹوں کے بعد

دلاور کے قبضے سے بازیاب کرالی گئی۔

رضیہ نے واپس آکر جو بیان پولیس کو دیا اور جو حالات ہم لوگوں کو بتائے ان میں پوری تفصیل سے بتایا کہ اس نے کس طرح دلاور کے ہاتھوں اپنی عزت برباد ہونے سے بچائی۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ نامساعد حالات کے باوجود رضیہ پاک وصاف اس شیطان کے ہاتھوں سے بچ کر نکل آئی۔

☆☆☆

مگر جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ ایسے بھی افراد تھے جنہیں رضیہ کی پاک دامنی پر یقین نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ رضیہ دو دن سے زیادہ دلاور کے قبضے میں رہی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ دلاور نے اس تمام وقت میں اسے ہاتھ بھی نہ لگایا ہو مگر مجھے، آفاق اور صغرا خالہ کو رضیہ کے بیان پر اعتبار تھا۔

دلاور اور اس کے ساتھیوں پر مقدمہ چلا۔ پولیس کو وہ اور بھی کئی وارداتوں میں مطلوب تھا جن کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ گرفتاری کے بعد...... اس کے کئی ساتھیوں نے اس کے خلاف بیانات دے کر ان وارداتوں کا ثبوت بھی فراہم کردیا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام جرائم میں جن میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی شامل تھیں، دلاور کو سب ملا کر سات آٹھ سال کی سزا ہوگئی۔

☆☆☆

یہ واقعہ اور اس کے چرچے ذرا کم ہوئے تو صغرا خالہ کے کہنے پر آفاق بھائی نے طارق اور اس کے گھر والوں سے رابطہ قائم کیا کہ وہ کب تک طارق اور رضیہ کی شادی کے فرض سے فارغ ہونا چاہتے ہیں۔ اس تمام مدت میں طارق اور اس کے گھر والوں کا رویّہ بڑا اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ انہوں نے صغرا خالہ کے گھر آنا جانا تقریباً بند کردیا تھا۔ رہائی کے بعد رضیہ نے بہت چاہا کہ طارق اس سے ایک...... بار ملاقات کرلے تاکہ وہ اپنی زبانی اس کا اطمینان کراسکے۔ اسے کئی خط بھی لکھے۔ مگر طارق نے نہ کسی خط کا جواب دیا اور نہ ہی رضیہ سے ملاقات کی۔ آفاق نے اس سے رابطہ قائم کیا تب بھی پہلے اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''تم صاف طور پر کیوں نہیں بتاتے کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟'' آفاق نے اس کی اُلجھی اُلجھی باتوں سے تنگ آکر پوچھا۔

''میں اگر صاف صاف بات کروں گا تو شاید آپ سن نہیں سکیں گے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''تمہیں جو کچھ کہنا ہے بلا روک ٹوک کہہ ڈالو۔''

''تو سنیے، مکمل بات یہ ہے کہ مجھے رضیہ کی پاک دامنی پر یقین نہیں ہے۔'' طارق نے ... کہا ''کوئی لڑکی دلاور جیسے عیاش اور بدمعاش آدمی کے پاس دو دن تک رہنے کے بعد پاک صاف کیسے رہ سکتی ہے۔ رضیہ اب وہ لڑکی نہیں رہی جس سے میں نے محبت کی تھی۔ اس کے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا ہے اور دوسری بات یہ کہ دلاور ایک جرائم پیشہ آدمی ہے۔ مانا کہ وہ سات آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا ہے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ آزاد ہوکر پھر رضیہ سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مجھ جیسے شریف، امن پسند لوگ غنڈوں بدمعاشوں کی مخالفت مول لینا پسند نہیں کرتے۔ میں آئے دن کے خطرات میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔''

''مجھے تمہارے خیالات سن کر افسوس ہوا۔'' آفاق بھائی نے جواب دیا ''اس سے قطع نظر کہ رضیہ کا بیان سچ ہے یا نہیں، تم خود تضاد بیانی کا شکار ہورہے ہو۔ اگر دلاور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہے تب پھر گویا اس نے اپنا انتقام لے لیا۔ اب رضیہ کے پاس کیا ہے کہ وہ جیل سے چھوٹ کر پھر اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اسی طرح تمہارا دوسرا اندیشہ تو محض ایک اندیشہ ہی ہے۔ اس کے علاوہ سات آٹھ سال بعد کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں کوئی آج کیسے اندازہ لگا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی تو ضروری نہیں کہ تم سات آٹھ سال بعد بھی اسی شہر میں رہو۔ اگر تمہیں ایسا ہی خوف ہے تو کہیں اور بھی جاسکتے ہو۔''

''میں دوسری وجہ پر زیادہ زور نہیں دینا چاہتا۔'' طارق بولا ''اصل میں بات ایک ہی ہے کہ اپنی عزت کھوکر رضیہ میری نظروں سے گرچکی ہے۔''

''بالفرض تمہارا شک درست بھی ہو تو مجھے بتاؤ کہ کیا ان حالات کے وقوع پذیر ہونے میں رضیہ کا کوئی قصور تھا۔'' آفاق بھائی نے کچھ تیزی سے کہا ''کیا وہ خود دلاور کے ساتھ بھاگی تھی یا اسے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اغوا کیا گیا تھا۔ پھر مان بھی لیا جائے گا کہ تمہارے بقول تین چار غنڈوں اور بدمعاشوں کے درمیان ایک بے بس لڑکی اپنی عزت کی حفاظت نہ کرسکی تو کیا اس کے لیے اسے مورد الزام ٹھہرایا جائے گا۔''

''اس کی کوئی غلطی ہو یا نہ ہو مگر اس ٹھوس حقیقت سے کوئی کیسے نظریں چُرا سکتا ہے کہ رضیہ بے عزت ہوچکی ہے۔''

''میں ایک مفروضہ کی بات کررہا ہوں، تم اسے بار بار اس طرح میرے سامنے نہ دُہراؤ جیسے کہ وہ حقیقت ہو۔''

آفاق بھائی نے جواب دیا ”یہ تہمت میں برداشت نہیں کرسکتا۔“
”یہ تہمت نہیں ہے۔“
”تہمت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ تمہارے پاس ایک فرضی شک وشبے کے علاوہ کیا ٹھوس ثبوت ہے کہ تمہارا الزام درست ہے؟“
”خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے۔ ان حالات میں کیا ہوا ہوگا، عقل اس کا ایک ہی جواب دیتی ہے۔“
”خدا کی ذات کو درمیان میں مت لاؤ۔ اس کی شریعت تو ان حالات میں...... بالفرض کچھ ہو بھی جاتا، تب بھی رضیہ کو بے قصور ہی ٹھہراتی۔“
”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ بحث کیوں کررہے ہیں؟“
”اس لیے کہ تمہیں رضیہ سے محبت کا دعویٰ ہے۔“
”دعویٰ ہے نہیں بھی تھا۔“
”تو تمہاری محبت رضیہ کے جسم سے تھی؟“
”ایسا ہی سمجھ لیں۔“
”اچھا اگر میں رضیہ کا طبّی معائنہ کراکے یہ تصدیق پیش کردوں کہ وہ پاکباز ہے تب......؟“
”میں تب بھی یقین نہیں کروں گا، آج کل جھوٹے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔“
”مجھے افسوس ہے طارق کہ تم اتنے سطحی جذبات کے انسان ثابت ہوئے ہو۔“ آفاق بھائی نے اُٹھتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ تو گویا اب تم رضیہ سے شادی کرنا نہیں چاہتے؟“
”جی ہاں، میں ہی کیا میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کا جواب یہی ہوتا۔“
”یہ تم نہیں کہہ سکتے۔ رضیہ جیسی اچھی لڑکی کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔“
”یہ بھی دیکھ لیں گے۔“ طارق نے طنزیہ لہجے میں کہا ”دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوتا؟“
”وقت آنے پر تمہیں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔“ آفاق بھائی نے جواب دیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

فطری بات تھی کہ رضیہ اور صغرا خالہ کو طارق کے انکار سے بہت صدمہ پہنچا۔ رضیہ کو تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس نے جس طارق سے محبت کی تھی اس کے ایسے خیالات بھی ہوسکتے ہیں۔
”اس کا مطلب تو یہ ہوا ریحانہ!“ اس نے مجھ سے کہا ”کہ طارق کو کبھی بھی مجھ سے سچی محبت نہیں تھی۔ وہ صرف میرے خوبصورت جسم کو چاہتا تھا۔ اسے میرے کردار، میرے اخلاق، میرے دل، میری روح سے نہ کوئی واقفیت تھی نہ اُنسیت۔ اگر اسے مجھ پر ذرا بھی اعتماد ہوتا تو وہ سوچتا کہ اگر میں واقعی دلاور کے ہاتھوں لُٹ گئی ہوتی تو خود اس سے شادی کرنے سے انکار کردیتی۔ مجھے معلوم ہے کہ مرد اس معاملے میں کس قدر حساس ہوتا ہے۔ ہرچند اس میں میرا کوئی قصور نہ ہوتا لیکن پھر بھی میں خود کو اس پر مسلط نہ کرتی۔“
”خیر طارق نے تو اپنے ظرف کا مظاہرہ کردیا۔“ میں نے کہا ”اب یہ بتاؤ کہ خالہ تمہارا رشتہ کہیں اور کرنا چاہیں تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟“
”کیسی باتیں کررہی ہو ریحانہ!“ رضیہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا ”جب طارق جو مجھے اتنی اچھی طرح جانتا تھا اس انداز میں سوچ سکتا ہے تو کوئی دوسرا نوجوان میری بے گناہی پر کیسے یقین کرے گا؟“
”کرے گا یا نہیں۔ وہ ایک دوسرا معاملہ ہے، تم تو مجھے یہ بتاؤ کہ کیا اب بھی تمہارے دل میں طارق کے لیے کوئی جگہ باقی ہے؟“
”کوئی جگہ!“ رضیہ نے طنزیہ انداز میں دُہرایا ”میں تو اس لمحے کو کوس رہی ہوں جب میں نے اس جیسے کم ظرف نوجوان کو اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنایا تھا۔ اس کے لیے اب میرے دل میں پچھتاوے اور نفرت کے علاوہ کوئی جذبہ نہیں ہے۔“
”بس میں یہی جاننا چاہتی تھی۔“ میں نے کہا۔
”وہ کیوں؟“
”بس یونہی۔“
”نہیں، تم بات ٹال رہی ہو۔ سچ بتاؤ، تم نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟“
”اس لیے کہ اگر تمہارے لیے کوئی اور رشتہ آئے تو کیا وہ شخص یہ اطمینان کرسکتا ہے کہ تم اپنے پورے قلب وذہن کے ساتھ اسے قبول کرسکوگی؟“
”کیوں جھوٹے خواب دکھا رہی ہو۔ اب ایسا کوئی رشتہ نہیں آسکتا۔“
”آ تو سکتا ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔
”تمہارا اشارہ آفاق صاحب کی طرف تو نہیں ہے؟“

رضیہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
”اگر ہو تب......؟“
”میں خود کو آفاق صاحب کے قابل نہیں سمجھتی۔“ رضیہ نے کہا ”اور کیا وہ شریف انسان بس اسی لیے رہ گیا ہے کہ دوسروں کے لیے ایثار کرتا رہے۔ ایک چیز کی خواہش کرے۔ پھر کسی دوسرے کے حق میں اس سے دستبردار ہوجائے اور جب وہ دوسرا اس چیز کو ٹھکرادے تو پھر اسے اُٹھاکر اپنے سر پر سجالے۔“
”تم نے آفاق بھائی کو ابھی تک نہیں سمجھا۔ میں بھی ان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی مگر اب معلوم ہوا کہ وہ انتہائی عظیم انسان ہیں۔ ہرچند کہ میری ان سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایک بار پھر تمہارے لیے پیام دیں گے۔“
”تب میں انکار کردوں گی۔“
”وہ کیوں؟“ میں نے بڑی حیرت سے کہا ”تم نے ابھی بتایا کہ تمہارے دل میں اب طارق کے لیے نفرت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔“
”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں طارق سے نفرت کرتی ہوں۔“ رضیہ نے جواب دیا۔
”پھر آفاق بھائی سے شادی کرنے میں کیا اعتراض ہے؟“
”صرف یہ کہ اب وہ مجھے ہمدردی اور خداترسی کے جذبے کے ساتھ قبول کریں گے جو میں نہیں چاہتی۔“
”گویا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا کہ آفاق تم سے سچی محبت کرتے ہیں؟“
”محبت محض الفاظ کی لفاظی ہے۔“ رضیہ بولی ”یا زیادہ سے زیادہ صنفی جاذبیت کا ایک اظہار۔ اگر اس جذبے میں کچھ بھی خلوص ہوتا تو طارق مجھے یوں نہ ٹھکراتا۔ اب طارق کی ٹھکرائی رضیہ کو آفاق صاحب صرف اس لیے اپنانا چاہیں کہ وہ ایک نیک طینت شریف آدمی ہیں اور دوسروں کی ضرورت میں ان کے کام آتے رہنا ان کی عادت ہے، تو میری عزتِ نفس اسے گوارا نہیں کرے گی۔“
میں خاموش ہوگئی کیونکہ تب یہ بات محض میرا ایک اندازہ ہی تھی اور میں نے بھی سوچا کہ محض اندازوں پر اس طرح بات کرنا جیسے وہ حقیقت ہوں ایک طرح کی حماقت ہی ہے لیکن دوسرے ہی ہفتے میرا اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ آفاق بھائی نے ایک بار پھر صغرا خالہ سے رضیہ کا ہاتھ مانگنے کی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرہی دیا۔ خالہ کو تو خواب میں بھی یہ امید نہیں تھی کہ ان کی بیٹی کی بگڑی ہوئی قسمت یوں بن کیا، چمک اُٹھے گی۔ وہ بے اختیار خوشی کے آنسو بہانے لگیں اور آفاق بھائی کی ماں کو گلے سے لگا کر بولیں کہ بہن، اب میرا رضیہ پر کوئی حق نہیں رہا ہے۔ آفاق نے ہی ایک بدمعاش سے اس کی عزت بچاکر اسے دوسری زندگی دی تھی اب تم اور وہ ہی اس کے مالک ہیں جو چاہیں کریں، مجھے انکار کی مجال نہیں ہوسکتی۔“

☆☆☆

مگر رضیہ کو نہ صرف انکار کی مجال تھی بلکہ مجھ سے اس کے اظہار کی ہمت بھی تھی۔
”تم کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔“ میں زچ ہوکر بولی ”آخر تم چاہتی کیا ہو؟“
”میں جو کچھ سوچ رہی ہوں تمہارا ذہن وہاں تک رسائی نہیں کررہا ہے۔“ رضیہ نے جواب دیا ”اس لیے اب اس بحث کو چھوڑو۔ تم یہی چاہتی ہونا کہ میں آفاق صاحب سے شادی کرلوں؟“
”ہاں، دل ودماغ کی پوری سپردگی کے ساتھ۔“ میں نے کہا ”آفاق بھائی جیسے انسان کے ساتھ میں تمہیں منافقت نہیں کرنے دوں گی۔“
”تو پھر اس کی ایک ہی صورت ہے۔“ رضیہ نے کہا۔
”وہ کیا؟“
”میں شادی سے قبل ایک بار تمہاری موجودگی میں آفاق سے ملنا چاہتی ہوں۔“
”وہ کس لیے؟“
”مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے۔“
”اچھی بات ہے۔ میں کل ہی اس ملاقات کا انتظام کردوں گی۔“ میں نے جواب دیا۔
اور دوسرے دن شام کے وقت آفاق اور رضیہ میرے ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا اور وہ ان دونوں بلکہ ہم تینوں کو تنہائی کا موقع دینے کے لیے اپنا کوئی پروگرام بنا کر گھر سے چلے گئے تھے۔
”آفاق صاحب، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک بار پھر مجھ سے شادی کے خواستگار ہیں۔“ رضیہ نے بڑی بے تکلفی سے کہا جس سے مجھے کچھ حیرت بھی ہوئی۔
”ہاں، بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“ آفاق نے جواب دیا۔
”مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔“ رضیہ نے کہا

”کیونکہ اعتراض کی جو وجہ تھی اب مجھ پر اس کا کھوکھلا پن ظاہر ہو چکا ہے۔ صاف الفاظ میں اب میرے دل و دماغ میں اس شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس کا نام لینے پر مجبور نہیں کریں گے۔“

”میں آپ کے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔“ آفاق بھائی نے بڑی ہمدردی اور خلوص سے کہا۔

”لیکن میں بھی آپ کے جذبات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا چاہتی ہوں۔“

”ضرور سمجھیں۔ میں اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔“

”آپ میرے...... صرف ایک سوال کا جواب دے کر میری مدد کر سکتے ہیں۔“

”ضرور پوچھیے۔“

”اگر دلاور نے مجھے برباد کر دیا ہوتا تو کیا جب بھی آپ مجھ سے شادی کرنے کا حوصلہ کرتے؟“

”کیوں نہیں۔“ آفاق بھائی نے فوراً جواب دیا۔

”یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو میرے سابقہ بیان کی سچائی پر یقین ہے۔“ رضیہ نظریں جھکا کر کچھ اداسی سے بولی ”مگر آج میں آپ کو حقیقت بتانا چاہتی ہوں۔ وہ سب کچھ جو میں نے کہا جھوٹ تھا۔ دلاور اس کے بدمعاش ساتھیوں کے قبضے میں آ کر کون لڑکی اپنی عزت بچا سکتی تھی۔ میں نے بڑی مزاحمت کی، بہت چیخی چلائی مگر ان درندوں کے سامنے بے بس ہو گئی اور......اور......“

وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ میں نے چونک کر پہلے اسے غور سے دیکھا اور پھر آفاق بھائی کو جو ایک دم سے بڑے سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ چند لمحے کمرے میں خاموشی چھائی رہی، آخر رضیہ پھر بولی۔

”اب بتائیے، کیا ایسی صورت میں بھی آپ مجھے اپنانے کے لیے آمادہ ہیں؟“

”اگر آپ کو اس بارے میں ذرا سا بھی شک ہے تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہیں۔“ آفاق بھائی نے بڑے ٹھہرے ہوئے مضبوط لہجے میں جواب دیا ”آپ پر کوئی بھی حادثہ گزر چکا ہو، میں آپ کو اب بھی اتنا ہی معصوم اور پاکیزہ خیال کرتا ہوں جتنا کہ آپ ہمیشہ سے تھیں۔ اس لیے کہ جو کچھ ہوا اس میں آپ کی مرضی اور ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ آپ دلاور اور اس کی ہوس کو کیا خیال کرتی ہیں، اس کا مظاہرہ آپ نے سرِ بازار اس کی مرمت کر کے کر دیا تھا۔ پھر اگر اس نے جبر اور زبردستی سے آپ کے ساتھ کوئی بھی سلوک کیا ہو اس میں آپ کو گناہگار ٹھہرانے والا بھلا میں کون ہوتا ہوں؛ جب خدا اور اس کے رسولؐ کی نظروں میں بھی آپ بے گناہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ ان تمام باتوں کو فراموش کر دیں۔ اپنی جانب سے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ میری نظروں میں آپ کی عزت و احترام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے کیونکہ میں نے آپ کو صرف آپ کے ظاہری حسن و جمال کے لیے نہیں بلکہ آپ کی سیرت و کردار کی پاکیزگی کو دیکھ کر چاہا ہے۔“

اور پھر بڑی عجیب بات ہوئی۔ رضیہ چند لمحے تو کسی بت کی طرح ساکت و جامد بیٹھی رہی پھر اچانک بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”آپ بڑے سچے اور عظیم انسان ہیں۔“ ساتھ ساتھ وہ کہتی جا رہی تھی ”مجھے آپ کو اس کڑی آزمائش میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اور اب خدا جانے آپ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں مگر سچ یہ ہے کہ خدا نے شاید مجھے آپ ہی کے لیے تباہی سے بچا لیا تھا۔ طارق کے انکار سے مجھے جو جذباتی ٹھیس پہنچی تھی اس کے بعد مجھے خود اپنے آپ پر کوئی بھروسا نہیں رہ گیا تھا۔ مگر اب میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب شاید ہی کوئی اور لڑکی ہو۔ آپ نے نہ صرف میرے دل میں پھر سے زندہ رہنے کی تمنا پیدا کر دی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ اگر محبت واقعی کسی سچے جذبے کا نام ہے تو اس جذبے کے مالک انسان کو کیسا ہونا چاہیے۔ ہرچند میں آپ کے قابل تو نہیں ہوں پھر بھی کوشش کروں گی کہ اپنی ذات سے کبھی آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دوں۔ خدا کے لیے آپ میری اس پہلی اور آخری غلطی کو معاف کر دیجیے۔“

☆☆☆

اس کے ایک ماہ کے بعد آفاق بھائی اور رضیہ کی شادی ہو گئی۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ خاص طور سے طارق تو اس قدر شرمندہ ہوا کہ اپنے والدین کے ساتھ وہ محلّہ ہی چھوڑ گیا۔ آج اس واقعے کو برسہا برس گزر چکے ہیں اور میں آفاق بھائی اور رضیہ کی گھریلو اور ازدواجی زندگی کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ ایسی بے مثال جوڑی نہ اس سے پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ اس کے بعد آج تک میری نگاہوں سے گزری ہے۔ ان دونوں کا پیار، محبت، ایک دوسرے کو چاہنے کا جذبہ اپنی مثال آپ ہے۔

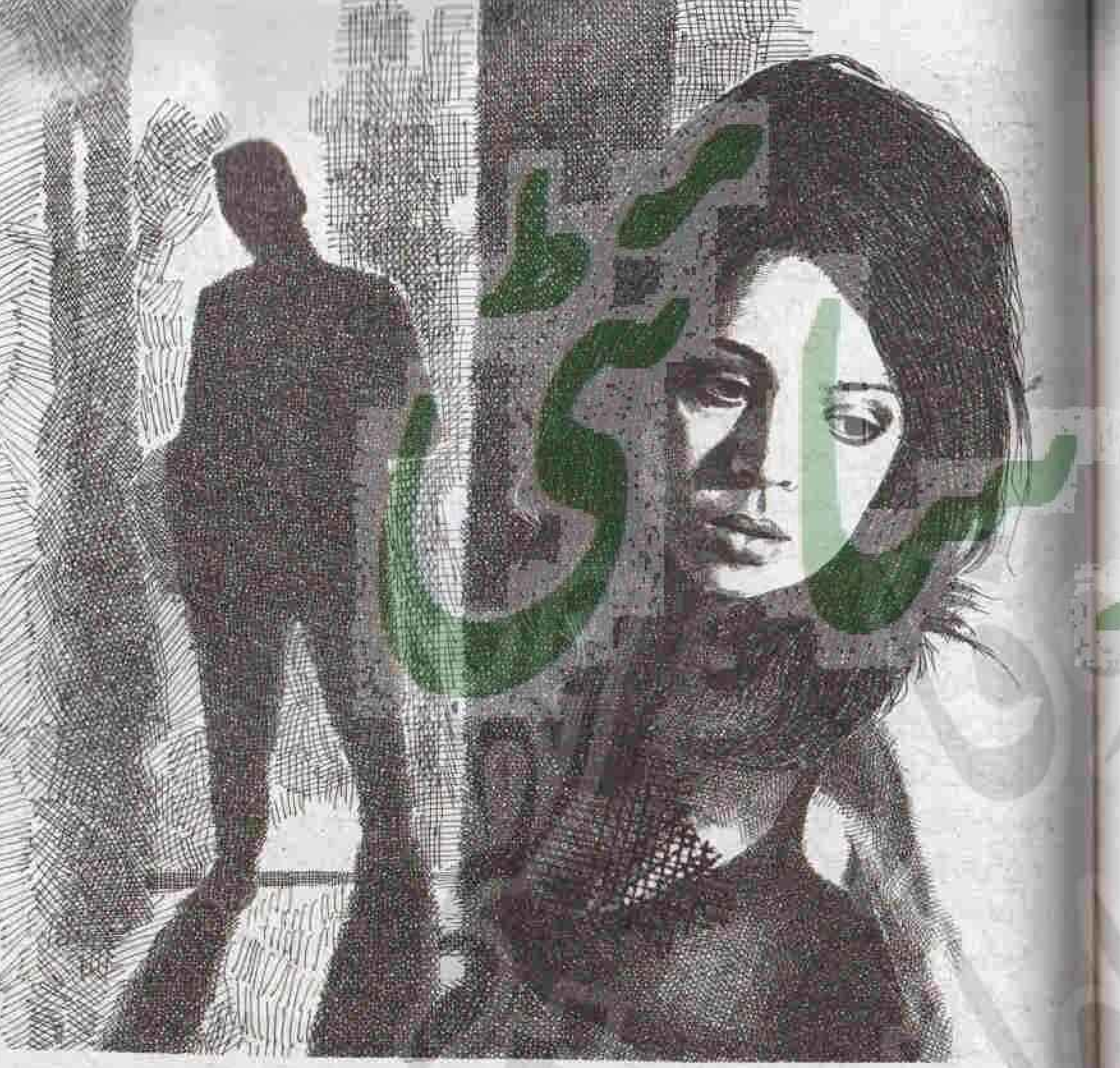

تعبیر

جناب معراج رسول صاحب!
السلام علیکم۔
عرصہ بعد ایک تحریر ارسال کر رہا ہوں۔ یہ میری نہیں کسی اور کی داستانِ حیات ہے جس کی میں نے ہوبہو لفظی تصویر کشی کی ہے۔ امید ہے میری یہ تحریر قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ ویسے یہ بتادوں کہ مجھے یہ داستان خود امجد نے سنائی ہے گوکہ وہ اب تک اس غم سے ابھر نہیں پایا ہے اور زیادہ وقت عبادت میں صرف کرتا ہے۔ کافی کرید کے بعد اس نے یہ داستان سنائی ہے۔
افسر حیات
(لاہور)

کہکشاں گھر کے کام کاج نمٹا کر کمر سیدھی کرنے باورچی خانے سے کمرے میں آئی۔ چٹائی پر لیٹ گئی۔ آج وہ بے حد تھک گئی تھی۔ اس کی خالہ نے بڑی نرمی سے کہا۔

”برابر میں گارمنٹ فیکٹری کھلی ہے۔ اب تم بھی ملازمت کر لو۔ کیوں اپنا وقت اور اپنی عمر برباد کر رہی ہو؟“

کہکشاں نے گردن گھما کر حیرت سے خالہ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر فکر کی بڑی گہری لکیر تھی جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے پوچھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''وہ کس لیے خالہ! یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے میری نوکری اور عمر کی فکر کیوں ہو رہی ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''اس لیے کہ دو برسوں میں اتنی رقم جمع ہو جائے کہ تمہارے جہیز میں کسی چیز کی کمی نہ پڑ جائے اور نہ کسر رہ جائے۔'' خالہ نے گہری سانس لی۔

''مگر خالہ......!'' کہکشاں جھجکتے ہوئے بولی تو اس کے چہرے پر حیا لہر بن کر دوڑ گئی۔ وہ سرخ ہو کے بولی ''امجد نے ایک دفعہ نہیں...... بلکہ کئی بار بہت صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اسے کسی چیز، جہیز اور لین دین کی کوئی ضرورت نہیں...... دو برس کے بعد جیسے ہی اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہو جائے گی......'' اس نے اپنی نظریں نیچی کر کے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''یہ بات تو امجد نے کہی ہے نا...... اس کی ماں نے تو نہیں کہی۔'' انہوں نے تیز لہجے میں تکرار کی۔

وہ دیوار کی طرف منہ کر کے بولی ''تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو۔ شادی امجد کو کرنا ہے، اس کی ماں کو نہیں۔''

خالہ نے اپنا ماتھا پکڑ لیا ''تو اٹھارہ برس کی ہو کر بھی بھولی کی بھولی ہی ہے۔ اری او احمق کی اماں، تجھے نباہ اس کے ساتھ بھی تو کرنا ہے۔ وہ صبح جائے گا تو شام کو لوٹے گا۔ سارا دن تیری ساس تیرے ساتھ رہے گی۔ جہیز میں کسی چیز کی کمی رہ گئی اور جہیز اچھا نہیں ہوا تو وہ تیرا جینا عذاب کر کے رکھ دے گی۔''

''امجد کی ماں تو ایسی نہیں ہے۔'' کہکشاں نے دفاع کیا۔ ''آپ اسے دو ایک برس سے نہیں بلکہ بیس برس سے جانتی ہیں، وہ آپ کی عزیز ترین سہیلی بھی تو ہے۔''

''عورت جب ساس بنتی ہے تو نہ صرف اس کے تیور بلکہ فطرت بھی بدل جاتی ہے۔'' وہ کہنے لگی ''کیا تم اندھی اور بہری ہو گئی ہو...... دنیا کو دیکھ نہیں رہی؟ سن نہیں رہی، شرفو کی ماں کیسی سیدھی عورت تھی، کم جہیز لانے پر اس نے اپنی بہو پر کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے۔ کیا اس نے غریب بہو کو جلا نہیں دیا؟ یاسمین نے کیا اپنی بہو کو زہر نہیں دے دیا تھا؟ کیا تنویر کی روز پٹائی نہیں ہوتی ہے؟ اس کی بھی تو پسند کی شادی تھی۔ اسے شوہر اور ساس کتنا مارتے ہیں؟ وہ ایک روز مجھ سے رو رو کر کہہ رہی تھی کہ اگر اس کا باپ آ کر اسے نہیں لے گیا تو وہ گھر سے بھاگ جائے گی یا سنکھیا کھا کر خودکشی کر لے گی۔''

کہکشاں تھوڑی دیر تک خاموشی سے سوچتی رہی پھر اس کے بعد ایک گہری سانس لے کر بولی ''تو سچ کہتی ہے خالہ، یہ دنیا غریب عورتوں کے لیے نہیں مردوں کے لیے بنی ہے۔ عورت پیر کی جوتی ہے۔ تو فکر نہ کر خالہ؟ میں نوکری کروں گی مگر گارمنٹ فیکٹری میں دھاگا کاٹنے کی نہیں۔ یہ جو میں کمپیوٹر سینٹر جا کر چھ ماہ سے جھک مار رہی ہوں، وہ کب کام آئے گا؟''

کہکشاں نے ایک اخبار میں ضرورت لیڈی کمپیوٹر آپریٹر کا اشتہار دیکھ کر درخواست بھیج دی تھی۔ خلاف توقع اسے انٹرویو کے لیے طلب کر لیا گیا۔

وہ انٹرویو دینے کے لیے اشتہاری کمپنی کے دفتر پہنچی تو خاصی نروس تھی۔ اس لیے بھی کہ یہ کمپنی ملک کی بڑی کمپنیوں میں سے ایک تھی۔ اس کمپنی میں صرف دو جگہیں خالی ہوئی تھیں۔ ایک اسکرپٹ رائٹر اور دوسری آپریٹر کی۔ اس نے آپریٹر کے لیے درخواست دی تھی۔ اس نے دفتر کے استقبالیہ میں قدم رکھا تو ششدر رہ گئی۔ صرف دو چار لڑکیاں انٹرویو دینے نہیں آئی تھیں بلکہ لڑکیوں اور عورتوں سے کمرا بھرا ہوا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے شہر کی تمام لڑکیاں سیلاب کی طرح امڈ آئی ہوں۔ وہ اس طرح سے بن سنور کر آئی تھیں جیسے مقابلۂ حسن ہو رہا ہو۔ ایک آسامی کے لیے اتنے سارے امیدوار دیکھ کر اس کا حوصلہ پست ہونے لگا۔ وہ رات بھر جو خواب دیکھتی رہی تھی، اسے اس کی تعبیر کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ اس کے کمپوز کرنے کی رفتار غیر معمولی تیز تھی اور املا کی غلطیاں بالکل بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ جن دنوں وہ کمپیوٹر سیکھنے کوچنگ سینٹر جا رہی تھی، امجد نے اسے ایک پُرانا کمپیوٹر لا کر دیا تھا۔ وہ روزانہ انگریزی کا کوئی رسالہ سامنے رکھ کر تین تین گھنٹے تک گھر پر مشق کرتی رہتی تھی۔ اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ وہ واپس چلی جائے۔

یہ اس کی زندگی کا پہلا انٹرویو تھا جو اسے ناکامی سے ہمکنار کرنے والا تھا۔ اس کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ اسے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ اسے امجد کی بات یاد آ گئی تھی جو اس نے بس اسٹاپ پر کہی تھی۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ پہلے انٹرویو میں کامیاب ہو جائے اور اسے ملازمت مل جائے اس لیے کہ بے روزگاری کے دور میں ایک چھوٹی سی نوکری کے لیے بھی آدمی کو بڑے دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ جوتے گھس جاتے ہیں۔ نوکری کا حصول دنیا کا سب سے مشکل ترین کام ہے۔ اس کے لیے عزم و حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حوصلہ برقرار رہے تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ امجد کی یہ باتیں یاد آتے ہی، وہ اس دلدل میں تنکے کے سہارے کھڑی اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا...... ملازمت نہ سہی، انٹرویو کا تجربہ ہی سہی۔

تھوڑی دیر بعد جب کہکشاں کی باری آئی تو اس کا دل اُچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ جب وہ انٹرویو دینے کے لیے کمرے کی طرف بڑھی تو اسے قدم اُٹھانا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ اسے اپنے سارے بدن پر ٹھنڈے پسینے چھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ انٹرویو دینے نہیں جا رہی ہو بلکہ تختہ دار کی طرف بڑھ رہی ہو۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو کمرا ائر کنڈیشنڈ تھا اور اس کی فرحت بخش خنکی اور فضا میں پھیلی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اور خواب ناک ماحول نے اسے اور مرعوب کر دیا تھا۔ وہ میز کے پاس جا کر کھڑی ہوئی تو دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔ انٹرویو منیجر واصف لے رہا تھا۔ وہ ایک کاغذ پر جھکا ہوا نوٹ لکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اُٹھا کر اپنا ہاتھ کاغذات لینے کے لیے کہکشاں کی طرف بڑھا دیا ''یس پلیز!''

پھر اس کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ اس نے چونک کر کہکشاں کو دیکھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے کاغذات لینا بھول گیا تھا۔ وہ اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے دنیا کا کوئی عجوبہ دیکھ رہا ہو پھر وہ اسے اوپر سے نیچے تک ناقدانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ کہکشاں کو اس کی نظریں اپنے سارے بدن پر نیزے کی اَنی کی طرح چبھتی ہوئی لگ رہی تھیں اور اسے منیجر کی نظروں سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

دوسرے لمحے واصف اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پاس آیا تو دہشت سے اس کا بدن لرزنے لگا۔ ان دونوں کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ دروازہ بھی بند تھا۔ امجد اور اس کی ماں نے کئی بار کہا تھا کہ وہ نوجوان بھی ہے اور بے حد حسین بھی...... اسے قدم قدم پر مردوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ یہ مرد ناگ سے بھی کہیں خطرناک ہوتے ہیں جو موقع پاتے ہی ڈس لیتے ہیں۔ اسے واصف ناگ سے بھی کہیں زہریلا اور خوفناک لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے ڈس سکتا ہے۔ وہ اس کے گرد کسی کتّے کی طرح گھوم کر دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے جسم میں لہو خشک ہوا جا رہا تھا اور وہ اپنے آپ میں اتنی سکت بھی نہیں پا رہی تھی کہ منیجر کو دھکا دے کر دروازے کی طرف بھاگ جائے۔ چیخنے چلّانے لگے۔ چند ساعتوں کے بعد اس کا خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ منیجر ناگ ثابت نہیں ہوا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی ناشائستہ حرکت کی بلکہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور اسے اس نے ان کرسیوں کی طرف اشارہ کیا جو ملاقاتیوں کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے شائستہ لہجے میں کہا ''پلیز! آپ تشریف رکھیے۔''

''جی......'' کہکشاں نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر بولی ''شکریہ!''

واصف نے انٹرکام کا ریسیور اُٹھا کر بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے پر بولا ''مس نوشین! جو لڑکیاں ...... انٹرویو کے لیے آئی ہوئی ہیں، ان سے معذرت کر لیں، میں نے ایک لڑکی کا انتخاب کر لیا ہے۔''

اس نے ریسیور رکھنے کے بعد کہکشاں کی طرف دیکھا جو دوپٹے کے پلو سے اپنے ماتھے کا پسینا پونچھ رہی تھی۔ کہکشاں کو منیجر کی بات سن کر اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اس کی نس نس میں سرشاری کی لہر بجلی کی رو کی طرح دوڑ گئی۔ دوسری طرف اس کے دل سے ابھی خوف دور نہیں ہوا تھا۔ وہ سہمی ہوئی سی سوچ رہی تھی کہ اس نوکری کے بدلے اسے منیجر کو خوش تو نہیں کرنا پڑے گا؟ اس نے سنا تھا کہ کچھ پانے کے لیے کھونا پہلی شرط ہے۔

عید مولود شافع المذنبینؐ

عیدالمسیح کے تیسویں دن اور یہودیوں کی عیدالفصح کے پچیسویں دن ولادت ہوئی۔ عیدالمسیح، اتوار 29 یا 31 مارچ 571ء مطابق 16 صفر عام الفیل کو تھی۔ یہود کی عیدالفصح، 8 1 یا 6 2 مارچ 4331 بروز جمعرات 13 صفر عام الفیل کو تھی۔ جدید ریاضی کے مطابق پیر نو ربیع الاول عام الفیل 22 اپریل 571 عیسوی مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تحقیق کے مطابق پیر 17 جون 569 عیسوی دیگر مورخین کے بہ قول کعبہ پر ابراہہ الاشرم کے حملے کے پچپن دن بعد ولادت ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہؓ اور حضرت آمنہؓ کی شادی کے دس ماہ بعد جبکہ دوسری روایت کے مطابق شادی کے ایک سال دس ماہ بعد ولادت ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ کی وفات آپ کی آمد کے چند ہفتوں بعد ہوئی مگر حضرت عبداللہؓ نے آپ کو نہیں دیکھا۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

واصف نے اس کے ہاتھ سے کاغذات لے کر اسے سرسری انداز سے دیکھا اور پھر اس کی درخواست پر ایک نوٹ لکھ کر اسے پیپر ویٹ کے نیچے دبا دیا پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی کرسی کے پاس آ کر شائستگی سے بولا ''آپ کو مبارک ہو! میں نے آپ کو اپائنٹ کرلیا ہے...... آپ میرے ساتھ آئیے۔''

پھر وہ کہکشاں کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آیا جو اس سے بھی بڑا، بے حد شاندار اور نہایت آراستہ وپیراستہ تھا۔ اس کا ماحول اس سے کہیں خواب ناک اور رنگین تھا۔ کمرے کی تمام دیواروں پر بہت بڑے بڑے رنگین اور خوبصورت پوسٹرز لگے تھے جو حسین اور نوجوان لڑکیوں، پُرکشش بدن کی عورتوں کے تھے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی پورے لباس میں تھی۔ سب مختصر لباس یا ساڑی بلاوز میں تھی مگر ان میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ یہ کہ بدن اور بے حجابی کی نمائش ہو رہی تھی۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس نے ان تصویروں کو دیکھا ہے۔ ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ...... ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود اسے یاد نہیں آیا کہ کہاں اور کب دیکھا ہے؟

جب منیجر نے اسے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا تو معًا اس کی نظر میز پر پڑی۔ میز کے کنارے بہت سارے انگریزی اور اردو رسالے بھی رکھے تھے۔ تب اسے اچانک یاد آیا کہ یہ تصویریں ماڈل عورتوں کی ہیں۔ اس نے مختلف قسم کے اشتہارات میں ان لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا ہے۔ یہ تصویریں اور پوسٹرز ان اشتہارات کے ہیں جو وقتاً فوقتاً اخبارات اور رسائل وجرائد میں چھپتے رہے ہیں۔

واصف نے انٹرکام پر دو گلاس میں اسکوائش کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور پھر اس نے کہکشاں کی طرف دیکھا جو کسی دلہن کی طرح سر جھکائے اور خاموش بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ وہ کچھ پریشان سی لگ رہی تھی۔ واصف نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے خاموشی کو توڑا۔

''مس کہکشاں! آپ کیا سوچ رہی ہیں؟''

کہکشاں اس کی آواز سن کر چونکی اور سنبھل کر اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی ''جی...... کچھ نہیں......''

''میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا ''کیا آپ اس معمولی تنخواہ کی ملازمت میں ایک اچھی زندگی گزار سکیں گی؟''

کہکشاں نے اپنی نظریں نیچی کرلی تھیں۔ نگاہیں اُٹھا کر کہا ''کیوں نہیں......؟ میرا خیال ہے کہ میں ہر ماہ پانچ چھ سو روپے پس انداز بھی کرلوں گی۔''

''پانچ چھ سو روپے!'' واصف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی ''آپ پانچ چھ سو کی بات کر رہی ہیں، اس مہنگائی کے دور میں تو چالیس پچاس روپے بھی بچانا مشکل ہے۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ مہنگائی روز بہ روز بڑھ رہی ہے؟''

کہکشاں اسے بڑی سادگی سے بتانے لگی۔ ''سر! بات یہ ہے کہ میں اور خالہ، ہم صرف دو ہی افراد ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ہماری گزر بسر ہو جاتی ہے۔ اب مجھے اپنی تنخواہ میں سے خالہ کو کچھ دینا نہیں پڑے گا۔ اس لیے میں اپنی ذات پر پانچ سات ہزار خرچ کرکے باقی رقم آسانی سے بچا سکتی ہوں۔''

''اگر میں آپ کو ایسی ملازمت کی پیشکش کروں جس سے آپ پندرہ سے بیس ہزار روپے حاصل کرسکیں؟'' اس نے کہا۔

''پندرہ ہزار......'' کہکشاں اچھل سی پڑی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''آپ کی آمدنی صرف پندرہ بیس ہزار روپے تک محدود نہیں رہے گی بلکہ پچیس تیس ہزار روپے بھی ہوسکتی ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔''

واصف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''آپ ..... کا مستقبل تابناک ہو جائے گا۔''

''وہ کیسے......؟'' کہکشاں کی حیرت اور خوشی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئی۔

''وہ ایسے کہ آپ ماڈلنگ کا پیشہ اختیار کرلیں۔'' واصف نے اسے مشورہ دیا۔ ''اس میں آپ کے لیے بڑا اسکوپ ہے۔ کمائی بھی خوب ہے۔''

کہکشاں کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حیرانی بھر گئی ''کون، میں...... میں ماڈل بن جاؤں؟''

''ہم آپ کو یہ جاب دینے کے بعد ہر ماہ دس ہزار روپے بہ طور تنخواہ دیں گے۔ اس ماڈلنگ کے لیے دیں گے جو اخبارات اور رسالوں کے لیے ہوگی۔'' واصف اسے تفصیل بتانے لگا ''اشتہاری فلموں میں کام کریں گی تو اس کا معاوضہ الگ ہوگا۔ ایک کمرشل کے پانچ سے دس ہزار روپے ...... جیسے جیسے آپ کے کمرشل کو شہرت اور قبولیت ملے گی، ویسے ویسے معاوضے میں اضافہ ہوتا جائے گا۔''

''لیکن میں اس لائن کی کہاں ہوں؟'' کہکشاں نے کہا

''یہ تو حسین لڑکیوں کے لیے موزوں ہے۔ میں ان کے معیار کی تو نہیں ہوں۔''

''اس کے لیے آپ جتنی مناسب اور موزوں ہیں شاید ہی کوئی دوسری لڑکی ہو۔'' وہ کہنے لگا ''آپ کے خوبصورت چہرے کے نقوش میں بڑا تیکھا پن ہے۔ میں نے بہت کم ماڈل گرلز کے چہروں کے نقوش میں ایسی دلکشی اور تیکھا پن دیکھا ہے اور پھر آپ کا سراپا بے حد پُرکشش ہے۔ آپ کے جسمانی نشیب وفراز میں بلا کی رعنائی اور دلفریبی ہے۔ آپ کی قامت نے آپ کے بدن کے حسن وشباب اور جاذبیت میں بڑا رنگ پیدا کردیا ہے۔ آپ اشتہاروں کی دنیا اور ماڈلنگ کے پیشے میں تہلکہ مچادیں گی، پھر ہر اشتہار میں صرف آپ ہی آپ نظر آئیں گی...... صابن کا ہو یا شیمپو کا...... ٹوتھ پیسٹ کا ہو یا ملبوسات کا...... اشتہاری فلموں میں آپ کی زبردست مانگ ہو جائے گی۔ لوگ آپ کے حسن وشباب اور آپ کی موہنی صورت دیکھ کر پاگل ہو جائیں گے۔ پورے ملک میں آپ کی شہرت ہوگی، دولت اور عزت میں بھی اضافہ ہوگا۔''

کہکشاں نے اس سے یہ دریافت کرنا چاہا کہ اسے بھی مختصر لباس میں بدن کی بے حجابانہ نمائش کرنی ہوگی؟ مگر فطری حیا مانع ہونے کی وجہ سے دل کی بات زبان پر نہ لاسکی۔ اس نے صابن کے ایک اشتہار کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، جس میں ماڈل نیم عریاں سی تھی۔

''کیا مجھے بھی اسی طرح کے لباس میں ماڈلنگ کرنی ہوگی؟''

واصف نے اس تصویر کی طرف لمحے بھر کے لیے دیکھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر جواب دیا ''ظاہر ہے...... اشتہارات وہی مقبول ہوتے ہیں جس میں گلیمر ہو، لوگ صرف چہرے کی دلکشی اور جاذبیت ہی نہیں بلکہ جسم کی خوبصورتی بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے اور پھر اس پیشے میں یہ اہم عنصر ہے۔''

واصف کا جواب سن کر اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ پھر اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ اس لباس میں واصف کے سامنے کھڑی ہو۔

''نہیں...... نہیں، میں اس طرح سے اپنے آپ کو پیش نہیں کرسکتی۔''

''کیوں......؟'' واصف کو تعجب ہوا ''آپ ایسا سنہرا موقع ہاتھ سے کیوں جانے دے رہی ہیں جو ہر کسی کو نہیں ملتا؟''

''میرے لیے یہ بات بڑی بے شرمی کی ہے کہ میرے جسم کی اس انداز سے نمائش ہو۔'' اس نے دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

''آپ پہلی لڑکی ہیں جس نے ایسی بات کہی۔'' واصف اسے بتانے لگا ''ماڈلنگ کے لیے روز ہی کتنی لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں چکر لگاتی ہیں۔ ان میں سے کسی کا چہرہ خوبصورت ہوتا ہے تو جسم بھدا یا فربہ ہوتا ہے کہ چہرے کے حسن کو غارت کردیتا ہے، کسی کے بدن کا تناسب پُرکشش ہوتا ہے تو ان کا چہرہ بے کشش ہوتا ہے۔ بہت کم لڑکیاں ایسی نکلتی ہیں جو فٹ ہوں۔ آپ ہر لحاظ سے موزوں ہیں۔''

''میں معافی چاہتی ہوں، مجھے یہ جاب پسند نہیں۔'' کہکشاں نے صاف گوئی سے کہا ''آپ مجھے آپریٹر کی جاب پر ہی رکھ لیں۔''

جبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ واصف کے ''یس'' کہنے پر دروازہ کھلا۔ چپراسی ایک خوبصورت ٹرے میں دو گلاس ٹھنڈا مشروب لے کر آیا تھا۔ وہ ان دونوں کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ واصف نے ایک گلاس اُٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ مشروب پینے لگی تو واصف نے کہا۔

''آج کی لڑکیاں اور عورتیں کہاں سے کہاں جا چکی ہیں، فلموں میں عورت کو کس حال میں پیش کیا جارہا ہے اور آپ......''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔'' کہکشاں نے درمیان میں تیزی سے کہا ''میں دقیانوسی خیالات کی لڑکی ہوں، اس جدید الیکٹرانک میڈیا کے دور میں بھی...... چونکہ میں ایک عورت ہوں اس لیے عریانی کی اس حد تک نہیں جاسکتی، آپ کچھ خیال نہ کریں۔''

''پندرہ سے بیس ہزار روپے بھی تو ایسے نہیں مل جاتے۔'' واصف اس کی طرف دیکھنے لگا ''جو پیسا خرچ کرتا ہے، پانی کی طرح بہاتا ہے وہ اس کا پورا پورا فائدہ بھی چاہتا ہے۔ اگر آپ فن کو عریانی کا نام دے رہی ہیں تو یہ غلط ہے، عریانی کہاں نہیں ہے؟ کیا عورت جو نت نئے فیشن کے لباس میں تقریبات میں سرِراہ اور بازاروں میں نظر آتی ہیں، وہ بے لباسی نہیں ہے؟''

''اب آپ مجھے اجازت دیں۔'' کہکشاں خالی گلاس رکھ کر جانے کے لیے اُٹھ گئی ''مجھے اپائنٹمنٹ لیٹر کب تک مل جائے گا؟''

''مس کہکشاں! آپ تشریف تو رکھیں۔ پلیز، اس قدر سنجیدہ نہ ہوں۔'' واصف نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے اسے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو اسے پُرخیال نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا یہ کسی ہرنی کی طرح بدک رہی ہے۔ متوحش ہو رہی ہے۔ اسے شکار کرنے کے لیے جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دفتر میں کام کرتی رہے گی، ماحول اور یہاں کی آب وہوا شکار کو آپ ہی آپ جال کی طرف کھینچ لائے گی۔ کیسی احمق اور بے وقوف لڑکی ہے۔ اسے تو دو سو برس پہلے پیدا ہونا تھا۔ آج کی گاؤں کی لڑکیاں بھی اس جیسی نہیں ہیں۔ وہ تو لباس کی قیود سے بھی آزاد ہو کر کام کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ کراچی میں تو ممنوعہ فلمیں بھی بننے کی افواہ ہے۔ پھر اس نے کہکشاں کو مخاطب کیا۔

''میں آپ کو ماڈلنگ کے پیشے کے لیے مجبور نہیں کر رہا ہوں، میں نے تو آپ کا حسن اور جسمانی کشش دیکھ کر ایک پیشکش کی تھی، ایک مخلص دوست کی حیثیت سے۔ میں آپ کا امتحان لیے بغیر آپ کو آپریٹر کی ملازمت دے رہا ہوں، اس کے باوجود ماڈلنگ کا دروازہ آپ کے لیے ہر وقت کھلا رہے گا۔ آپ جب، جس روز اور جس گھڑی شوبز کی دنیا میں آنا چاہیں، آسکتی ہیں۔''

وہ دفتر سے نکلی تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر رہی ہو۔ اس کے پر ہوتے تو وہ پرواز کرتے ہوئے سیدھے اپنے محلے پہنچ جاتی، اپنی خالہ کو بتاتی، امجد کو خوشخبری سناتی کہ اس سنگلاخ راستے پر قدم رکھتے ہی کامیابی نے اس کے قدم چوم لیے ہیں۔ پہلا قدم...... پہلا انٹرویو اور پہلی کامیابی جس نے اس کے زندگی میں خوش قسمتی کا در کھول دیا ہے۔ اسے خود یقین نہیں آیا تھا اور بار بار پرس سے اپائنٹ منٹ لیٹر نکال کر دیکھتی تو اس کی تسلی ہو جاتی۔

وہ خالہ کے ہاں جانے کے لیے بس میں سوار ہوئی تو بس میں مردوں سے زیادہ لڑکیاں اور عورتیں بھری تھیں، وہ سب کسی نہ کسی دفتر سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہی تھیں۔ اسے منیجر کی بات یاد آئی۔ اس نے ان لڑکیوں اور عورتوں کے چہرے، لباس اور سراپے دیکھے۔ منیجر نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس لباس میں جسمانی حصوں کی نمائش ہو رہی تھی۔ اسے ان پر ترس آنے لگا۔ آج عورتوں کو کامیابی حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے ہتھیاروں سے لیس ہو کر نکلنا پڑتا ہے۔

آج جمعے کا دن تھا۔ ہفتہ اور اتوار چھٹی کے دن تھے۔ اسے پیر کے روز سے دفتر جانا تھا۔ وہ یہ دو دن اپنی ماں کے پاس گزارنا چاہتی تھی۔ امجد سے ملنا اور سیر وتفریح بھی ضروری تھی۔ ایک گھنٹے کا یہ سفر اس کے لیے قیامت کا سفر بن گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا، اس کا محلہ دور ہوتا جا رہا ہو۔ دن ڈوب جائے گا، رات ہو جائے گی پھر بھی اس کا محلہ نہیں آئے گا۔

پانچ بجے وہ بس سے اُتر کے گھر کی طرف بڑھی تو اسے راستے میں عائشہ مل گئی۔ عائشہ نے اس کا خوب مذاق اُڑایا تھا کہ اسے کبھی نوکری نہیں مل سکتی۔ اس لیے کہ وہاں سفارش اور تجربے کو دیکھا جاتا ہے۔ جب اس نے اس کو خوش خبری سنائی اور اپائنٹ منٹ لیٹر دکھایا تو اس کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ اندر ہی اندر جل گئی تھی۔ وہ آگے بڑھی تو اسے امجد اسکوٹر پر آتا دکھائی دیا۔ امجد نے اسے اسکوٹر پر بٹھا کر اس کے گھر لے جانے کے بجائے اس پارک میں لے آیا جہاں وہ دونوں ملتے اور تجدید محبت کرتے تھے۔ اس تنہائی میں امجد نے اسے اتنی گرم جوشی اور محبت سے مبارک باد دی کہ اسے بہک جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اگر وہ امجد کو احساس نہ دلاتی تو وہ بے قابو ہو کر رہ جاتا۔

رات وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی تو اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیا وہ اس قدر حسین اور پُرکشش ہے کہ ماڈلنگ کے پیشے سے پندرہ سے بیس ہزار روپے تک کی آمدنی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے لیے اسے ایسا لباس بھی پہننا پڑے گا جس میں اس کا ظاہری حسن لوگوں کے دلوں کو برما دے گا۔ کیا یہ بے شرمی نہیں ہے؟ یہ بے حیائی کی قیمت نہیں ہے۔ پھر اس میں اور ایک بے غیرت عورت میں کیا فرق رہ جائے گا؟ پھر بالفرض محال وہ ماڈل بن جاتی ہے، اس کی ماں یہ بات پسند کرے گی؟ کیا امجد کو غصہ نہیں آئے گا؟ محلے کے لوگ کیا کہیں گے...... دوسری طرف وہ اس آمدنی سے اپنے پُرانے اور بوسیدہ مکان کو توڑ کر نیا اور خوبصورت مکان بنا سکتی ہے۔ جب اس کا بیاہ ہوگا اور وہ اتنا جہیز لے جائے گی کہ اس کی ساس ششدر رہ جائے گی۔

دفتر کا پہلا دن اس کے لیے بڑا خوش گوار تھا۔ منیجر واصف نے اس کا تعارف دفتر کے پورے اسٹاف سے کرایا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ اسٹاف میں مردوں سے زیادہ نوجوان لڑکیاں اور عورتیں ہیں۔ لنچ میں اس کے ساتھ والی میز کی لڑکی ماہا نے اس سے کہا تھا۔

''تم اتنی حسین اور غیر معمولی پُرکشش ہو کر آپریٹر کیوں بن گئیں؟ ماڈلنگ میں کیوں نہیں چلی جاتیں؟''

''ماڈلنگ......؟'' اس نے جواب دیا ''سنا ہے کہ ماڈلنگ میں جو بھی لڑکی جاتی ہے، اسے اپنا سب کچھ کھونا پڑتا ہے؟''

''پانے کے لیے کھونا پہلی شرط ہے۔'' وہ بولی ''اگر میرے پاس تمہارا جیسا چہرہ اور جسم ہوتا تو وہاں جاتی۔ یہاں جھک نہ مارتی......''

''اس میں عزت کہاں ہوتی ہے؟'' کہکشاں سنجیدہ ہو کر بولی ''عورت کے لیے عزت سے بڑی دولت کوئی نہیں ہے۔''

ماہا ہنسنے لگی ''عزت...... ! تم عزت کو روتی ہو، عورت کے پاس عزت کہاں رہتی ہے؟ جب وہ بیوی بنتی ہے تو شوہر کے ہاتھوں عزت تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس عزت کے بدلے میں تو بہت کچھ دیتا ہے، عزت بیچے بغیر کسی سے کسی کو کچھ نہیں ملتا، پھر کیوں نہ یہ عزت کسی کے بھی حوالے کر کے بہت کچھ پایا جائے تا کہ زندگی خواب ناک گزر سکے۔''

ماہا کی عجیب وغریب فلسفیانہ باتیں سن کر اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی اور اسے ایک اَن جانا سا خوف آنے لگا۔ اس نے ایسی باتیں آج تک کسی عورت سے نہیں سنی تھیں۔ شائستہ سے بھی نہیں جو اس کے محلے کی تھی اور اس کی شوخ وشنگ سہیلی تھی اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑی منہ پھٹ تھی، اس نے بھی کبھی ایسی بے شرمی کی باتیں نہیں کی تھیں۔

پندرہ بیس دنوں میں اسے عملی زندگی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ کوئی بات پردے میں نہ رہی اور نہ ہی پوشیدہ...... یہاں کے ماحول، فضا، لڑکیوں عورتوں کی بے لگام زندگی...... آزادی، ان کی باتوں اور بحث وتکرار انکشافات نے اسے ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے وہ سب کچھ معلوم ہو رہا تھا جو اپنے محلے میں وہ سو برس میں بھی جان نہیں سکتی تھی۔ یہاں ماڈلنگ کے لیے، رسالے اور اخبارات کے لیے اشتہارات لینے جو لڑکیاں اور عورتیں آتی تھیں، وہ دور بہت دور جانے کے لیے بھی تیار رہتی تھیں۔ ان کے نزدیک عورت و آبرو کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

اسے ماہا یا مسز کوکب بتاتی تھیں ''وہ لڑکی جو سفید براق ساڑی کے لباس اور گہرے سیاہ رنگ کے سلیولیس بلاؤز میں اس روز آئی تھی نا...... وہ ماڈل بننے کے لیے آئی تھی۔ اسے منیجر واصف کی ایک شرط پوری کرنی پڑی تھی۔ اس نے دو راتیں واصف کے ساتھ ایک ہوٹل میں کالی کی تھیں۔ تب کہیں جا کر اسے ایک صابن کا کمرشل ملا تھا اور پھر دوسری کمپنی کے ٹالکم پاؤڈر کے کمرشل کے لیے کمپنی کے منیجر کو خوش کرنا پڑا تھا۔ مسز بیلا جو دو بچوں کی ماں ہے، جو مختلف رسالوں کے لیے اشتہارات لینے آتی ہے اور فری لانس ہے، اسے میڈیا منیجر عارف کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ سیر وتفریح کے بہانے مری جاتی رہتی ہے۔ اس لیے عارف اسے سب سے زیادہ اشتہارات دیتا ہے۔ اس کا پُرشباب وگداز بدن مردوں کو بہت لبھاتا اور تڑپاتا ہے۔ اسے اپنے شوہر کی کوئی پروا نہیں۔ اس کا شوہر بڑا بے غیرت ہے۔ گھر پر رہتا ہے۔ کھانا پکاتا ہے اور بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجتا ہے۔ بیوی کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ وہ شوہر سے تو یہ کہتی ہے کہ وہ پکنک منانے اپنی سہیلیوں کے ساتھ جا رہی ہے۔ منیجر کے ساتھ دن اور رات گزار کے واپس گھر آجاتی ہے۔ عارف کے ساتھ جانے سے اسے نہ صرف اشتہارات ملتے ہیں بلکہ بل بھی پاس ہوتے ہیں۔ صرف عارف ہی نہیں بلکہ اور بھی اشتہاری کمپنیوں میں ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ اسے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات اس کا شوہر بھی جانتا اور سمجھتا ہے۔ پھر بھی انجان اور اندھا بنا رہتا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکی پھر بولی ''جو لڑکی عارف جیسے لوگوں کو خوش نہیں کرتی اسے روز چکر لگانا اور مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ اب تو شوبزنس کی لڑکیوں اور بازاری عورتوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔''

کہکشاں نے دنیا کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی نیو کراچی میں دنیا اتنی قریب نظر آتی تھی۔ ایک مہینے میں اس نے جو تجزیہ کیا تھا، وہ یہ تھا کہ یہ دنیا خود غرض، فریب اور ریاکاری کی ہے۔ قدم قدم پر منافقت ہے۔ وہ یہ دیکھ اور محسوس کر رہی تھی کہ عورت کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ وہ روز بہ روز سستی ہوتی جا رہی ہے۔ جس کا گھر اور معاشرے میں ایک مقام ہے، وہ پستیوں میں گرتی جا رہی ہے۔ یہاں شوہر بیویوں کو دھوکا دیتے ہیں اور بیویاں اپنے شوہروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہیں۔ اسے یہ سارے گھناؤنے کھیل دیکھ کر اور باتیں سن کر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے نزدیک یہ دکھ اور حیرت کی بات نہیں رہی تھی۔

واصف نے نہ اسے کبھی بُری نظروں سے دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی سیر وتفریح اور ہوٹل میں چل کر چائے پینے کے لیے

کہا تھا۔ البتہ اسے ماڈل بنانے کی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ وہ اسے کئی مرتبہ کمپنی کے اسٹوڈیو ضرور لے گیا تھا جو اس عمارت میں سب سے اوپر والی منزل پر بنا ہوا تھا۔ وہ اسے یہ دکھانے کے لیے لے جاتا تھا کہ ماڈل لڑکیاں کس قدر فری ہو کر کیمرے کے سامنے آتی ہیں۔ ان میں زاویے بناتے ہوئے شرم اور جھجک نام کو نہیں ہوتی۔ اصل بات تو زاویے کی ہے۔ اس کی قدر و قیمت بھی ہوتی ہے۔ کیمرا جسم کے حسن اور زاویوں کو اس خوبصورتی سے نمایاں کرتا تھا کہ وہ اش اش کر اُٹھتی تھی۔ دوسری طرف جب وہ ان ماڈل لڑکیوں اور عورتوں کو ہر قسم کے لباس میں، کئی مردوں کے سامنے بے باکی اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر پوز دیتے ہوئے دیکھتی تو وہ شرم سے دُہری ہو جاتی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اسے کیمرے کے سامنے نیم عریاں کر دیا گیا ہو۔

وہ اب تک اپنے آپ کو اس کام کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ کر سکی تھی۔ وہ ماڈل لڑکیوں کے چیک بھی ٹائپ کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کون کتنی رقم لے جاتی ہے۔ ادھر واصف کی آفر اپنی جگہ موجود تھی۔ پندرہ بیس ہزار کا لالچ بھی اسے اُکسا نہ سکا تھا۔ وہ جو تھی، وہی رہنا چاہتی تھی۔ اس کے دل کے کسی کونے میں اس راستے پر چلنے کی ذرا سی خواہش نہ تھی۔ اس کے نزدیک ایک عورت کی بہت زیادہ قیمت تھی۔

ایک روز وہ دفتر کی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ لنچ کر رہی تھی کہ ماہا نے یہ کہہ کر سنسنی پھیلا دی۔

’’دبئی سے وارشہ آگئی ہے۔‘‘

’’واقعی……؟‘‘ آصفہ کا چہرہ کھل گیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ’’تمہیں کس نے بتایا؟‘‘

’’وہ مجھے کل شام ملی تھی۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’کہاں……؟‘‘ آصفہ نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

’’طارق روڈ پر ملی تھی۔‘‘ ماہا بتانے لگی ’’وہ وحید شاہ کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک ساڑی اور بلاؤز بھی گفٹ کیا۔‘‘

’’وحید شاہ!‘‘ مسز کوکب کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا ’’مگر اس نے تو دبئی میں کسی عرب سے شادی کر لی تھی۔‘‘

’’مجھے اس نے بتایا کہ وہ اس سے طلاق لے کر پھر کراچی آگئی ہے۔‘‘ ماہا بولی ’’اسے یہاں آئے ہوئے دو تین دن ہوئے ہیں۔ وہ مصروف ہے۔ دو ایک دن میں دفتر آ کر سب سے ملے گی۔ وہ سب کو بہت یاد کر رہی تھی اور پوچھ بھی رہی تھی۔‘‘

’’وحید شاہ اس کے ہاتھ کیسے لگ گیا؟‘‘ آصفہ نے پوچھا ’’اس وقت تو وہ بڑے رئیسوں میں سے ایک ہے۔‘‘

’’وحید شاہ سے اس کی ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔‘‘ ماہا نے جواب دیا ’’اگر وحید شاہ اس پر ریجھ گیا ہے تو اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے، اس کے پاس حسن و شباب، تو جوانی اور جسمانی کشش کی بے پناہ دولت ہے۔‘‘

’’یہ…… وارشہ کون ہے؟‘‘ کہکشاں نے ان کی گفتگو سن کر درمیان میں شدید حیرت سے دریافت کیا۔

’’تم وارشہ سے واقف نہیں ہو۔‘‘ مسز کوکب نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا ’’یہ مشہور ماڈل گرل ہے۔ اس نے پانچ برس قبل اسی کمپنی سے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ماڈلنگ کے میدان میں قدم رکھتے ہی دھوم مچا دی تھی اس لیے کہ وہ جسمانی کشش کی نمائش میں نہ کبھی جھجکی اور نہ ہی اسے شرم آئی تھی۔ کون سا ایسا کمرشل ہے جس میں وہ نہ آئی ہو۔ واصف کے کمرے میں اس کی بھی بڑی بڑی تین چار تصویریں لگی ہوئی ہیں۔‘‘

’’پھر وہ یہاں سے چلی کیوں گئی؟‘‘ کہکشاں نے حیرت سے سوال کیا۔

’’اس لیے کہ کراچی میں وہ اسکوپ نہ تھا۔‘‘ مسز کوکب اسے بتانے لگی ’’اس نے بمبئی جا کر ماڈلنگ شروع کی تو ایک اسمگلر اس پر ریشہ خطمی ہو گیا۔ وہ دو برس تک اس کی محبوبہ رہی، اس نے دو مرتبہ وارشہ کو ساری دنیا کی سیر کرائی۔ وہ تہران میں منشیات اسمگل کرتا ہوا پکڑا گیا تو اسے پولیس نے گولی ماردی۔ ایک برس پہلے میں دبئی گئی تھی۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اسمگلر کی موت کے بعد اس نے ایک شیخ سے شادی کر لی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا کہ اس کا بینک بیلنس کروڑوں کا ہے۔ میں نے اس کے زیورات دیکھے تو ششدر رہ گئی۔ اس کے پاس اتنے زیورات تھے کہ ایک دکان کھولی جا سکتی ہے۔‘‘

دوسرے دن وارشہ دفتر آئی تو سارے دفتر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پہلے وہ کمپنی کے اعلیٰ عہدے داروں سے ملی پھر اسٹاف سے ملنے آئی۔ کہکشاں کو بھی اسے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ کہکشاں نے اسے دیکھا۔ وہ نہایت حسین اور پُرشباب تھی، اس میں بلا کی کشش تھی۔ اس کا سراپا بڑا فتنہ خیز تھا۔ وارشہ کو ماہا اس کی میز پر لے آئی۔ وارشہ اسے دیکھ کر چونک پڑی۔ اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔

’’سویٹ بے بی! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟‘‘ وارشہ اس کا چہرہ اور سراپا گھورنے لگی۔

’’میں یہاں کمپیوٹر آپریٹر ہوں۔‘‘ کہکشاں نے جواب دیا ’’آپ کتنی سویٹ ہیں؟‘‘ اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

’’وہاٹ نان سنس!‘‘ وارشہ اپنائیت کے لہجے میں بولی ’’حیرت کی بات ہے کہ اتنی حسین اور پُرکشش ہو کر اتنی معمولی جاب کر رہی ہو؟‘‘

’’واصف نے اسے کئی مرتبہ ماڈلنگ کی آفر کی…… لیکن اس نے ہمیشہ اس آفر کو ٹھکرا دیا۔‘‘ ماہا نے کہا۔

’’دیکھنے میں کسی ایسے گاؤں کی لڑکی لگتی ہے جو شہر سے ہزاروں میل دور ہو۔‘‘ وارشہ مسکرائی۔

’’یہ بات تو ہے…… یہ نیو کراچی کی ہے۔‘‘ ماہا بھی مسکرا دی۔

’’ایسی لڑکیاں نہ صرف بڑی دقیانوسی ہوتی ہیں بلکہ ایک خول کے اندر بند ہوتی ہیں۔‘‘ وارشہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی ’’پھر یہ خول رفتہ رفتہ ٹوٹ جاتا ہے…… آج کل تو پنڈ کی لڑکیاں بھی اتنی بیک ورڈ نہیں ہوتیں۔‘‘

وارشہ اس دن سے روز ہی دفتر آنے لگی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے گپ شپ کرنے اور چائے پینے آتی تھی۔ ماہا، مسز کوکب اور دو ایک عورتوں کو اس طرح چاہتی تھی جیسے اس کے خاندان کی فرد ہو۔ مگر وہ کہکشاں سے ملے بغیر نہیں جاتی تھی۔ وہ اسے بہت پسند کرنے اور چاہنے لگی تھی۔ کہکشاں بھی اس کے اخلاق اور محبت سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔

ایک روز وہ شام کو دفتر کی چھٹی ہونے پر خالہ کی لڑکی سے ملنے اس کے سسرال جا رہی تھی کہ وارشہ نے اس کے پاس گاڑی روک لی۔

’’سویٹ بے بی! کہاں جا رہی ہو؟‘‘ وارشہ اسے سویٹ بے بی کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی۔

’’بس اسٹاپ۔‘‘ اس نے جواب دیا ’’اپنی کزن سے ملنے کورنگی جا رہی ہوں۔‘‘

وارشہ نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا ’’آؤ بیٹھو…… میں اُدھر ہی جا رہی ہوں۔ تمہیں ڈراپ کیے دیتی ہوں۔‘‘

وارشہ کی گاڑی نئی، خوبصورت اور شاندار تھی۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا جو وہ گاڑی میں بیٹھی تھی، اسے ٹیکسی تک میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کے اندر بیٹھ کر اسے بڑی فرحت، آسودگی اور سکون سا محسوس ہوا تھا۔ سارے دن کی تکان اُتر گئی تھی۔

وارشہ اس کے نجی حالات پوچھنے لگی۔ باتوں باتوں میں اسے کچھ خبر نہ ہو سکی تھی کہ گاڑی ڈی ایچ اے سے گزر رہی ہے۔ وہ کبھی اس علاقے میں نہیں آئی تھی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا ’’یہ کون سی جگہ ہے؟‘‘

’’ڈی ایچ اے۔‘‘ وارشہ نے ایک چار منزلہ عمارت کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے جواب دیا ’’اس عمارت میں میرا فلیٹ ہے۔ یہاں چائے پی کر چلتے ہیں۔ میں تمہیں یہاں اس لیے لائی ہوں کہ تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔‘‘

وارشہ کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ وہ اسے لفٹ سے لے کر اوپر پہنچی۔ کہکشاں نے اس کے فلیٹ میں قدم رکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی شاہی محل میں آگئی ہو۔ اس نے فلموں میں ہی ایسے گھر دیکھے تھے۔ گھر کی فضا اور ماحول نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک سحر زدہ کھڑی اس آراستہ و پیراستہ فلیٹ کے راحت و آسائش کے لوازمات کو دیکھتی رہی تھی۔

وارشہ نے اپنی بوڑھی ملازمہ سے ناشتے اور چائے کے لیے کہا اور اسے اپنے بیڈ روم میں لے آئی۔ بیڈ روم میں پہنچ کر وہ اور ششدر سی رہ گئی۔ اس کے طلسم نے اسے مبہوت سا کر دیا تھا۔ وہ خواب ناک نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھتی رہی تھی۔

وارشہ الماری کے پاس گئی اور اس میں سے ایک جوڑا نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما کر ملحق واش روم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ’’نہا کر اور یہ لباس پہن کر آؤ، سویٹ بے بی!‘‘

’’مگر……؟‘‘ کہکشاں لباس دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔ اسے تذبذب ہو رہا تھا۔

’’صرف تھوڑی دیر کے لیے…… میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تم کیا ہو؟‘‘ وارشہ بولی۔

غسل خانے نے بھی اسے بڑا مرعوب اور متاثر کیا تھا۔ ایک طرف باتھ ٹب تھا اور قریب ہی شاور بھی…… شاور کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے بڑی آزادی اور فراخ دلی سے غسل کیا۔ اس کے علاقے میں پانی کی تکلیف ہمیشہ رہتی تھی جبکہ یہاں فراوانی تھی۔ ایسی لذت اس نے نہانے میں کبھی محسوس نہیں کی۔ ایک تو غسل خانہ بہت ہی بڑا تھا اور دوسرا خوشبودار صابن تھا…… سامنے والی دیوار میں قد آدم آئینہ، جس میں وہ اپنے آپ کو نہانے کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔

وارشہ نے اسے جو سلیولیس بلاؤز اور ساڑی دی تھی، وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گہرے کالے رنگ کی تھی۔ جب وہ ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس باہر آئی تو وارثہ نے اسے اسٹول پر بٹھا کر اس کا بڑی نفاست سے میک اپ کیا اور اسے اپنے زیورات پہنائے، پھر اسے سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

”اب دیکھو...... تم کیا چیز ہو۔“ وارثہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ گئی۔

کہکشاں نے اپنے آپ کو آئینے میں جو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا، اس کی نظریں دھوکا کھا رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نہیں بلکہ کسی اور کو دیکھ رہی ہے۔ اس لباس اور میک اپ نے نہ صرف اس کی شخصیت بلکہ رنگ روپ کو بھی بدل دیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک بہت ہی حسین اور پُرشباب لڑکی کھڑی تھی جس کی جوانی بڑی قیامت خیز تھی۔ وہ غیر معمولی طور پر پُرکشش تھی۔ اب تو سرتا پا توبہ شکن بن گئی تھی۔ وہ ہر زاویے سے اپنے آپ کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وارثہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

”سویٹ بے بی! اب تمہیں اندازہ ہو رہا ہے نا کہ تم کتنی حسین و پُرکشش ہو؟“

کہکشاں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے لجا کر اپنا سر جھکا لیا۔ وارثہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے، وہ دل میں اپنے آپ سے بولی۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں اس قدر حسین ہوں۔ اس تصور سے ہی اس کے سارے بدن پر میٹھی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ واصف کیوں اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اسے ہر صورت میں ماڈل بنانے پر تلا ہوا ہے۔

ناشتے کی میز پر چائے پیتے ہوئے وارثہ نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں اور پوچھا۔

”کیا تم امجد سے شادی کرو گی جو 5 ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے اور تم جہیز کے لیے نوکری کر رہی ہو، کیا یہ بے وقوفی نہیں ہے؟“

”کیسی بے وقوفی!“ کہکشاں نے اپنی لانبی لانبی پلکیں جھپکائیں ”میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“

”تم دو برس تک نوکری کر کے، جھک مار کے اور اپنا پیٹ کاٹ کر جہیز کے لیے رقم جمع کرو گی اور پھر اس کا گھر بھی بساؤ گی۔“ اس نے چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے کہا ”وہ دونوں ہاتھوں سے تمہیں لوٹ رہا ہے۔ ایک نوجوان اور حسین لڑکی کے مال و دولت کا مالک بھی بنے گا اور اس خوبصورت اور نازک، شادابی سے بھرے بدن کو ایک کھلونا بنا کر کھیلتا رہے گا۔ بیوی کو اپنی ملکیت سمجھے گا۔ کیا ایک عورت کے لیے یہ احمقانہ بات نہیں ہے جو اس کی باندی بن کر ساری زندگی اس کی خدمت کرے گی اور اس کے لیے بچے پیدا کرنے کی مشین بن جائے گی۔“

”یہ نئی بات تو نہیں ہے۔“ کہکشاں نے تکرار کے انداز میں کہا ”ایسا صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ عورت کو اللہ نے مرد کی خدمت کرنے کے لیے بنایا ہے۔“

”آخر تمہیں کیا ضرورت ہے امجد سے شادی کرنے کی؟“ وارثہ سنجیدہ ہو گئی ”شادی نہ کر کے بھی زندگی گزاری تو جا سکتی ہے؟“

”شادی ضرورت ہے ایک مرد اور عورت کے لیے......“ کہکشاں نے جواب دیا ”اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی تو کرتے ہیں؟“

وارثہ ہنسنے لگی ”محبت، سب سے بھیانک انجام محبت کی شادی کا ہوتا ہے۔ شادی کے بعد یہ ملمع سب سے پہلے اُترتا ہے۔ محبت کی شادی انہیں زیب دیتی اور راس آتی ہے جو دولت مند ہوتے ہیں۔ کیا ایک کلرک کی تنخواہ میں محبت کی گاڑی چل سکے گی؟“

”میں بھی تو ملازمت کروں گی۔ ہم دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو کھینچیں گے تا کہ زندگی سکھ سے..... ہنسی خوشی..... بسر ہو۔“

”ملازمت تو تم جب کرو گی نا جب تمہیں بچے پیدا کرنے سے فرصت ملے گی۔“ وارثہ بولی ”شادی کے بعد سارے ارمان اور خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ پھر زندگی کتنی کٹھن ہو جاتی ہے کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ ساری جذباتی باتیں ہیں جو پوری نہیں ہو پاتی ہیں۔“

کہکشاں کے چہرے پر حیا سرخی بن کر پھیل گئی، وہ لجا کر بولی ”آخر پاکستان میں سیکڑوں نہیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ ہیں۔ وہ بھی تو کسی نہ کسی طرح ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں دکھ ہی دکھ تو نہیں ہوتے۔“

”تم آسودہ حال لوگوں کی باتیں کر رہی ہو جو کروڑوں کی آبادی میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔“ وارثہ کہنے لگی ”میں اس طبقے کی بات کر رہی ہوں جو متوسط کہلاتا ہے۔ تم نے ان کے انجام دیکھے ہیں۔ میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں

کہ تم امجد سے شادی کر کے اپنی زندگی کیوں برباد کرنا اور اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا چاہتی ہو۔ تم دو برس میں کتنا پس انداز کر لو گی؟ دس بارہ ہزار یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس ہزار روپے۔ تمہاری ماں نے شاید دس پندرہ ہزار روپے پس انداز کیے ہوں گے۔ کیا تیس ہزار روپے میں اتنا جہیز لے جا سکو گی کہ تمہاری ساس خوش اور مطمئن ہو جائے؟ میری جان! اس رقم میں سونے کے زیورات کا ایک سیٹ تک نہیں بن سکے گا۔ برتنوں، فریج، واشنگ مشین اور ملبوسات اور ٹی وی کے لیے کم سے کم بھی لاکھ چاہئیں۔ کسی روز تمہاری ساس، دوسری ساسوں اور نندوں کی طرح مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دے گی۔“

کہکشاں کے سارے بدن میں دہشت کی لہر اُٹھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر بولی تو اس کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ ”نہیں...... امجد کبھی اپنی ماں کو مجھ پر ایسا ظلم کرنے نہیں دے گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”وہ تم سے نہیں، تمہارے حسن و شباب، بھرپور جوانی اور ہیجان خیز جسم سے محبت کرتا ہے۔“ وارثہ کہنے لگی ”اگر اسے تم سے سچی محبت ہوتی تو وہ کہتا...... میں تمہیں بغیر جہیز کے بیاہ کر لے جاؤں گا۔ تمہیں ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر اس نے نہ تو اپنی محبت کے جذبے کا کوئی ثبوت دیا اور نہ کسی ایثار کا مظاہرہ کیا۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور تم جہیز کے حصول کے لیے ملازمت کر رہی ہو؟“

کہکشاں لاجواب سی ہو گئی۔ وارثہ کی بات کو وہ غلط ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ امجد کو اس سے شدید محبت تھی تو اس نے اپنی محبت کا ثبوت پیش کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ ایک مرد ہونے کے ناتے ایثار نہیں کر سکتا تھا؟ وہ ایک لمحے کے لیے خیالوں کی دنیا سے بہت دور نکل گئی۔ کیا اس نے اپنا ہاتھ امجد کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ جب بھی وہ تنہائی میں یکجا ہوئے تو اپنا سر اس نے امجد کے سینے پر نہیں رکھا۔ سیر و تفریح کے لیے جب بھی ساتھ گئی تو اس کے بازوؤں میں محصور رہی۔ اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتی رہی۔ کیا وہ اس سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کہکشاں! مجھے جہیز کی کوئی ضرورت نہیں...... مجھے تم سے صرف تم سے محبت ہے۔ میں تمہیں جلد بیاہ کر لے جاؤں گا۔ دو برس انتظار نہیں کروں گا۔ تمہیں جہیز کے لیے ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔

”تمہیں ایسے شخص سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے جو تمہیں روزانہ جیب خرچ کے لیے دو ہزار روپے نہ دے سکے۔“ وارثہ کی آواز نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر لا کھڑا کیا۔ اس نے چونک کر وارثہ کے چہرے کی طرف دیکھا ”تمہیں ایسا شوہر ملے گا...... ضرور ملے گا۔ اس لیے کہ تم اتنی حسین ہو، تمہارے لیے قدردانوں کی کوئی کمی نہ ہو گی۔ تمہارے ایک اشارے پر کئی ایک پالتو کتوں کی طرح تمہارے قدموں میں لوٹنے لگیں گے۔“

”میں امجد کے علاوہ کسی اور سے شادی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔“ کہکشاں بے جان سے لہجے میں بولی۔

”تم چاہتی ہو کہ ساس کے ظلم و ستم کا نشانہ اور اپنے شوہر کے چھ سات بچوں کی ماں بن کر کسی روز خون تھوکنے لگو اور وہ تمہیں کسی سرکاری یا خیراتی اسپتال کے گندے اور غلیظ جنرل وارڈ میں داخل کرا دے۔ جب تم کسی روز مر جاؤ گی تو وہ بچوں کو کسی یتیم خانے میں داخل کر کے دوسری شادی کر لے گا۔“

”آخر آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں امجد سے شادی نہ کروں؟“ کہکشاں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا ”آخر اتنی محبت اور اپنائیت کس لیے......؟“

”اس لیے کہ تم بہت حسین اور معصوم ہو۔“ وارثہ نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ”میری بڑی بہن بھی تم جیسی حسین تھی۔ اس نے امجد جیسے مرد سے شادی کر لی۔ میرے باپ کے پاس جہیز دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ آخر اس نے ایک دن اپنی ساس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ اس کی دردناک موت کے دو ماہ بعد ہی اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ محبت کا تاج محل ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی اس عذاب سے دوچار ہو۔ ایک بات مت بھولو کہ عورت کے لیے اس کا حسن و شباب ایک قیمتی خزانے کی طرح ہوتا ہے۔ وہ پندرہ سے بیس برس تک اس کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اس کی مالک بھی رہتی ہے۔ وہ مستقبل کا سوچے تو اتنا کچھ اپنے حسن و شباب سے حاصل کر سکتی ہے کہ بڑھاپا سکون سے گزر سکتا ہے۔ اسے کسی محتاجی کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسے میں ہوں۔ میرے پاس ابھی سے اتنا کچھ ہے کہ میں کسی کی محتاج نہیں۔“

کہکشاں اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ”آپ کی باتوں نے مجھے عجیب اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔“

”چلو اُٹھو...... ہم گھوم کر آتے ہیں، ذرا دماغ فریش

ہو جائے گا۔"

"کہاں......؟" کہکشاں نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا "مجھے اپنی بہن کے گھر بھی جانا ہے۔"

"نہیں بھئی۔" وارثہ مسکرائی "اپنی بہن کے ہاں تم کل چلی جانا۔"

کہکشاں کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ وہ وارثہ کی گاڑی میں گھومے۔ وہ غسل خانے کی طرف بڑھنے لگی تو وارثہ نے پوچھا۔

"اُدھر کہاں جا رہی ہو، یہ باہر جانے کا راستہ تو نہیں۔"

"کپڑے بدلنے۔" کہکشاں نے جواب دیا "اپنے کپڑے تو بدل لوں۔"

"نہیں...... تم انہی کپڑوں میں چلوگی۔" وارثہ نے کہا "واپس آ کر بدل لینا۔ کپڑے بدلنے کی اتنی جلدی کیا ہے؟"

"ان کپڑوں میں......؟" اس نے حیرت سے وارثہ کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے اَن جانے خیال سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا "میں اس بلاؤز میں باہر نہیں جا سکتی۔"

"وہ کیوں؟" وارثہ کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"اس لیے کہ اس کا جسم پر ہونا نہ ہونا برابر ہے۔" کہکشاں سرخ ہو کر بولی۔

"ہش...... اس کا تو فیشن ہے...... آج کون عورت اور لڑکی ایسی ہے جو ایسے لباس میں نہیں نکلتی ہو؟"

کہکشاں کو اس کے آگے ہار ماننا پڑی۔ یہ بات ٹھیک ہی تھی۔ مختصر سا بلاؤز فیشن بن گیا تھا۔ کمر اور بلاؤز کے درمیان کے فاصلے کی نمائش کی جاتی تھی اور آگے اور پیچھے کا گریبان اس قدر کھلا ہوتا تھا کہ انہیں کچھ شرم محسوس نہیں ہوتی تھی، یہ بلاؤز بھی ایسا ہی تھا۔ تاہم اس نے ساڑی کے پلّو سے کسی حد تک ڈھک لیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر براجمان تھی۔ دنیا اس کے لیے نئی نہیں تھی مگر گاڑی میں بیٹھ کر نئی لگ رہی تھی۔ اس میں ایک ایسا حسن اور دلفریبی محسوس ہو رہی تھی جو اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ دن ڈوب چکا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا اور روشنیوں سے شہر، بازار، دکانیں اور سڑکیں جگمگا رہی تھیں۔ وارثہ اسے ساتھ لے کر ایک پارک میں آئی۔

"میں پابندی سے شام میں کچھ دیر ٹہلتی ہوں، کھلی ہوا میں سانس لے کر جسم کو تازگی بخشتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ روش پر آگے بڑھ گئی۔ کہکشاں وہیں ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر تک پارک کی پختہ روش پر ٹہلتے ہوئے وارثہ کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ وہ کہکشاں کے پاس جا کر بولی جو فوارے کے پاس کھڑی تھی۔

"آج پی سی ہوٹل میں پارٹی ہے۔ وحید شاہ نے ٹی وی کے اداکاروں، فنکاروں اور بڑی بڑی شخصیات کو ڈنر پر مدعو کیا ہوا ہے۔ مجھے بھی اس نے دعوت نامے دیے تھے کہ ملنے والوں میں تقسیم کر دوں۔ میں تو بھول گئی۔ چلو ہم چلتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو دعوت نہیں ہے۔" کہکشاں گھبرا کے بولی۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے اس نے دعوت نامے دیے تھے۔" وارثہ بولی "چار دعوت نامے...... ہم دو ہی تو جا رہے ہیں۔"

"کیا میں اس لباس میں پارٹی میں چلوں؟" کہکشاں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔

"اس لباس میں کیا خرابی ہے؟" وارثہ نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "یہ پارٹی ڈریس ہے۔ سات ہزار آٹھ سو روپے کا۔ تم نے جو زیورات کا سیٹ پہن رکھا ہے وہ ایک لاکھ روپے کی مالیت کا ہے۔"

"مجھے وہاں بڑی شرم آئے گی۔" کہکشاں نے قدرے تذبذب سے کہا۔

"تم وہاں چل کر دیکھنا، تو جوان لڑکیاں اور عورتیں کیسے کیسے لباس میں آئی ہوئی ہوں گی۔ ایسی حالت میں کہ انہیں دیکھ کر مردوں کو شرم آ جائے۔" پھر وہ اسے گاڑی میں لے آئی۔

پی سی کے پارکنگ لاٹ پر اس نے گاڑی روک کر کہکشاں سے پوچھا۔

"سویٹ بے بی! کیا تم کبھی یہاں آئی ہو؟ یہ کراچی کے ٹاپ ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔"

"میں دفتر کے سامنے والے ہوٹل کے سوا کبھی کسی دوسرے ہوٹل میں نہیں گئی۔" کہکشاں نے جواب دیا۔

"میری بات سنو!" وارثہ نے اسے جس لہجے میں اور انداز میں مخاطب کیا وہ بڑا پُراسرار سا تھا "تمہارے حسن کا جادو، تمہارے جسم کے تناسب میں ہے۔ پارٹی میں مرد تمہارے سراپا اور حشر سامانیوں کو دیکھ کر دیکھتے رہ جائیں گے۔ بہت سارے مرد تمہارے قریب آنے کی کوشش کریں گے۔ تم انہیں لفٹ دینے کی کوشش نہ کرنا۔ اس لیے کہ تمہیں چاند کو چھونا ہے۔ کسی ایسے مرد کو لفٹ دینا اور دوستی کرنا جو

تمہاری زندگی میں خوش قسمتی کے ساتوں در کھول دے۔"

کہکشاں نے ہوٹل کی عمارت کے اندر قدم رکھا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی طلسم کدے میں آ گئی ہو۔ وہ وارثہ کے ساتھ اس ہال کی طرف بڑھ رہی تھی جس میں پارٹی ہو رہی تھی۔ صرف مرد ہی نہیں بلکہ لڑکیاں اور عورتیں بھی اسے بار بار پلٹ کر دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ ہال کے اندر داخل ہوئی تو مہمانوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ پارٹی پورے شباب پر تھی۔ رنگینی صرف فضا ہی پر نہیں بلکہ سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ وارثہ نے اسے صرف وحید شاہ سے ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے فنکاروں اور بڑی بڑی اہم شخصیات سے بھی ملایا تھا۔ واصف بھی آیا ہوا تھا۔ وہ پہلی نظر میں کہکشاں کو پہچان نہ سکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پہچاننے کے بعد بولا "کہکشاں! تم واقعی کہکشاں ہی ہو؟ میری نظریں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں؟"

وہ لالی ووڈ کے مقبول اور بہت بڑے ہیرو سے بات کر رہی تھی، جس کی وہ بڑی مداح تھی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس ہیرو سے اس کی اچانک اور غیر متوقع ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے باتیں کر رہی تھی، معاً اس کی نگاہ سامنے کھڑے ہوئے ایک مرد پر پڑی جو حسین اور نوجوان لڑکیوں کے نرغے میں تھا۔ وہ باتیں تو لڑکیوں سے کر رہا تھا لیکن اس کی ساری توجہ کا مرکز وہ تھی۔ وہ اسے پیار بھری نظروں سے...... گہری اور ناقدانہ نظروں سے...... آہستہ آہستہ سے، رک رک کر دیکھ رہا تھا۔ کہکشاں کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی نگاہیں دھیرے دھیرے اس کے سارے وجود کو اپنے اندر جذب کر رہی ہیں۔ آر پار ہو رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں شراب کا سا نشہ چھا رہا ہے۔ پہلے تو کہکشاں نے اسے اپنی نظروں کا واہمہ سمجھا تھا لیکن یہ واہمہ نہیں تھا۔

کہکشاں نے اس کے بہترین اور عمدہ تراش کے نفیس ترین سوٹ، انگلیوں میں بیش قیمت ہیروں کی انگوٹھیوں سے یہ محسوس کیا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ یوں بھی یہاں ایک سے ایک بڑا موجود تھا۔ اس کی شخصیت میں کوئی سحر تھا اس کے ساتھ کھڑی لڑکیاں چہک رہی تھیں اور اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیے جا رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اس کے گلے میں اپنی باہنیں ڈال دیتیں۔

کہکشاں نے دوسری طرف دیکھا، پھر چاروں طرف دیکھا۔ صرف اس مرد ہی کی نہیں بلکہ اس ہال کے سارے ہی مردوں کی نگاہیں اس کے چہرے اور سراپا پر پروانوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ اپنی دانست میں اسے ایسی حالت میں دیکھ رہے تھے جہاں کوئی حد اور قید نہیں۔ وہ گویا ان کے بازوؤں کے حصار میں قید ہو کر رہ گئی ہو۔ وہ اس کے چہرے پر جھکے ہوئے ہوں۔

وارثہ جب اسے اپنے ساتھ لے کر اس مرد کی طرف بڑھی تو دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں۔ اس مرد کا تعارف اس سے کرایا گیا۔

"آپ ہیں مسٹر ریاض ناتھانی! کراچی، اسلام آباد، لاہور، پشاور اور دبئی میں آپ کی جیولری کی شاپس ہیں...... اور آپ مس کہکشاں ہیں۔"

ناتھانی نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے مصافحہ نہیں کیا تو ریاض ناتھانی خجل سا ہو گیا۔ تاہم اس نے فوراً ہی اپنی خجالت کو دلکش مسکراہٹ کے پیچھے چھپا لیا۔ پاس کھڑی لڑکیاں اسے نفرت اور حسد سے دیکھے جا رہی تھیں۔

پارٹی کے اختتام پر ریاض ناتھانی اس کے ساتھ چپکا رہا تھا۔ کتنے مرد اس سے بات کرنے، ہاتھ ملانے اور قریب سے دیکھنے کے لیے ترستے رہے تھے۔ کتنوں کی سخت اور اَن جان نگاہوں کی گرفت میں اس نے اپنے آپ کو جکڑا ہوا پایا تھا۔ اس سے مسز کوکب کہتی تھی کہ مرد جب بھی کسی حسین لڑکی کو دیکھتے ہیں، وہ چشم تصور میں اسے بے حجاب کر دیتے ہیں۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس پوری محفل میں وہ فطری حالت میں کھڑی ہوئی ہو۔

وارثہ نے اسے گھر پر ڈراپ کیا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس کی خالہ گھر کی دہلیز پر حیران و پریشان کھڑی انتظار کے کرب و اذیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وارثہ نے اس کی خالہ کو بتایا کہ وہ اسے پارٹی میں لے گئی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہوئی ہو۔ کبھی اس کا کوئی خواب اتنا حسین نہیں ہوا تھا۔ آج کا دن بڑا سہانا اور خوش گوار تھا۔ اس کی ویران اور سپاٹ سی زندگی میں پہلی بار بہار آئی تھی۔ چپکے چپکے سے...... غیر محسوس انداز سے۔

صبح جب وہ دفتر پہنچی تو بہت خوش تھی۔ رات کے آخری پہر تک جاگتے اور سوچتے رہنے سے نیند کوسوں دور رہی تھی۔ صبح بیدار ہوئی تو اس پر ایک تھکن سی سوار تھی۔ آنکھوں میں نیند کا خمار بھرا تھا اور لال لال ڈورے بھی تھے۔ اس کا دل دفتر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ اس لیے دفتر آ گئی تھی کہ کل کی رنگین اور دلچسپ کہانی سنا کر سرپرائز دے سکے۔ کہانی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سنانے کا موقع لنچ ہی میں ملتا تھا۔

لنچ تک کا وقت اس نے سوچتے سوچتے گزارا تھا۔ ٹائپ کرتے کرتے وہ رک جاتی۔ رات اس کے دل و دماغ پر جو نشہ چھایا تھا، وہ ابھی تک تھا۔ کل کی پارٹی کا منظر اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگتا تھا کہ وہ وارشہ کے دیے ہوئے لباس کو پہن کر کیسی قیامت بن گئی تھی۔ اس ساڑی، مختصر اور کھلے گریبان کے بلاؤز میں اس کا دلکش جسم عجب بہار دے رہا تھا اور اس کے پورے بدن میں چلتے وقت کٹے ہوئے اسپرنگ کا تناؤ سا آجاتا تھا۔ لوگ اسے کتنی حیرت اور بھوکی نظروں سے سارا وقت گھورتے رہے تھے جیسے وہ دنیا کی سب سے حسین عورت ہو۔

لنچ کرنے کے لیے وہ، ماہا، مسز کوکب اور یاسمین قریبی ہوٹل میں چلی جاتی تھیں۔ ان کی میز مخصوص ہوتی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد ماہا بولی ”کیا بات ہے کہکشاں! آج تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔ اتنا خوش تو میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔“

”تم نے کیسے جانا کہ آج میں بہت خوش ہوں؟“ کہکشاں کھل اٹھی۔

”تمہارے چہرے اور انگ انگ سے خوشبو پھوٹ رہی ہے، اس سے پتا لگا۔“ ماہا نے جواب دیا ”میں نے دیکھا کہ تم ٹائپ کرتے کرتے کتنی ہی بار رک گئی تھیں اور سوچ میں ڈوبتی رہی تھیں اور تمہارے چہرے پر دھنک کے رنگ کھلتے دکھائی دیے تھے۔“

”شاید اس کے بیاہ کی تاریخ طے ہوگئی ہوگی۔“ یاسمین بولی ”اب آج ابھی سب کو مٹھائی کھلائے گی۔“

”نہیں...... یہ بات نہیں۔“ کہکشاں لجاتے ہوئے کہنے لگی ”کل شام جب میں دفتر سے نکل کر کزن سے ملنے جارہی تھی تو وارشہ مل گئی تھی۔“ پھر اس نے مختصر الفاظ میں سنسنی خیز اور تحیر انگیز ساری کہانی سنا دی۔

پھر کہکشاں نے دیکھا، سب کے چہرے فق ہوگئے اور پتھرا کے اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھے رہے تھے۔ ان کی حسد و رشک بھری نگاہیں اس پر ایسی جمی تھیں جیسے اس کے چہرے پر جھوٹ پڑھنے کی کوشش کررہی ہوں۔ سب پر جیسے کوئی بجلی سی آگری ہو۔ کیونکہ ان پر سناٹا سا چھا گیا تھا۔ جب ویٹر آیا تو یہ سکوت ٹوٹ کر بکھر سا گیا۔

”اس سرپرائز کی خوشی میں آج کہکشاں کی طرف سے لنچ ہوگا۔“ ماہا کی آواز میں جان نہیں تھی۔

”میں تائید کرتی ہوں۔“ یاسمین کی آواز کھوکھلی سی تھی ”اسے ستا نہیں چھوڑا جاسکتا۔“

جب ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو مسز کوکب بولی تو اس کا لہجہ کانپ رہا تھا ”تم کتنی خوش قسمت ہو کہ تمہارا تعارف ریاض ناتھانی سے ہوا۔ تعارف اور پارٹی کے اختتام تک وہ تمہارے ہی ساتھ ساتھ رہا۔ تم کتنی خوش نصیب ہو میری چاند!“

”ریاض ناتھانی جس حسین لڑکی کو لفٹ دے سمجھو کہ اس کے دن پلٹ گئے۔ وہ کروڑ پتی ہے اور پھر کنوارا بھی۔“ ماہا نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”تم بھی تو اس قدر خوبصورت ہو کہ دس ہزار ریاض ناتھانی مرمٹیں تو کم ہی ہیں۔“ مسز کوکب نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

جب ویٹر لنچ لے کر آیا تو وہ اس کے ساتھ بڑی فراخ دلی سے انصاف اور کہکشاں پر رشک کرنے لگیں۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کررہی تھی۔

چھٹی سے ذرا دیر پہلے وارشہ کا فون آیا ”تم دفتر سے سیدھے اور فوراً میرے گھر پہنچو۔ تم سے ایک بے حد ضروری بات کرنا ہے۔“

”ضروری بات کیا ہوسکتی ہے؟“ کہکشاں دفتر سے نکل کر وارشہ کے گھر پہنچنے تک یہی سوچتی رہی۔ وارشہ نے اسے دیکھتے ہی اپنے بازوؤں میں بھرلیا اور اسے اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ پھر اس کے رخسار کو گرم جوشی سے چوم کر بولی۔

”تم جلدی سے نہا کر تیار ہولو...... میں نے ایک جوڑا غسل خانے میں رکھ دیا ہے۔ پھر میک اپ بھی کرلینا۔“

”وہ کس لیے......؟“ کہکشاں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”اس لیے کہ ریاض ناتھانی تم سے ملنے، سیر کرانے اور ڈنر پر لے جانے یہاں آرہے ہیں۔“ وارشہ نے بتایا۔

”کیا مطلب......؟“ وہ گڑبڑا سی گئی۔

”مطلب یہ ہے کہ شام چار بجے ریاض کا فون آیا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ وارشہ، آپ نے مجھے کس سے ملا دیا؟ ساری رات اس حسین چہرے کے تصور نے سونے نہیں دیا۔ اس نے تو مجھ پر جادو کردیا ہے۔ میں مس کہکشاں سے تھوڑی دیر کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔ میں ٹھیک چھ بجے آپ کے یہاں پہنچ رہا ہوں۔“ وارشہ بولی۔

”مگر......؟“ کہکشاں نے کچھ کہنا چاہا۔ دل کی بات

زبان پر نہ آسکی۔ وارشہ درمیان میں جلدی سے بولی ”اگر مگر کچھ نہیں احمق لڑکی! ملک کا ایک کروڑ پتی تم پر ریشہ خطمی ہوگیا ہے، اس کے خواب سیکڑوں ہزاروں لڑکیاں اور عورتیں دیکھتی ہیں۔ مگر وہ آج تمہارا خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ تمہیں روزانہ خرچ کے لیے دس بیس ہزار روپے بھی دے سکتا ہے۔ ساری دنیا کے دورے پر لے جاسکتا ہے۔ تمہاری قسمت بدل رہی ہے۔ لکشمی کو لات نہ مارو۔“ پھر اس نے کہکشاں کو غسل خانے میں دھکیل دیا۔

وہ شاور کے نیچے کھڑی نہاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسے قدرت نے راتوں رات کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ریاض ناتھانی جیسا شخص اس کے لیے پاگل ہورہا تھا۔ جب تک وہ نہاتی رہی، اس کے بدن پر میٹھی میٹھی سنسنی دوڑتی رہی۔ نس نس میں خون رقص کرتا رہا۔ وہ نہا کر نکلی تو وارشہ نے کل کی طرح اس کا نفیس میک اپ کیا۔ اس نے جو جوڑا دیا تھا وہ کل سے بھی بہترین اور بیش قیمت تھا جس نے اسے دو آتشہ بنادیا تھا۔ ٹھیک چھ بجے ریاض ناتھانی آیا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

پھر ریاض ناتھانی اپنی پجیرو لے کر پی سی آیا تھا۔ سبزہ زار کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اس نے چائے اور پُرتکلف ناشتے کا آرڈر دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتا رہا۔ پھر اس نے ذاتی سوال کیا تو کہکشاں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ بڑی سادگی سے اسے صاف صاف بتادیا کہ وہ مقامی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ٹائپسٹ ہے۔ اس کی تنخواہ دس ہزار روپے ہے۔ اوور ٹائم مل جاتا ہے تو اس میں کچھ اضافہ ہوجاتا ہے۔ اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے۔ اس نے اپنی منگنی اور امجد کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ اس بات کو دانستہ گول کرگئی تھی۔

ریاض اس کی آنکھوں میں جھانکتے ڈوبتے ہوئے بولا ”مس کہکشاں! آپ پہلی لڑکی ہیں جس نے اپنے بارے میں سچ سچ بتادیا۔ اس لیے آپ کی عزت پہلے سے کہیں زیادہ میرے دل میں بڑھ گئی ہے۔ لڑکیاں جتنا جھوٹ بولتی ہیں، اتنا سیاسی لیڈر بھی نہیں بولتے۔“

چائے پینے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ کمرشل اسٹریٹ لے آیا تھا۔ ملبوسات، میک اپ کے بے حد قیمتی لوازمات اور زیورات کا ایک بیش قیمت سیٹ اس نے اپنی دکان سے لے کر دیا تھا۔ کہکشاں نے چائے پیتے ہوئے بڑی سادگی سے اسے بتایا تھا کہ یہ لباس اور زیورات وارشہ کے ہیں۔ سونے کے زیورات کا سیٹ کہکشاں کے گھر پہنچنے سے پہلے دوسرے سامان کے ساتھ اس کے گھر پہنچ چکا تھا۔ اس کی خالہ بیٹھی ان سب چیزوں کو حیرت سے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

کہکشاں کو یہ سب کچھ کسی سپنے کی طرح لگتا تھا۔ اس کی زندگی میں دھنک کے سارے رنگ بکھر گئے تھے۔ ہر رنگ میں اس کے لیے کیا کچھ نہ تھا۔ ریاض واقعی اس کے لیے دیوانہ ہورہا تھا۔ وہ روز اس سے ملتا تھا۔ اس سے ملے بغیر اسے چین نہ آتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا۔ اس سے کہتا تھا۔ میں کچھ دنوں کے بعد دبئی جارہا ہوں۔ جہاں کچھ کام نمٹانے کے بعد دنیا کی سیر و سیاحت پر نکلوں گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلوگی۔ تمہیں مہینے میں دس ہزار روپے ملتے ہیں، میں تمہیں روزانہ دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔“

کہکشاں کی نس نس میں خواب ناکی کا زہر سرایت کرچکا تھا۔ اتوار کی صبح وہ ریاض کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے سپر ہائی وے پر نکل گئی تھی۔ اپنے محلّے کے قریب سے گزری۔ محلّے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے نظریں چرالی تھیں اور چہرے کو سر پر پلو ڈال کر اس طرح چھپالیا تھا کہ امجد یا محلّے کا کوئی آدمی نہ دیکھ لے۔ امجد دکھائی نہ دیا۔ اب تو اس نے امجد کے بارے میں سوچنا بھی بند کردیا تھا۔ اب وہ صرف ریاض ناتھانی کے بارے میں سوچتی اور اونچا اُڑنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔

ریاض نے ستانے کی غرض سے ہائی وے پر ایک ہوٹل کا کمرا کرائے پر لے لیا۔ وہ بہت دیر تک ریاض سے دنیا کی سیر و سیاحت کے موضوع پر باتیں کرتی رہی تھی۔

جب چلنے کا وقت ہوا تو وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر تیار ہورہی تھی۔ ریاض ناتھانی اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہکشاں کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اس کے چہرے پر جھک گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ...... کتنا فرق ہے امجد اور ریاض میں۔ ایسا ہی فرق جو کڑواہٹ اور مٹھاس میں ہوتا ہے۔

کوئی ایک ہفتے بعد ریاض نے اس کے پرس میں ایک پھولا ہوا لفافہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں رات کی فلائٹ سے دبئی جارہا ہوں۔ وہاں سے ایک ہفتے کے لیے ایک ضروری کام سے ہانگ کانگ، تم ایک ہفتہ بعد بذریعہ ہوائی جہاز دبئی پہنچوگی۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ اس لفافے میں ہے اور پچپن ہزار کی رقم بھی۔ تم ائرپورٹ پہنچ

کر رائل سٹی ہوٹل فون کروگی تو ان کی گاڑی آ کر تمہیں لے جائے گی۔ تمہارے لیے وہاں ایک کمرا بک ہوگا۔ پھر ہم دنیا کی سیروسیاحت کا پروگرام بنائیں گے۔"

امجد نے جو سنا تو اس پر بجلی سی آ گری۔ اسے اپنی سماعت کا فتور محسوس ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تک سکتے کے عالم میں کہکشاں کو دیکھتا رہا جس کا حسن نکھر گیا تھا اور اس کا شباب کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا۔ یہ روپ وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کے حلق میں گولا سا اٹک رہا تھا۔

"کہکشاں! تم سراب کے پیچھے اندھادھند بھاگ رہی ہو۔"

"میں سراب کے پیچھے نہیں، اپنی منزل کی طرف بھاگ رہی ہوں۔ میری منزل ریاض ناتھانی ہے، دبئی ہے، ساری دنیا کی سیروسیاحت ہے۔ مجھے وقت ملا ہے، ایک سنہری موقع ملا ہے...... اپنی زندگی اور مستقبل سنوارنے کا۔ زندگی میں باربار سنہرے مواقع نہیں ملتے۔" کہکشاں سانس لینے رکی اور پھر بولنے لگی "میں کچھ بھی کھونا نہیں چاہتی، نہ وقت، نہ منزل اور نہ ہی تابناک مستقبل۔"

"تم نے نہ صرف جذباتی بلکہ بڑا غلط فیصلہ کیا ہے۔" امجد نے اسے سمجھانا چاہا "جو بہت اونچا اُڑنے کی کوشش کرتا ہے، وہ نیچے گر بھی جاتا ہے۔ ریاض تم سے ایک کھلونے کی طرح کھیلنا چاہتا ہے۔ دولت مند لوگ حسن وشباب کو بستر کی زینت بناتے ہیں، جیون ساتھی نہیں۔ ان کے نزدیک نئے ماڈل کی گاڑیاں اور جوان بدن ایک مشغلہ ہوتا ہے۔"

"ریاض ناتھانی مجھے ذرّے سے آفتاب بنا رہا ہے۔" وہ تنک کر بولی۔ اسے امجد کی ناصحانہ باتیں زہر لگی تھیں "میں دنیا کے نزدیک ایک قطرہ تھی اس نے مجھے انمول موتی بنا دیا۔ تم میں اور اس میں ایک فرق ہے، تم مجھے آفتاب سے ذرّہ بنانا چاہتے تھے، موتی کو قطرہ...... میں اس کے سہارے اپنے خواب اور منزل کو پانے جارہی ہوں۔ تم کبھی میری راہ میں نہیں آنا۔ مجھے ایک خواب سمجھ کر بھول جانا۔ میں اب کبھی واپس نہیں آؤں گی۔"

ہوائی جہاز میں یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ آج وہ اپنی زندگی میں اونچی پرواز بھی تو کررہی تھی۔ اس نے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نیچے بستیاں تھیں۔ وہ بستیاں جو چھوڑ کر آئی تھی۔ اب وہ وہاں واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ پلٹ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ امجد اب اس کے لیے یاد کی ایک رمق ہی تو تھا۔

اس نے ائرپورٹ سے ہوٹل فون کیا تو تھوڑی ہی دیر میں اسے لینے کے لیے گاڑی آ گئی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی شاہی محل میں آ گئی ہو۔ ایسا آراستہ وپیراستہ کمرا اس نے کب دیکھا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ہوٹل کے ملازمین اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ الہ دین کے جادوئی چراغ کے جن کی طرح اس کا ہر حکم بجالاتے تھے۔ اس نے دو دن ہوٹل کے کمرے میں بند رہ کر اپنی مرضی سے گزارے تھے۔ کراچی کے دفتر فون کر کے ماہا، یاسمین اور مسز کو کب سے بھی بہت دیر تک باتیں کرتی رہی تھی۔

تیسرے دن سہ پہر کے وقت ریاض آ گیا۔ پھر اسے دبئی کی سیروتفریح کرانے اور انڈین فلمی ستاروں سے ملانے لے گیا۔ پھر اسے شاپنگ کرائی۔ پُرتکلف ڈنر دیا۔ جب وہ دونوں ہوٹل واپس پہنچے تو خوشی کی لہریں برقی رو کی طرح اس کی نس نس میں دوڑ رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی منزل پالی ہو مگر ریاض ناتھانی نے ابھی تک اپنی منزل نہیں پائی تھی۔ وہ بیوپاری تھا، بیوپاری کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ وہ رات رک گیا۔ صبح کہکشاں نے ریاض ناتھانی سے خواب ناک لہجے میں پوچھا "تم شادی کب کروگے؟"

"شادی......؟" وہ اس کے ریشمی سیاہ بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا "اصل شادی تو دو دلوں کا ملاپ ہے۔ نکاح کا نام نہیں...... ہم شادی سوئزرلینڈ جا کر کریں گے تاکہ وہ یادگار بن جائے۔"

ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ دونوں میاں بیوی کی طرح ہوٹل میں رہنے لگے تھے۔ ریاض صبح جاتا تو رات یا شام کے وقت واپس آتا تھا۔ اس نے کہکشاں کو پینا سکھا دیا تھا تاکہ نشے کی حالت میں مسرتوں سے محظوظ ہوتے رہیں۔ اس نے ایک دن ریاض کی غیر موجودگی میں وارثہ کو فون کر کے قدرے تفصیل سے بتا دیا۔

"شاباش...... سویٹ بے بی! ویری گڈ...... تم بہت اچھی جارہی ہو۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولی "تم لندن جاؤ تو میرے لیے بھی کچھ لیتی آنا۔"

ایک روز ریاض اس کے ریشم جیسے سیاہ بالوں کو سہلاتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"ڈارلنگ! میں کل کی فلائٹ سے ایک ضروری کام سے مسقط جارہا ہوں...... مسقط میں ایک روز قیام کر کے لندن چلا جاؤں گا۔ لندن میں صرف ایک دن کا کام ہے۔ اگر میں

نہیں گیا تو کروڑوں کا نقصان ہو جائے گا۔"

"تم تو مجھے لندن بھی لے جانے والے تھے؟" وہ بولی "مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"

"چونکہ مجھے مسقط جانا ہے اور تمہارا مسقط کا ویزا ایک دن میں لگ نہیں سکتا، میں واپس آ کر سوئزرلینڈ لے جاؤں گا۔ وہاں سے ہم لندن جائیں گے۔"

کوئی پانچویں دن ریاض کے آفس سے اس کی پرائیویٹ سیکریٹری نے فون پر اسے اطلاع دی۔

"مسٹر ریاض کو لندن ائرپورٹ پر سونے کی اسمگل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ انہیں کئی برس کی سزا ہوگی۔"

اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ سر چکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ یہ اندھیرا اس کی زندگی پر ہی نہیں، اس کے خوابوں اور مستقبل پر بھی چھا گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی پھر اسے وارثہ کا خیال آیا، اس نے کراچی فون کیا۔ اس کی ملازمہ نے بتایا کہ وہ لاہور گئی ہوئی ہے۔ چار پانچ روز کے بعد آئے گی۔ اس کے پاس نہ تو لاہور کا نمبر ہے اور نہ ہی موبائل نمبر۔

ہوٹل کا منیجر پانچویں روز اس کے کمرے میں بل لے کر، جو پورے بارہ ہزار روپے کا تھا اور ڈپازٹ کی رقم سے وضع کیا ہوا تھا۔ اس نے بل وصول کر کے منیجر کو باہر بھیج دیا۔ ریاض ناتھانی کی آفس سیکریٹری کو فون کیا تو اس نے صاف معذرت کرلی۔

"باس کے احکامات آنے تک...... بل کی ادائیگی نہیں ہوسکتی۔ باس سے دو تین مہینے سے پہلے رابطہ قائم ہونا مشکل ہے۔"

اتفاق سے اس کے پرس میں جو نوٹ بک تھی اس میں وارثہ کا موبائل نمبر تھا۔ اس نے رابطہ کیا تو وارثہ بڑی روکھائی سے بولی۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے، اسے تم ہی حل کرو۔"

"میں کیسے حل کروں؟" کہکشاں نے کہا "میں یہاں کسی کو نہیں جانتی، اس شہر میں اجنبی ہوں۔"

"واجد درانی سے بات کر کے دیکھو۔" وارثہ نے اسے مشورہ دیا۔

"یہ واجد درانی کون ہے؟ یہ میں کسی کو نہیں جانتی، تمہیں بتا چکی ہوں۔" کہکشاں نے بے بسی سے جواب دیا۔

"دبئی کا بہت بڑا ساہوکار ہے۔ اچھا تم ایک گھنٹا صبر کرو۔ میں اس سے بات کر کے بتاتی ہوں۔" وارثہ بولی۔

ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد وارثہ کا فون آیا "اس کا یہ نمبر لکھ لو۔ تم ابھی اور اسی وقت اسے فون کرنا اور ہاں...... تم پریشان نہ ہو۔ زندگی میں ایسے نشیب وفراز اور کٹھنائیاں آتی ہیں، ایک بات اور...... تم مجھ سے رابطہ قائم رکھنا۔"

اس نے واجد درانی کو اسی وقت فون کیا تو وہ تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ موٹا، پستہ قد اور گینڈے کی طرح تھا۔ اس کی آنکھیں کسی سور کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس نے کہکشاں کو اوپر سے نیچے تک اس طرح دیکھا جس طرح قصاب قربانی کے جانور کو دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے ہوس جھانک رہی تھی۔ وہ کسی بھیڑیے کی طرح اپنی رال ٹپکاتا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ پھر اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"وارثہ بھی کیا چیز ہے۔ کراچی میں ہو یا لاہور میں، کیسی کیسی حسیناؤں کا تعارف کمیشن پر کراتی ہے کہ کسی کو بیس ہزار روپے دیتے ہوئے دکھ نہیں ہوتا۔ میرے آدمی نے اسے بیس ہزار روپے دے دیے ہیں۔"

اس نے واجد کا ہاتھ جھٹک دیا "کیا مطلب ہے تمہارا...... یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟"

"غصہ تھوک دو...... جذباتی نہ بنو۔ ذرا میری پوری بات سن لو۔ وارثہ جب کسی کلی یا پھول سے ملاتی ہے تو دس سے بیس ہزار روپے لیتی ہے...... کیا تمہیں اس بات کی خبر نہیں ہے؟" واجد درانی نے بتایا۔

"نہیں......" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا سارا بدن سن اور زبان گنگ ہوگئی۔

"اس نے مجھے فون پر رابطہ کر کے کہا تھا کہ ایک بٹر فلائی ہے۔" واجد درانی تفصیل بتانے لگا "تمہارا سودا بیس ہزار روپے میں طے ہوا ہے۔ میں تمہیں ایک مہینے تک اپنے پاس رکھوں گا۔"

"بکومت......" وہ برافروختہ ہوکر بولی "میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔"

واجد درانی ہنسنے لگا۔ اس کی توند بھی جیسے ہنسنے لگی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تو پھر جیل کی ہوا کھاؤ...... میں تو اس لیے آیا کہ تمہارے ہوٹل کا بل ادا کر کے عزت سے اپنے گھر لے جاؤں...... تم میری بات مان لو تو وہاں ایک مہینے تک عیش سے رہوگی۔ میرا دل تم سے نہیں بھرا اور تم مجھے ہر طرح خوش کرتی رہوگی تو پھر ایک مہینا اور بڑھ سکتا ہے ورنہ پولیس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تمہارے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈال کر لے جائے گی۔ دبئی پولیس کو نہیں جانتیں، وہ کتنی بدمعاش ہے۔ تم ان کے لیے مالِ مفت بن جاؤ گی۔ وہ تمہیں گدھ کی طرح نوچیں گے۔''

''میں پولیس کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔'' اس کا سارا بدن خوف سے لرزنے لگا۔

''تو پھر میرے ساتھ چلو۔'' اس نے پھر قریب ہوکر کہکشاں کی عریاں مرمریں کمر کو بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

کہکشاں کی بے وفائی سے امجد کو دنیا کی ہر عورت سے نفرت ہوگئی۔ اس کے نزدیک ہر عورت ایک بکاؤ مال تھی۔ اس نے اپنی بہن کی شادی کے بعد خود شادی نہیں کی۔ وہ ایک رشوت خور بن گیا۔ وہ رشوت صرف اس لیے لیتا تھا کہ عورت سے دل بہلائے۔ اس سے کھلونے کی طرح کھیلے۔ جب بھی کسی شہر دفتر کے کسی کام سے جاتا تھا تو اپنی راتیں کسی لڑکی کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ آج وہ لاہور آیا تو اپنی خواہش کو دبا نہ سکا۔ اس کے دوستوں نے اسے بتایا تھا، یہاں ہر قوم، ہر مذہب کی، زوردار اور ہر عمر کی لڑکیاں ملتی ہیں۔

مال روڈ پر اسے ایک دلال ملا اور اسے اپنے ساتھ لے کر ڈیفنس پہنچا۔ ایک بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے ایک ایسی حسین، دراز قد اور پُرکشش عورت کھڑی تھی جیسی وہ چاہتا تھا۔ اس عورت کے بدن کا تناسب بے حد خطرناک تھا۔ اس دلال نے اس عورت کی قیمت پانچ سو روپے بتائی تھی۔ اس کے دو ہزار بھی کم تھے۔ مگر جب اس نے اسے بہ غور دیکھا تو اس طرح چونک پڑا جیسے کسی زہریلے بچھو نے اس کے بدن پر ڈنک ماردیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہکشاں......!''

اُدھر کہکشاں دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے بدن پر دوپٹا یا اوڑھنی نہیں تھی جس سے وہ اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی جو امجد کو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ کن کن منزلوں سے گزری ہے۔ مگر وہ ہر بات کیسے چھپا سکتی تھی۔ وہ جس منزل پر کھڑی تھی، یہاں کچھ بھی چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ کل امجد اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا، آج وہ اس کے جسم کا خریدار بن کر آیا تھا...... وقت نے کیسی کروٹ لی تھی۔ اسے کتنا ذلیل کردیا تھا۔ اس کے چہرے پر کتنی کالک مل دی تھی۔ کیا وہ اپنے چہرے کی کالک دھو سکتی ہے؟

''یہ ہے تمہاری منزل...... خواب اور مستقبل، کہکشاں......؟'' امجد نے اس سے پوچھا۔

''کیا تم میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آئے ہو؟'' کہکشاں سسکتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... میں صرف جسم کا خریدار ہوں...... مجھے کیا لینا ہے کسی کی زندگی سے۔'' امجد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی ''میرا کرایا سامنے ہے۔''

امجد نے اپنی جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف اُچھال دیے۔

''مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے...... تم نے کل مجھے جس طرح ٹھکرایا تھا، آج میں تمہیں ٹھکرا رہا ہوں...... اچھا ہوا آج مجھے تمہاری قیمت معلوم ہوگئی۔''

امجد ہوٹل واپس آیا تو ساری رات ایک پُل کے لیے بھی سو نہ سکا۔ کہکشاں کے بارے میں سوچتا اور انگاروں پر لوٹتا رہا۔ خواب دغا باز ہوتے ہیں، اس میں کہکشاں کا کوئی دوش نہیں۔ خواب سب دیکھتے ہیں۔ کہکشاں نے بھی دیکھا تھا، اس نے بھی تو دیکھا تھا۔ نہ اسے اپنا خواب ملا، نہ کہکشاں کو۔ اس نے کہکشاں سے محبت کی تھی، اس کے حسن و شباب سے نہیں...... اگر ایسا ہے تو وہ کہکشاں کو اپنا کیوں نہیں لیتا......؟ اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتا......؟ اس کا جسم گندا ہو چکا ہے، روح تو نہیں۔ وہ اسے دیکھ کر کس لیے روئی تھی، کس لیے؟''

ادھر سورج نکلتے ہی وہ بھی ہوٹل سے نکل پڑا۔ ڈیفنس کے روڈ پر وہ ٹیکسی سے اُترا تو اس نے فٹ پاتھ پر بھیڑ دیکھی۔ لوگ کسی چیز کے گرد جمع تھے۔ اس نے قریب جاکر دیکھا، پولیس کے نرغے میں ایک ایمبولینس تھی۔ اس نے پوچھا ''کیا ہوا......؟''

''ایک حسین جوان عورت نے صبح صبح چھت سے کود کر خودکشی کرلی ہے۔''

''کون عورت ہے بھائی؟''

''پتا نہیں جی...... اس کا کوئی وارث تک نہیں ہے۔''

امجد بھیڑ چیر کر آگے پہنچا۔ اس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ لاش کہکشاں کی تھی۔ اس نے اپنا سینہ دباتے ہوئے سوچا۔

''کیا غریب کے خوابوں کی یہی تعبیر ہوتی ہے......؟''

مشورے

جناب ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم۔

آپ کا سرگزشت ڈائجسٹ مجھے بہت پسند ہے۔ میں پابندی سے ہر ماہ پڑھتا ہوں۔ کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ بالآخر میں نے خود پر گزرا ایک واقعہ مثل کہانی لکھ دیا۔ گوکہ یہ صرف ایک واقعہ ہے جس کا اختتام میں نے فرضی لکھا ہے۔ مگر بہ غور اطراف کا جائزہ لیں تو آپ کو ہر ایک مشورہ نواز نظر آئے گا۔ اسے سبق آموزی کی خاطر شامل اشاعت کرسکتے ہیں۔

محمد انصار

(فیصل آباد)۔

مجھے کتابوں کا شوق تھا اور میرے بیٹے کو کھلونوں کا اس لیے میرے کمرے میں صرف کتابیں بھری ہوئی تھیں اور میرے بیٹے کا کمرا طرح طرح کے کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم صرف دو باپ بیٹے ہی تھے۔ میرے بیٹے کی والدہ یعنی میری بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اسی لیے میں نے اپنی ساری محبت اپنے بیٹے پر مرکوز کردی... اور ہم ایک دوسرے کی محبت میں سرشار رہتے۔

اسے طرح طرح کے کھلونوں کا شوق تھا جو میں اس کے لیے لایا کرتا تھا۔ میرا یہ معمول تھا کہ صبح اٹھ کر

اسے تیار کرواتا۔ اس دوران میں کام والی آ کر ناشتا بنا دیتی پھر ہم دونوں باپ بیٹے ناشتا کرتے اور میں اسے اسکول پہنچا کر اپنے دفتر چلا جاتا۔

دوپہر کے وقت میرا چپراسی اسے اسکول سے میرے دفتر ہی لے آتا۔ میرا دفتر اس کے اسکول کے قریب ہی تھا۔ یہاں وہ میرے ساتھ لنچ کرتا اور اپنے اسکول کے کام میں مصروف ہو جاتا پھر شام کو جب میں آف کرتا تو ہم باپ بیٹے گھر آ جاتے۔

ہمارے گھر میں صرف دو کمرے اور ایک صحن تھا۔ ہم اس صحن میں گدے بچھا کر سوتے تھے کیونکہ دونوں کمرے کتابوں اور کھلونوں سے بھرے ہوئے تھے۔

سخت سردیاں تھیں۔ اتوار کی صبح میرے ایک جاننے والے شیخ صاحب ملنے کے لیے آ گئے۔ وہ اتوار کی مناسبت سے بہت سویرے سویرے یعنی نو بجے آئے تھے۔

میں نے انہیں صحن ہی میں بٹھایا۔ یہ صحن ہمارا ٹی وی لاؤنج، بیٹھک سب ہی کچھ تھا۔ میرا بیٹا امروز ابھی تک سویا ہوا تھا۔ کام کرنے والی نے چائے بنا کر شیخ صاحب کے سامنے رکھ دی۔

''یہ تمہارا بیٹا یہاں کیوں سو رہا ہے؟'' شیخ صاحب نے امروز کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم تو یہیں سوتے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''ارے، وہ کیوں تمہارے گھر میں کمرے نہیں ہیں کیا جو اس سردی میں یہاں سوتے ہو۔''

''کمرے تو ہیں لیکن ایک میری کتابوں سے اور دوسرا امروز کے کھلونوں سے لبریز ہے۔''

''حد ہو گئی یعنی کمروں کے ہوتے ہوئے بھی ایسی بے آرامی...... توبہ ہے تم کتابیں اور کھلونے ایک کمرے میں رکھو اور دوسرے کو استعمال میں لے آؤ۔''

''واہ، یہ بات تو پہلے دھیان ہی میں نہیں آئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا۔''

''میاں عقل سے کام لیا کرو تو سب ہو جائے۔''

شیخ صاحب اچھی ترکیب بتا کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم دونوں باپ بیٹا اسی کام میں لگ گئے۔ دن بھر کے لیے مشغلہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ ہم دن بھر کتابوں اور کھلونوں کو سیٹ کرتے رہے۔ شام تک دونوں کمرے ٹھیک ہو گئے تھے یعنی ایک کمرے میں کتابیں اور کھلونے تھے اور دوسرے میں ہم دونوں کے بستر۔

شیخ صاحب کو بھی یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ''ہاں یہ بات ہوئی نا۔ اب دونوں باپ بیٹے آرام سے رہو۔''

پھر گرمیاں آ گئیں اور رانا صاحب ملنے آئے۔ یہ بھی ہمارے رشتے دار تھے اور ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بہت ہوشیار انسان ہیں اور ان کے مشورے پورے خاندان میں مانے جاتے ہیں۔

رانا صاحب کو ہم نے اپنے کمرے میں بٹھایا۔

''میاں یہ تو انتہائی غیر صحت مندرویہ ہے۔ ایک دوسرے کی سانسیں ایک دوسرے کو ڈسٹرب کرتی ہیں تم اپنے بیٹے کو دوسرے کمرے میں سلایا کرو۔''

رانا صاحب کی بات بھی دل کو لگی۔ واقعی میرا اور امروز کا ایک ہی کمرے میں سونا ٹھیک نہیں تھا۔ رانا صاحب کے جانے کے بعد ایک بار پھر شفٹنگ شروع ہوئی۔

میں نے اپنی کتابیں دوسرے کمرے سے نکال کر پہلے والے کمرے میں سجا دیں۔ امروز کے کھلونے ترتیب کے ساتھ رکھ دیے گئے۔ میری کتابیں بھی سلیقے سے سج گئیں۔ اس کام میں دو دن تو لگے تھے لیکن سب ٹھیک ہو گیا۔

اب میں اور امروز الگ الگ کمروں میں آرام سے سوتے۔ دو چار مہینوں کے بعد رشتے کی ایک خاتون ملنے کے لیے آ گئیں۔

کام کرنے والی نے اس دن بہت اچھی بریانی بنائی تھی۔ بریانی کھا لینے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو اگر برا نہ مانو تو تم سے ایک بات کہوں؟''

''جی ضرور کہیں۔''

''لگتا ہے تم کو اپنے بیٹے سے محبت نہیں ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ...... اس سے محبت نہیں ہو گی تو پھر کس سے ہو گی؟''

''اگر ایسا ہے تو پھر اسے الگ کیوں سلاتے ہو؟''

''جی......!'' میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''دیکھو، بچوں کے لیے یہی عمر پیار کا لمس محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔ وہ ابھی بچہ ہے اور وہ ماں سے محروم ہو چکا ہے۔ اسے تمہاری اور تمہارے پیار کی ضرورت ہے۔ اس عمر کے بچے نیند میں ڈرنے لگتے

ہیں۔ اس لیے انہیں پوری توجہ چاہیے کہ کوئی ہر وقت اس کے ساتھ رہے اور تم نے اسے الگ کر دیا۔ اس کی ماں کیا مری ہے تم نے اس کے ساتھ برا سلوک کر دیا۔''

ان کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ بھی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ امروز کو اکیلے میں خوف بھی آتا ہو گا۔ وہ بچہ ہی تو ہے نہ جانے اکیلے میں وہ کیا کیا سوچتا ہو گا۔

خیر ایک بار پھر شفٹنگ شروع ہو گئی یعنی میری کتابیں پھر سے پہلے کمرے میں جانے لگیں۔ امروز بھی اس صورت حال سے پریشان ہونے لگا تھا۔

''ابو یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''بیٹا یہ سب لوگ ہمارے بھلے کی باتیں بتاتے ہیں۔ ان کی باتیں مان لینی چاہیے۔ یہ صدیوں کے تجربے ہیں بیٹا۔'' امروز پھر خاموش ہو گیا۔

یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلتا رہا پھر گرمیوں میں ایک اور صاحب ملنے کے لیے آ گئے انہوں نے باقاعدہ اپنا سر پیٹ لیا۔ ''حد ہو گئی اس گرمی کے موسم میں تم دونوں باپ بیٹے کمرے میں سوتے ہو۔''

''تو پھر کہاں سویا جائے؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

''بھائی تمہارے گھر میں اتنا کشادہ صحن آخر کس لیے ہے۔ لگتا ہے تمہیں تازہ ہواؤں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بھائی خود بھی تازہ ہوا میں رہو اور بیٹے کو بھی لینے کا موقع دو۔ تم تو اس طرح سے اس کی صحت تباہ کر دو گے۔''

لیں جناب، ایک بار پھر ہم صحن میں آ گئے۔ پہلے کی طرح۔ کتابیں اور کھلونے جس طرح پہلے تھے اسی طرح سیٹ کر دیے گئے۔

کچھ دنوں کے بعد ایک صاحب اور تشریف لائے۔ یہ بھی بہت بڑے دانش ور تھے۔ ''میاں کیوں اپنے بیٹے کو تباہ کر رہے ہو؟'' انہوں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''اب تو اسے تازہ ہوا بھی مل رہی ہے اور ہم باہر سونے لگے ہیں۔''

''تازہ ہوا تو مل رہی ہے لیکن دوستی کا مول نہیں رہا۔'' انہوں نے کہا۔ ''اس عمر کے بچوں کو دوستوں کی

بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کسی "تیر بہدف" "قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بوڑھیاں، ملا یا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کردی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پیے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہوگی جتنی میں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے اتار کے درختوں میں کسی کے لیے اتنے نقوش سلیمانی نہیں ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لیے۔

اقتباس: رشید احمد صدیقی بقلم خود

مرسلہ: نوشین فرحت، جہلم

ضرورت ہوتی ہے یہ ان کی ذہنی نشو ونما کے لیے بہت ضروری ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، آپ مشورہ دیں میں کیا کروں؟"

"بھائی اسے ہاسٹل میں داخل کرا دو۔" انہوں نے کہا۔ "وہاں اسی کی عمر کے دوسرے بھی ہوں گے وہ ان کے ساتھ کھیلے کودے گا، پڑھے گا تو اس کا ذہن کھلتا چلا جائے گا۔ تم کیوں اسے اپنے ساتھ رکھ کر اس کی زندگی برباد کررہے ہو۔"

ان کا یہ مشورہ بھی بالکل درست معلوم ہوا حالانکہ امروز جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے سمجھا بجھا کر اسے ایک اچھے سے ہاسٹل میں داخل کروا دیا۔ امروز کے جانے کے بعد میری زندگی بہت بے کیف سی ہوگئی۔

وہ ہر وقت یاد آیا کرتا۔ اس کا ناشتا کرنا پھر میں اسے اپنے ساتھ اسکول لے جاتا اور وہ میرے دفتر آکر میرے سامنے بیٹھ جاتا پھر شام کو ہم قریبی پارک کی طرف چلے جاتے۔

ایک دن وہی خاتون ملنے کے لیے آگئیں جو ایک بار پہلے آچکی تھیں۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ امروز ہاسٹل میں رہنے لگا ہے تو انہوں نے باقاعدہ اپنا سر پیٹ لیا۔

"بس سمجھ میں آگیا کہ تم بچے کے دشمن ہو دوست نہیں ہو۔ ارے یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ باپ کا ساتھ بہت ضروری ہے۔ وہ بن ماں کا بچہ ہے اور تم اس کے ساتھ ایسا سلوک کررہے ہو۔ ارے اس کو اپنے ساتھ رکھو ہاسٹل میں جا کر تو وہ برباد ہو جائے گا۔ اتنا پیارا بچہ ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہاں کیسے کیسے بچے ہوا کرتے ہیں۔"

ایک بار پھر ان کی باتیں دل کو لگیں۔ اسی لیے امروز کو ہاسٹل سے گھر لے آیا۔ وہ خود بھی بہت پریشان ہو رہا تھا۔ "ابو آخر ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"بیٹا ہم لوگوں کے مشورے پر عمل جو کررہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ عقل مند لوگ ہیں یہ جانتے ہیں کہ زندگی کس طرح گزاری جاتی ہے۔"

"لیکن اب مجھے ایسی زندگی نہیں گزارنی۔"

"تو پھر تم ہی کوئی مشورہ دو۔"

"آپ ایسا کریں کہ گھر کے دونوں کمرے تڑوا دیں۔" امروز نے کہا۔ "اور ہم جس طرح پہلے صحن میں رہتے تھے اسی طرح رہیں گے۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ ہمارے گھر میں صرف صحن ہی صحن ہو؟"

"ہاں صحن، واش روم اور کچن۔ ان کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔"

امروز کا مشورہ بھی اچھا تھا میں نے یہی کیا۔ دونوں کمرے تڑوائے۔ ساری کتابیں بیچ دیں اور کھلونے کباڑیے کو دے دیے۔ اب ہم دونوں باپ بیٹے بڑے آرام اور سکون کے ساتھ صحن میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اب ہمیں کوئی یہ مشورہ نہیں دیتا کہ دونوں باپ بیٹے کمرے میں جا کر سوؤ یا ایک کمرے میں رہو تاکہ بیٹا پیار کا لمس محسوس کرے یا دونوں الگ الگ رہو تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو۔

اب کوئی مشورہ ہی نہیں دیتا کیونکہ گھر میں کمرے ہی نہیں ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ مشورہ دینے والوں نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے لیکن ہم دونوں باپ بیٹے خوش ہیں...... بہت خوش۔

میری اس عبرت انگیز کہانی کا صرف ایک سبق ہے کہ آپ کبھی بھی سب کو مطمئن نہیں کرسکتے چاہے کچھ بھی کرلیں۔

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!

تسلیمات۔

برسوں قبل ایک شعر نظروں سے گزرا تھا "دیکھا جو تیر کھاکے کمین گاہ کی طرف، اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی" ایسا لگتا ہے یہ شعر نہ معلوم شاعر نے میرے لیے ہی لکھا ہے۔ میری زندگی کی تفسیر ہے یہ شعر۔ مجھے کس کس طرح اپنوں نے ہی برباد کیا، یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔ پڑوسی ملک کے چینلز سے جس قسم کے ڈرامے آتے ہیں، اسی کا اثر ہے کہ آج ہمارے ہاں بھی گھریلو سیاست شروع ہوگئی ہے۔

رابعہ

(سرگودھا)

بغلی گھونسا

بہت سال گزرے ایک میگزین میں افسانہ پڑھتے ہوئے ایک جملہ نظر سے گزرا تھا۔ رائٹر نے لکھا تھا "عورت بھی بہت عجیب چیز ہے مل جائے تو نظر ہی نہیں آتی، نہ ملے تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

اس وقت میں نے سوچا تھا کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی، اب اپنے ساتھ گزری ہے تو اتنے برس پہلے پڑھا ہوا جملہ بمع معنی اور تفصیل کے سمجھ میں آگیا ہے، کیسے؟ یہ سمجھنے کے لیے آپ کو میرے ماضی میں جانا ہوگا۔

میں نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ کھولی، بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ سب سے بڑی ستارہ باجی پھر

ارسلان اس کے بعد میں یعنی رابعہ اور مجھ سے چھوٹی سعدیہ۔ ہم لاہور کے ایک اچھے علاقے میں بنے ہوئے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ستارہ باجی نے میٹرک مکمل کرنے کے بعد تعلیم چھوڑ کر گھر داری سنبھال لی تھی۔ ارسلان بھائی نے ایف اے کیا اور ابا کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگے۔ ابا کی گاڑیوں کے اسپئر پارٹس کی دکان تھی اور خوب چلتی تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ میں فرسٹ ائیر میں تھی جب گھر میں ارسلان بھائی کی شادی کا ہنگامہ جاگا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سب سے پہلے ستارہ باجی کی شادی ہوتی مگر یہ مائیں بیٹوں کے معاملے میں بڑی جذباتی ہوتی ہیں۔ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کا خواب بھی اسی وقت دیکھنا شروع کر دیتی ہیں جب بیٹا جھولے میں ہوتا ہے۔ امی بلڈ پریشر اور شوگر کی مریضہ تھیں۔ سو ابو نے بھی ان کی بات مان لی۔ لڑکی پسند کر لی گئی اور بہت دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ بھابی بہت خوبصورت تھیں۔ ارسلان بھائی تو بیوی کے دیوانے تھے۔ امی بہو کو دیکھ دیکھ نہال ہوتیں۔

مگر امی کو یہ خوشی زیادہ دیر تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی، شادی کے ایک سال بعد وہ وفات پا گئیں۔ ماں نہ رہے تو گھر گھر نہیں رہتا۔ پھر بھی مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد سب اپنے اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے۔ گھر کا سارا انتظام ستارہ باجی کے ہاتھ میں آگیا۔ ابو ستارہ باجی کو خرچ کی رقم دیتے تھے جسے وہ خوش اسلوبی سے خرچ کرتیں۔ ہمیں جیب خرچ بھی وہ دیتیں ساتھ ساتھ وہ اپنے جہیز کا سامان بھی تیار کر رہی تھیں۔ رشتہ کروانے والی ایک عورت کو ابو نے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ہم تینوں بہنوں میں بہت محبت تھی۔ ارسلان بھائی اور بھابی ہمارا بہت خیال رکھتے تھے سو زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔

☆☆☆

ایک شام رشتہ کروانے والی عورت آئی تو اس نے بتایا کہ اس نے ستارہ باجی کے رشتے کی ایک جگہ بات چلائی ہے۔ لہٰذا لڑکے کے گھر والے کل دوپہر کو دیکھنے آئیں گے۔ ابو نے اجازت دے دی۔ ستارہ باجی کو بلا کر ابو نے ساری بات سمجھائی۔ وہ اسی وقت مصروف ہوگئیں۔ دوسرے دن میرا بہت ضروری ٹیسٹ تھا۔ سعدیہ نے تو چھٹی کر لی اور باجی کا ہاتھ بٹانے لگی۔ میں نے سوچا کہ میں بھی دوپہر تک پہنچ ہی جاؤں گی، مگر ہوا یہ کہ انہیں کہیں اور جانا تھا سو وہ دوپہر سے پہلے ہی چلے آئے۔ لڑکے کی ماں اور ایک بہن اور بڑی بھابی ساتھ تھیں۔ سعدیہ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے باجی کو پسند کر لیا ہے اور وہ ہمیں دعوت دے کر گئی ہیں۔ اتوار کو ہم لڑکا دیکھنے جائیں گے، ستارہ باجی بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ مسکراہٹ ان کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اتوار کو ابو بھابی اور میں لڑکے والوں کے گھر گئے، ضد تو سعدیہ نے کی مگر ابو زیادہ لوگوں کو پہلی ہی بار لے جانے پر راضی نہیں تھے سو ارسلان بھی دکان پر رک گئے تھے۔

گھر اچھا تھا۔ اندر سے سجاوٹ بھی خوبصورت تھی۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ آسودہ حال لوگ تھے۔ لڑکا آفس میں تھا۔ اس کی امی نے بتایا کہ وہ آتا ہی ہوگا۔ ان لوگوں کا اخلاق بھی بہت اچھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد لڑکا بھی آگیا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس اونچے قد کا خوبصورت سا لڑکا ستارہ باجی کیلئے ہم سب کو بہت پسند آیا۔ سو یہ رشتہ ہر لحاظ سے ابا کو بھی بہتر لگا۔ ابا کے ساتھ بات وغیرہ کرتا رہا۔ بھابی سے بات ہوئی مگر میں نے سلام کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ اصل میں، میں ذرا ریزرو رہنے والی لڑکی تھی۔ جب کھانے کے بعد رخصت ہونے لگے تو ابا تو سلیم کے گھر والوں سے الوداعیہ فقرے کہہ رہے تھے۔ بھابی سلیم کی امی سے کہہ رہی تھیں کہ کوئی دن مقرر کر کے آئیں اور آکر رسم کر لیں۔ میں ایک طرف کھڑی سب کو دیکھ رہی تھی کہ سلیم میرے قریب آیا۔

"آپ کیا کرتی ہیں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ...... میں تھرڈ ائیر میں پڑھ رہی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کو ہمارا گھر کیسا لگا؟ اس نے پھر سوال کیا۔

"بہت اچھا ہے۔" میں ذرا سا مسکرائی۔

"اور گھر والے؟" پھر سوال آیا۔

"آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور میں آپ کو کیسا لگا ہوں؟ اس نے عجیب سا سوال کیا۔

"آپ اچھے ہیں اور مجھے بھی اچھے لگے ہیں۔ ابو اور بھابی کو بھی آپ پسند آئے ہیں۔" میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

"بہت شکریہ! مجھے پسند کرنے کا۔"

یہ کہہ وہ پلٹ گیا۔

ہم لوگ گھر آگئے۔ ستارہ باجی کو میں نے بہت تنگ کیا۔ سلیم کا نام لے لے کر چڑاتی رہی، وہ مسکراتی رہیں۔ جب میں نے بتایا کہ سلیم بھائی بہت ہینڈسم ہیں۔ ان کی آنکھیں بہت حسین ہیں۔ ان کی گفتگو بڑی اچھی ہے تو باجی

کے چہرے پر خوشی کے رنگ پھیل گئے۔ ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا ہونے والا جیون ساتھی خوبصورت، کمانے والا اور اپنا گھر رکھتا ہو۔ میں نے ستارہ باجی کے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دیکھا تو بے اختیار دل سے دعا نکلی کہ خدا ان کی زندگی خوشیوں سے بھر دے۔ زندگی کا نیا سفر خوبصورت ہو۔

سلیم کے گھر سے واپس آنے کے تیسرے دن کی بات ہے، میں کالج سے لوٹی تو گھر میں غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ستارہ باجی جو میرے گھر آتے ہی میرے لیے کھانا نکالتی تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک چادر لپیٹے کمرے میں لیٹی تھیں۔ سعدیہ ہوم ورک کر رہی تھی۔ بھابی کچن میں تھیں۔

"کیا بات ہے۔ ستارہ باجی کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے پلیٹ میں سالن ڈالا اور روٹی لے کر وہیں کھانے بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے!" بھابی نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ان کا چہرہ سپاٹ سا تھا۔

میں کھانا کھا کر لیٹ گئی۔ شام تک باجی ویسے ہی لیٹی رہیں۔ میں نے دوبارہ جا کر آواز دی، مگر وہ نہ بولیں۔ سعدیہ نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ رات کو کھانا میں بناتی تھی میں نے کھانا بنایا۔ ابو اور بھائی کے آنے پر ہم سب ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ رات آٹھ بجے ابو اور بھائی آئے۔ وہ آتے ہی ستارہ باجی کے پاس چلے گئے۔ ارسلان بھائی بھی چپ چپ تھے۔ میں حیران تھی کہ آخر کیا بات ہوگئی ہے؟ میں کھانا لگا کر ابو کو بلانے کے لیے کمرے میں گئی تو مجھے دیکھ کر ابو کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئے۔ ستارہ باجی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ قریب ہی بھابی اور ارسلان بھائی بیٹھے تھے۔ میں نے کھانے کا بتایا تو ابو کھڑے ہوگئے۔ "چلو آؤ کھانا کھاتے ہیں پھر اس مسئلے پر بات کریں گے۔"

بھائی اور بھابی بھی کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں نے ایک نظر ستارہ باجی پر ڈالی اور ان کے قریب بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہوگئی ہے باجی، مجھے بھی تو کچھ بتائیں؟"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ کیا ہوا ہے؟" باجی کا لہجہ اتنا کڑوا تھا کہ میں ایک لمحے کو چپ ہوگئی۔ "سلیم کی امی آئی تھیں صبح تمہارے جانے کے بعد۔ سلیم نے کہا ہے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ ہمارے گھر سے کوئی بھی رشتہ استوار نہیں کرنا چاہتا۔" باجی کی آواز تھی کہ کوئی بم گرا تھا میری سماعتوں پر۔ باجی یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئیں، میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ یہ جان کر کہ سلیم کو میں پسند آگئی ہوں اور اس نے کہا ہے کہ اگر شادی ہوگی تو صرف رابعہ سے ورنہ میں اس گھر میں کسی دوسری لڑکی سے رشتہ نہیں کروں گا۔ میں حیران پریشان رہ گئی، میں نے بھی سلیم کو پسند کیا تھا مگر باجی ستارہ کے لیے، بہنوئی کے روپ میں وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

گھر میں ٹینشن کی فضا قائم ہوگئی تھی۔ میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی باجی سے نظریں ملانے سے ڈر رہی تھی۔ بھابی اور سعدیہ بھی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے میں نے کہہ دیا ہو کہ میری شادی سلیم سے ہوگی۔

تین چار دن گزر گئے، چھٹی کا دن تھا۔ ابا اور ارسلان بھائی بھی گھر پر تھے، سلیم کی بھابی اور والدہ پھر آگئیں۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ سلیم نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہو، مگر کچھ نہ ہوا۔ ابو نے مجھے دوسرے کمرے میں بلایا اور بلا تمہید کہنے لگے "رابعہ آج پھر سلیم کی والدہ آئی ہیں۔ وہ بضد ہیں کہ تمہارا رشتہ لے کر ہی جائیں گی۔ میں نے اور ارسلان نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ انہیں ہاں کر دی جائے۔ بات مقدر کی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا نصیب سلیم ہی ہو اور ستارہ کے لیے کوئی اور خدا نے منتخب کر رکھا ہو۔ ہماری کوشش یہی ہوگی کہ ستارہ کے ساتھ ہی تمہاری شادی ہو۔" میں سر جھکائے سن رہی تھی۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا۔" انہوں نے پوچھا۔

"آپ جو بھی فیصلہ کریں گے میری بہتری کے لیے ہی ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

ابو نے ہاں کر دی اور سلیم کے ساتھ میرا رشتہ طے ہوگیا۔ وہ لوگ منگنی کرنا چاہتے تھے مگر ابو نے کہا کہ ستارہ باجی کے لیے رشتہ تلاش کرنے کے بعد دونوں کی منگنی کر دی جائے گی۔ وہ لوگ مان گئے اور یوں سلیم کا نام میرے نام کے ساتھ آنے لگا۔ وہ خوبصورت انسان جو پہلی نظر میں ہی بہت اچھا لگا تھا، میرا بننے والا تھا، میں خوش تھی۔ اب ستارہ باجی کے لیے رشتے کی تلاش زیادہ شروع کر دی گئی۔ گھر کا ماحول معمول پر آچکا تھا مگر مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے ستارہ باجی میرے ساتھ سرد مہری سے پیش آتی ہیں۔ ایک اَن دیکھا سا پردہ حائل ہو چکا تھا ہمارے درمیان حالانکہ وہ پہلے کی طرح میرا خیال بھی رکھتی تھیں، کالج سے لوٹتے ہی میرے لیے کھانا گرم کرتیں۔ بات چیت بھی کرتی تھیں پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا ہمارے درمیان پہلے والی بے تکلفی نہیں رہی، ستارہ باجی

اب اپنے ساتھ میرے لیے بھی جہیز تیار کر رہی تھیں۔

☆☆☆......☆☆☆

سلیم سے میرا رشتہ طے ہوئے دو تین ماہ گزر چکے تھے۔ اس کی امی اور بہنیں کبھی کبھار چکر لگا لیتی تھیں۔ وہ جب بھی آتیں ستارہ باجی کچن میں چلی جاتیں۔ چائے اور کھانے وغیرہ کا اہتمام کرتیں مگر ان کے سامنے سلام کرنے کے بعد دوبارہ نہ آنے کی حتی الامکان کوشش کرتی تھیں۔

امی مجھے بہت پیار کرتیں میری نند بتاتی کہ آپ کے لیے سلیم بھائی کی پسند سے بری تیار ہو رہی ہے۔ میں دل ہی دل میں مغرور ہونے لگتی۔ جتنا ہم لوگ ستارہ باجی کے لیے رشتے کی دعائیں کر رہے تھے اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ ادھر سلیم کے گھر والوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک دن چھٹی کے بعد میں کالج سے باہر نکلی اور اسٹاپ کی طرف چلنے لگی۔ میں بڑی سی چادر لپیٹے اپنی دھن میں مگن جا رہی تھی کہ اچانک میرے ساتھ کوئی چلنے لگا۔

''رابعہ!'' کسی نے میرا نام پکارا۔

میں چونک کر مڑی تو میرے قریب سلیم کھڑا تھا، میں تو حیران رہ گئی۔

''آپ یہاں۔'' میں نے پوچھا۔

''رابعہ!'' اس نے کہا ''تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ کہیں بیٹھ کر بات کرو گی؟''

''مگر......'' میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''بہت ضروری بات ہے پلیز۔''

میں نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھ سے انکار نہ ہوا، ہم دونوں وہاں سے ایک قریبی پارک میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نظریں جھکائے خاموش تھی۔ سلیم کی نظروں کی تپش میں محسوس کر رہی تھی۔ ایک بار نظریں اٹھا کر دیکھا، مگر اس کی آنکھوں سے چھلکتی وارفتگی نے مجھے نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا۔

''کیا بات کرنی ہے مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ، میرا تمہارا رشتہ طے ہوا تو تمہیں کیسا لگا؟''

میں خاموش رہی۔

وہ پھر بولا ''میں نے اپنی شادی کا معاملہ اپنے گھر والوں پر چھوڑ رکھا تھا۔ تمہاری باجی کو بھی انہوں نے ہی پسند کیا تھا۔ میں ان کی پسند پر راضی تھا، اس دن تم میرے گھر آئیں، تمہیں دیکھا تو یوں لگا، جیسے مجھے تمہاری ہی تلاش تھی، سو میں نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ میری شادی اگر ہوگی تو تم سے ہی ہوگی، تم بتاؤ تمہیں کیسا لگا؟''

''اچھا لگا۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اب تمہارے گھر والے تمہاری باجی کے رشتے کی وجہ سے ہماری شادی میں تاخیر کر رہے ہیں، جبکہ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔'' اس کا لہجہ خمار آلود ہو گیا۔ ''میں تمہیں بہت جلد اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔

''میں کل دوبارہ امی کو بھیجوں گا۔ پلیز اپنے گھر والوں کو تم بھی ذرا سمجھاؤ۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''میں کیا سمجھاؤں؟''

''ہماری جان پر بنی ہے اور تمہیں ہنسی آ رہی ہے۔''

ہم تقریباً ایک گھنٹا بیٹھے رہے، وہ اپنی بے تابیوں کی کہانی سناتا رہا اور میں دل میں سوچتی رہی کہ میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ اتنا چاہنے والا شخص میرا ہمسفر بننے والا ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن سلیم کی امی آئیں، ابو اور بھائی سے کافی دیر باتیں کرتی رہیں۔ ان کا موقف تھا کہ سلیم سے چھوٹی بہن کی شادی بھی کرنی ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ سلیم کی شادی ہو جائے۔

ابو نے بھابی اور ستارہ باجی سے مشورہ کیا۔ ستارہ باجی تو خاموش رہیں البتہ بھابی نے بہت مخالفت کی۔ مگر ارسلان بھائی نے فیصلہ کر لیا کہ ستارہ کے رشتے کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ جب اس کا وقت آئے گا شادی ہو جائے گی اور یوں میری شادی کا دن مقرر ہو گیا۔ صرف ایک ماہ بعد کی تاریخ رکھی گئی۔ گھر میں تیاری شروع ہو گئی۔ میرا جہیز بہت قیمتی اور شاندار تھا۔ ستارہ باجی نے ایک ماں کی طرح مجھے رخصت کیا۔ میں سلیم کے گھر آ گئی۔ زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔

سلیم کے گھر والوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سلیم تو میرا دیوانہ تھا۔ اتنی شدت سے مجھے چاہتا کہ میں خوف زدہ ہو جاتی، گھبرا جاتی۔ میں اپنے گھر بہت خوش تھی۔ میکے جاتی تو وہاں بھی سب ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ ستارہ باجی سلیم سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھیں۔ سلام کے بعد کچن میں چلی جاتیں البتہ سعدیہ بہنوئی سے مذاق کرتی تھی۔ ابو بھائی اور بھابی سلیم سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ چھ ماہ بعد مجھے ماں بننے کی نوید ملی۔ اب تو سلیم اور میری ساس نے محاورتاً ہی نہیں

حقیقتاً مجھے چارپائی سے پاؤں نیچے نہیں اُتارنے دیا۔ پھر خدا نے مجھے بیٹے سے نوازہ، بالکل باپ کی طرح خوبصورت سا بچہ، سب کی آنکھ کا تارا بن گیا اس کا نام حمزہ رکھا۔ باپ بن کر میرے لیے سلیم کی چاہت اور بڑھ گئی۔ میری زندگی میں اور نکھار آ گیا۔

☆☆☆

مقدر کی بات تھی کہ ابھی تک ستارہ باجی کا رشتہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ بہت خاموش رہنے لگی تھیں البتہ حمزہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ میرے گھر بہت کم آتی تھیں۔

دن گزرتے جا رہے تھے میں دن رات دعا کرتی تھی کہ باجی کا رشتہ ہو جائے۔ حمزہ دو سال کا ہو گیا تھا۔ یہ اس کی دوسری سالگرہ کی رات کا ذکر ہے۔ پہلی سالگرہ بھی ہم نے بہت دھوم دھام سے منائی تھی، اب کی بار حمزہ کا عقیقہ بھی ساتھ ہی رکھا تھا۔ گوشت تو دوپہر تک تقسیم کر دیا تھا۔ رات کو سالگرہ کا فنکشن تھا۔ مہمان وغیرہ جمع تھے، میرے میکے والے بھی آئے ہوئے تھے۔ حمزہ سعدیہ کے پاس تھا۔ میں اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ سلیم اس موقع کے لیے میرے لئے سبز رنگ کی ساڑی لائے تھے۔ ستاروں سے بھری ساڑی زیور اور میک اپ کے علاوہ موتیے کے پھولوں کے زیور نے مجھے عجیب سا حسن بخش دیا تھا ہم تینوں بہنوں کا رنگ بہت گورا تھا۔ جسم اسمارٹ اور دلکش تھا۔ شادی کے بعد میرا جسم تھوڑا سا ابھر گیا تھا جس سے میں بقول سلیم اور بھی دلکش لگنے لگی تھی۔

میں تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچی جہاں کیک کٹنے کا انتظار ہو رہا تھا۔ میں نے سلیم کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے بڑی خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ سلیم ستارہ باجی کے قریب صوفے پر بیٹھا تھا اور وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ باجی نے میری شادی سے سمجھوتا کر لیا ہے۔

اس دن کے بعد باجی کی آمد و رفت میرے گھر میں بہت بڑھ گئی۔ وہ میرے اور حمزہ کے لیے بہت سی چیزیں پکا کر لاتیں۔ سلیم کی پسند کی ڈشیں بناتی تھیں۔ سلیم بھی اب ان سے بے تکلفی سے ہنستا بولتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ باجی غم اور مایوسی کی کیفیت سے نکل آئی ہیں۔ اب تو سلیم میرے بغیر بھی میرے میکے چلا جاتا تھا۔ میکے اور سسرال کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے سلیم کا رویّہ اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ میں نے پہلے تو اپنا وہم سمجھا مگر جب وہ زیادہ غصہ کرنے لگا تو میں نے توجہ دی۔ پہلے خود ہی کہتا تھا کہ تیار ہو کر میرا استقبال کیا کرو، اب اگر لپ اسٹک بھی لگا لیتی تو کہتا کس کو دکھانے کے لیے لگائی ہے۔

☆☆☆

میرے سسرال کے قریب ہی ریس کورس تھا۔ اکثر ہم دونوں شام کو حمزہ کے ساتھ وہاں چلے جاتے۔ حمزہ کھیلتا رہتا۔ ہم باتیں کرتے۔ کبھی کبھی کھانا بنا کر ساتھ لے جاتی۔ حمزہ سیر کر کے خوش ہوتا تھا۔ اب کافی دن گزر گئے سلیم گھر آتا اور تیار ہو کر دوبارہ گھر سے باہر چلا جاتا، میں پوچھتی کہ کہاں جا رہے ہو تو ڈانٹ دیتا۔ میں پریشان رہنے لگی۔ اپنی ساس اور سسر کو کیا بتاتی وہ خود حیران تھے کہ سلیم کا رویّہ اس قدر سخت کیوں ہو گیا ہے؟ ایک دن میں اپنے بیڈ روم کی صفائی کر رہی تھی کہ بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے مجھے کسی کاغذ کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے چادر اُٹھا کر دیکھا تو گدے کے اوپر ایک تہ کیا ہوا کاغذ اسکاچ ٹیپ کے ساتھ چپکا ہوا تھا میں نے اسے...... کھول کر دیکھا۔ وہ کوئی تعویذ تھا۔ میں پریشان ہو گئی کہ کون میرا دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ یقیناً کوئی نہ کوئی میرے اردگرد ضرور تھا جو تعویذوں کے ذریعے سلیم کو مجھ سے متنفر کر رہا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ ابو یا باجی کو ساری بات بتا دوں، کیونکہ ستارہ باجی اب میری ماں کی جگہ تھیں، میرے ساتھ اب ان کا رویّہ بھی بہت اچھا ہو گیا تھا۔ میں دوسرے دن اپنے میکے چلی گئی۔ ستارہ باجی کو تعویذ دکھایا اور سلیم کے رویّے کے متعلق بھی بتایا۔ وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ وہ سلیم کو سمجھائیں گی۔ دو دن بعد سلیم مجھے لینے آیا تو باجی نے میرے سامنے ہی اسے سمجھایا۔ سختی سے بات کی۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ گھر آنے کے بعد کئی دن تک اس کا رویّہ میرے ساتھ ٹھیک رہا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ وہ پھر میری طرف لوٹ آیا تھا۔

اب ہم دوبارہ شام کو ریس کورس جانے لگے تھے۔ ایک دو بار سلیم کو باہر کام تھا تو اس نے کہا کہ میں خود حمزہ کو ساتھ لے جایا کروں، اب کثر ایسا ہونے لگا کہ سلیم نہ ہوتا تو ہم دونوں ماں بیٹا ریس کورس چلے جایا کرتے تھے۔ وہ گیند سے کھیلتا، ایک دو گھنٹے کے بعد ہم واپس آ جاتے۔ ایک شام حمزہ اپنے گیند سے کھیل رہا تھا۔ میں گھاس پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی کہ ایک لڑکا میرے قریب آیا۔ ''یہ آپ کا بھائی ہے؟'' اس نے حمزہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

مجھے ہنسی آ گئی میں نے کہا ''نہیں میرا بیٹا ہے۔''

''اوہ سوری۔'' وہ شرمندہ سا ہوگیا۔ ''بہت پیارا بچہ ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس کے ساتھ کھیل لوں۔ مجھے یہ بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں اکثر اسے اِدھر دیکھتا ہوں میں روزانہ اِدھر آتا ہوں۔''

مجھے اس کی باتوں سے اُلجھن ہونے لگی، خواہ مخواہ فری ہو رہا تھا۔

''جی نہیں ......'' میں نے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''اس کے پاپا آنے والے ہیں ہم گھر جا رہے ہیں اور پھر یہ اجنبیوں سے بہت گھبراتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے حمزہ کا ہاتھ پکڑا اور گیٹ کی طرف چل دی۔ کافی دن تک میں وہاں نہیں گئی۔

حمزہ کی تیسری سالگرہ آنے والی تھی سلیم کا رویّہ عجیب تھا کبھی بہت مہربان اور کبھی نامہربان، میں نے اب اس کی عادت سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ میں نے سلیم سے کہا کہ وہ باجی کے لیے کوئی رشتہ دیکھے۔ اپنے ملنے ملانے والوں میں پتا کرے کیونکہ اب تو سعدیہ بھی جوان ہوگئی ہے۔ وہ میری بات کے جواب میں خاموش رہا۔ ایک شام ستارہ باجی ہمارے گھر آئیں اور کہنے لگیں مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کہیں باہر چلو، میں نے بہت کہا کہ اِدھر اپنے بیڈروم میں بات کرلیتے ہیں مگر وہ نہ مانیں، وہ مجھے ساتھ لے کر ریس کورس چلی آئیں۔ حمزہ تو کھیلنے لگا، ستارہ باجی مجھے بٹھا کر کسی ضروری کام سے چلی گئیں۔ میں وہیں بیٹھی تھی کہ وہ اُس دن والا لڑکا پھر آگیا۔ میں تو اسے بھول چکی تھی۔ اب اس کی شکل دیکھ کر یاد آیا، وہ کچھ کہے بغیر میرے پاس ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ ''آپ بہت دنوں بعد آئی ہیں میں روزانہ آپ کا انتظار کرتا تھا۔'' وہ مسکرا کر کہنے لگا، ابھی میں اسے کوئی سخت جواب دینے ہی والی تھی کہ سلیم وہاں آگیا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے بڑی سختی سے پوچھا، میں ڈر گئی۔

میرے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔

''آپ کون ہیں؟'' وہ لڑکا سلیم سے مخاطب ہوا۔

''میں بتاؤں تمہیں کہ کون ہوں؟'' سلیم آگے بڑھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''نہیں پلیز سلیم یہ کوئی نہیں ہے۔ اصل میں ......'' میرے منہ سے کوئی جملہ نہ نکل سکا۔ سلیم نے میری بات نہیں سنی وہ اس لڑکے کو گھورتے ہوئے بولا۔

''اس کے پاس کیوں بیٹھے تھے؟''

''یہ میری دوست ہیں۔'' وہ لڑکا اطمینان سے بولا، میرے سر پر تو آسمان گر پڑا۔ ''بتاؤ نا انہیں رابطہ میں تمہارا جاننے والا ہوں اور ہم روزانہ اِدھر ملتے ہیں۔''

سلیم کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ انہوں نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر... کھینچا دوسرے ہاتھ سے حمزہ کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے مڑا، جب ہم گھر پہنچے تو باجی ستارہ گھر میں موجود تھیں۔ میں انہیں پوچھنے والی ہی تھی کہ آپ مجھے وہاں چھوڑ کر گھر کیوں آگئیں کہ سلیم نے اپنے ابو اور امی کو آواز دی۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے تو سلیم نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''میری بیوی بدکردار ہے۔ یہ باہر روزانہ ایک غیر مرد سے ملاقات کرتی ہے۔ شک تو مجھے کافی دنوں سے تھا مگر آج میں نے خود دیکھ لیا ہے۔ اس لیے میں اسے اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکتا۔ میں اسے طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔'' تین بار یہ الفاظ دُہرا کر وہ حمزہ کی طرف مڑا ''یہ بچہ بھی میں اسے دے رہا ہوں۔ کیوں کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ میرا ہی بچہ ہے۔''

میرے سر پر آسمان گرا کر وہ تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ میں کانپتے جسم کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی۔ میرا ذہن ماؤف ہوچکا تھا باجی نے آگے بڑھ کر حمزہ کو گود میں اُٹھا لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل آئیں۔

میں ایک روبوٹ کی طرح ستارہ باجی کے ساتھ ..... چلی آئی۔ گھر آئے تو ابا اور ارسلان گھر میں موجود تھے۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میری حالت دیکھ کر ابا تیزی سے آگے بڑھے۔

''سلیم نے اسے طلاق دے دی ہے۔'' ستارہ باجی کے لہجے میں اتنا سکون تھا کہ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور تب فہم و ادراک کی ساری منزلیں میں ایک لمحے میں طے کرگئی۔ دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف، اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے اس مقام تک لانے میں سارا کردار ستارہ باجی نے ہی ادا کیا تھا۔

ستارہ باجی نے یہ سب کچھ اپنی ہی سگی بہن کے ساتھ کیوں کیا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ انہوں نے اپنا بدلہ لے لیا حالانکہ اس میں میرا قصور کوئی نہیں تھا کہ سلیم نے انہیں چھوڑ کر مجھے پسند کیا۔ دکھ تو یہ تھا کہ میں بے خبری میں لٹ گئی تھی۔ ستارہ باجی کے چہرے پر اطمینان اور سکون پھیل گیا تھا۔ اب وہ قہقہے لگانے لگی تھیں، میں نے ان سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ ابا نے گلے لگایا اور رونے لگے۔ میں نے صرف اتنا کہا۔

''میں بے قصور ہوں میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔''

☆☆☆

میں دوبارہ اسی گھر میں آگئی تھی۔ سلیم کے گھر والوں نے میرا سامان بھجوا دیا تھا۔ میں سارا وقت گم صم لیٹی رہتی۔ سعدیہ زبردستی کھانا کھلا دیتی، حمزہ کو بھی وہی سنبھال رہی تھی۔ اس واقع کو ایک ماہ ہو چلا تھا۔ ابا اور ارسلان بھائی بھی مجھے سمجھاتے، حمزہ کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بات کرتے۔

آہستہ آہستہ میں اس دکھ سے باہر نکلنے لگی۔ حمزہ کی معصوم صورت اور شرارتیں مجھے جینے پر مجبور کرنے لگیں۔ میں نے سوچا کہ باپ تو زندہ ہوتے ہوئے بھی مر گیا ہے اب اگر میں نے بھی اس پر توجہ نہ دی تو یہ معصوم بکھر کر رہ جائے گا۔ سو میں نے اپنے آپ کو حمزہ کی ذات میں قید کرلیا۔ ستارہ باجی سے میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، ویسے بھی وہ اب مجھے مکمل طور پر نظرانداز کرنے لگی تھیں۔ بھابی کو بھی انہوں نے ساتھ ملا لیا تھا۔ صرف ابا اور سعدیہ میرا خیال رکھتے، ابا مجھے الگ سے پیسے دیتے، حمزہ کے لیے چیزیں لاتے۔ ارسلان بھی اپنے بچوں میں گم تھے۔ ایک سال کا عرصہ گزر گیا، اس دن کے بعد سلیم سے میرا کبھی سامنا نہیں ہوا۔ میں نے بھی اسے تلخ خواب سمجھ کر بھلانے کی کوشش شروع کردی تھی، اب میری ذات کا محور صرف حمزہ تھا۔

☆☆☆

میں نے اپنی بے رنگ زندگی سے سمجھوتا کرلیا تھا، مجھے سلیم کے گھر سے نکلے دوسرا سال ہونے والا تھا۔ ستارہ باجی نے اگر میرے ساتھ زیادتی کی تھی تو وہ بھی ابھی تک کنواری بیٹھی تھیں۔ رشتے آئے تھے اور نہ جانے کیوں پسند کرنے کے باوجود دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے تھے۔ سعدیہ بھی اب شادی کے قابل تھی۔ اسے نت نئے فیشن کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے تک محدود کرلیا تھا۔ ابا اور سعدیہ کے علاوہ کوئی مجھ سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا تھا، میں نے حمزہ کو نرسری کلاس میں داخل کروانے کا سوچا، نزدیک ہی ایک پرائیویٹ انگلش اسکول تھا۔ میں نے وہاں جا کر داخلے کی بات کی تو انہوں نے بتایا کہ چھوٹا سا ٹیسٹ لینا ہوگا، جس میں بچے کو چند بنیادی چیزوں کا آنا ضروری ہے۔ ٹیچر نے مجھے ایک لسٹ دی جس میں داخلہ ٹیسٹ کی تیاری کا تھوڑا بہت مواد تھا۔ ٹیسٹ پندرہ دن بعد ہونا تھا۔

میں نے حمزہ کو تیاری کروانا شروع کی، گرمیوں کے دن تھے، میں شام کو حمزہ کو لے کر چھت پر چلی جاتی، وہاں اسے پڑھاتی اور رات گئے تک اوپر ہی رہتی۔ ایک شام میں حمزہ کو پڑھا رہی تھی کہ اچانک میرے قریب ایک پتھر آ کر گرا، میں نے اسے دیکھا تو پتھر کے ساتھ ایک کاغذ بھی تھا، حیرانگی کے ساتھ میں نے وہ کاغذ اُٹھایا، کھولا تو وہ ایک خط تھا، لکھا تھا بغیر کسی القاب کے ''میں بہت دنوں سے آپ کو چھت پر دیکھ رہا ہوں، پہلے تو سرسری دیکھا پھر دل نے کہا کہ بار بار دیکھوں اور جب بار بار دیکھا تو دل کے راستے کھلتے گئے اور آپ خود بہ خود دل میں آسمائیں، میں جانتا ہوں کہ آپ کو میرا یہ عمل اچھا نہیں لگے گا پھر بھی قسمت آزمانا چاہتا ہوں کہ دیارِ حسن میں میری پذیرائی ممکن ہے یا نہیں۔ فقط آپ کی نظرِ کرم کا منتظر وسیم۔''

میں نے خط پڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو سامنے ہی فلیٹ کی بالکونی میں ایک لڑکا کھڑا نظر آیا، مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کیا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا خط ٹکڑے ٹکڑے کرکے..... پھینک دیا اور خود حمزہ کو لے کر نیچے آگئی۔ اگلی شام پھر ایک خط پتھر کے ساتھ آیا، اس میں بھی وہی بے قراری اور چاہت کا اظہار تھا، میں نے وہ بھی پھاڑ دیا۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں دن بھی وہ مستقل مزاجی سے ڈٹا ہوا تھا، میں اس کے خط ابا یا بھائی کو بھی نہیں دکھا سکتی تھی پہلے ہی سلیم نے طلاق کی وجہ بتاتے ہوئے ابا اور بھائی کو یہی کہا تھا کہ میرا کردار اچھا نہیں ہے۔

وسیم نے ہمت نہیں ہاری، وہ صرف ایک بار مل لینے کے لیے اصرار کرتا رہا، اپنے دسویں خط میں اس نے لکھا کہ کل دوپہر دو بجے میں اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول دوں گا تم میرے گھر آجانا، اگر نہ آئی تو پھر میں خود تمہارے گھر آجاؤں گا۔ میں نے وہ خط بھی اسے دکھا کر پھاڑ دیا مگر اندر سے مضطرب ہوگئی۔ کیا پتا وہ سچ مچ ابا سے ملنے آجائے۔ رات بھی اسی فکر میں گزر گئی، دوسرے دن دوپہر کو میں نے سعدیہ سے کہا کہ میں حمزہ کی کچھ چیزیں خریدنے کے لیے بازار جا رہی ہوں۔ اس نے حمزہ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ میں گھر سے نکلی تو سناٹا تھا، وسیم کے فلیٹ کا تو مجھے پتا تھا، میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے دروازے پر پہنچی اور تیزی سے کھلے دروازے کے اندر داخل ہوگئی۔ سامنے ہی وہ کھڑا تھا، دور سے بھی وہ بہت اچھا لگتا تھا مگر قریب سے دیکھا تو وہ بہت خوبصورت لڑکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کرلیا اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ پہلے تو اس نے میرے آنے کا شکریہ ادا کیا تقریباً ایک گھنٹا میں وہاں بیٹھی رہی اس دوران زیادہ تر وہی بولتا رہا۔ اس نے

اپنے بارے میں بتایا۔ میں نے بھی اسے سلیم سے طلاق اور حمزہ کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ یہ بات جانتا تھا کہ میں حمزہ کی ماں ہوں۔ اس نے اپنی محبت کا یقین دلایا، قسم کھائی کہ وہ میرے بیٹے کو باپ کی محبت دے گا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب میں اس کے فلیٹ سے نکلی تو وسیم کی محبت پر یقین کر چکی تھی۔

وسیم الیکٹریکل انجینئر تھا۔ لاہور میں علامہ اقبال ائرپورٹ کی تعمیر شروع ہوئی تو وہاں بہت سی کمپنیاں کام کر رہی تھیں۔ وسیم پشاور کا رہنے والا تھا اور اپنی کمپنی کی طرف سے لاہور ائرپورٹ پر کام کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس کے ساتھ تین لڑکے اور تھے۔ کمپنی نے انہیں فلیٹ لے کر دیا تھا۔ یہاں دو سال تک رہنے کا معاہدہ تھا۔ یعنی جب تک اقبال ٹرمینل مکمل طور پر تیار نہ ہو جاتا۔ ائرپورٹ کی کنسٹرکشن کا کام ہو چکا تھا اب بجلی پانی لفٹ کی تنصیب اور دوسرا کام ہو رہا تھا۔ وسیم کی اس ملازمت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار اسے دوسرے شہر بھیجا گیا تھا۔ وسیم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کام ختم ہوتے ہی واپس جائے گا اور اپنی والدہ و بہن کو لے آئے گا۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی اور میں جو بے رنگ زندگی گزار رہی تھی۔ اس کی محبت کی شدت نے میری زندگی میں نیا رنگ بھر دیا۔ پہلے حمزہ اور اب وسیم تھا جن کی وجہ سے میری زندگی میں رنگ بھر گئے۔ سلیم کا دیا ہوا دکھ فراموش کر کے میں نے وسیم کی محبت کو دل میں بسا لیا تھا۔ میری اور وسیم کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ لاہور کی ساری سیرگاہوں، ہوٹلوں، پارکوں میں ہم ملے۔ اس کے فلیٹ میں بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ رہنے والے تینوں لڑکے اس کے رازدار تھے۔ ہر ملاقات پر حمزہ میرے ساتھ ہوتا۔ وسیم حمزہ سے بہت پیار کرتا اس کے لیے کھلونے کپڑے چاکلیٹ وغیرہ لاتا۔ میں دل و جان کی تمام شدتوں سے وسیم سے پیار کرنے لگی تھی۔ ابھی تک گھر والوں کو کوئی خبر نہیں تھی۔ مگر ایک دن سعدیہ نے اچانک کسی ضرورت کے تحت میرا پرس کھولا تو وسیم کی تصویر نکل آئی۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔ میں بھی کوئی رازدار چاہتی تھی پھر سعدیہ مجھ سے چھوٹی بھی تھی اور مجھ سے پیار بھی بہت کرتی تھی۔ میں نے اسے وسیم کے بارے میں بتایا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر اس نے کہا کہ وہ بھی وسیم سے ملے گی۔ میں نے اس سے وعدہ لیا کہ باجی اور بھائی کو اس معاملے کی خبر نہ ہو، جب وسیم اپنے گھر والوں کو لے کر آئے گا تب انہیں پتا چلنا چاہیے۔ سعدیہ نے وعدہ کر لیا۔ میں نے اگلی ملاقات میں سعدیہ کو وسیم سے ملوایا۔ سعدیہ اس سے بہت خوش دلی سے ملی۔ اسے کہنے لگی ہماری باجی بہت دکھی ہیں اب آپ اسے ملے ہیں تو انہیں بہت سی خوشیاں دیجیے گا۔

سعدیہ کو رازدار بنا کر میں مطمئن ہو گئی۔ اب مجھے ابا سے بات کرنا تھی۔ وسیم کے گھر والوں کے آنے سے پہلے میں ابا کو بتا دینا چاہتی تھی۔

وسیم سے ملاقات جاری تھی۔ ہم تنہائی میں بھی ملنے لگے تھے۔ تنہائی میں ہونے والی ملاقاتوں نے ہم دونوں کے درمیان کی ساری دوریاں ختم کر دی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کہ غیر مرد اور عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو ندامت بھی ہوئی پھر وسیم کی باتوں نے وہ احساس بھی ختم کر دیا بقول اس کے کہ محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ میں کوئی تم سے فلرٹ نہیں کر رہا، ہم دونوں بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔ سو جو احساسِ گناہ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ وسیم اور میری محبت کو تقریباً ڈیڑھ سال ہونے والا تھا۔ ائرپورٹ کا کام بھی مکمل ہونے کو تھا، وسیم کے واپس جانے میں دو ماہ رہ گئے تھے۔ ایک دن میں حمزہ کو لینے اسکول جا رہی تھی کہ وسیم سے ملنے کو دل چاہا، پچھلے دو دنوں سے وہ بہت مصروف تھا۔

اس لیے وسیم کے فلیٹ کی طرف آ گئی۔ لنچ ٹائم پر وہ روزانہ گھر آ جایا کرتا تھا۔ چونکہ اس کے ساتھ رہنے والے لڑکے مجھے جانتے تھے اس لیے اگر وہ ہوتے بھی تو دوسرے کمرے میں چلے جایا کرتے تھے۔ سعدیہ اور ستارہ باجی شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھیں۔ سو میں مطمئن ہو کر وسیم کی طرف آ گئی۔ بیل بجائی تو کافی دیر بعد دروازہ کھلا، دروازہ کھولنے والا وسیم ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے انہوں نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا بات ہے؟ اندر آنے کے لیے راستہ بھی نہیں دو گے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں رابعہ، دراصل اندر ہماری کمپنی کے مالک آئے ہوئے ہیں۔ وہ کھانا کھا رہے ہیں۔ اس وقت تم چلی جاؤ میں بعد میں تمہیں فون کروں گا۔“ (ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گئی ہوں کہ وسیم نے مجھے ایک موبائل فون لے کر دیا تھا، وہ مجھے فون کر دیتا یا میسج بھیج دیتا تھا)

میں واپس آ گئی اور شام تک اس کے فون کا انتظار کرتی رہی مگر فون نہیں آیا، دوسرے دن دوپہر کو فون آیا کہ وہ میرا گھر پر ہی انتظار کر رہا ہے۔ میں سعدیہ کو اس کے گھر جانے کا کہہ کر اس کی طرف آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح ہم دونوں بہت والہانہ انداز میں ملے، باتوں کے دوران اچانک اس نے کہا۔

”رابعہ..... تمہارے شوہر نے تمہیں طلاق کیوں دی تھی؟“

میں حیران ہو گئی کیونکہ میں نے اسے ساری بات پہلے ہی بتا دی تھی۔ ”میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میری بڑی باجی نے سازش کر کے میرے شوہر کو میرے خلاف ورغلایا تھا۔“

”ہاں ہاں مجھے یاد آیا، تم نے ذکر کیا تھا میں بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔“

وسیم کی محبت اور توجہ نے میری ساری محرومیاں ختم کر دی تھیں، مجھے یقین تھا کہ بہت جلد وہ مجھے دلہن بنا کر پشاور لے جائے گا اور حمزہ کو ساری عمر باپ کا پیار دے گا، وہ اپنی آنکھوں اپنے لہجے سے سچا لگتا تھا، دیوانگی کی حد تک مجھے چاہتا تھا۔

17 مارچ 2003ء کو پرویز مشرف کو اقبال ٹرمینل کا افتتاح کرنے کے لیے آنا تھا، اس سے ایک دن پہلے میں وسیم سے ایک پارک میں ملی تھی، اس نے کہا کہ چند دنوں تک وہ پشاور چلا جائے گا اور پھر اپنے گھر والوں سے بات کر کے امی اور بہن کو ساتھ لائے گا۔ میں اس کے جانے سے اداس تو تھی مگر اس بات کی خوشی تھی کہ وہ بہت جلد مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آئے گا۔ جس دن افتتاح ہوا، اس سے اگلے روز وسیم کی روانگی تھی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ اس دن صبح دس بجے فلیٹ پر ملاقات کریں گے۔ اس کے ساتھ والے لڑکے کچھ شاپنگ وغیرہ کیلئے جانے والے تھے اس وقت وہ اکیلا ہوگا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے موبائل پر رِنگ کر کے آنے کا بتائے گا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ دس، گیارہ اور پھر بارہ بج گئے۔ میں پریشان ہو گئی۔ سعدیہ بھی گھر پر نہیں تھی وہ صبح سے ہی اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی تھی۔ بھائی اور باجی نے تقریباً مجھ سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ ایک بج گیا تو سعدیہ واپس آئی، میں نے اسے وسیم کے بارے میں بتایا اور اس سے کہا کہ وہ کسی طرح پتا کرے کہ وسیم کہاں ہے کیونکہ وہ اپنا موبائل بھی بند کر چکا تھا۔ میں بار بار اسے فون کر رہی تھی مگر اس نے موبائل آف کر رکھا تھا۔ سعدیہ نے مجھے اتنا پریشان دیکھا تو وہ کہنے لگی میں خود جا کر پتا کرتی ہوں، وہ وسیم کے فلیٹ تک گئی اور جلد ہی واپس آ گئی۔ اس نے بتایا کہ فلیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔ میں تو رونے لگ گئی۔ سعدیہ نے کہا ”ہوسکتا ہے وہ لوگ کہیں شاپنگ کے لیے چلے گئے ہوں اور وسیم ان کے ساتھ ہوگا۔“

میں رات گئے تک انتظار کرتی رہی۔ دوسرے دن میں حمزہ کو اسکول چھوڑنے گئی تو واپسی پر فلیٹ پر چلی گئی۔ وہاں دیکھا کہ تالا لگا ہوا ہے۔ میرا دل ڈوب گیا اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا وسیم کی کوئی خبر نہیں ملی، میں دن رات تڑپ رہی تھی آخر ایک دن میں ائرپورٹ چلی گئی، حمزہ میرے ساتھ تھا وہاں میں نے وسیم کی کمپنی کا نام لے کر کسی کو بلانے کو کہا۔ ایک پولیس والا ادھر کھڑا تھا۔ میں نے اس کی منت کی۔ اس نے کہا کہ اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ اچھا آدمی تھا میری پریشانی دیکھ کر اس نے مجھے ایک جگہ رکنے کو کہا اور خود پتا کرنے چلا گیا، کافی دیر کے بعد وہ ایک لڑکے کے ساتھ واپس آیا۔ اس نے کہا کہ یہ لڑکا جس کا نام طاہر تھا۔ وسیم کے ساتھ ہی کام کرتا ہے میں نے اسے وسیم کی تصویر دکھائی۔ اس نے تصدیق کی کہ یہ واقعی وسیم ہے۔

”وہ کہاں ہے؟“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔ ”میں کافی دنوں سے اسے تلاش کر رہی ہوں۔“

طاہر نے کہا، ”وسیم تو کافی دن ہوئے واپس پشاور چلا گیا ہے۔“

میں نے یہ بات سنی تو میری ٹانگوں سے جان نکلنے لگی، وہ مجھے ملے بغیر چلا گیا تھا، میں کچھ دیر تو شاید بیٹھی رہی پھر میں نے کہا کہ بھائی آپ کی مہربانی ہوگی مجھے اس کا پشاور کا نمبر دے دیں۔

اس نے کہا کہ ہمارے پاس اس کا کوئی نمبر نہیں ہے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا ہے۔ میں وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ مجھے روتے دیکھ کر حمزہ بھی رونے لگا، وہ لڑکا پریشان ہو گیا پھر اس نے کہا ”میں جانتا ہوں تم رابعہ ہو، وسیم نے ہم سب لڑکوں کو تمہارے بارے میں بتا رکھا تھا۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ تم سے شادی کرے گا۔ تو پھر تمہیں یوں بغیر ملے کیوں چلا گیا؟“

میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا اور اس کا نمبر بھی لے لیا۔ گھر آ کر میں بہت پریشان رہی، اب میں انتظار و امید کی کیفیت میں دن گزار رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد طاہر کا فون آیا، اس نے مجھے وہیں ائرپورٹ بلایا تھا، میں وہاں گئی تو اس نے بتایا کہ میں نے اپنے طور پر پشاور میں وسیم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے وہاں سے پتا چلا ہے کہ وسیم فرم چھوڑ چکا ہے اور وہ اب یہاں کام نہیں کرتا۔ میں یہ بات سن کر گم صم بیٹھی رہ گئی۔ میری حالت اس مسافر کی سی تھی جس کی جمع پونجی راستے میں ہی لٹ گئی ہو۔ وہ لڑکا کہنے لگا تمہیں ایک غیر لڑکے پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے تھا وہ تمہارے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔

’’نہیں ...... میں نے تڑپ کر کہا وہ ایسا نہیں تھا، وہ میرے ساتھ مخلص تھا، مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا کہ وہ بے وفا ہے۔‘‘

’’تو ٹھیک ہے اب جاؤ اور انتظار کرو شاید وہ آجائے۔‘‘ اس نے کہا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر التجا کی۔ ’’خدا کے لیے بھائی، کسی نہ کسی طرح پشاور میں اس کی رہائش کا ایڈریس یا فون نمبر کا پتا کروا دو، میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گی، تمہیں تمام عمر دعائیں دوں گی۔‘‘

’’دیکھو بی بی، یہ کام بہت مشکل ہے، میں لاہور میں رہ کر کس طرح اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کر سکتا ہوں۔‘‘

میں رونے لگی اور پھر التجا کی، اسے کہا کہ جتنے بھی پیسے خرچ ہوں گے میں دوں گی، کسی بھی طرح اس کا فون نمبر لا دیں۔ یا اگر وہ ملے تو صرف ایک بار مجھے خود کہہ دے کہ وہ مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، پھر مجھے یقین آئے گا، میرا دل نہیں مانتا کہ وہ بے وفا ہے، یا وہ مجھ سے فلرٹ کر رہا تھا۔

وہ لڑکا طاہر بہت اچھا تھا اس نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا، پندرہ بیس دنوں کے بعد اس کا فون آیا، اس نے مجھے وسیم کے گھر کا نمبر دیا، میں اس کی بہت احسان مند ہوئی، بعد میں، میں نے وسیم کے گھر کا نمبر ملایا، کافی دیر کے بعد کسی نے اُدھر سے فون ریسو کیا۔ ’’ہیلو۔‘‘ ایک مردانہ آواز آئی۔

’’کیا وسیم صاحب ہیں؟‘‘ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

’’جی نہیں وہ تو موجود نہیں ہیں۔‘‘ جواب ملا۔

’’کہاں ہیں؟‘‘ میں نے پھر پوچھا۔

’’وہ تو دبئی جا چکا ہے، آپ کون ہیں اور وسیم سے کیا کام ہے؟‘‘ دوسری طرف سے سوال ہوا، مگر میری ہمت تو یہ سن کر ہی ٹوٹ گئی تھی کہ وسیم پاکستان سے باہر چلا گیا ہے۔ اب تو کوئی آس کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اس رات مجھے بہت تیز بخار ہو گیا، دو دن تک میں نیم بے ہوشی کی حالت میں رہی، حمزہ کی بھی مجھے ہوش نہ تھی تیسرے دن حالت سنبھلی۔ ابا نے ڈاکٹر گھر بلوا لیا تھا، سعدیہ میری تیمارداری کر رہی تھی۔ ستارہ باجی اور بھائی میرے قریب بھی نہیں آئے تھے۔ میں ایک بار پھر زندہ ہوتے ہوئے بھی مر گئی تھی۔ وسیم کی باتیں اس کا والہانہ پن اس کی چاہت یاد آتی تو دل تڑپ اٹھتا۔ دو سال تک وہ مجھے بے وقوف بناتا رہا تھا، میں دوبارہ محبت کے دھوکے میں برباد ہو گئی تھی ایک بار سلیم کی محبت نے مجھے برباد کیا، اپنی بہن کی نظروں میں میں اس کی خوشیوں کی قاتل ٹھہری اور وہ بھی بے وفا نکلا میری محبت کا صلہ طلاق کی صورت میں دیا، دوسری بار وسیم نے برباد کیا، بشریٰ رحمٰن نے اپنے ایک ناول میں لکھا ہے۔

’’مرد دریافت کا پرندہ ہے جب عورت کے وجود میں اسے دریافت کرنے کو کچھ نہیں رہتا تو وہ اُڑ جاتا ہے، کسی نئی عورت کو دریافت کرنے کے لیے۔‘‘

کتنا درست تجزیہ کیا تھا رائٹر نے مرد کے بارے میں۔ مرد کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

☆☆☆

میں زندگی گزار نہیں گھسیٹ رہی تھی کہ ایک جان لیوا انکشاف ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا، حمزہ کو اسکول سے لے کر آئی اس کا یونیفارم تبدیل کروا کر اس کے لیے کھانا لینے کچن کی طرف جا رہی تھی کہ ستارہ باجی کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنا نام سن کر غیر ارادی طور پر رک گئی، اندر سعدیہ، ستارہ باجی اور بھابی تھیں، ستارہ باجی سے کہہ رہی تھی۔

بڑا اونچا اُڑ رہی تھی وسیم کی محبت میں، دیکھا کیسے منہ کے بل گرا دیا ہے۔ ایسی بہن تو خدا کسی کو نہ دے، پہلے بڑی بہن کے ہونے والے شوہر کو چھینا، پھر چھوٹی بہن جس سے پیار کرنے لگی تھی اسے اپنے جال میں پھنسا لیا۔

سعدیہ کہے جا رہی تھی، میں تو وسیم کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھی تھی، مگر یہ کھنی اسے لے اُڑی، چھت پر حمزہ کو پڑھانے کے بہانے وسیم کو دیکھتی تھی، کیا بتاؤں جب مجھے پتا چلا کہ جس لڑکے کو میں پسند کرتی ہوں وہ رابعہ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے تو آگ ہی لگ گئی، ٹھیک ہے اگر وہ میرا نہیں بنا تو اس چڑیل کا کیوں بنے۔ کہتا تھا شادی کروں گا، حمزہ کو باپ کا پیار دوں گا، بڑی مشکلوں سے اس نے یقین کیا کہ رابعہ کا کردار ٹھیک نہیں ہے، اسی لیے اس کے شوہر نے اسے طلاق دی اور یہ کہ حمزہ بھی ناجائز اولاد ہے۔ بڑی محنت کی ہے میں نے اسے یقین دلانے میں، اسی لیے تو بغیر ملے چلا گیا۔ ہونہہ، بڑی خوش تھی، پھر سے دلہن بننے کے خواب دیکھ رہی تھی، بہنوں کی دشمن۔‘‘ سعدیہ کے لہجے میں اتنی نفرت تھی کہ میں اپنی جگہ سن ہو گئی، تو سعدیہ نے وسیم کو میرے خلاف ورغلایا تھا اور وہ کتنا کانوں کا کچا نکلا کہ مجھ سے تصدیق بھی نہیں کی حالانکہ میں اسے سب کچھ بتا چکی تھی۔ میری بہنوں نے میری خوشیوں کو دوبارہ نگل لیا تھا، مجھے تو خبر ہی نہیں تھی کہ ستارہ باجی کے اندر اتنا زہر بھرا ہوا ہے، میرا خیال تھا کہ مجھے طلاق ہو جانے کے بعد تو ستارہ باجی کے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی، حالانکہ سلیم میرا نصیب تھا تو اس کا رشتہ باجی سے کیسے ہو سکتا تھا۔ رشتے تو خدا نے بنا رکھے ہیں ازل سے اور اب سعدیہ جسے میں چھوٹی بہن ہی نہیں بیٹی سمجھتی تھی، اس نے بھی مجھے بے خبری میں ڈس لیا، اگر مجھے خبر ہوتی کہ وہ وسیم کو پسند کرتی ہے تو میں اس کی خاطر پیچھے ہٹ جاتی مگر میری قسمت بقول شاعر کہ

غیروں کو کیا پڑی ہے کہ رسوا کریں ہمیں
ان سازشوں میں ہاتھ کسی آشنا کا ہے

میری آستینوں میں چھپے سانپوں نے مجھے ڈس لیا تھا۔

’’اب دیکھنا میں آگے کیا کرتی ہوں، ستارہ باجی نے کہا، اسے خون کے آنسو رلاؤں گی، یہ مرنے کی دعائیں کرے گی مگر اسے موت نہیں آئے گی۔‘‘

میں آگے نہ سن سکی لڑکھڑاتے قدموں سے واپس آ گئی سوچ سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا، اب نہ جانے مقدر میں کتنی رسوائی لکھی ہو، نہ جانے میری بہنوں کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ میں خوف زدہ ہو گئی، اب تو رات دن عجیب سے خوف میں گزرنے لگے، سوتے سوتے چونک پڑتی اور پھر ایک دن میرا خوف مجسم شکل میں سامنے آ گیا۔

سردیوں کے دن تھے سرِ شام ہی اندھیرا ہو جاتا تھا، رات کا کھانا کھا کر میں حمزہ کے ساتھ لیٹ کر اسے سلا رہی تھی کہ سعدیہ مجھے بلانے آئی کہ ابا بلا رہے ہیں، میں ڈرائنگ روم میں پہنچی تو سامنے ہی سلیم بیٹھا تھا، اسے اچانک اتنے سالوں بعد دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ ابا اور ارسلان بھائی وہاں موجود تھے ’’آؤ بیٹی...... ابا نے مجھے پاس بٹھا لیا، سلیم تم سے ملنا چاہتا تھا، میں نے اسے گھر بلا لیا۔‘‘

’’اب کس لیے ملنا چاہتا ہے، اب ہمارے درمیان کون سا رشتہ رہ گیا ہے۔‘‘ میں نے تلخی سے جواب دیا۔

’’ایسا نہ کہو رابعہ، میاں بیوی میں ناراضی ہو ہی جاتی ہے دس سال تک الگ رہنے کے بعد بھی صلح ہو ہی جاتی ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اب پلیز ناراضی ختم کرو اور میرے ساتھ چلو۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ میرے سر پر تو جیسے آسمان گر پڑا ’’تم نے مجھے طلاق دے دی ہے اب تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔‘‘ میں چیخ کر بولی۔

’’دیکھیں چچا جان، میں نے اسے بُرا بھلا کہا تھا، گالیاں بھی دی تھیں، گھر سے نکلنے کو بھی کہا تھا لیکن میں نے طلاق نہیں دی، میرے امی ابو سے پوچھ لیں، ستارہ باجی وہاں موجود تھی، میں نے اسے طلاق نہیں دی تھی، میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔‘‘ سلیم نے ابو کو مخاطب کر کے بڑی عاجزی سے کہا، ابا نے میری طرف دیکھا۔

’’نہیں نہیں، اس نے مجھے تین بار طلاق دی تھی۔‘‘ میں نے ارسلان بھائی سے کہا۔ ’’ستارہ باجی اور اپنے ماں باپ کے سامنے اس نے مجھے طلاق دے کر گھر سے نکالا تھا۔‘‘ میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔

’’جاؤ ستارہ کو بلاؤ۔‘‘ ابا نے سعدیہ سے کہا، وہ ستارہ باجی کو بلا لائی۔ سلیم، ستارہ باجی کو دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

’’آپ بتائیں کہ میں نے طلاق کا لفظ کہا تھا، اس وقت میں شدید غصے میں تھا صورتِ حال ہی ایسی تھی آپ بتائیں کہ کوئی بھی شوہر اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ ملتے دیکھ سکتا ہے؟‘‘

’’ستارہ تم نے ہی آ کر مجھے کہا تھا کہ سلیم نے رابعہ کو طلاق دے دی ہے۔‘‘ ابا نے باجی سے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئیں میرا دل ڈوبنے لگا، پتا نہیں اب کیا ہونے والا ہے۔ ’’شاید سلیم نے طلاق نہ دی ہو مجھے ہی سننے میں غلطی ہوئی ہو۔‘‘ الفاظ تھے کہ زہر میں بجھے ہوئے تیر، میری روح تک چھلنی ہو گئی، ایک بار پھر میری بہن نے میری بربادی کا سامان کر دیا تھا، ابا اور ارسلان بھائی کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ اس وقت تو وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ بہت جلد مجھے لینے آئے گا، بعد میں میں نے رو رو کر ابا اور بھائی کو یقین دلانے کی کوشش کی، مگر ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی اگلے چند دن کرب و اذیت میں گزر گئے۔ ایک دن وہ پھر آ گیا، اس بار اس کے ماں باپ ساتھ تھے، انہوں نے بھی یہی کہا کہ ہم نے طلاق کا لفظ نہیں سنا، ابا نے کہا کہ تم لوگوں نے سامان کیوں واپس بھیجا تھا تو اس کی ماں کہنے لگی، اس وقت سلیم سخت غصے میں تھا، وہ ہر تعلق ختم کر لینا چاہتا تھا اسی لئے سامان واپس بھیج دیا تھا، اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ ہمیں سامان نہیں چاہیے ہماری بہو واپس کر دیں۔

اب تو ابا اور بھائی کو مکمل یقین ہو گیا، بھائی نے مجھے سمجھایا کہ اب وہ خود چل کر آئے ہیں تو اپنے گھر چلی جاؤ، تم نے اتنا عرصہ جھوٹ بولا، اب جاؤ اپنے گھر۔

میں نے خدا رسول کی قسمیں کھائیں مگر میری کسی نے نہ سنی باجی، بھابی اور سعدیہ سب مجھے جانے پر مجبور کرتے رہے، میں نے صاف انکار کر دیا، مرنے کی دھمکی دی، ابا نے

کہہ دیا کہ تمہیں ہر صورت جانا پڑے گا، جب مجھے بھیجنے کی ہر صورت ناکام ہوگئی تو ابا کو سعدیہ نے میرے اور وسیم کے بارے میں بتا دیا۔ وسیم کو لکھے ہوئے خط اور موبائل فون بھی ابا اور بھائی کو دکھا دیا اور کہا کہ اسی لیے یہ اپنے شوہر کے پاس نہیں جانا چاہتی، ابا اور بھائی تو وہ خط دیکھ کر پاگل ہوگئے۔ دونوں نے مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگئی، میرا سارا وجود زخمی ہوگیا، ابا ستارہ باجی پر بہت یقین کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو باجی کا مجرم بھی سمجھتے تھے، اب ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اسی وقت سلیم کے گھر والوں کو کہہ دیتے کہ اگر شادی کرنی ہے تو بڑی سے ہی ہوگی تو آج تک وہ کنواری نہ بیٹھی ہوتی، ستارہ باجی نے بھی ابا اور ارسلان بھائی سے یہی کہا کہ میرے وسیم سے ناجائز تعلقات تھے۔ ہم منع کرتے تھے تو یہ ہمارے ساتھ لڑتی تھی، دوسری طرف سلیم نے دن رات ایک کر دیا تھا، اس کا کہنا تھا کہ طلاق کا ثبوت لاؤ ورنہ میں عدالت میں بلوالوں گا کہ بغیر طلاق کے میری بیوی مجھے چھوڑ کر بیٹھی ہوئی ہے، میں رابعہ کو معاف کرکے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں ورنہ آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے۔ ایسی باتوں نے ابا اور بھائی کو ڈرا دیا اور انہوں نے مجھے کہہ دیا کہ اگر تم شوہر کے گھر نہ گئیں تو اس گھر میں تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ابا نے سلیم کو بلوالیا اور مجھے زبردستی اس کے ساتھ بھیج دیا۔ حمزہ پہلے تو ڈرا پھر سلیم کی محبت دیکھ کر پُرسکون ہوگیا، سلیم نے اسے کہا کہ میں تمہارا پاپا ہوں، میں دبئی گیا ہوا تھا، اب آگیا ہوں۔

سلیم کے گھر واپس آکر میں نے اس سے کہا کہ اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو میں خودکشی کرلوں گی، تم جانتے ہو کہ ہمارے درمیان طلاق ہوچکی ہے۔ اس لیے ہم میاں بیوی کی حیثیت سے رہیں گے تو گناہ آلود زندگی گزاریں گے۔

اچھا! سلیم نے طنزیہ انداز میں کہا، وسیم کے ساتھ تم بہت نیکی کا کام کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرتے وقت تمہیں گناہ کا احساس نہیں ہوا، میں یہ بات سن کر چپ ہوگئی وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں سلیم کے گھر پر ہی رہ رہی ہوں، وہ میرا اور حمزہ کے تمام خرچے پورے کر رہا ہے، حمزہ کو اس نے بہت اچھے اسکول میں داخل کرادیا ہے۔ میں اس کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے نہیں رہ رہی، وہ جلد ہی شادی کرنے والا ہے، اس کی ماں اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی ہے، میں حمزہ کی وجہ سے زندہ ہوں، سلیم اور اس کے ماں باپ جتنا لفظوں سے مجھے ذلیل کرتے ہیں میں کب کی جان دے چکی ہوتی، مگر حمزہ کی معصوم صورت مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ یہ کوئی زندگی تو نہیں، میں سلیم سے التجائیں کرتی ہوں، ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھے جانے دے، آزاد کردے، مگر میری بہنوں نے ایسا چکر چلایا ہوا ہے کہ وہ کہتا ہے تمام عمر ایسے ہی باندھے رکھوں گا، خود دوسری شادی کروں گا، میں دن رات دعائیں کرتی ہوں کہ خدا سلیم کے دل میں رحم ڈالے وہ خود ہی سب سے کہہ دے کہ میں نے طلاق دے دی ہے۔ شاید یہ میرے گناہوں کی سزا ہے کہ میں اسی طرح نامراد زندگی گزار رہی ہوں۔

میں سلیم کے گھر آنے کے بعد بھی کئی بار اس فرم کے آفس میں گئی ہوں جہاں وسیم کام کر رہا تھا۔ اس لڑکے طاہر سے بھی پوچھتی رہتی ہوں کہ شاید وسیم واپس آگیا ہو، کئی بار میرا دل چاہتا ہے کہ میں پشاور چلی جاؤں وہاں وسیم کا گھر تلاش کروں، اس کے گھر والوں سے التجا کروں، مگر میں اکیلی کس طرح جاؤں، دوسرے سلیم مجھ پر نظر رکھتا ہے، وہ کہتا ہے میں جانتا ہوں جس دن بھی تمہیں کوئی اور مل گیا تم اس کے ساتھ بھاگ جاؤ گی، مگر میں ایسا موقع آنے ہی نہیں دوں گا۔

گھر والوں سے میں نے اپنا تعلق ختم کر دیا ہے۔ ستارہ باجی کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی نہ ہی سعدیہ کا کوئی رشتہ آیا ہے۔ اور میں بھی اب تو یہی بددعائیں کرتی ہوں کہ وہ دونوں بھی میری طرح نامراد رہیں پتا نہیں قصور کس کا ہے؟

یہ کہانی سنانے کا مقصد یہی ہے کہ اگر وسیم یہ کہانی پڑھے یا کوئی اسے جاننے والا تو خدا کے لیے وسیم کو بتائے کہ میں اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہوں، میں نے اس سے سچی محبت کی ہے، وہ ایک بار مجھے ملے تو سہی۔

وسیم تمہیں اس محبت کا واسطہ جو بھی تمہاری آنکھوں سے چھلکتی تھی مجھے اس قید سے آزاد کرادو آکر مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ......

میں تمہاری منتظر ہوں،

اب پتا نہیں یہ میرا انتظار کتنا لمبا ہے شاید عمر بھر کا انتظار ہے، اب تو حمزہ کو بھی سلیم اور اس کے دادا دادی نے میرے خلاف متنفر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایک یہ سہارا بھی مجھے...... چھوٹتا نظر آرہا ہے، مجھے لگتا ہے سلیم اور میری بہنوں کی نفرت ایک دن میرے بیٹے کی آنکھوں میں بھی نظر آنے لگے گی اور شاید اس دن میں اپنا آپ ختم کرلوں؟

محترم ایڈیٹر سرگزشت!

آداب ونیاز۔

میں کوئی لکھاری نہیں ہوں اور نہ کبھی کوئی کہانی لکھی ہے۔ بس پڑھنے کا شوق ہے اس لیے ہر ماہ پابندی سے سرگزشت پڑھتا ہوں۔ دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ میرے ساتھ بھی تو مختلف مواقع پر بہت سے واقعات پیش آئے ہیں تو کیوں نہ کسی ایک واقعہ پر کہانی بنادوں، بس جناب اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ اس کے نوک پلک سنوار کر ضرور شائع کریں۔

خیرالدین
(حیدرآباد)

نسخہ

میں نے ایک دن اس لڑکی سے اپنی پسند کا اظہار کر ہی دیا۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ یہ وہ محلّہ تھا جس میں نئے آنے والی ہر لڑکی کے بارے میں میرے مخبر قسم کے دوست ساری معلومات حاصل کرکے میرے سامنے رکھ دیا کرتے تھے۔

یہ نام ہے اس کا، یہ کرتی ہے، اس کا باپ فلاں کام کرتا ہے۔ اس کے اتنے بہن بھائی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اگر میں ضروری سمجھتا تو اس لڑکی کو ایک نظر دیکھ بھی لیتا تھا۔

لیکن اب تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی لڑکی مجھے پسند آئی ہو۔ اب تک یہی ہوتا آیا تھا لڑکی کو ایک نظر دیکھتا اور یہ کہہ کر ریجکٹ کر دیتا۔ ”نہیں یار۔ یہ میرے معیار کی نہیں ہے۔ تم میں سے جو ٹرائی کرنا چاہے وہ کرسکتا ہے۔“

پھر میرے دوست مجھ سے پوچھتے۔ ”پرنس آخر تمہارا معیار کیا ہے؟“

اور میں انہیں بتانے لگتا کہ میرا معیار کیا ہوسکتا ہے۔ میں اپنے بارے میں بتادوں کہ نام تو میرا خیرالدین تھا کیونکہ یہ میرے دادا کا رکھا ہوا نام تھا اور مجھ میں اسے تبدیل کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن میں نے اس زمانے کے فیشن کے لحاظ سے خود کو پرنس کہلوانا شروع کر دیا تھا۔

جی ہاں اس زمانے میں بے شمار پرنس ہوا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ریڈیو کے فرمائشی پروگراموں سے ہوا کرتا۔ ہر شہر میں تھوک کے بھاؤ پرنس ہوا کرتے تھے۔

تو میں بھی اپنے محلے کا پرنس تھا۔

تو اس پرنس کو آج تک کوئی ایسی لڑکی نہیں مل سکی تھی جو میرے معیار کی ہوتی۔ یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ میرا معیار کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے لیے تو جو بھی ملتی وہ غنیمت ہوتی۔

لیکن لگتا ہے کہ اس زمانے کی لڑکیوں کو فرمائشی پروگرام سننے کا شوق نہیں تھا ورنہ انہیں معلوم ہوجاتا کہ جیا بے

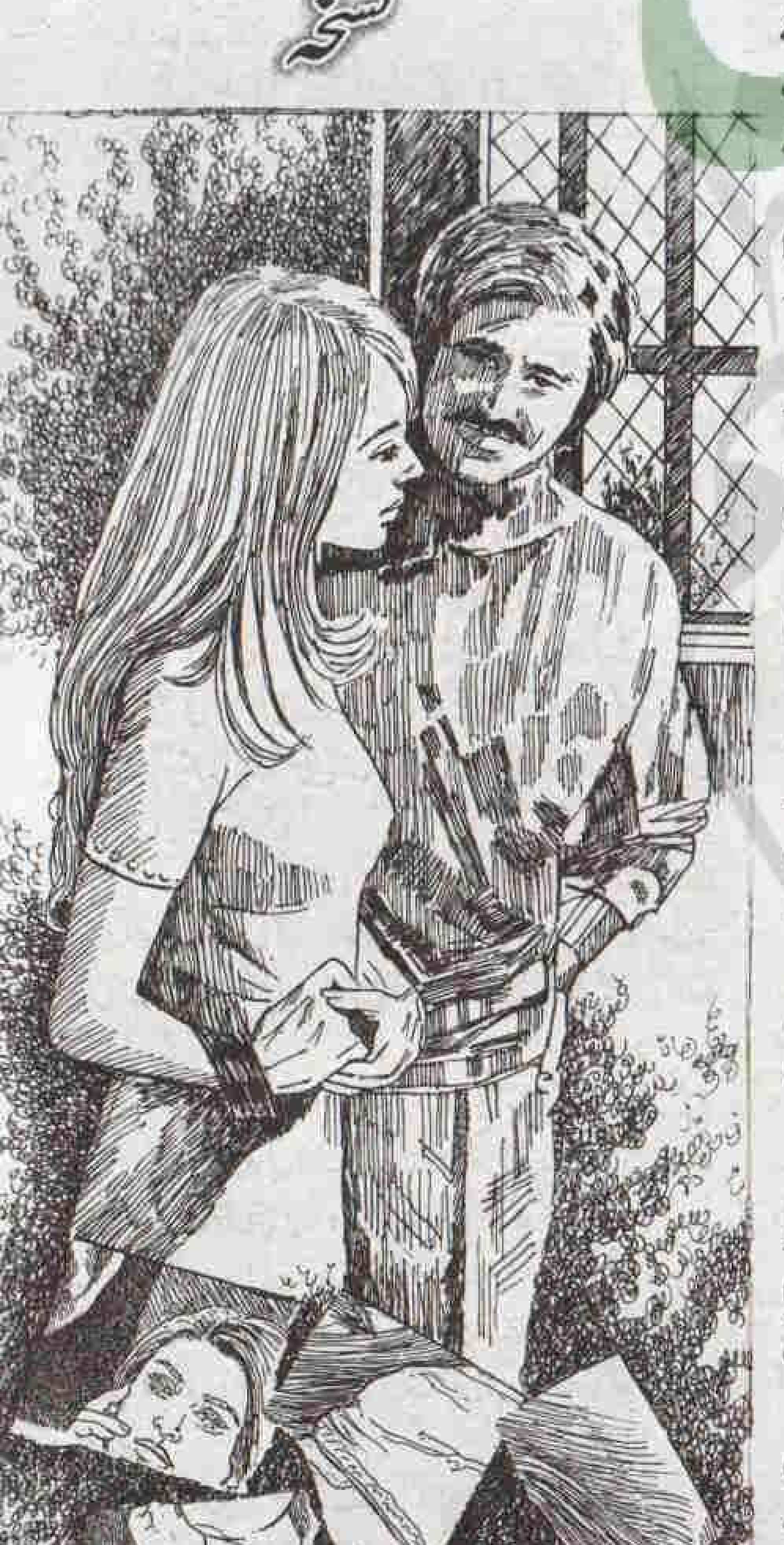

قرار ہے، چھائی بہار ہے کی فرمائش کرنے والا پرنس... خیرالدین انہی کے محلے میں رہتا ہے۔

اس لیے کسی نے مجھے لفٹ نہیں دی۔ البتہ صرف ایک بار ایک لڑکی نے مجھے اپنا سمجھ کر آواز دی تھی۔ وہ مجھے محلے سے دور کہیں اور مل گئی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں سے اتنا راشن اٹھا کر لا رہی تھی کہ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھوں میں کپڑے کے بڑے بڑے تھیلے تھے جن میں بہت کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس قسم کے محبت بھرے اتفاقات بس اتفاق ہی سے ہوتے ہیں کہ میں اس طرف سے گزر رہا تھا کہ اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔

''ارے بات سنیں۔''

میں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''جی فرمائیں۔''

''آپ مجھے جانتے ہیں نا، میں نور بانو ہوں۔'' اس نے بتایا۔

اب میں اس سے کیا کہتا کہ میں تو اسے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں لیتا رہتا ہوں۔ جاننا تو بہت معمولی سی بات تھی۔ ''جی ہاں کیوں نہیں۔'' میں اس وقت سراپا اخلاق بنا ہوا تھا۔ ''آپ اسی محلے میں رہتی ہیں جہاں میں رہتا ہوں۔''

''پلیز آپ میری ہیلپ کر دیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک تھیلا آپ اٹھالیں۔ گھر جا رہی ہوں۔''

''جی نہیں۔'' میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

''جی!'' اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''میں ایک تھیلا نہیں۔ دونوں تھیلے اٹھاؤں گا۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی۔

میری یہ بات سن کر وہ مسکرا دی، بہت خوبصورت مسکراہٹ تھی اس کی۔ زندگی سے بھرپور حوصلہ دلاتی ہوئی۔ میں نے دونوں تھیلے لے لیے اور کچھ دیر کے لیے جھول کر رہ گیا۔

کم بخت ان تھیلوں میں کیسا وزنی سامان ٹھونس کر لے جا رہی تھی۔ بہرحال اب تو یہ حماقت کر ہی چکا تھا۔ اس لیے تھیلا اٹھائے چل پڑا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ تھی۔

پہلی دفعہ اس طرح کسی لڑکی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور وہ بھی محلے کی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ وہ بھی عجیب تھی۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ چل رہا ہوں۔

میرے دوستوں نے یہ ماجرا دیکھا اور وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس وقت میری چال میں ایک خاص قسم کی مردانگی پیدا ہو گئی تھی حالانکہ دونوں تھیلے میرے ہاتھوں کی ہڈیاں توڑ رہے تھے۔ اس کے باوجود میں ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے ان تھیلوں کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

اسی طرح میں اس کے مکان کے دروازے تک پہنچ گیا۔ ''لائیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب آپ شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔''

''آپ بہت اچھے ہیں۔ اس محلے کے دوسرے لوگوں سے بالکل الگ۔''

میں مسکرا کر رہ گیا تھا۔

بہرحال میں نے اس کے دونوں تھیلے اس کے گھر پہنچا دیے اور محلے کے نوجوانوں میں ایک ہیرو کی حیثیت اختیار کر لی سب کے سب مجھ سے بہت مرعوب ہو گئے تھے۔

میں جانتا تھا کہ اب یہ سلسلہ چل نکلے گا کیونکہ سلسلے اسی طرح شروع ہوتے ہیں۔ میں نے اس لڑکی کے حوالے سے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ نوجوانوں کی مبارکبادیں وصول کرنے لگا۔

اس دن کے بعد سے کئی دنوں تک پھر اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ شاید مصروف ہو گئی تھی۔ بہرحال جب ایک دن دکھائی دے گئی تو میں لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس دن میں نے بہت کلف دار کپڑے پہن رکھے تھے۔

''کیسی ہیں آپ؟'' میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''اس دن کے بعد سے دکھائی نہیں دیں۔''

''کیوں؟'' وہ غرانے لگی تھی۔ ''میرا دکھائی دینا کیا ضروری ہے۔''

''شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔'' میں اس کے انداز سے گڑبڑا گیا تھا۔ ''میں وہی ہوں جو اس دن آپ کے تھیلے اٹھا کر لایا تھا۔''

''تھیلے اٹھا کر لائے تھے تو کیا سر پر بٹھا لوں۔'' اس نے کہا۔ ''یا تم سے محبت شروع کر دوں؟ بہتر یہی ہے کہ تم آئندہ مجھے دکھائی نہ دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

اس کی ڈانٹ پھٹکار نے میرے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ دل چاہا کہ کم بخت کا گلا گھونٹ دوں۔ ایسی بے عزتی

ہوئی تھی کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔

کہاں تو میں کچھ اور سوچ رہا تھا اور کہاں اس کے یہ تیور تھے۔ میں دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیج کر آگے بڑھ گیا۔ ذرا سی دیر میں میرا سارا عشق ہوا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد میں نے محلے کی لڑکیوں پر دھیان دینا چھوڑ دیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شاید میری قسمت میں اب کوئی بھی نہیں ہے۔

لیکن اس لیے کہا جاتا ہے کہ مایوسی گناہ ہوتی ہے۔

کچھ دنوں کے بعد ایک لڑکی واقعی... مل گئی۔ وہ لوگ نئے نئے محلے میں آئے تھے۔ انہوں نے ایک بڑا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ بہت ہی آباد قسم کا خاندان تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو اس گھر میں دیکھا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے، لڑکے، لڑکیاں لائن لگی رہتی تھی۔

اور لڑکیاں بھی بہت خوبصورت ایک سے ایک۔ ان ہی میں ایک لڑکی مجھے پسند آ گئی تھی۔ وہ سب سے طرحدار تھی اس کے انداز سے اس کے مزاج کی شوخی اور شرارت کا اظہار ہوتا تھا۔

میں ایک دو بار اس کے برابر سے گزرا اس نے بہت بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

بالآخر ایک دن میں نے ہمت کر کے اس سے بات کر ہی لی۔ ''سنیں کیا آپ لوگ نئے نئے محلے میں آئے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''میرا نام۔'' میں خیرالدین کہتے کہتے رک گیا تھا۔ ''میرا نام پرنس خیر ہے۔''

''اچھا نام ہے۔'' وہ مسکرا دی۔

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اس کے بعد راہ چلتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے رہے پھر ایک دن خود اس نے میرے دل کی بات کر دی۔

''سنیں اس طرح راستے میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔''

''تو پھر آپ جو مناسب سمجھیں۔''

''چلیں کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

اس زمانے میں ہمارے محلے سے کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ ہوا کرتا تھا۔ گل رنگ نام تھا اس کا ہم وہیں جا کر بیٹھ گئے۔

ایسا لگا جیسے وہ میرے ساتھ آنے سے بہت خوش ہو رہی ہے پھر اس نے بیٹھنے کے بعد ایک عجیب سی بات پوچھ لی۔ ''یہ بتائیں کیا آپ مجھ سے محبت تو نہیں کرنے لگے ہیں؟''

''آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا؟''

''آپ کے انداز سے۔'' اس نے کہا۔ ''اس معاملے میں لڑکیوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے ذرا سی دیر میں انہیں اندازہ ہو جاتا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ خدا!'' وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ ''کیا آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں بھائی بالکل سچ۔''

''بہت بہت شکریہ آپ کا۔''

میں اس بات پر حیران رہ گیا تھا کہ محبت کے اظہار پر کس بات کا شکریہ۔ بہرحال اس کے بعد ہمارے درمیان ایسی باتیں ہونے لگیں جو پیار کرنے والوں کے درمیان اس وقت ہوا کرتی ہیں جب پہلی بار .... ایک دوسرے کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

ہم دونوں ہی بہت خوش خوش گھر لوٹے تھے۔

اور پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ محبت میں کتنی سرشاری ہوا کرتی ہے۔ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ انسان بادلوں کے درمیان پرواز کرتا رہتا ہے۔

اس سے ایک اور ملاقات تیسرے دن ہوئی۔ اس دن بھی اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ''سنیں ہمارے خاندان میں وہ لڑکی بہت خوش نصیب سمجھی جاتی ہے جس سے کوئی محبت کرتا ہو۔''

کچھ دیر کے انتظار کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی ''جی ہاں، میں شاید خاندان کی دوسری لڑکی ہوں جس کو محبت حاصل ہوئی ہے۔ اسی لیے میرے گھر والے آپ کا شکریہ ادا کرنے آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔''

''کیا!'' میں اس انوکھی بات پر حیران رہ گیا تھا۔ ''یہ...... یہ کیسا دستور ہے؟''

''بس۔ ہمارا خاندان ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا پورے خاندان کی یہی حالت ہے۔''

''ہاں سب اسی دستور پر عمل کرتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''سب آ کر اس لڑکے کا شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے کسی سے محبت کا اظہار کیا ہے۔''

''کون کون لوگ ہیں تمہارے خاندان میں؟''

''گھر میں تو اماں، ابو اور تین بھائی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''خاندان میں ایک خالو پولیس کے sp پھر دو چچا زاد بھائی ہیں وہ ہیں تو مجرمانہ ذہن کے لیکن مجھے بہت چاہتے ہیں بہت پیار کرتے ہیں۔''

''مجرمانہ ذہن سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''ارے غنڈے قسم کے ہیں ذرا سی بات پر پستول نکال لیتے ہیں۔ دو دو بار جیل ہو چکی ہے۔''

''تو کیا وہ دونوں بھی شکریہ ادا کرنے آئیں گے؟''

''ظاہر ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ''ان کے حق تو سب سے زیادہ ہیں۔''

''وہ لوگ کب آئیں گے، میرا مطلب ہے کہ یہ سلسلہ کب سے شروع ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سے۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنی گردن ہلا دی۔

بس وہ دن ہے اور آج کا دن میں اپنے محلے میں لوٹ کر نہیں گیا۔ کرائے کا مکان تھا اس لیے چھوڑنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ میں اس لڑکی کو تو برداشت کر سکتا تھا لیکن اس کے پورے خا۔ ان کو برداشت کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

پھر یہ تفصیل کہ ایک خالو پولیس کے ایس پی تھے اور دو چچا زاد بھائی مجرمانہ ذہنیت کے تھے۔ اس تفصیل نے مجھے ہولا کر رکھ دیا تھا۔

کوئی بعید نہیں تھی کہ کس وقت کس کا دماغ خراب ہو جائے اور وہ میری جان کو عذاب بن جائے۔ اسی لیے عقل مندی اسی میں تھی کہ میں خاموشی کے ساتھ اس محلے سے نکل لوں۔

اور میں اس محلے سے نکل گیا۔

اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا گزری۔ اس نے میرا انتظار کیا ہوگا یا اس نے مجھے کیا سمجھا ہوگا۔

میں تو عزت بچا کر نکل آیا تھا۔ ہاں دوسرے محلے میں آ کر میں نے اپنا پرنس والا خطاب بھی اس خوف سے ترک کر دیا تھا کہ کہیں اس کے خاندان والے مجھے تلاش کرتے ہوئے نہ پہنچ جائیں۔

بہت دنوں کے بعد ایک دن راستے میں اس کے ابو سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے پہچانتے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے با آواز بلند پکارا۔ ''ارے میاں پرنس۔''

میں چونکہ اس محلے میں پرنس کے طور پر مشہور تھا اسی لیے وہ مجھے پرنس کے طور پر پکار رہے تھے۔ ''جی جناب۔'' میں بڑی سعادت مندی سے ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

''میاں تم تو ہمارے محلے میں رہتے تھے نا۔''

''جی جناب لیکن اب میں نے وہ محلہ چھوڑ دیا ہے۔''

''معلوم ہے مجھے۔'' وہ ہنس دیے۔ ''اور میں جانتا ہوں کہ تم نے وہ محلہ کیوں چھوڑا۔''

''جی! آپ جانتے ہیں۔''

''جی ہاں۔'' ان کی مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔ ''میاں تم ہمارے گھرانے کی کسی بھی لڑکی سے ملو گے تو وہ تم کو یہی کہانی سنائے گی جو میری صاحبزادی نے سنائی ہوگی۔''

''میں نہیں سمجھ سکا جناب۔''

''ارے بھائی، اس نے یہی بتایا ہوگا کہ اس کا پورا خاندان تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے آئے گا۔''

''جی ہاں اس نے یہی بتایا۔''

''تو میاں خود سوچو ایسا کون سا خاندان ہوگا جو اتنی بے غیرتی پر آمادہ ہو جائے گا۔''

''تو پھر اس نے ایسا کیوں کہا؟''

''تم بتاؤ تمہارا کیا ردِ عمل ہوا۔''

''ظاہر ہے کہ میں نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا۔''

''بس میاں۔ دوسرے بھی اسی طرح محلہ چھوڑ جاتے ہیں۔''

''میں ابھی بھی آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔''

''میاں یہ سمجھ لو کہ خاندان کی بچیوں کو تم جیسے دل پھینک نوجوانوں سے بچانے کا یہ آسان نسخہ ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ''یعنی انکار مت کرو۔ سامنے والے کی محبت قبول کر لو۔ اس کے بعد بہت نرمی اور پیار سے اسے بتاؤ کہ اس کا پورا خاندان شکریہ ادا کرنے کے لیے آئے گا۔ میاں نوّے فیصد نوجوان یہ سن کر بھاگ لیتے ہیں۔ جس طرح تم بھاگ لیے۔''

''اور جو دس فیصد نہیں بھاگتے ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟''

''پھر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبے میں سچے ہیں پھر ان کی شادی کر دی جاتی ہے اور وہ ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں لیکن میاں تم تو ان نوّے فیصد میں نکلے۔''

وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے اور میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

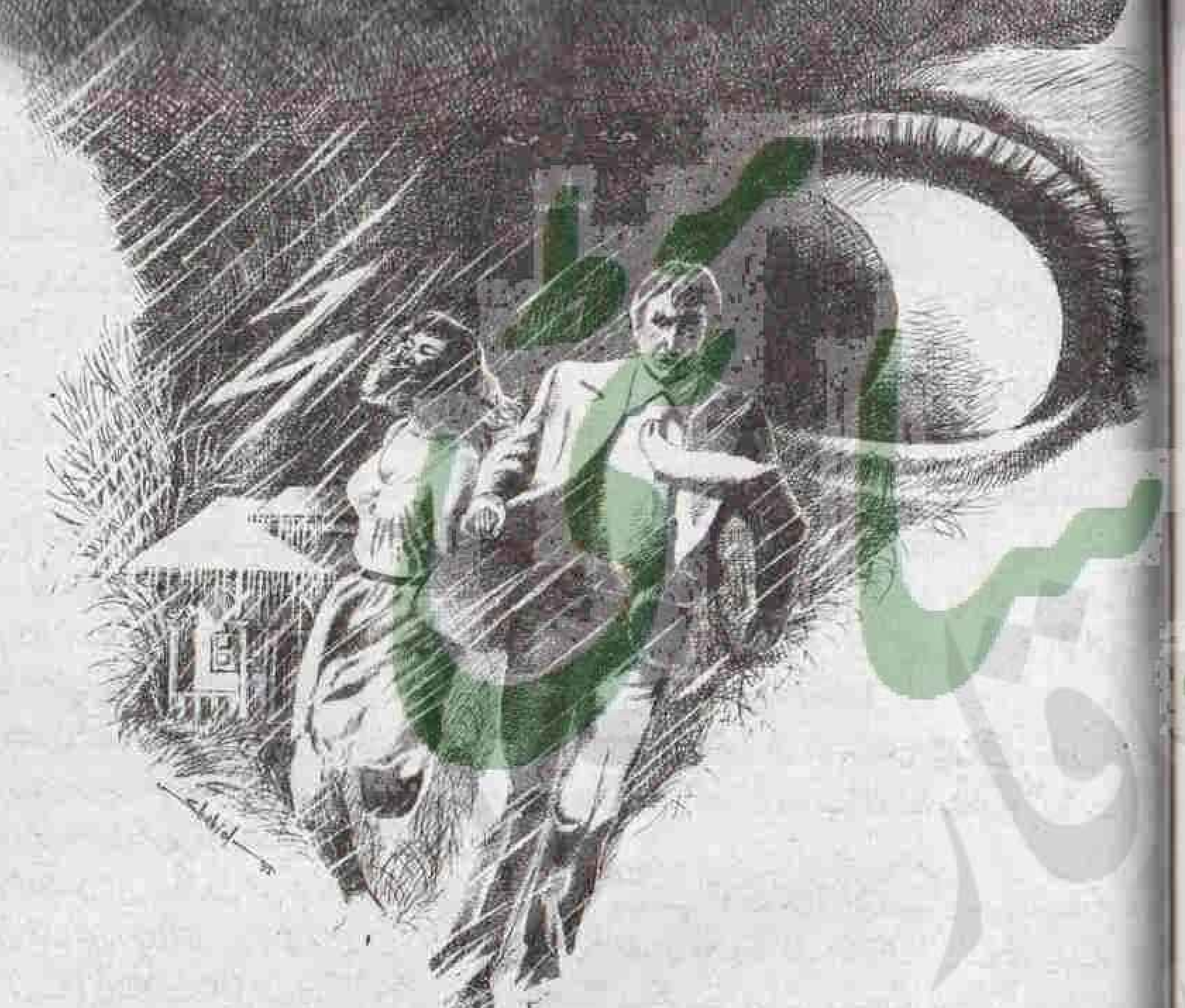

انتقام

جناب معراج رسول صاحب!

السلام علیکم۔

ایک عورت کتنی مجبور ہے، وہ انتقام لینا چاہے بھی تو لے نہیں سکتی بلکہ خود انتقام کا شکار ہو جاتی ہے جیساکہ میرے ساتھ ہوا ہے۔ میری دکھ بھری آپ بیتی پڑھ کر آپ سوچیں گے کہ میں کتنی بے حیا و بے غیرت ہوں مگر میں نے یہ سب کچھ غصے میں کیا تھا جس کی سزا آج تک بھگت رہی ہوں۔

مسز رداز بیر
(سیالکوٹ)

پتا نہیں میری یہ کہانی میری مجبوری کی ہے۔ میرے انتقام کی ہے یا میرے پیار کی ہے۔

یہ کہانی میری شادی کے بعد سے شروع ہوئی۔

میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک سے محبت کی۔ خورشید نام تھا اس کا۔ خود بھی خورشید ہی کی طرح چمکتا دمکتا ہوا۔ ایک مہذب انسان۔ جس میں وہ ساری خوبیاں تھیں جو کسی لڑکی کو اپنی طرف کھینچ سکتی ہیں۔

لیکن لڑکی کی بات اور ہوتی ہے۔ والدین کی بات اور ہوتی ہے۔

نہ جانے اس دور میں بھی ایسے والدین کیوں ہیں، جو اپنی انا اور خاندانی نجابت اور شرافت وغیرہ کے چکر میں پڑ کر اپنی اولادوں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔

میرے والدین نے بھی یہی کیا حالانکہ خورشید انہیں بھی بہت پسند آیا تھا۔ وہ اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس لئے منع کر دیا کہ وہ اُن کے خاندان کے معیار کا نہیں تھا۔

خدا جانے یہ خاندانی معیار کیا چیز ہوتا ہے؟

بہانا یہ تھا کہ خورشید کم تر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ہمارے یہاں کی یہ روایت نہیں ہے کہ ہماری لڑکی کی شادی ایسے گھرانے میں ہو۔ ہم ہڈی سے ہڈی ملا کر دیکھتے ہیں۔

حالانکہ کچھ لوگوں نے ہمارے گھر والوں کو سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ اس دور میں کن چکروں میں پڑے ہو۔ اس کے علاوہ اسلام نے بھی سختی سے منع فرمایا ہے۔ بس اتنا بہت ہے کہ لڑکا شریف اور مہذب ہو۔ تعلیم یافتہ ہو اور اس میں آگے بڑھنے کی لگن ہو۔ لیکن والدین کہاں ماننے والے تھے۔ ان کے سروں پر خاندانی معیار کا بھوت جو سوار تھا۔

بہر حال ہوا وہی جو میرے والدین چاہتے تھے۔

میری شادی زبیر سے کر دی گئی۔ جو خاندانی معیار کے عین مطابق تھا۔ لیکن انتہائی درجے کا ظالم اور بے رحم قسم کا انسان۔ جس نے اپنی اصلیت شادی کے بعد ظاہر کی تھی۔

وہ کسی بینک میں ملازم تھا۔ صورت شکل بھی واجبی سی تھی۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو اسے خورشید سے بہتر ثابت کرتی۔ سوائے نام نہاد خاندان کے۔

اس سے میری شادی کرا دی گئی اور میں خورشید کو یاد کر کر کے روتی بلکتی رہی۔ لیکن لڑکیوں کی قسمت میں تو اس قسم کی مجبوریاں لکھ دی جاتی ہیں۔ میری قسمت میں بھی تھیں۔

شادی کے بعد میں اپنی سسرال آ گئی۔ یہ ایک مختصر سا گھر تھا۔ جس میں وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ لیکن میرے آنے کے بعد جگہ چونکہ کم ہو گئی تھی۔ اس لئے خورشید نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور ہم وہاں شفٹ ہو گئے۔

اب تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جس سے اس کے مزاج کا پتا چلتا لیکن فلیٹ میں شفٹ ہونے کے بعد اس نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے۔

وہ ایک عیاش مزاج کا انسان تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو کان کھول کر سن لو! میں اُن آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو بیویوں کے غلام بنے رہتے ہیں۔''

''میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''تم کو کرنا بھی نہیں چاہئے۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ میں آدمی ذرا دوسرے مزاج کا ہوں۔ دو منٹ میں چھٹی کر دوں گا۔''

''خدا کا خوف کریں، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''میں سب جانتا ہوں کہ خورشید سے تمہارے.... تعلقات تھے۔'' اس نے کہا۔

''جی۔'' میں یہ سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ ''خورشید سے تعلقات؟''

''ہاں، ہاں۔ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''وہ یار تھا تمہارا۔''

''کچھ شرم کریں زبیر۔'' میں بھی بپھر گئی۔ ''خورشید سے صرف میری دوستی تھی۔ اس نے کبھی میرے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

''یہ تو تم کہہ رہی ہو نا۔ میں کیسے یقین کر لوں؟ بہر حال سمجھا دیا ہے تمہیں۔ اب اس سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔''

میں اپنے کمرے میں آ کر رونے لگی۔ یہ کیسا بے رحم آدمی ثابت ہوا تھا۔ اتنا گھٹیا۔ اتنا فالتو۔ اس نے خورشید کے حوالے سے مجھ سے کیسی باتیں کی تھیں۔

بہر حال میں نے اپنے گھر والوں کو یہ سب نہیں بتایا۔ بتانے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ وہ تو مجھے جہنم میں جھونک ہی چکے تھے۔ کہاں وہ خورشید تھا جس کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے اور کہاں یہ زہر اُگلنے والا گھٹیا انسان لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ میرا شوہر تھا۔

میرا قانونی اور شرعی مالک۔ پتا نہیں۔ عورت کی قسمت کا مالک مرد کو کیوں بنا دیا جاتا ہے؟ کیا اس کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہوتی؟ سنا تھا کہ زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ آج کی عورت خود مختار ہو گئی ہے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سب بکواس ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

آج کی عورت بھی وہی صدیوں پرانی عورت جیسی ہے جسے ٹھوکروں پر رکھا جاتا ہے، جسے زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے، کاری کے نام پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ جس پر کتے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ تیرا برس کی عمر میں جس کی شادی اسّی برس کے بوڑھے سے کر دی جاتی ہے۔

یہ سب آج بھی ہو رہا ہے۔ ذرا اپنے ارد گرد دیکھیں۔ اخبارات دیکھیں۔ ٹی وی کے چینلز دیکھیں۔ آپ کو اسی قسم کی خبریں سنائی اور دکھائی دیں گی۔

زندگی اس شخص نے اتنی دشوار کر دی تھی کہ جس کا تصور بھی محال ہے اور اس کے مزاج کی سب سے خطرناک اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ بات بات پر شک کیا کرتا۔ اگر کبھی بازار سے آتے ہوئے دیر ہو جاتی تو اس کا پہلا سوال یہی ہوتا۔ ''ہاں بھئی۔ کیا کہہ رہا تھا خورشید؟''

''خورشید۔ خورشید کہاں سے آ گیا؟''

''اوہ! میں نے سمجھا شاید اس سے ملاقات ہو گئی ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ معنی خیز انداز سے ہنسنے لگتا۔

اس وقت میرے پاس سوائے آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کسی دن اگر میں اچھی ڈریسنگ کر لیتی تو اس کی باتیں شروع ہو جاتیں۔ ''اوہو۔ لگتا ہے آج اس نے کسی بڑے ہوٹل میں بلایا ہے۔ اس لئے اتنا بن ٹھن کر جا رہی ہو۔''

''زبیر۔ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ آپ نے مجھے پاگل کر کے رکھ دیا ہے جب دس دفعہ کہہ چکی ہوں کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تو آپ بار بار ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟''

وہ اپنی زہریلی ہنسی ہنستا ہی رہتا تھا۔

ایک دن مارکیٹ میں اچانک خورشید سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہمیشہ ہی کی طرح تھا۔ خوش اخلاق۔ خوش گفتار۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اس طرح رک گئے تھے۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

''ردا۔ کیسی ہو تم؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ''کیسی گزر رہی ہے۔''

''ہاں۔ زندہ ہوں اور تم...... تم اپنی سناؤ۔''

''میرا کیا پوچھتی ہو۔ یوں زندگی گزار رہا ہوں تیرے بغیر۔ جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں۔''

''تمہارا موبائل نمبر تو وہی ہے نا۔''

''ہاں۔ وہی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن مجھے فون مت کرنا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارا شوہر بہت شکی مزاج قسم کا انسان ہے۔''

میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتی کہ اس شخص کا سارا شک خورشید ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔

اس سے ملاقات کے بعد جب میں بہت اداس سی گھر پہنچی تو ایک نیا دکھ میرے انتظار میں تھا۔ وہ ایک لڑکی... بلکہ اسے عورت کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

اس کے چہرے سے مکاری اور بے شرمی نمایاں ہو رہی تھی۔ زبیر اور وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازہ

> مجھے گدھے پر رشک آتا ہے۔ اس عقلمند جانور نے اپنی بے وقوفی کا پرچار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ہر مشکل کام اور ذمے داری سے محفوظ کر لیا ہے۔ اب وہ بڑی سے بڑی چالاکی کرے تو بھی آپ اسے حماقت پر محمول کر کے ہنس دیں گے اور پیار سے کہیں گے، گدھا ہے گدھا۔ چونکہ آپ اسے خالص بے وقوف تسلیم کر چکے ہیں اور حماقت کے سوا اور کسی بات کی توقع نہیں رکھتے اور گھوڑا...... بے وقوف! اپنی ذہانت کا ڈھونگ رچا کر ہمیشہ کے لیے غلام بن چکا ہے۔ ہر کام جس میں ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے ذمے ہو چکا ہے مثلاً بھرے بازاروں میں تانگہ لیے پھرنا، لڑائیوں میں سواروں اور توپوں کو لے کر آگے بڑھنا، شادی میں دلہا کو اُٹھائے پھرنا۔ اس کے برعکس گدھا، زیادہ سے زیادہ مٹی کا بورا اُٹھایا اور بس......''
>
> ممتاز مفتی کی کتاب ''غبارے'' سے
>
> انتخاب: فہیم تبسم، شورکوٹ

چونکہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے میں ڈائریکٹ لاؤنج میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سٹ پٹا سے گئے تھے۔ پھر زبیر نے بے شرمی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''ردا۔ یہ میری دوست ہیں فریدہ۔''

میں نے کچھ نہیں کہا اور سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُن دونوں کی باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں میرے کمرے تک آتی رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد زبیر میرے کمرے میں داخل ہوا۔ ''چلو۔ میری دوست کے لیے چائے بنا دو۔''

''نہیں۔ میں چائے نہیں بناؤں گی۔ اسے کہیں باہر لے جاؤ۔''

''کیوں لے جاؤں باہر؟'' وہ غرایا۔ ''وہ اتنے دور سے مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''میں نے کہا نا کہ میری دوست ہے۔ اور ہاں، ایک بات سن لو! وہ یہاں آتی رہے گی اور تم اس کے آنے جانے پر اعتراض نہیں کرو گی۔''

''واہ! کیا بات ہے تمہاری۔ خود چاہے کچھ بھی کرتے رہو اور مجھ پر اتنا شک۔ کیا قانون اور شریعت نے تمہیں چھوٹ دے رکھی ہے۔ کیا تمہارا جرم کوئی جرم نہیں ہے؟''

''بس، بس بکواس نہیں۔ میں مرد ہوں، شوہر ہوں

تمہارا۔ تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔"
"کیا کہنے ہیں۔ کیسا دُہرا معیار ہے تمہارا۔"
"خاموش۔" وہ زور سے چیخا۔ اور اس دن اس نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔
میں جیسے سکتے میں رہ گئی تھی۔ وہ مجھے دھمکیاں اور گالیاں دیتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس نے ایک آوارہ عورت کے لئے مجھ پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔ میری توہین کی تھی۔
میں نہ جانے کب تک بستر پر لیٹی ..... روتی رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ دونوں لاؤنج میں کیا کرتے رہے تھے۔
اس کے بعد اس کا یہ معمول بن گیا تھا۔
وہ لڑکی اس کے ساتھ آیا کرتی۔ زبیر کی ہمت دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک بار اس کے ساتھ ایک اور لڑکی آ گئی، پھر ایک اور...
اور میرے لیے اس کا وہی رویّہ، وہی شک، وہی شبہ۔ اس نے اپنی حرکتوں سے مجھے ویران کر کے رکھ دیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر ہاتھ اُٹھانے لگتا۔
اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ آوارہ عورتیں اور لڑکیاں اب بیڈ روم میں بھی جانے لگی تھیں۔ اُس وقت میں لاؤنج میں بیٹھی اپنی قسمت کو روتی رہتی۔
میں نے اپنے گھر والوں کو زبیر کی ان حرکتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب سن کر وہ بے حال ہو جائیں گے۔ بیٹی کا دکھ کون برداشت کر سکتا ہے۔
ورنہ دل تو یہی چاہتا تھا کہ جا کر ابو کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور اُن سے پوچھوں کہ آپ جو خاندان، خاندان کہا کرتے تھے تو دیکھ لیں ایک خاندانی آدمی کو۔ دیکھ لیں کہ وہ کیسی شرافت کا ثبوت دے رہا ہے۔ لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں جانتی تھی کہ ابو اس صدمے کو برداشت نہیں کر پائیں گے۔
کئی سال گزر گئے۔
اس کی حرکتیں اپنی جگہ برقرار رہیں۔ خورشید سے میری کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ اس شریف آدمی نے کبھی مجھے اس کے خلاف بھڑکانے یا بہکانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ میں اسے سب کچھ بتا دیا کرتی۔ اور وہ ہمیشہ یہی کہتا۔ "ردا، یہ تمہارے صبر کا مرحلہ ہے۔ صبر سے کام لو اور اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہو۔ ہو سکتا ہے کہ خدا اسے راہِ راست پر لے آئے۔"
"میرا خیال ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اس کی فطرت ہی خراب ہے۔"
"مایوس مت ہو۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔"
اور بالآخر ایک دن ایک راستہ نکل ہی آیا۔ یہ عجیب واقعہ تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔
ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں زبیر کی ریڑھ کی ہڈی اس بُری طرح متاثر ہوئی کہ وہ مفلوج ہو گیا۔
آپریشن پر سات آٹھ لاکھ روپے بھی خرچ ہو گئے۔ اس کے باوجود کچھ نہیں ہوا۔ وہ مفلوج ہی رہا۔ اس کی ساری اکڑ ختم ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر بے جان لوتھڑے کی طرح پڑا رہتا۔ قدرت نے کیسی سزا دی تھی اس کو۔
پہلے اس کے خاندان والوں نے اس کا ساتھ چھوڑا۔ پھر دوست وغیرہ بھی اس سے دور ہو گئے۔ ظاہر ہے وہ اب مفلوج بھی تھا اور مفلس بھی۔
اور ایک دن میں نے خورشید سے کہا۔ "خورشید۔ تمہیں آج رات میرے گھر آنا ہے۔"
"تمہارے گھر۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "وہ کیوں؟"
"میرے ساتھ رات گزارنے کے لیے۔" میں انتہائی بے باکی سے بولی۔
"ردا یہ کیا کہہ رہی ہو۔ ہوش میں تو ہو؟"
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس شخص نے زندگی بھر مجھے تڑپا تڑپا کے رکھا ہے۔ اتنے دکھ دیے ہیں کہ جن کا شمار نہیں ..... اب میرا وقت آیا ہے۔ میں اسے دکھ دوں گی۔"
"نہیں ردا۔ یہ مناسب نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "تمہیں انتقام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قدرت نے اسے سزا دے دی ہے۔"
"قدرت نے سزا دی ہے، میں نے ابھی نہیں دی۔ یاد رکھو۔ اگر تم نہیں آئے تو پھر میں کسی اور کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔"
"یہ فیصلہ تم اپنے پاگل پن میں کر رہی ہو۔"
"کچھ بھی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے آوارہ بدچلن کچھ بھی کہہ لو لیکن مجھے وہی کرنا ہے جو میں نے سوچ رکھا ہے۔ تم ہاں یا نا میں جواب دو۔ آ رہے ہو یا نہیں؟"
"ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "لیکن بہتر یہی ہے کہ تم یہ سب نہ کرو۔"
مجھ پر اُس دن نہ جانے کیسا جنون سوار ہو رہا تھا۔ اس

لیے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ خورشید میرے لیے کیا سوچ رہا ہوگا۔
"کچھ بھی ہو۔ تمہیں آنا ہے۔" میں نے کہا۔
خورشید سے اچھی طرح وعدہ لینے کے بعد میں گھر واپس آ گئی۔ زبیر بستر پر حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا لیٹا تھا۔ میں اس کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ "زبیر تمہیں معلوم ہے کہ آج میں کس سے ملنے گئی تھی؟ میرا خیال ہے کہ تمہیں اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔ ہاں، میں خورشید سے ملنے گئی تھی۔"
زبیر غصے بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا تھا۔
"اوہو۔ اب ایسا بھی کیا غصہ۔" میں نے کہا۔ "اور ہاں، میں یہ بھی بتا دوں کہ وہ آج رات یہاں آئے گا اور ساری رات ایک کمرے میں میرے ساتھ رہے گا۔"
"ذلیل۔" زبیر پھنکارا۔
"اوہو۔" میں ہنس پڑی۔ "تم مجھے ذلیل کہہ رہے ہو اور تم جو آوارہ لڑکیوں کو لایا کرتے تھے اور کمرے کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ وہ کیا تھا؟ زبیر صاحب! اس وقت تمہارا دور تھا اور آج میری باری ہے۔ تم مجھے روک نہیں سکتے اور تم تو خورشید کو رو رہے ہو نا۔ اب میری ہر رات کسی نہ کسی کے ساتھ گزرے گی۔"
"بے شرم۔" وہ اپنے بال نوچنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں حرکت تھی۔ اسی لیے وہ صرف اپنے بال نوچ سکتا تھا۔
"اوہو۔ میں بے شرم ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "چلو دیتے رہو گالیاں۔ تم اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہو۔" وہ مجھے گالیاں دیتا رہا اور میں ہنستے ہوئے اس کے پاس سے ہٹ گئی۔
اس رات وعدے کے مطابق خورشید مجھ سے ملنے آ گیا تھا۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر زبیر کے سامنے لے آئی۔
"زبیر! یہ دیکھو، پہچانو اس کو۔ یہ ہے میرا وہ عاشق جس کا سایا زندگی بھر تمہاری خباثت اور تمہارے شکی مزاج پر رہا ہے۔ تم نے اس کے حوالے سے کیا کیا تکلیفیں دی ہیں۔ تمہیں تو سب کچھ یاد ہوگا۔ اس وقت تو میں مفت میں بدنام ہو رہی تھی۔ لیکن اب وہی کروں گی جن باتوں کا الزام تم مجھ پر لگاتے چلے آئے ہو۔"
"کم بخت۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" زبیر بلبلانے لگا۔
"اچھا۔" میں ہنس پڑی۔ "کیسے مارو گے۔ یہ بتا دو؟ بددعائیں کرو گے نا۔ تو کرتے رہو بددعائیں۔"

''پردا۔'' خورشید نے کچھ کہا لیکن میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

میں اسے کھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئی۔

''پردا۔ آخر یہ سب کیا کررہی ہو؟'' خورشید نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''بس بیٹھے رہو چپ چاپ۔'' میں نے کہا۔ ''آج رات ہماری اپنی ہے۔ یادگار رات۔ ہم باتیں کریں گے۔ ہمارے درمیان پاکیزگی کا جو رشتہ ہے وہ ہمیشہ برقرار رہے گا۔''

''اب سمجھا۔'' خورشید نے ایک گہری سانس لی۔ ''یعنی تم صرف زبیر سے انتقام لینا چاہتی ہو۔''

''ہاں۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔''

''یہ سن کر میں بہت خوش ہوا ہوں پردا۔'' خورشید نے کہا۔ ''ورنہ تمہارے بارے میں میرے خیالات بدلنے لگے تھے۔''

''چلو۔ تم اپنی شاعری سناؤ۔ ایک عرصے سے میں نے تمہاری غزلیں نہیں سنیں۔''

خورشید بہت اچھا شاعر بھی تھا۔

ہم ساری رات بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں جن کے لیے میں ترس کر رہ گئی تھی۔ اعلیٰ خاندان کے اس فرد کو ایسی باتیں کہاں آتی تھیں۔ وہ تو صرف اعلیٰ خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

ہم اپنے پچھلے عہد میں واپس چلے گئے۔

وقت ایک جست لگا کر بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ ہم اسی طرح پارکوں اور ہوٹلوں میں ملا کرتے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتیں کی جاتیں چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹی جاتیں۔

اور اس رات بھی ویسی ہی باتیں ہورہی تھیں۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ ہم کن حالات میں ہیں اور کمرے سے باہر ایک مفلوج آدمی زور زور سے ہمیں گالیاں دے رہا ہے۔ صبح ہوئی تو میں نے ناشتا تیار کیا اور ناشتے کے بعد خورشید کا ہاتھ تھام کر اسے زبیر کے سامنے لے گئی۔ ''اچھا زبیر! رات کے مہمان واپس جارہے ہیں۔ انہیں الوداع تو کہہ دو۔''

''بکواس بند کرو۔'' زبیر دہاڑا۔

''اچھا خورشید اب جاؤ۔ کل پھر تمہارا انتظار کروں گی۔''

خورشید کشمکش میں مبتلا ہوکر گھر سے چلا گیا۔ میں نے زبیر سے کہا۔ ''زبیر صاحب! تمہیں اب خورشید کے آنے جانے کی عادت پڑجانی چاہیے۔ یہ یہاں روز آیا کرے گا۔''

وہ غصے میں پھر اول فول بکنے لگا تھا۔

اس دوران وہ ملازمہ آگئی جو زبیر کی دیکھ بھال کے لیے رکھی گئی تھی۔ وہ اسے ناشتا وغیرہ کرایا کرتی تھی۔

اس کے بعد سے یہ میرا معمول ہوگیا۔

میں خورشید کو ہر رات بلالیا کرتی اور اسے ساتھ لے جاکر کمرے میں بند ہوجاتی۔ زبیر کو اذیت پہنچا کر مجھے جیسے سکون مل رہا تھا۔

اس شخص نے بھی تو میرے ساتھ یہی کیا تھا۔ اگر آج یہ مجبور نہ ہوجاتا تو پھر یہی کرتا۔ اس کی ہر رات آوارگی کی داستان ہوا کرتی اور میں لاؤنج میں بیٹھی اپنی قسمت کو رویا کرتی۔

لیکن اب وہ خود رو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ سسک رہا تھا اور میں خوش ہورہی تھی۔

اس دوران میں ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ گھر کے معاشی حالات بہت تیزی سے خراب ہوتے چلے گئے۔ زبیر مفلوج ہوکر رہ گیا تھا۔ جو کچھ جمع پونجی تھی وہ اس کے علاج پر خرچ ہوچکی تھی۔

اب گھر میں راشن تک کے لالے پڑگئے تھے۔ زبیر کی دیکھ بھال کے لیے جو ملازمہ رکھی گئی تھی۔ اس کو بھی پیسے دینے پڑتے تھے۔

خورشید کے مالی حالات اگرچہ ٹھیک ہوچکے تھے لیکن اس سے میرا ایسا رشتہ تھا کہ میں اس سے پیسے نہیں مانگ سکتی تھی ورنہ وہ تو زندگی بھر کے لیے میرا خرچ برداشت کرنے کو تیار ہوجاتا۔

ایک شام جب خورشید میرے پاس آیا تو اس نے بتایا۔ ''پردا میں یہاں سے جارہا ہوں، میرا دفتر ایک سال کے لیے جرمنی بھیج رہا ہے۔''

''کیا......!'' مجھے یہ سن کر ایک شاک سا لگا تھا۔ ''تم جارہے ہو؟''

''ہاں۔ اگر تم کہو تو میں منع کردوں۔''

''نہیں تم چلے جاؤ۔ یہ تمہارے اچھے مستقبل کا سوال ہے اور میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔''

خورشید کے جانے کے بعد میں پھر تنہا ہوگئی۔

میں تھی اور مفلوج زبیر۔ خورشید کے حوالے سے میں اس سے اپنا انتقام لے رہی تھی۔ تسکین حاصل کررہی تھی لیکن اب تو خورشید بھی نہیں رہا تھا پھر میں کیا کرتی کس کو پکڑتی۔

ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا تھا کہ میں ساری رات کے لیے باہر رہا کروں لیکن کہاں اس میں تو خطرے تھے نہ جانے کیوں یہ سنک سوار ہوئی تھی کہ زبیر کو بے سکون کرنے اور تڑپانے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ رات بھر کسی کے ساتھ رہا کروں۔ لیکن کون ہوسکتا ہے؟ کاش مجھ پر ایسی جنونی کیفیت نہ ہوتی۔

پھر مجھے اسلم کریانے والے کا خیال آگیا۔

اپنے محلے میں اس کی کریانے کی دکان تھی۔ میرا حساب وہیں سے چلا کرتا تھا ادھیڑ عمر لیکن بہت شائستہ میرا بہت احترام کیا کرتا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب انسان ہے۔

میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن سامنے جو کچھ تھا وہ بہت بہتر تھا۔ ایک شام جب اس کی دکان پر کوئی نہیں تھا تو میں نے اس سے کہا۔ ''مسٹر اسلم تم سے ایک کام ہے۔''

''جی میڈم، فرمائیں۔''

''یہ بتاؤ کیا تم اچھی اچھی باتیں کرسکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں سمجھا؟''

''اسلم صاحب میرے ساتھ ایک نفسیاتی پرابلم ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا علاج یہ ہے کہ میں دنیا جہاں کی باتیں کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کروں ورنہ گھٹن کا شکار ہوجاؤں گی۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔

''تم تو جانتے ہو کہ میرے شوہر مفلوج ہوچکے ہیں اور انہیں باتیں کرنی بھی نہیں آتیں اسی لیے میں کسی پڑھے لکھے معقول آدمی کی تلاش میں ہوں۔''

''میں حاضر ہوں میڈم! اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔''

''تو پھر رات کو میرے گھر آجانا۔'' میں نے کہا۔

''بشرطیکہ تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہو۔''

''یہ کیا بات ہوئی گھر والوں کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

گھر پہنچ کر میں نے زبیر سے کہا۔ ''زبیر، خورشید تو ملک سے باہر چلا گیا ہے لیکن میرے لیے راستے تو بند نہیں ہوئے جس طرح تمہارے لیے بند نہیں ہوئے تھے۔ آج رات میں نے کسی اور کو بلایا ہے۔''

''ذلیل، کمینی۔'' وہ پھر دہاڑنے لگا۔

''دیتے رہو گالیاں۔'' میں ہنس پڑی۔ ''میں جو کچھ کر رہی ہوں اس میں تمہارا اپنا قصور ہے تم ہی نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے اور اب برداشت کرو اگر کرسکتے ہو اگر نہیں کرسکتے... تو خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ کر مرجاؤ۔''

وہ چیختا چلاتا رہا اور میں ہنستی رہی، ہنستی رہی۔

اسلم رات کو آگیا تھا۔ میں زبیر کے سامنے اسے کمرے میں لے گئی۔ زبیر کو جیسے سکتہ سا ہوگیا تھا میں نے اسلم سے کہا ''اب بیٹھ جاؤ، ہم دنیا بھر کی باتیں کریں گے۔''

''صرف باتیں؟'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

''کیا مطلب؟''

''میڈم! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ تمہارے اشاروں کا مطلب نہ سمجھ سکوں۔ کون عورت کسی مرد کو صرف باتیں کرنے کے لیے اپنے گھر میں لے کر آتی ہے اور میں تو ویسے بھی تمہاری خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

''جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔ میں ایسی نہیں ہوں۔''

''ارے چھوڑو یہ باتیں کسی اور سے کرنا۔'' اسلم نے کہا۔ اب تو اس کی شخصیت کچھ اور معلوم ہونے لگی تھی۔

''تم جاتے ہو یا نہیں؟''

اور اس نے ذرا سی دیر میں مجھے بے بس کرکے رکھ دیا، میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

صبح جاتے ہوئے اس نے بستر پر ہزار کا نوٹ پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لو اور راشن وغیرہ کی فکر مت کیا کرو اور ویسے بھی جب بلاؤ گی، آجایا کروں گا۔''

وہ چلا گیا اور میں اپنی بے بسی پر روتی رہی۔

اور اب ایک عرصہ گزر چکا ہے، لوگ میرے پاس آتے ہیں، رات گزارتے ہیں اور پیسے دے کر چلے جاتے ہیں۔

زندگی اسی طرح گزر رہی ہے۔ میں اب ہر قسم کے احساس کی حد سے بھی گزر چکی ہوں، اب کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ صرف یہ جانتی ہوں کہ گھر کے اخراجات چل رہے ہیں۔ زبیر کی دوائی آرہی ہے اور میری روح دلدل میں اترتی جارہی ہے۔

کہانی کی ابتدا میری بے بسی سے ہوئی تھی پھر انتقامی جذبہ سامنے آیا اور اب مجبوریوں نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دہاڑی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!
السلام علیکم۔
ایک دلچسپ واقعہ آپ کی خدمت میں بہ شکل کہانی ارسال ہے۔ امید ہے یہ تحریر آپ اور قارئین کو پسند آئے گی کیونکہ یہ واقعہ آئینہ ہے جس میں ہمارے ملک کی سیاست کا اصل چہرہ عیاں ہے۔

عمرانہ انور مقصود
(کراچی)

بابا خیرالدین بہت ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا۔ جب سے سیلاب میں زمینیں دھنس گئی تھیں، گاؤں چھوڑ کر نزدیک شہر میں آ گیا تھا۔ اس نے بہو بیٹے اور دو پوتوں کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔

شہر کی زندگی مشکل ضرور تھی لیکن بیٹے کو کام مل گیا تھا اور بابا نے گھر میں بہو اور بچوں کے ساتھ دل لگا لیا تھا۔ کبھی کبھی محلّے میں شور اُٹھتا کہ ٹرک آیا ہے، جلسے میں جانا ہے۔ یہ خبر اسے بھی مسرور کر دیتی تھی اور وہ لپک کر ٹرک میں سوار ہو جاتا تھا۔

دن بھر کے بعد رات کو تھکے ہارے وہ سب واپس آتے، ہاتھ میں 500 روپے ہوتے اور دن میں ایک بار.. کھانا بھی مفت مل جاتا تھا۔ کام زیادہ نہیں تھا بس دھوپ میں بہت دیر کھڑے رہ کر، جھنڈے ہلاتا اور نعرے لگاتا۔ کبھی کبھی پولیس کی لاٹھی بھی پڑتی تھی مگر بابا خیرالدین کی سفید ڈاڑھی اور ڈوبی ڈوبی آنکھیں دیکھ کر پولیس والا شرافت سے ہلکے سے لاٹھی لگا کر کہتا ”بزرگو! پیچھے ہو جاؤ۔“

”مہینا دو مہینے میں ایک بار 500 روپے کیا بُرے تھے؟“

بچے دادا کا انتظار کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ آج بابا پانچ سو روپے لے کر آئے گا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتا، دونوں پوتے اس کے کندھوں پر چڑھ جاتے اور وہ بغیر وقت

ضائع کیے انہیں ایسے ہی باہر لے جاتا، دکان سے مٹھائی دلا کر ہی اس کی جان چھوٹتی۔

وہ سیاست سے ذرا بھی واقف نہیں تھا اور نہ کسی سیاست دان کو پہچانتا تھا۔ وہ جانتا تھا تو صرف اس شخص کو جو اس کے محلے میں ٹرک بھیجتا تھا۔ یہ کام وہ شخص اپنے طور پر اپنی ساکھ بنانے کے لیے کرتا تھا۔ وہ شخص جس پارٹی کے لیے نعرے لگانے کا کہتا، وہ رٹے رٹائے نعرے لگانے لگتا۔ ایک دفعہ کسی بڑے جلسے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تیاریاں اتنی زوروں پر تھیں کہ بابا کا چھوٹا سا غریب محلّہ بھی لال پیلے جھنڈوں سے سج گیا تھا۔ شہر کا حال تو پوچھو مت، ہر طرف رنگین بورڈ تھے، تصویریں تھیں۔ پورا شہر جیسے براتی بن گیا ہو۔ بابا خیرالدین اور بچے بہت خوش تھے۔ اتنے بڑے جلسے میں اگر لے کر گئے تو شاید پیسا بھی زیادہ ملے۔

صبح ہی صبح اس شخص کا کارندہ آ گیا۔ اس نے بتایا کہ صاحب جی نے بتایا ہے کہ اس بار یہ والے نعرے لگیں گے، یہ کہہ کر اس نے ایک خاص بندے کو نعرے رٹوائے پھر محلّے محلّے لوگوں کی گنتیاں ہونے لگیں۔ ایک دن پہلے سے ٹرک کھڑے ہو گئے تھے۔ ٹرک دیکھنے کے لیے بچے ایسے جمع ہو رہے تھے جیسے بقرعید کے بکرے دیکھنے کے لیے بچے جمع ہوتے ہیں۔ ہر طرف عید تھی، میلہ تھا۔ بابا خیرالدین کا بلاوا آ گیا۔ باقاعدہ لسٹ میں نام درج کیا گیا۔ بابا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کوئی بڑا لیڈر بن گیا ہے۔ نعرے یاد کروائے گئے۔ دُہرائے گئے اور ٹرک بھرنا شروع ہوئے۔ بابا کی بزرگی کو دیکھ کر ٹرک ڈرائیور نے اسے اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھایا۔ بابا کا دل اس بات سے بہت خوش تھا۔

ٹرک قافلے بنا کر بڑے شہر کے ائرپورٹ کی طرف چل پڑے۔ سڑکوں پر کھڑے لوگ ان قافلوں کو ہی دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ زور زور سے ہاتھ ہلاتے اور آنے والے لیڈر کی شان میں نعرے لگاتے۔ بابا نے سوچا کہ اس وقت اتنا جوش ہے تو لیڈر کے آنے کے بعد کتنا ہوگا۔ یہ لوگ سب میری اتنی عزت کر رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ لیڈر سے میرا سامنا بھی ہو جائے۔ اگر ہو گیا تو میں فوراً ہی اپنی ڈوبی ہوئی زمینوں کی شکایت درج کروا دوں گا۔

لیڈر کی گاڑی نظر آئی۔ ائرپورٹ سے شہر آتے آتے چھ سات گھنٹے لگ گئے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی رفتار اور سست ہو گئی۔ جگہ جگہ قافلہ رک رہا تھا، نعرے لگ رہے تھے۔ مٹھائیاں بانٹی جا رہی تھیں، شربت پلائے جا رہے تھے۔ پھول پھینکے جا رہے تھے۔ بریانی کی تھیلیاں بٹ رہی تھیں۔ بابا

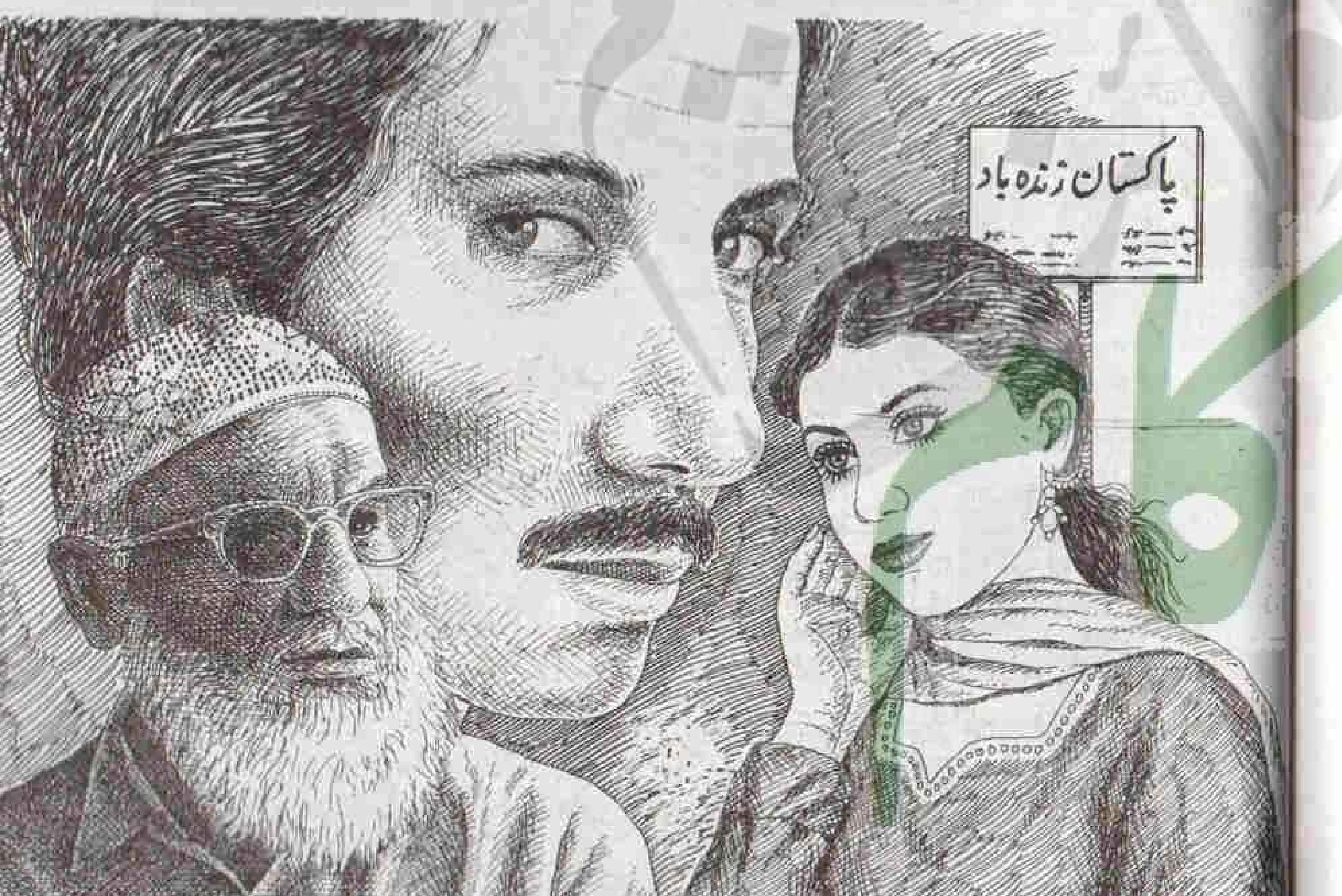

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کے دل سے لیڈر کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ ایک بار انہوں نے بلند آواز میں دعا مانگی ”پروردگار! یہ لیڈر ہمارے لیے مبارک ہو۔ ہمارے بگڑے کام بنادے۔“ اسی وقت زوردار دھماکے اور دھوئیں کے بادل اُٹھے۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لوگ سب بھول کر اپنی اپنی جان بچانے میں لگ گئے۔ جو زمین پر گر گئے تھے، وہ لوگوں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔ جو بھاگ سکتے تھے، زخمی حالت میں بھاگ گئے۔ اس بھاگ دوڑ میں کچھ جاں نثار ایسے تھے جو لیڈر کی جان بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے چل پڑے۔

بابا بھی ایسا ہی جاں نثار تھا۔ لیڈر کا ٹرک، بابا کے ٹرک کے بالکل سامنے ہی تھا۔ بابا نے ایک چھلانگ لگائی اور لیڈر کے ٹرک پر چڑھ گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے لیکن اگلے ہی جھٹکے میں بہت دور جا کر گرا۔ سارا دن شہر خون میں نہاتا رہا۔ ائیرپورٹ سے شہر تک پھولوں سے سجی سڑک پر خون کی بو پھیل گئی تھی۔ انسانی جسم کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔

دو تین دن تک جو سیاسی کارکن گھر نہیں پہنچے، یا اسپتال میں رجسٹر نہیں ہوئے، ان کا نام مرنے والوں میں لکھ دیا گیا۔ بابا خیرالدین کے گھر بھی ان کے نہ ملنے اور شاید مرنے کی اطلاع کردی گئی۔ کچھ دن اور گزرے، بابا کے گزر جانے کا یقین ہوگیا لیکن اس یقین کے ساتھ ایک بات اچھی بھی ہوئی۔ ہزاروں روپے کے کڑکڑاتے نوٹ بھی خاندان والوں کو دے دیے گئے۔ بیٹا بہو اتنے نوٹ ایک ساتھ دیکھ کر ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اپنے لیڈر کو دعائیں دینے لگے اور بابا خیرالدین کو بھول گئے۔ بھول کیا گئے، وہ تو اس کی لاش کی تلاش بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، بلاوجہ آس پڑوس کو روٹی کھلانا پڑے گی۔

اوہ یہ کیا......؟ بابا خیرالدین گھر آ گیا۔ بیٹا بہو چونک گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رقم ان سے واپس لے لی جائے؟

انہوں نے بابا سے، اس کے بچ جانے کی کہانی بھی نہیں سنی۔ بس جلدی سے اسے کوٹھری میں بٹھا دیا۔ کھانا پینا سب وہیں دے دیا گیا۔ اسے سختی سے منع کردیا گیا کہ وہ باہر نہ نکلے ورنہ آس پاس کے لوگ اسے بھوت سمجھیں گے۔ بابا نے وہیں کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے اپنے پوتوں کو اپنی دردناک کہانی سنادی کہ کس طرح وہ جھاڑیوں میں بے ہوش پڑا رہا۔ آنکھ کھلی تو بھوک اور پیاس سے بے حال تھا۔ کس طرح وہاں سے نکلا، لوگوں نے فقیر سمجھ کر اس کی مدد کردی۔ کچھ کھایا پیا اور چھپتا چھپاتا یہاں تک پہنچ گیا۔ ویسے بھی اس کی شکل اس ٹرک ڈرائیور کے علاوہ کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔

”اور 500 روپے!“ پوتے نے شوق سے پوچھا۔

”پانچ سو سے بہت زیادہ تیرے باپ کو مل گئے نا۔“

ہفتے بھر کھانا پانی ملتا رہا۔ بابا میں جان پڑ گئی۔ محلّے والوں سے سامنا نہیں ہوتا تھا لیکن وہ اپنے پوتوں کے ساتھ دل ضرور بہلا لیتا تھا۔ کبھی احسان نہیں جتایا کہ ان کے پاس نئے کھلونے کہاں سے آئے؟ ماں کے پاس کانوں کے بندے کہاں سے آئے؟ گھر والوں کے پاس نئے نئے کپڑے کہاں سے آئے؟

کچھ دن گزرے تو محلّے میں پھر ٹرک آنا شروع ہوگئے۔ کسی جلسے کے لیے لوگوں کو جمع کرنا تھا۔ اس دفعہ بابا ڈر گیا۔ اس نے شکر کیا کہ لوگوں کو پتا ہی نہیں ہے کہ میں زندہ ہوں ورنہ جب نہ مرا تو اب تو مر جاؤں گا۔

ڈرتے ڈرتے بہو سے اتنا پوچھا ”بیٹی، ذرا جا کر پتا کر کہ وہ ڈرائیور جو مجھے لے گیا تھا، زندہ ہے یا......“ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پتا چلا، وہ ڈرائیور بھی مر چکا تھا۔ یہ خبر سن کر بہو خوش ہوگئی۔ اب بابا کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے شوہر کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ بابا کے بیٹے کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

بابا کو چادر اُڑھا کر گلی سے باہر نکالا۔ جاتے ہوئے ٹرک کے پیچھے دوڑایا، اسے رکوایا۔ ٹرک پیچھے آیا اور بابا کو اس میں پھینک دیا۔ بابا ہاتھ پاؤں مارتا رہا، دہائیاں دیتا رہا اور چیختا چلاتا رہا...... پھر بے بس سا ٹرک میں جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کچھ آس پاس کے لوگ بھی ٹرک میں تھے۔ بابا کو زندہ دیکھ کر چونک گئے اور بس۔

ادھر گھر والوں کو چین پڑ گیا۔ ہزاروں نہیں تو بابا 500 روپے تو ضرور لائے گا مگر وہ بھول گئے تھے کہ اب سیاست میں قتل و غارت گری ہوتی ہے۔ سیاسی پارٹیاں بیلٹ پیپر سے نہیں رائفل بلٹ سے مقابلہ کرتی ہیں۔ راستے میں قافلے کو مخالف پارٹی کے کارکنوں نے روک لیا پھر جو مار دھاڑ چلی تو الامان الحفیظ۔ بابا بھی کام آ گیا مگر بیٹے بہو کا کام نہ بن سکا۔ ان کی پارٹی نے امداد دینے سے انکار کر دیا۔ پارٹی کے آفس کے سامنے گھنٹوں لاش پڑی رہی مگر بابا کی لاش کو پارٹی نے شناخت سے انکار کردیا کہ ایک بندہ دو بار کیسے مر سکتا ہے؟ وہ دن ہے اور آج کا دن، بیٹے بہو مختلف دفاتر کا چکر لگا رہے ہیں، لگائے جا رہے ہیں۔

ایثار

مکرمی مدیر اعلیٰ!

سلام مسنون۔

یہ سچ بیانی جو میں نے آپ کے نام ارسال کی ہے، یہ دو ایسے کرداروں کی ہے جو مجھے سرِراہ ملے تھے۔ یہ ان دنوں ملے تھے جب میں وقت گزاری کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں بہ طور کاؤنٹر مین کام کررہا تھا۔ یہ کردار ایسے دلچسپ تھے کہ میں انہیں بھلا نہیں پایا ہوں۔ اس لیے قارئین سے شیئر کررہا ہوں۔ آپ خود بھی غور کریں، انسان کس طرح نفسیاتی گتھیوں میں اُلجھا ہوا ہے۔

ارشد نیاز

(کوئٹہ)

میں نے ان دونوں کو ریسٹورنٹ میں آتے ہوئے دیکھا تو تھا لیکن ان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

میرے ریسٹورنٹ کا نام گالا ریسٹورنٹ ہے۔ کراچی کے ایک پوش علاقے میں بنا ہوا صرف ایک ہال ہے جس میں میزیں اور کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میزوں پر سفید میز پوش بچھے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنے ریسٹورنٹ کا ماحول بہت پرسکون رکھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کراچی میں اس قسم کے ریسٹورنٹ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ آپ پورا شہر گھوم لیں آپ کو کہیں ڈھنگ کا ناشتا نہیں ملے گا۔

ناشتے کے طور پر آپ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر حلوہ پوری ضرور کھا سکتے ہیں یا پھر فوراسٹار اور فائیواسٹار قسم کے ہوٹلز ہیں اگر چائے کی خواہش ہو تو پورے شہر میں کوئٹہ والی چائے ملے گی۔

ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں آپ کو سلیقے سے چائے دانی میں چائے اور دودھ اور چینی سلیقے کے ساتھ الگ الگ پیش کی جائے۔

پورے شہر کا یہی حال ہے اگر ایک یا دو ریسٹورنٹ ہیں بھی تو وہ کسی گنتی میں نہیں آتے۔ بہرحال میرا ریسٹورنٹ ایسا ہی ہے یعنی سفید پوش لوگوں کے لیے۔

جہاں کھانا بھی بہت سلیقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ویٹرز بھی باوردی اور صاف ستھرے ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے بہت سے لوگ میرے ریسٹورنٹ کے باقاعدہ کسٹمر بن گئے ہیں جہاں وہ چند لمحے سکون کے گزار سکتے ہیں۔

تو اس دن میں کاؤنٹر پر ہی تھا کہ میں نے ان دونوں کو ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت تک میں نے دھیان اس لیے نہیں دیا تھا کہ میں بل بنانے میں مصروف تھا۔

بل بنانے سے فرصت ملی تو میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

لڑکی کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں ہوگی، بہت خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی تھی جبکہ اس کے ساتھ جو شخص تھا وہ کم از کم ساٹھ سال کا ہوگا۔ دبلا پتلا سا ایک بوڑھا جس کے بال سفید ہو چکے تھے وہ کلین شیو تھا۔

میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں باپ بیٹی ہو سکتے تھے لیکن جو بات مجھے کھٹک رہی تھی وہ اس شخص کا طرزِ عمل تھا وہ دونوں اسی طرح گھل مل کر باتیں کررہے تھے جیسے عام طور پر ڈیٹ کے لیے آنے والے جوڑے کیا کرتے ہیں۔

لڑکی مسکرا مسکرا کر اس شخص سے باتیں کر رہی تھی، کبھی کبھی وہ دونوں آگے کی طرف جھک کر معنی خیز انداز میں سرگوشیاں بھی کیا کرتے۔ یہ انداز کسی بھی صورت باپ یا خاندان کے کسی بزرگ کا نہیں ہوسکتا۔

خیر مجھے کیا لیکن ایک حیرت ضرور ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں بل ادا کر کے روانہ ہو گئے۔ جاتے ہوئے اس شخص نے اس لڑکی کا ہاتھ تھام لیا تھا اور لطف یہ تھا کہ اس لڑکی کی طرف سے مزاحمت بھی نہیں تھی بلکہ وہ ہنسی خوشی برداشت کر رہی تھی۔

دونوں چلے گئے اور میں دوسرے کسٹمرز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس شہر میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے تھے۔ اب کہاں تک کسی کے لیے سوچا جائے۔

پندرہ بیس دنوں کے بعد وہ دونوں پھر آ گئے۔ اس بار ان دونوں کے ہاتھ میں شاپنگ بیگز تھے یعنی دونوں شاپنگ کر کے آئے تھے اور انداز وہی تھا یعنی ایک دوسرے پر فدا ہو جانے والا۔

میرے ریسٹورنٹ میں ایک اکاؤنٹنٹ ہوا کرتا تھا۔ ریاض نام تھا اس کا۔ ریسٹورنٹ چونکہ اچھا خاصا چل رہا تھا اسی لیے حساب کتاب اور اکاؤنٹ کو ترتیب دینے کے لیے میں نے ریاض کو رکھ لیا تھا۔

وہ جزوقتی یعنی پارٹ ٹائمر کے طور پر آیا کرتا تھا۔ اس کے آنے کا کوئی خاص وقت بھی مقرر نہیں تھا یعنی جب اس کی مرضی ہوتی وہ آجایا کرتا۔ میں نے بھی اس بات کی اجازت دے رکھی تھی۔ اتفاق سے اس وقت وہ بھی موجود تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد ریاض میرے پاس آ گیا۔ ”راشد صاحب یہ تو بہت ان نیچرل جوڑا تھا۔“ اس نے کہا۔

”کیوں۔ ان نیچرل کیوں؟“

”ان دونوں کی عمروں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔“ اس نے کہا۔

”بھئی ہوسکتا ہے کہ وہ اس کا کوئی بزرگ ہو۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بزرگ ایسے نہیں ہوتے، یہ کہانی کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔“

ہاں احساس تو مجھے بھی ہوتا ہے لیکن ہمیں کیا۔ وہ ہمارے ریسٹورنٹ کے کسٹمر ہیں۔ ہمیں ان کی نجی زندگی سے کیا لینا دینا؟“

ریاض خاموش ہو گیا۔

اس کی بات میرے ذہن میں بھی کھٹک رہی تھی یعنی میرے علاوہ اوروں نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ان کی عمر کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہے وہ ان نیچرل سا ہے۔

اس کی بے شمار وجوہات ہوسکتی تھیں۔ دوسرے دن مجھ سے پہلے خود ریاض نے وہ وجوہات بتا دیں۔ ”ارشد صاحب یاد رکھیں یا تو وہ لڑکی اس بوڑھے کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی ہے یا پھر وہ اسے بے وقوف بنا رہی ہے یا ایک تیسری بات بھی ہوسکتی ہے۔“

”اور وہ تیسری بات کیا ہے؟“

”وہ یہ ہے کہ اس بوڑھے کو شاید کوئی جادو وغیرہ آتا ہو۔“ ریاض نے کہا۔ ”جس کے بل بوتے پر اس نے اس لڑکی کو اپنے قابو میں کر رکھا ہو۔“

”یہ تو خیر یونہی سی بات ہے۔“ میں مسکرا دیا۔ ”لیکن تمہارے پہلے والے دونوں اندیشے درست معلوم ہوتے ہیں۔“

دو چار دنوں کے بعد اتفاق سے وہ لڑکی بالکل اکیلی ہی آ گئی۔ ہوسکتا ہے کہ اس بوڑھے نے اس کو وقت دے رکھا ہو۔ یا وہ یونہی ادھر سے گزرتی ہوئی اس طرف آ نکلی ہو۔

اس نے اپنے لیے کولڈ ڈرنک منگوالی تھی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی کہ ایک نوجوان ریسٹورنٹ میں داخل ہوا اور اس کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

وہ لڑکی اس نوجوان کو دیکھ کر چہک اٹھی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی محبوب اپنے محبوبہ کو دیکھ کر خوش ہو جاتی ہو۔ دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے جس طرح اس عمر کے لڑکے اور لڑکیاں کیا کرتے ہیں۔

اب یہاں سے ایک تیسرا خیال بھی ذہن میں آنے لگا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس لڑکی کا مشغلہ ہی یہی ہو۔ یعنی دوسرے الفاظ میں اس کا کردار کچھ ٹھیک نہ ہو۔

پھر وہی بات کہ ہمیں کیا ہمیں ان کے معاملات سے کیا لینا دینا تھا۔

ایک بار پھر وہ لڑکی اسی بوڑھے کے ساتھ آئی۔ وہی انداز، وہی لگاوٹ۔ وہ بوڑھا اسی طرح اس پر واری ہوا جارہا تھا جس طرح پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں اور ریاض ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دیے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ پھر آ گئی۔ اس بار وہ اکیلی تھی اور اس بار میں نے اس سے ..... بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے کاؤنٹر چھوڑ کر یونہی ٹہلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور آرڈر کے بارے میں دریافت کیا۔ ”کیا لینا پسند کریں گی؟“ میں نے بڑے ادب سے پوچھا تھا۔

”کولڈ ڈرنک۔“ اس نے بتایا۔

”ہم ایک مشینی دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پانی اور ہوا پر انسان نے قابو پا لیا ہے۔ ہم وقت، رفتار اور فاصلے پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اب روحانی باتوں کا زمانہ نہیں۔ بالکل مادی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس لیے مسکراہٹیں بھی مادی ہو گئی ہیں اور جب میری طرف کوئی مسکرا کر دیکھتا ہے تو سوچنے لگتا ہوں کہ اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے؟“

اقتباس: چاندی کے تار از مہندر ناتھ
مرسلہ: نوروز خان، کوئٹہ

”وہ صاحب آج نہیں آئے جو آپ کے ساتھ آیا کرتے ہیں؟“ میں نے یونہی سرسری انداز میں دریافت کیا۔

”ہاں...... وہ۔“ وہ چونک اٹھی تھی۔ ”ہاں وہ نہیں آئے۔“

اس نے مختصر جواب دے کر اپنی طرف سے بات ختم کر دی تھی اور ظاہر ہے کہ میرے بھی وہاں کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اسی لیے میں وہاں سے ہٹ آیا۔

کئی دنوں کے بعد وہ پھر اکیلی آئی اور اس بار کسی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے براہ راست میرے پاس کاؤنٹر پر آ گئی تھی۔ ”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی ہاں فرمائیں۔“ میں نے پوچھا۔

”دیکھیں۔“ وہ کچھ ہچکچا رہی تھی۔ ”بہت ممکن ہے کہ خورشید صاحب اور نعمان میں کوئی جھگڑا ہو جائے اسی لیے پلیز آپ اس جھگڑے کو رکوا دیجیے گا بلکہ ایسا کیجیے گا کہ ان دونوں کو ہوٹل سے باہر کر دیجیے گا، لیکن نہیں پہلے کسی ایک کو روانہ کیجیے گا پھر دوسرے کو۔“

”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے کہا۔ ”کون ہیں یہ دونوں؟“

”خورشید صاحب تو وہی بوڑھے انسان ہیں جو میرے ساتھ اکثر آیا کرتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”اور نعمان وہ نوجوان ہے جو ایک دن میرے ساتھ آیا تھا شاید آپ کو یاد ہو۔“

”ہاں مجھے یاد ہے لیکن معاملہ کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میں کیوں ان چکروں میں پڑوں؟“

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in. just visit www.paksociety.com for complaints and issues send mail at admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

''دیکھیں پلیز میں بڑی امیدوں سے آپ کے پاس آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ نے ساتھ نہیں دیا تو بہت گڑ بڑ ہو جائے گی۔''

''دیکھو جب تک تم پوری چویشن نہیں بتاؤ گی میں کوئی وعدہ نہیں کر سکوں گا۔ ویسے وہ دونوں کب تک آئیں گے؟''

''شام کے وقت۔'' اس نے بتایا۔ ''یہی ٹائم دیا ہے دونوں نے۔''

''تمہارے پاس ابھی بھی بہت وقت ہے۔'' ابھی صرف بارہ بجے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اگر چاہو تو مجھے پوری چویشن بتا دو پھر میں اپنے طور پر معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا ورنہ ویسے بھی ریسٹورنٹ میں تو لڑائی جھگڑا نہیں ہونے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کچھ سوچ کر ایک گہری سانس لی۔ ''تو آئیں میں آپ کو بتاتی ہوں۔''

''یہاں نہیں۔ یہ میرا اپنا ریسٹورنٹ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں ہم بات کریں گے تو سب ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ تم بلیو مون میں چل کر بیٹھو میں وہیں آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی اور میرے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔ میں نے کاؤنٹر کے معاملات ریاض کے حوالے کیے اور بلیو مون آ گیا جہاں وہ پہلے سے بیٹھی تھی۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے جیسے وہ یہ سوچ رہی ہو کہ مجھے اس راز میں شامل کرنا چاہیے یا نہیں۔ بہر حال کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''سب سے پہلے تو میں اپنا نام بتا دوں۔ میرا نام درشہوار ہے۔''

''خوبصورت نام ہے۔''

''خورشید صاحب میرے ابو کے دوست تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے ابو کا انتقال ہو چکا ہے۔ ابو کے زمانے ہی سے خورشید صاحب نے ہمارا بہت خیال رکھا ہے۔''

''ہمارا سے کیا مراد ہے؟''

''میرا، میری امی کا اور میرے دو بھائیوں کا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ دونوں ابھی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے مالی حالات شروع سے خراب رہے ہیں۔ ابو کے زمانے ہی سے ہم نے شدید قسم کی مفلسی دیکھی ہے۔ اگر خورشید صاحب ہمیں سہارا نہیں دیتے تو ہم برباد ہو کر رہ جاتے۔''

''اور انہوں نے تمہاری مجبوری کا فائدہ اٹھالیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔'' درشہوار نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی، ابو کی موت کے بعد وہ ہم پر اور بھی زیادہ توجہ دینے لگے' یوں سمجھیں کہ ہمارے سارے اخراجات وہی اٹھاتے رہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن انہیں یہ سب اس حوالے سے کرنا چاہیے تھا کہ وہ تمہارے ابو کے دوست تھے۔''

''شروع شروع میں تو ایسا ہی تھا۔'' اس نے کہا۔ ''پھر یہ ہوا کہ میں نے جب ان کی تنہا اور اداس زندگی کو دیکھا تو مجھے ان سے ہمدردی ہونے لگی۔ وہ تنہا انسان ہیں۔ بہت پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اب وہ اپنی سیکڑوں کتابوں کے درمیان اداس زندگی گزارا کرتے ہیں۔ ان کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔''

''اور تم ان سے ہمدردی کی بنا پر قریب ہوتی چلی گئیں۔''

''ہاں بالکل یہی ہوا ہے۔'' درشہوار نے کہا۔ ''میں اس تعلق کو ان سے محبت نہیں کہہ سکتی۔ بس انسیت اور ہمدردی سمجھ لیں، لیکن وہ بھی ایسی کہ میں چاہتی ہوں کہ وہ ہمیشہ خوش رہیں ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہے۔ اسی لیے میں ان کے ساتھ اتنی بے تکلف ہوں بلکہ یوں سمجھیں کہ ہمارے درمیان خاصا قریبی رشتہ ہے۔ اس حد تک تو نہیں لیکن بڑی حد تک آپ سمجھ رہے ہوں گے۔''

''ہاں اب میں سمجھ گیا۔''

''خورشید صاحب کو بھی احساس ہونے لگا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت غلط ہے اور وہ میرے ساتھ باہر نکلنے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور وہ اپنے کمرے میں جا کر بند ہو جاتے ہیں اور اس وقت میں سوچتی ہوں کہ اس طرح نہیں اس طرح تو موت ان کے قریب پہنچ جائے گی۔ اسی لیے میں ان کے پاس جا کر انہیں باہر لے آتی ہوں زندگی کی طرف خوشیوں کی طرف اور وہ پھر سے جی اٹھتے ہیں۔''

''اور وہ اس نوجوان کا کیا قصہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا نام نعمان ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ ویسی محبت جو نیچرل ہوتی ہے یعنی دو ایک جیسی عمر کے درمیان' ایک لڑکا اور ایک لڑکی

کے درمیان۔ میں اور نعمان ایک دوسرے کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ ایک سیدھی سادی بات ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ فطری بات تو یہی ہونی چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''اب میں دوراہے پر آ کر کھڑی ہوگئی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''خورشید صاحب کے ساتھ رہتی ہوں تو نعمان مجھ سے بچھڑ جاتا ہے اگر نعمان کے ساتھ رہوں تو خورشید صاحب ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔''

''اور وہ جھگڑا جس کی تم بات کر رہی تھیں۔''

''وہ دونوں ایک دوسرے سے آپ کے ریستوران میں ملنا چاہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''شام پانچ بجے دونوں آئیں گے اور ظاہر ہے کہ دونوں کو اپنے جذبات پر قابو نہیں ہوگا۔ اسی لیے دونوں کے درمیان جھگڑے کا اندیشہ ہے اور میں یہی چاہتی ہوں کہ آپ کسی طرح اس جھگڑے کو ختم کروا دیں۔''

''کیا خورشید صاحب کو تمہارے ایشو پر لڑتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کیسے آدمی ہیں جو تماشا بننا چاہتے ہیں۔''

''ظاہر ہے۔ یہ بات ان کی عمر کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔'' درشہوار نے کہا۔ ''لیکن ایسے معاملات میں لوگ اندھے ہو جاتے ہیں اور خورشید صاحب بھی اندھے ہو گئے ہیں۔ وہ ہر قیمت پر نعمان سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکاری لی۔ ''صورت حال پیچیدہ ہوگئی ہے۔''

''پلیز آپ سنبھال لیں گے نا۔ نہ جانے کیوں آپ پر بھروسا کر کے میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا تم خورشید صاحب کو وقت سے پہلے بلا سکتی ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ کیوں؟''

''میں ان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نعمان کو اپنا بھتیجا ظاہر کر کے ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائیں اور دو جوان دلوں کو ایک ہو جانے دیں۔''

''میں ان سے بات کر کے دیکھ لیتی ہوں۔''

''تم میرا یہ کارڈ رکھ لو۔'' میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ ''اس میں میرا موبائل نمبر ہے اور جیسے ہی وہ راضی ہو جائیں تم مجھے بتا دینا ہم اسی ہوٹل میں ملیں گے۔''

درشہوار نے مجھ سے کارڈ لے لیا تھا اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس سچویشن سے بہت پریشان ہو رہی ہے اور یہ پریشان ہونے والی بات بھی تھی۔

یہ داستان ہی محبت کی تھی لیکن کتنی مختلف۔

اس داستان میں دو آدمی تھے ایک بوڑھا اور ایک نوجوان اور ان دونوں کے درمیان ایک خوبصورت لڑکی۔ نہ جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا۔

میں اپنے ریسٹورنٹ میں واپس آ گیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور میں کس طرح حالات کو سنبھالوں گا۔

بہرحال ایک گھنٹے بعد ہی درشہوار کا فون آ گیا تھا۔ ''ارشد صاحب۔ میں نے خورشید صاحب کو ساری بات بتا دی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''تو بس اسی ریسٹورنٹ میں لے کر آ جاؤ۔''

آدھ گھنٹے بعد ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ خورشید صاحب ایک معقول آدمی معلوم ہو رہے تھے۔ میں ہچکچا رہا تھا کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے پھر درشہوار نے خود ہی بات شروع کی۔ ''ارشد صاحب میں آپ کو خورشید صاحب اور نعمان کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ یہ دونوں ہی میرے لیے بہت مخلص ہیں دونوں ہی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان ایک ایسی فضا قائم ہو چکی ہے جو نہیں ہونی چاہیے۔''

''خورشید صاحب!'' میں نے خورشید کو مخاطب کیا۔ ''حالانکہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے میں ایک غیر جانبدار آدمی ہوں لیکن میں صرف ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں اگر معاملہ کسی کے سلجھانے سے سلجھ جائے تو اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور اگر میرے مشورے سے کسی کا بھلا ہوتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔''

''ضرور یہ بہت اچھی بات ہے۔'' خورشید نے اپنی گردن ہلائی۔ ''بتائیں کیا مشورہ ہے آپ کا؟''

''میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ پیچھے ہٹ جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہی آپ کے لیے مناسب ہوگا کیونکہ آپ ایک معزز اور معقول انسان ہیں۔ آپ ان چکروں میں پڑیں گے تو آپ کو سوائے پشیمانی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' خورشید نے گہری سانس لی۔

''میں خود بھی تماشا نہیں بننا چاہتا۔ درشہوار نے شاید میرے احساسات کے بارے میں بتا دیا ہو۔ میں جب باہر نکلتا ہوں تو مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔ معنی خیز نگاہیں میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ میں اپنی عمر کے اس اسٹیج پر ہوں کہ میں درشہوار جیسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ لوگ مذاق اڑائیں گے میرا اور میں سوائے محرومیوں اور ناکامیوں کے اس کے دامن میں اور کیا ڈال سکتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس سے دست بردار ہو رہے ہیں۔''

''نہیں میاں، یہ کس نے کہہ دیا۔''

''کیا مطلب؟''

''محبت کا رشتہ ختم تو نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے دوسرے روپ اور انداز ہو جاتے ہیں۔ محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کو حاصل ہی کر لیا جائے بلکہ دور رہ کر بھی محبت ہو سکتی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خورشید صاحب!'' درشہوار بہت حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہاں سچائی کو تسلیم کر لینا ہی سب سے بڑی عقل مندی ہے۔'' خورشید نے کہا۔ ''اور سچائی یہ ہے کہ میں کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں ہوں۔''

اس وقت درشہوار کے چہرے پر کش مکش کے آثار تھے۔

خود مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ خورشید اتنی آسانی سے اس معاملے کو ختم کر دے گا۔ وہ واقعی ایک معقول آدمی تھا جس نے زندگی کی حقیقت جان لی تھی۔

''درشہوار تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم نعمان سے بات کر لو کہ اسے خورشید صاحب کی طرف سے کسی اندیشے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ مسئلہ خورشید صاحب کی طرف سے حل ہوا ہے میری طرف سے نہیں۔'' وہ ہم دونوں کو دیکھتے ہوئی بولی۔

''کیا مطلب؟''

''میں خورشید صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ نعمان مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں بھی اس کے لیے بہت سنجیدہ ہوں لیکن نعمان ابھی جوان ہے، خوبصورت ہے اس کے سامنے ایک شاندار زندگی ہے لیکن خورشید صاحب کے پاس سوائے میرے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ میرے انتظار میں رہتے ہیں ان کی ساری امیدیں میرے وجود سے وابستہ ہیں۔ میں اگر ان سے دور ہو گئی تو یہ مر جائیں گے۔''

''ارے نہیں۔'' خورشید دھیرے سے ہنس پڑا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوگی میں زندہ رہوں گا۔ بہت ہی ڈھیٹ قسم کا انسان ہوں۔''

''نہیں خورشید صاحب یہ مجھے معلوم ہے نا۔''

اس وقت اندازہ ہوا کہ درشہوار کا جھکاؤ خورشید صاحب کی طرف ہے۔ لیکن یہ ان نیچرل سی بات تھی اسے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیے تھا۔ اس وقت وہ خورشید صاحب کی اداسی دیکھ کر جذباتی ہو رہی تھی۔

''اچھا آپ ایک بات بتائیں۔'' میں نے خورشید صاحب سے پوچھا۔ ''آپ نعمان سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ کیا جھگڑے کے لیے۔''

''ارے نہیں۔'' خورشید نے جلدی سے اپنی گردن ہلائی۔ ''میرا اس سے کیا جھگڑا میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اگر درشہوار کو اپنا رہا ہے تو پھر پوری طرح اس کا خیال رکھے کیونکہ یہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ یہ پیار کرنا جانتی ہے اور زندگی بھر سائے کی طرح ساتھ نبھائے گی۔''

''تو آپ اسی لیے نعمان سے مل رہے تھے۔'' درشہوار نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں صرف اسی لیے۔''

''نہیں خورشید صاحب اب یہ طے ہو گیا ہے کہ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' درشہوار نے کہا۔ ''اور جہاں تک نعمان کا تعلق ہے تو میں اس سے بات کر لوں گی۔ آپ کو اس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

کچھ دیر تک اور اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں اور یہ طے پا گیا کہ درشہوار کے لیے خورشید صاحب سے جدا ہونا بہت مشکل ہے۔ خدا جانے اسے کیا ہوا تھا حالانکہ خورشید پوری شدت سے اسے منع کیے جا رہا تھا لیکن وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

بہرحال یہ میٹنگ یونہی ختم ہوگئی۔

میں نے خورشید کو سمجھانے کے لیے بلایا تھا لیکن اس کے برعکس مجھے خود درشہوار کو سمجھانا پڑ گیا تھا اور اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

بہرحال میں اپنے ریسٹورنٹ واپس آ گیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کہانی کا کیا انجام ہونے والا

ہے۔

شام کے وقت وہ نوجوان نعمان ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تھا اس وقت نہ تو در شہوار تھی اور نہ ہی وہ خورشید تھا ممکن ہے کہ اسے کچھ بتایا نہ گیا ہو لیکن وہ مجھے دیکھ کر سیدھے میرے پاس آ گیا تھا۔ ”ارشد صاحب شاید در شہوار سے آپ کی کوئی بات ہوئی تھی۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں بات تو ہوئی تھی۔“

”اس نے فون کر کے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”چلیں یہ تو اور اچھی بات ہو گئی کہ سارا معاملہ آپ کے لیے کلیئر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن جہاں تک میری ذاتی رائے ہے مجھے در شہوار کے فیصلے پر بہت حیرت ہوئی ہے۔“

”کیا آپ کو اندازہ ہے کہ میں آج کیوں خورشید صاحب سے ملنے والا تھا۔“ اس نے پوچھا۔

”ظاہر ہے جذبۂ رقابت۔“

”جی نہیں بلکہ خورشید صاحب پر زور دینے کے لیے کہ وہ در شہوار کو اپنا لیں۔“ اس نے کہا۔

”کیا......!“ اس کی اس بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”یعنی تم یہ خود چاہتے ہو کہ تم در شہوار سے دستبردار ہو جاؤ اور وہ خورشید صاحب کی ہو جائے۔“

”ہاں میں خود یہی چاہتا تھا۔“

”کمال ہے۔ میں نے اب تک محبت کا ایسا تکون نہیں دیکھا ہو گا۔ خورشید صاحب یہ چاہتے ہیں کہ در شہوار تمہیں اپنا لے۔ اور تم یہ چاہتے ہو کہ در شہوار خورشید صاحب کو اپنا لے۔ چلو خورشید صاحب کی حد تک تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو realize کر لیا ہو گا لیکن تم، تم شاید در شہوار سے محبت نہیں کرتے۔“

”ارشد صاحب آپ کو شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“ نعمان نے کہا۔ ”لیکن خورشید صاحب کی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ در شہوار ان کی ہو جائے کیونکہ خورشید صاحب کینسر کے مریض ہیں اور ان کو زندہ رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ انہیں خوش رکھا جائے اور یہ خوشی انہیں صرف در شہوار ہی دے سکتی ہے۔“

”کمال ہے اتنی بڑی بات اس نے مجھے نہیں بتائی۔“

”شاید ذکر نہ کیا ہو لیکن یہ درست ہے۔“ نعمان نے کہا۔ ”اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے سہی اگر خورشید صاحب کی قسمت میں تھوڑی سی خوشیاں اگر ہیں تو وہ مل ہی جائیں۔“

”میں نے زندگی میں پہلی بار ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو ایک دوسرے کے لیے اس طرح قربانیاں دے رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”زندگی تو اسی ایثار کا نام ہے ارشد صاحب۔“ نعمان نے کہا۔ ”بس ہمارے لیے دعا کرتے رہیے گا۔“

یہ کہانی شاید ختم ہی ہو جاتی یا شاید ہو بھی گئی ہو کیونکہ اس کے بعد بہت دنوں تک ان میں سے کوئی بھی ریسٹورنٹ میں دکھائی نہیں دیا تھا اور ایک دن اچانک شاید چھ یا سات مہینوں کے بعد وہ دونوں پھر دکھائی دے گئے۔ ان دونوں سے مراد ہے نعمان اور در شہوار۔

وہ دونوں کاؤنٹر کے پاس آ گئے تھے۔ ”ارے کہاں رہے تم دونوں اتنے دنوں تک۔“ میں نے پوچھا۔

”ارشد صاحب ہم اپنے دکھوں کو سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔“ در شہوار نے بتایا۔ پھر نعمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان سے ملیں یہ ہیں میرے شوہر۔“

”شوہر۔“

”ہاں پچھلے مہینے ہماری شادی ہوئی ہے۔“ نعمان نے بتایا۔

”اور وہ۔“ میں جھجک گیا تھا۔ ”میرا مطلب ہے خورشید صاحب۔“

”ان کا انتقال ہو گیا۔“ در شہوار نے بتایا۔ ”ہم نے شادی کر لی تھی اور شادی کے ایک ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آخری لمحے میں ان کے چہرے پر سکون تھا۔ میں نے ایک ہفتے کے دوران ان کی اتنی خدمت کی ان کا اتنا خیال رکھا کہ وہ جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہوں گے اسی لیے انہیں موت بھی آئی تو بہت اطمینان کی موت تھی۔“

”دیکھ لیا ارشد صاحب۔ یہ ہے زندگی۔“ نعمان نے کہا۔ ”در شہوار کو میرا تو ہونا ہی تھا اور یہ ہو گئی لیکن اس سے پہلے اگر میری اور اس کی وجہ سے کسی کو آخری لمحات میں خوشیاں مل گئیں ہوں تو اس میں کیا حرج ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔“

اور میں سکتے کے عالم میں ان دونوں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ خدا کی پناہ یہ کتنے بڑے لوگ تھے۔ کیا آج بھی ایسے لوگ ہوا کرتے ہیں۔“

دعاجی بابا

محترم معراج رسول صاحب!
السلام علیکم۔
یہ دنیا اسرار بھری ہے۔ کون کس بھیس میں ہے۔ کسے خدانے کیسی قوت عطا کردی ہے، یہ کسے پتا؟ میں نے بھی جب اس شخص کو دیکھا تھا تو ذرا بھی یقین نہیں تھا کہ یہ صاحبِ کمال ہوگا مگر بعد کے واقعات نے حیران کردیا۔ آپ خود بھی اس سرگزشت کو پڑھیں، یقینا آپ بھی قائل ہوجائیں گے۔

کمال الدین
(کراچی)

گزشتہ دنوں گردے میں اچانک اٹھنے والی تکلیف کی وجہ سے جب ڈاکٹر نے علاج کے ساتھ دس دن کا مکمل بیڈ ریسٹ تجویز کیا تو مجبوراً پورے تیس سال بعد میں نے میڈیکل لیو لے لی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے صحت کی نعمت سے نواز رکھا تھا اور اب بھی اللہ کا شکر ہے۔ صبح سے شام تک کام کرنے والا آدمی اچانک بستر پر لیٹ جائے یا سارا دن گھر میں بیکار بیٹھا مکھیاں مارتا رہے تو اس کی بوریت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس روٹین کے عادی ہوں اور ان کو اچانک جبری فراغت سے واسطہ پڑا ہو۔ میں سرکاری محکمے کا نام نہیں لوں گا لیکن یوں سمجھ لیں کہ

اس کا تعلق لکھنے لکھانے اور ادب سے ہے۔ میں یہاں اب ڈائریکٹر کی پوسٹ پر ہوں۔

اچانک گھر بیٹھا تو بوکھلا گیا تھا، وقت کسی طرح کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ بیگم خود ایک اسکول میں پرنسپل ہیں اور بچے ماشاء اللہ سب اپنے کام دھندوں سے لگ چکے ہیں۔ یعنی دونوں بیٹیاں گھر بار والی ہیں اور دونوں بیٹے ملازمت اور کاروبار سے وابستہ ہیں۔ جو صاحبزادے ملک میں ہیں وہ کاروبار کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس ملک میں صرف حرام کھانے والی ملازمت ایسی ہے جس میں آدمی مالی طور پر آسودہ ہوسکتا ہے دوسری صورت میں اس کی حالت ہینڈ ٹو ماؤتھ والی ہوتی ہے چاہے وہ کتنا بڑا سرکاری یا غیر سرکاری افسر کیوں نہ ہو۔ دوسرے نے انجینئرنگ کرنے کے بعد باہر جانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہا۔ اب مزے سے آسٹریلیا میں کام کررہا ہے۔

گھر پر اکیلے رہنا مجبوری تھی۔ ایک دن تو بیگم نے چھٹی کرلی لیکن وہ روز روز چھٹی نہیں کرسکتی تھیں۔ دوسرے دن مجھے اکیلے رہنا پڑا تو شام تک میں سنجیدگی سے ملازمت پر جانے کا سوچنے لگا لیکن بیگم نے سختی منع کیا یعنی اپنی قسم دے دی۔ اس کے بعد مجبوری تھی۔ وقت گزاری کے لیے انہوں نے کئی نسخے تجویز کیے جن میں مطالعے کا نسخہ پسند آیا کیونکہ آج کل کے حالات میں ٹی وی دیکھنے کا مطلب سوائے دماغ یا دل کا مریض بننے کے اور کچھ نہیں ہے۔ گھر میں بہت ساری کتابیں تھیں لیکن خالص ادب سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ بہت پہلے جوانی کے دنوں میں ایک جغادری ادیب صاحب نے تفاخرانہ انداز میں کہا تھا کہ وہ اسے ادب ہی نہیں مانتے جو عام لوگوں کے لیے لکھا جائے بس تب سے ادب سے جی اچاٹ ہوگیا تھا۔ مزے کی بات ہے میں ادب اور ادیبوں کے محکمے سے ہی تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود پڑھنے لکھنے سے تعلق نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔

بیگم خود بھی رسالے شوق سے پڑھتی ہیں اور ہمارے گھر کوئی درجن بھر ڈائجسٹ اور رسالے آتے ہیں۔ انہوں نے ان کا ڈھیر لا کر سرہانے رکھ دیا اور اتفاق سے جو پہلا رسالہ اٹھایا وہ سرگزشت تھا۔ جب اسے پڑھا اور پہلی بار پڑھا تو مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارے ہاں اس قسم کی معیاری اور اعلیٰ تحریریں رکھنے والے رسائل بھی شائع ہوتے ہیں.... بدقسمتی سے ڈائجسٹوں کے بارے میں بھی میرا تجربہ کوئی تیس سال پرانا ہے۔ اسی وقت ڈائجسٹوں کا معیار بلند نہیں تھا اور ان میں سستی جذباتی تحریروں کی بھرمار ہوتی تھی اس لیے کسی کا ڈائجسٹ پڑھنا اس کے آوارہ اور لوفر ہونے کی سند سمجھا جاتا تھا اور سنجیدہ گھروں میں ڈائجسٹ کا آنا کسی قیامت کے آنے سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن الحمدللہ اب اس تاثر کی نوعیت بدل گئی ہے۔ میں بات مختصر کرتا ہوں۔ سرگزشت میں پُراسراریت نمبر کا اعلان پڑھا تو نہ جانے کیوں مجھے دعا جی بابا یاد آگیا۔

آپ کو شاید اس نام کو سن کر تعجب ہو لیکن یہ اس شخص کا حقیقی نام نہیں ہے۔ اس کا اصل نام تو شاید ہی کسی کے علم میں ہو لیکن لوگ اسے دعا جی بابا کہتے تھے۔ ممکن ہے اس نام کو سن کر آپ نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بنالیا ہو جیسا کہ میں نے بنالیا تھا جب میں نے آج سے کوئی بائیس سال پہلے یہ نام سنا تھا۔

میں اس محکمے میں آیا تو یہ میری پہلی ملازمت تھی اور محکمے کے لیے بڑا کڑا وقت تھا۔ ملک میں مارشل لا تھا اور سنسر شپ نے سب سے زیادہ لکھنے والوں کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ اوپر سے آرڈر آگئے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔

بہرحال کیونکہ میرا لکھنے والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا البتہ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کل تک جو ادیب کلف لگے لٹھے کی طرح اکڑے ہوئے تھے اور ان کی نشست و برخاست تک سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی تھی اب وہ ململ کی طرح نرم اور بے آواز ہوگئے تھے۔ اپنے سوا ہر شخص کو حقیر اور بے مول سمجھنے والے اب معمولی معمولی افسروں کے سامنے گڑگڑاتے تھے۔ بہرحال وقت گزرتا رہا اور مارشل لا جس طرح اچانک آیا تھا اسی طرح اچانک رخصت بھی ہوگیا۔ نئی حکومت آئی تو انکشاف ہوا کہ سابق حکومت میں جن افسران نے مزے کیے ہیں ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ مجھے اس بات کی زیادہ فکر نہیں تھی کہ میں نے مزے نہیں کیے تھے۔ اپنے کسی نااہل رشتے دار یا دوست کی کتاب نہیں چھپوائی تھی اور نہ ٹی وی اور ریڈیو پر کسی کو کام دلوایا تھا۔

مگر بدقسمتی سے ایک کلف لگے لٹھے سے ململ اور ململ سے دوبارہ کلف لگا لٹھا ہو جانے والے ایک ادیب سے میرے تعلقات کچھ کشیدہ چل رہے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ گزشتہ دور میں، میں نے ان کی کچھ ناجائز گزارشات کو نظر انداز کیا تھا اور عملاً ان کو بے عزتی سے بچالیا تھا کیونکہ یہ گزارش اگر میں آگے روانہ کردیتا تو جو افسر میرے اوپر بیٹھے

تھے ان کی پالیسی ہمیشہ شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار رہی ہے۔ وہ یقیناً ان کو دل کھول کر بے عزت کرتے اور میں نے ان کو ادب سے منع کردیا تھا کہ یہ کام ممکن ہی نہیں ہے لیکن وہ اسے میرا گھٹیا پن سمجھے تھے اور انہوں نے بات کو یوں دل میں رکھ لیا جیسے زمین خزاں میں گرنے والے پھل کا بیج محفوظ کرلیتی ہے اور بہار آتے ہی اس سے پودا پھوٹتا ہے۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی اور حکومت بدلتے ہی ان ادیب صاحب کے لیے بہار کا موسم آگیا۔ نتیجے میں عداوت کا بیج یک دم پھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن گیا۔ ان کے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ میرے گھٹیا پن کا بدلہ چکایا جائے۔ یہ بات بتانے وہ بہ نفس نفیس میرے دفتر میں آئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران ہوا تھا کیونکہ کچھ عرصے پہلے وہ مجھے بتا چکے تھے کہ وہ مجھے ناچیز سمجھتے ہیں۔

"جناب آپ...... اس ناچیز کے کمرے میں؟"

وہ میری طرف جھکے اور ڈرامائی انداز میں بولے۔

"میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہارا انجام قریب ہے۔"

میں مزید حیران ہوا تھا۔ فلموں میں اس قسم کا ڈائلاگ ولن سے کہا جاتا ہے جب فلم میں کرنے کو کچھ نہیں رہ جاتا سوائے ولن کے خاتمے کے۔ لیکن میں نے کبھی خود کو اتنے اہم کردار کے لائق نہیں سمجھا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں سمجھا نہیں جناب کیونکہ میں نے کبھی آپ کی دست شناسی کا امتحان لینے کی کوشش نہیں کی۔"

موصوف دست شناسی کا دعویٰ بھی رکھتے تھے۔ اس بات پر وہ مزید خفا ہوگئے کہ میں ابھی تک نہیں سمجھا تھا کہ وہ کس بات پر مجھے نوشتۂ دیوار پڑھا رہے تھے۔ وہ غرائے۔ "میں نے کبھی تم جیسے لوگوں کے ہاتھ دیکھے بھی نہیں ہیں۔ یاد ہے میں نے تم سے ایک کام کہا تھا اور تم نے فرعونیت سے انکار کردیا تھا؟"

میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آیا کیونکہ میں سچ مچ بھول گیا تھا۔ "جی جناب انکار تو کیا تھا لیکن فرعونیت سے ہرگز نہیں کیا تھا بلکہ آپ کے بھلے کے لیے کیا تھا کیونکہ وہ کام کسی صورت نہیں ہوسکتا تھا۔ اوپر والے انکار تو کرتے لیکن اس سے پہلے آپ کو ذلیل بھی کرتے۔"

"کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ مجھے ذلیل کرسکے۔" انہوں نے بڑک ماری اور اس وقت وہ اردو کے ادیب سے زیادہ پنجابی فلم کے ولن لگ رہے تھے۔ "تم نے انکار کیا تھا اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اگر میں یہ کہوں کہ مجھے ان کی دھمکی پر تشویش نہیں ہوئی تھی تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ کیونکہ ان دنوں وہ ہمارے محکمے کے نئے سربراہ کی ناک کا بال سمجھے جاتے تھے بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا تھا کہ نئے سربراہ کی تقرری میں ان کا بھی عمل دخل تھا۔ بہرحال ان کے مقابلے میں میری حیثیت ایسی تھی جیسے سانڈ کے مقابلے میں مینڈک کی ہوسکتی ہے۔ مگر اس کا کیا کیجیے کہ بچپن سے ایک انا کہیں اندر چھپی بیٹھی تھی حالانکہ ملازمت میں کیا انا اور کہاں کی انا، یہاں تو سب سے پہلے انسان کی اسی چیز کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ان کے قدموں میں گر جاتا۔ سچی بات ہے ایک لمحے کو مجھے بھی یہی خیال آیا تھا۔ گھر میں بیوی کے ساتھ ایک بچہ تھا اور ایک ہونے والا تھا۔ ماں جی کی بیماری کا علاج سرکار کے کھاتے میں ہو رہا تھا ورنہ نجی علاج کی سکت کہاں تھی۔ ایک بہن تھی جس کی شادی کرنی تھی۔ ایسے حالات میں ملازمت چھننے کے تصور سے نبضیں چھٹنے لگی تھیں لیکن وہی انا آڑے آئی جو کہیں کونے کھدرے میں چھپی بیٹھی تھی۔

"جناب ممکن ہے آپ کو میری بات اسی طرح [illegible] ہوئی ہو لیکن خدا گواہ ہے میں تو اپنے چپڑاسی تک سے نہیں پیش آتا، آپ تو بہت بڑی شخصیت ہیں [illegible] کرنے کا مجرم ہوں اور اس کی وجہ میں آ[illegible] ہوں۔ صرف میں ہاں کردیتا تب بھی آپ [illegible] والوں نے کرنا تھا اور ان کے بارے میں آپ [illegible] بہتر جانتے ہیں۔"

"اب بھی وہی اوپر والے ہیں۔" وہ [illegible] وہ تم سے اس بارے میں انکوائری کریں تو ان کو [illegible] دے دینا۔"

محکمے میں دس مہینے گزارنے والا یہاں کے طور طریقوں سے واقف ہوجاتا ہے۔ میں نے تو تقریباً دس سال گزار لیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ انکوائری کا صرف ڈراما کیا جاتا ہے اور فیصلہ پہلے تیار کرلیا جاتا ہے جسے آدمی کو رگڑنے اور اچھی طرح ذلیل کرنے کے بعد سنا دیا جاتا ہے۔ اگر ادیب صاحب مجھے دھمکی دے کر جارہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ فیصلہ پہلے ہی تیار کرلیا گیا تھا اور اب تب میں انکوائری شروع ہونے والی تھی۔ میں نے دل کڑا کرکے ان سے کہا۔ "جناب میں جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے میں نے آپ کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا۔"

انہوں نے بہ نظر حقارت مجھے دیکھا۔ "تم جیسے لوگ

میرا کچھ برا چاہ بھی نہیں سکتے۔ البتہ میں تمہارا وہ حشر کرسکتا ہوں کہ تمہیں دیکھنے والا ہر فرد عبرت پکڑے گا۔''

میں نے دل کو مزید کڑا کیا اور ان سے کہا۔ ''جناب آپ خدا نہیں ہیں اس لیے بننے کی کوشش بھی نہ کریں۔ آپ نہ میرے مقدر کا رزق چھین سکتے ہیں اور نہ ہی وقت سے پہلے مجھے مار سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ جو کرنا چاہتے ہیں ضرور کرگزریں۔''

انہوں نے نظروں میں مزید حقارت پیدا کی اور اسی طرح مجھے گھورتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے ان افسر کے کمرے کا رخ کیا جن کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ وہ قبلہ نما مرغ تھے اور ان کا رخ ہمیشہ صاحب اقتدار کی طرف ہوتا تھا۔ خلقِ خدا کا خیال تھا کہ وہ سابق حکومت کی وفاداری میں حد سے گزر چکے ہیں لیکن انہوں نے ثابت کیا تھا کہ اس معاملے میں ان کی کوئی حد نہیں تھی۔ انہوں نے..... ٹرن نہیں لیا تھا بلکہ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی گاڑی کو ریورس گیئر لگانے کا کمال دکھایا تھا۔ ان تک شاید اطلاع پہنچ گئی تھی اس لیے انہوں نے میری صورت دیکھتے ہی کہا۔

''بھئی کمال میاں تم نے بہت غلط آدمی سے پنگا لیا ہے۔''

''حافظ صاحب آپ جانتے ہیں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے ان سے کہا۔ وہ سچ مچ حافظ تھے اور نام کے بھی حافظ تھے۔ ''میں نے تو ان کے ساتھ بھلائی کی تھی۔''

''تو اب بھگتو۔'' انہوں نے کہا اور پھر فارسی اور عربی کی مثالوں سے واضح کیا کہ کئی موذی اور زہریلے جانداروں سے بھلائی کرنے والوں کا عام طور سے یہی انجام ہوتا ہے۔ میں نے ڈوبتے دل سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے مجھے اپنی ملازمت پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔''

''کہنا تو یہی چاہیے۔'' وہ ہمدردی سے بولے۔ ''لیکن اچھائی کی توقع بھی رکھنی چاہیے ممکن ہے تمہیں کوئی چھوٹی موٹی سزا دے دی جائے۔''

''یہ چھوٹی موٹی سزا کیا ہوسکتی ہے؟'' میں نے غور کیا۔

''یہی کہ تمہیں پھر سے سیکشن آفیسر بنا دیا جائے یا کسی علاقائی سیکشن میں بھیج دیا جائے۔''

مجھے سب قبول تھا، میں تبادلے کے لیے بھی تیار تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ادیب صاحب میری ملازمت سے برخواستگی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گے۔ میں نے حافظ صاحب سے فریاد کی۔ ''وہ میری ملازمت کے درپے ہیں اور مجھے نکلوائے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

حافظ صاحب نے ہمدردی سے تائید کی۔ ''میرا بھی یہی اندازہ ہے لیکن اب میں کیا کرسکتا ہوں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان کی پہنچ پرائم منسٹر ہاؤس تک ہے اور اس صورت میں، میں تو کیا محکمے کا سربراہ بھی شاید ہی تمہیں بچا سکے۔''

حافظ صاحب کی بات درست تھی، وہ یا محکمے میں کام کرنے والا کوئی شخص میرے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ایک بار پھر مجھے خیال آیا کہ میں ادیب صاحب کے پاس جاؤں اور جس طرح بھی ہو ان سے معافی حاصل کرلوں، مگر ایک بار پھر انا آڑے آئی۔ وہ مجھے جتنی فرعونیت سے للکار کر گئے تھے اس کے بعد ان کے پاس جانا اور معافی مانگنا گناہ بے لذت والی بات لگ رہی تھی۔ شام کو گھر پہنچا تو بیگم صاحبہ نے چہرے سے جان لیا کہ کوئی مشکل ہے۔ انہوں نے نہایت مہارت سے چائے پلانے کے دوران مجھ سے اگلوا لیا کہ کیا بات ہے اور خلافِ توقع پریشان ہوئے بغیر بولیں۔ ''آپ فکر نہ کریں، وہ کوئی ہمارا رازق تھوڑی ہے جو رزق روک لے گا۔''

امی کو پتا چلا تو انہوں نے بھی مجھے تسلی دی تھی۔ وہ بیماری کے باوجود حوصلے سے کام لے رہی تھیں، ان کو دیکھ کر مجھے بھی حوصلہ ہوا اور مجھے لگا کہ میں بے نام سے اندیشوں کا شکار ہوں۔ بہرحال حوصلہ پکڑنے سے صرف یہ ہوا کہ مستقبل کا سوچ کر میرا دماغ خراب نہیں ہو رہا تھا اور مجھے کسی قدر اعتماد ہو چلا تھا کہ جو میرے مقدر میں ہے وہی ہوگا لیکن اس سے محکمہ جاتی کارروائی پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ دو دن بعد شوکاز نوٹس میری میز پر تھا اور اس میں مجھ پر الزام لگایا گیا تھا کہ سابقہ دورِ حکومت میں میں نے آمریت کے مخالف ادیبوں کو نقصان پہنچایا تھا اور ان کی تذلیل کی تھی۔ مجھے کہا گیا تھا کہ پندرہ دن کے اندر میں اس شوکاز نوٹس کا جواب دوں بہ صورت دیگر مجھے ملازمت سے فارغ کردیا جائے گا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے جواب کو پڑھنے کی زحمت بھی نہیں کی جائے گی میں نے شوکاز نوٹس کا تفصیلی اور مدلل جواب لکھا۔ جواب بھیج کر میں نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔ میرے جاننے والوں اور دوست احباب کو خبر ہوگئی تھی اور سب پیشگی افسوس بھی کرچکے تھے۔ جو ذرا احتیاط پسند تھے انہوں نے دفتر کی حدود میں مجھ سے ملنا جلنا اور گپ شپ کرنا ترک کردی تھی۔ البتہ بعض بے فکرے پہلے کی طرح ملتے رہے۔ ان میں ایک شاہد مجید صاحب بھی تھے۔ بزرگ آدمی تھے اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔ پہلے بائیں بازو کے سکہ بند ادیب تھے پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بازوؤں کی سیاست چھوڑ کر صرف اللہ والے بن گئے۔ سیاست اس طرح سے چھوڑی کہ لکھنا ہی چھوڑ دیا اور اب ملازمت کرکے گزر بسر کر رہے تھے۔ دل اور زبان کے کھرے آدمی تھے جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ لوگوں سے ڈرتے نہیں تھے۔ بعض تو مذاق اڑاتے تھے کہ اللہ سے بھی نہیں ڈرتے۔ ایک بار میں نے شاہد صاحب سے یہ بات کہی تو ہنسے۔

''لوگ سچ کہتے ہیں۔ بھئی جو کیا نہیں اس پر ڈرنا کیا؟''

میں نے غور کیا تو ان کی بات کو پتے کی پایا۔ وہ تھے بھی ایسے ہی، کچھ کرتے ہی نہیں تھے تو ڈرتے کیوں۔ جب ان کو پتا چلا تو میرے کمرے میں چلے آئے اور چائے کی فرمائش کرنے کے بعد بولے۔ ''کمال میاں کمال کرتے ہو ان فصلی بٹیروں سے ڈر رہے ہو۔''

میں نے عرض کی۔ ''جناب یہ فصلی بٹیر نہیں بلکہ موسمی سنڈی ہیں جو میری ملازمت کی پکی پکائی فصل چٹ کرجانا چاہتی ہیں۔''

اس مثال پر وہ خوب ہنسے۔ ''کہا تو ٹھیک ہے پر اللہ پر بھروسا رکھو جو تمہارے نصیب میں ہے، اس سے زیادہ یا کم کیا ہوگا۔''

''آپ نے ٹھیک کہا لیکن انسان ہوں نا پریشان ہونا فطری بات ہے۔''

''تو بس اللہ سے دعا کرو اور اگر میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔''

''آپ سے بھی دعاؤں کی درخواست ہے۔''

شاہد صاحب چائے پی کر اور گپ شپ کرکے چلے گئے۔ دس دن بعد حافظ صاحب نے مجھے بلا لیا اور بولے۔ ''کمال الدین کل تمہیں بورڈ کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہاں اپنی صفائی پیش کرنی ہے۔''

''پیش کردوں گا جناب لیکن شاید اس کا فائدہ نہیں ہو۔''

حافظ صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے اتنا کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کمال ...... بہرحال ہوسکتا ہے چند سال بعد تم واپس آسکو۔''

ان کا مطلب واضح تھا مجھے فائر کرنے کی تیاریاں کرلی گئی تھیں۔ چند سال سے مراد یہ تھی کہ حکومت بدلے گی اور کوئی دوسرا اقتدار میں آیا تو اس وقت میں واپس آسکوں گا۔ لیکن اس ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد میں کیا کروں گا اور کس طرح گزارہ کروں گا یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہمارے ملک میں اور شاید ساری دنیا میں سرکاری ملازم کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کہیں اور کام کرنے کے قابل نہیں رہتا ہے اور اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی لگن ختم ہوجاتی ہے۔ یوں سمجھ لیں وہ خرگوش کی طرح لمبی چھلانگوں کا خطرہ مول لینے کے بجائے کچھوے کی محفوظ رفتار سے چلنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔

ویسے شوکاز نوٹس کے بعد کام تو کوئی نہیں تھا لیکن دفتر تو آنا تھا اس لیے صبح آتا اور شام کو واپس چلا جاتا، درمیان میں سارا دن بیٹھ کر مکھیاں مارتا یا چائے وغیرہ نوش کرتا تھا۔ اس شام کو چھٹی کے وقت گھر جانے کے لیے نکلا تو شاہد صاحب کے کمرے میں یارانِ رفتگاں کی محفل سجی تھی۔ یہ سارے ریٹائرڈ یا فائرڈ ادیب تھے جو صرف حوالہ دینے کے کام آتے تھے۔ میں نے سلام کے لیے کمرے میں جھانکا تو انہوں نے مجھے بھی بلا لیا۔ مقصد افسوس سے زیادہ تفریح تھی اور وہ میری زبانی سننا چاہتے تھے کہ میں نے ادیب صاحب کے ساتھ کیا کیا تھا جو وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر تل گئے تھے۔ میں نے دفتر میں کوئی ایک سوویں بار اپنی کہانی سنائی۔ وہ سب بہت محظوظ ہوئے تھے۔ ایک بزرگ نے کہا۔ ''میاں ایسا کرو جاکر ان سے معافی مانگ لو۔''

دوسرے بزرگ نے کہا۔ ''اس سے بہتر ہے یہ کسی اونٹ سے معافی مانگ لے، نہیں میاں ڈٹے رہو۔''

''وقتِ شہادت تک۔'' تیسرے بزرگ نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ ''ویسے تم کچھ کراتے کیوں نہیں ہو؟''

''کیا کراؤں؟''

''تعویذ دعا یا کوئی سفلی ٹوٹکا۔''

''ان پر اثر نہیں کرے گا۔'' دوسرے بزرگ نے کہا۔

''آپ کمال میاں کو دعا جی بابا کے پاس کیوں نہیں لے جاتے ہیں۔'' یہ خیال اچانک ہی ایک کم سخن بزرگ کو آیا تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو بولنے کا شوق نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ پان، سگریٹ اور چائے سے بیک وقت شغل تھا۔ اس لیے ان کو بولنے کا موقع کم ملتا

تھا۔ میں ان کی بات سن کر چونکا۔

''دعاجی بابا؟۔۔۔۔یہ کون ہیں؟''

''ایک آدمی ہے۔'' شاہد صاحب نے کہا۔ ''اس کی ہر دعا قبول ہوتی ہے جو یہ دوسروں کے لیے کرتا ہے اسی وجہ سے دعاجی بابا کہلاتا ہے۔''

میں باباؤں پر یقین رکھنے والا آدمی نہیں ہوں۔ یعنی اس واقعے کے باوجود اپنے یقین پر قائم ہوں کہ جو ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اسی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ مگر تجسّس تو ہوتا ہے اس لیے میں نے شاہد صاحب سے پوچھ لیا۔ ''کیا سچ مچ؟''

''ہاں برخوردار میری آزمائی ہوئی بات ہے۔ وہ شخص دوسروں کے لیے جو دعا کرتا ہے وہ پوری ہوجاتی ہے چاہے وہ کتنے ہی مشکل کام کے لیے دعا کرے۔''

میں نے شک سے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے اگر میں اس سے دعا کراؤں کہ میری ملازمت بچ جائے تو یہ دعا قبول ہوگی۔''

شاہد صاحب نے سر ہلایا۔ ''اس کا پورا امکان ہے کیونکہ میں نے جہاں تک دیکھا ہے اس نے جس کے لیے بھی دعا کی اس کا کام ضرور ہوگیا۔''

''میاں تم بھی دعا کرالو۔'' کم سخن بزرگ بولے۔ ''شاہد بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''اگر تم کہو تو آنے والے جمعے کو میرے ساتھ چلو، میں اس کی طرف جارہا ہوں ایک اور صاحب کو بھی اس سے کام ہے۔''

میں ہچکچایا کیونکہ میں ایسی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا اب بھی نہیں رکھتا ہوں۔ بزرگ نمبر دو اور تین نے بھی تائید کی تھی کہ مجھے ضرور جانا چاہیے۔ اگر دعا نہ بھی کراؤں تو ذرا تفریح رہے گی کیونکہ دعاجی بابا شہر سے باہر ایک بستی میں رہتا ہے۔ شاہد صاحب نے زور دیا تو میں مان گیا اور طے ہوا کہ جمعے والے دن میں شاہد صاحب کے گھر آجاؤں گا اور ہم ان کے ساتھ چلیں گے۔ اس وقت جمعے والے دن چھٹی ہوتی تھی۔ میں جمعے کے دن صبح نو بجے شاہد صاحب کے گھر پر تھا۔ انہوں نے ناشتا بنوایا تھا اور ہم ناشتا کرکے روانہ ہوگئے۔ شاہد صاحب کے ایک قریبی عزیز دانیال حسن بھی ساتھ تھے ان کی بچی کے دل کا آپریشن تھا اور وہ اس کے لیے دعاجی بابا سے دعا کرانے جارہے تھے کیونکہ ڈاکٹروں نے آپریشن کو خطرناک قرار دیا تھا اور بچی کی جان کو خطرہ تھا۔

شاہد صاحب کی کار پرانی لیکن چلنے میں خوب تھی۔ سفر طویل تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ حب کی طرف جانے والی پرانی سڑک پر ایک بستی تھی جو کراچی کی حدود میں بالکل آخر میں آتی تھی۔ اس وقت یہ سفر بہت طویل تھا اور دھکوں سے بھرپور بھی۔ اب تو یہاں نئی موٹروے جیسی سڑک بن گئی ہے اور اس بستی تک آدھے گھنٹے میں پہنچا جاسکتا ہے۔ بستی بھی بدل گئی ہے اور اب یہاں جدید طرز کے مکانات اور دکانیں نظر آتی ہیں۔ تمام جدید سہولتیں پہنچ گئی ہیں لیکن اس وقت یہ کسی گاؤں کا منظر پیش کرتی تھی۔

کیونکہ راستے یا بستی میں اچھا کھانا ملنے کا امکان نہیں تھا اس لیے شاہد صاحب نے کھانا بنواکر ساتھ لے لیا تھا۔ احتیاطاً ٹھنڈے پانی کا ایک چھوٹا کولر بھی ساتھ لے لیا تھا۔ موسم اچھا تھا اس لیے طویل سفر برا نہیں لگا تھا اور راستہ گپ شپ میں کٹ گیا۔ دوپہر کے قریب ہم اس کچی آبادی نظر آنے والی بستی میں داخل ہوئے۔ کچی گلیوں میں سیوریج کا گندہ پانی بہہ رہا تھا اور وہاں لائٹ یا گیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ظاہر ہے یہاں رہنے والے بھی بہت غریب تھے۔ گھر بھی زیادہ تر کچے تھے اور گلیاں ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ شاہد صاحب نے کار ایک تندور ہوٹل کے پاس روکی اور کار اس کے مالک کے حوالے کی جس نے ایک بیرے کو اس کی رکھوالی پر مامور کردیا۔ وہاں آس پاس جس قسم کے لوگ نظر آرہے تھے شاہد صاحب کا خدشہ درست لگ رہا تھا کہ واپسی پر ہمیں کار یا اس کے کچھ پارٹس نہیں ملیں گے، اسی لیے انہوں نے احتیاطاً کار کو ہوٹل کے مالک کے سپرد کیا کہ وہ انہیں جانتا تھا۔ کھانے کے بارے میں طے ہوا تھا کہ دعاجی بابا سے ملاقات کے بعد واپس آکر اسی ہوٹل سے تازہ روٹیاں لے کر کھانا بھگتائیں گے۔

''اب کہاں جانا ہے؟''

''کچھ دور جانا ہوگا۔'' شاہد صاحب نے ہوٹل کے سامنے چھوٹا سا گندہ نالا پھلانگتے ہوئے سفر کا آغاز کیا اور یہ سفر خاصا طویل ثابت ہوا۔ کسی قدر گرمی اور اس سے بھی زیادہ دھول مٹی میں چل چل کر ہمارا حلیہ بالکل خراب ہوچکا تھا۔ پیروں کا حال تو شروع میں ہی خراب ہوگیا تھا کیونکہ ہر گلی کسی نالے کا منظر پیش کررہی تھی۔ کچی آبادیوں کے بارے میں ایک بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ اس کے کسی مکین سے پوچھو کہ یہاں پانی آتا ہے تو وہ فوراً بتائے گا کہ پانی کی لائن ہی نہیں ہے یا لائن ہے تو پانی نہیں آتا۔ اس

پر گلیوں کو تالاب بنانے کے لیے ان کے پاس پانی کہاں سے آتا ہے یہ راز کسی کو نہیں معلوم۔

دس منٹ بعد پتا چلا کہ شاہد صاحب راستہ بھول گئے ہیں اور اس میں ان کا قصور نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں کہیں کوئی صراطِ مستقیم نہیں تھا۔ تمام گلیاں بھٹکنے کے لیے نہایت موزوں تھیں۔ اس لیے ہم بھٹک رہے تھے اور مقامی لوگ بھی اس معاملے میں حسبِ توفیق ہماری مدد کررہے تھے۔ خدا خدا کرکے ہم دعاجی بابا کے مکان تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس بستی کا حال دیکھ کر میں نے دعاجی بابا کے ڈیرے کا جو تصور بنالیا تھا اس میں مناسب ترمیم کرلی یعنی اسے جس حد تک غریبانہ کرسکتا تھا کرلیا۔ اس کے باوجود جب اصل مکان سامنے آیا تو میرا تصور نوے فی صد غلط نکلا تھا۔ یہ ٹین کی چھت اور پانچ فٹ کی دیواروں والا ایک چھوٹا سا گھر تھا جو شاید پچاس گز سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دیواریں کچی اینٹوں کی اور بغیر پلاسٹر کی تھیں۔ اندر شاید دو کمرے تھے۔ مکان کے سامنے دو بچے پھٹے پرانے کپڑوں میں مظلومیت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ شاہد صاحب ان سے واقف تھے۔ انہوں نے بتایا۔ ''یہ دعاجی بابا کے بچے ہیں۔''

میں نے بچوں کا معائنہ کیا۔ اگر یہ واقعی دعاجی بابا کے بچے تھے تو وہ خود دعا کے محتاج تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا جو شخص دوسروں کے لیے دعا کرتا ہو اور بہ قول شاہد صاحب اس کی دعا قبول بھی ہوجاتی ہے تو وہ، اس کے بچے اور گھر اتنے برے حالوں میں کیوں ہے؟ شاہد صاحب نے بچوں سے پوچھا۔ ''تمہارا بابا گھر پر ہے؟''

''نہیں بابا کام پر گیا ہے۔'' ایک بچے نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ سندھی تھا۔ یہ سن کر ہم سب ہی پریشان ہوگئے تھے کہ بابا کام پر گیا ہے۔ اگر بابا کام پر گیا تھا تو یہاں شاہد صاحب کے عزیز کا کام کون کرتا۔ بلکہ اب تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ اتنے دھکے کھانے کے بعد یہاں پہنچے ہیں تو دعاجی بابا سے دعا بھی کرالوں اگر کوئی فائدہ نہ ہوا تو نقصان بھی نہیں ہے لیکن یہاں تو باباجی ہی غائب تھے۔ شاہد صاحب نے بچے سے مزید انکوائری کرنے کی کوشش کی کہ بابا کہاں گیا ہے اور کب آئے گا لیکن بچے کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا کہ بابا کام پر گیا ہے۔۔۔ یا تو اس کی سمجھ میں شاہد صاحب کے سوالات نہیں آرہے تھے یا اس کی معلومات باباجی کی سرگرمیوں کے بارے میں یہیں تک محدود تھیں۔

''شاہد صاحب ایسا کریں دروازہ بجائیں۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''یار وہ گھر پر نہیں ہے۔'' شاہد صاحب ہچکچا کر بولے۔ ''ظاہر ہے اندر عورت ہوگی۔''

''کوئی بات نہیں ممکن ہے وہ بتادے کہ بابا کہاں ہے؟''

میرے اور دانیال حسن کے اصرار پر شاہد صاحب مان گئے۔ اس سے پہلے دعاجی بابا ان کو ہمیشہ اپنے گھر کے باہر یا آس پاس مل جاتا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کہیں کام پر گیا ہوا تھا۔ شاہد صاحب نے اس کے گھر کے جھولتے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک بڑی عمر کا لڑکا نکلا۔ اس نے صرف شلوار پہن رکھی تھی اور شاید سوتے سے اٹھ کر آیا تھا اس لیے پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔ ''کیا ہے؟''

''تمہارے بابا سے ملنا ہے۔''

اس نے جواب میں اپنے چھوٹے بھائی کو کس کر تھپڑ رسید کیا اور بولا۔ ''تجھے یہاں کیوں کھڑا کیا ہے بتایا نہیں۔''

چھوٹا پہلے گلا پھاڑ کر رویا اور پھر بولا۔ ''بتایا پر اس نے دروازہ بجادیا۔'' اس پر چھوٹے کو ایک عدد تھپڑ اور کھانا پڑا تھا۔ پھر بڑے نے ہماری طرف توجہ دی۔ ''سن لیا بابا گھر پہ نہیں ہے کام سے گیا ہے۔''

''کہاں گیا ہے کب آئے گا؟''

''پتا نہیں جہاں کام مل گیا ہوگا وہاں ہوگا، میرے کو نہیں معلوم کب آئے گا۔'' لڑکے نے رکھائی سے جواب دیا اور واپس گھر میں گھس گیا۔ اس نے جس انداز میں دروازہ بند کیا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پھر اسے نہیں کھولے گا۔ شاہد صاحب نے بے بسی سے ہماری طرف دیکھا۔

''بدتمیز لڑکا ہے۔''

''وہ بھی دعاجی بابا کا۔'' میں نے سر کھجایا۔ ''شاہد صاحب بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے، آپ کا کہنا ہے کہ اس شخص کی دعا دوسروں کے لیے قبول ہوتی ہے اور دعا آدمی اسی صورت میں کراتا ہے جب اور کوئی چارہ نہ رہ گیا ہو۔ تب اس شخص کے بیوی بچے اور گھر اتنے خستہ حال کیوں ہے؟''

''یہ میں آپ کو واپسی کے سفر میں بتاؤں گا۔ ابھی تو اسے تلاش کرنا ہے پتا نہیں کہاں مر گیا ہے؟''

اگرچہ جب سے دعاجی بابا کا ذکر کیا جارہا تھا اور میں نے سنا تھا تو میں نے شاہد صاحب سمیت کسی کے لہجے میں اس کے لیے عزت محسوس نہیں کی تھی حالانکہ شاہد صاحب کہہ رہے

تھے کہ انہیں خود ذاتی طور پر دعاجی بابا کا تجربہ رہا ہے، اس کے باوجود ان کے لہجے میں ایک بار بھی اس کے لیے احترام محسوس نہیں کیا تھا اور اب تو انہوں نے یوں بات کی تھی جیسے دعا جی بابا عام سے بھی گئی گزری کوئی شخصیت ہو۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ ایک بزرگ ہستی کے بارے میں اس طرح سے بات کر رہے ہیں۔''

''کیسا بزرگ اور کہاں کا بزرگ؟'' وہ اسی انداز میں بولے۔ ''خیر تمہیں کیا بتاؤں ابھی مل جائے تو تم دیکھ لوگے۔''

اس کے بعد دھکے کھانے اور بھٹکنے کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم بستی میں چکراتے ہوئے مختلف لوگوں سے دعاجی بابا کے بارے میں پوچھتے رہے۔ دعاجی بابا کے نام سے اسے سب جانتے تھے اور مزے کی بات تھی میں نے مقامی لوگوں کے لہجے میں اس کے لیے کوئی عزت اور احترام محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ بالکل عام سے انداز میں اس کا نام لے رہے تھے اور بعض نے تو صاف بے زاری سے کہا۔ ''ہمیں کیا پتا کہاں مرا ہوا ہے؟''

مجھے لگ رہا تھا کہ ہم اس کی تلاش میں یونہی بھٹکتے رہیں گے اور وہ ہمیں نہیں ملے گا لیکن بالآخر ایک کریانے کی چھوٹی سی دکان کے مالک نے ہمیں بتایا کہ دعاجی بابا ان دنوں وہاب گل کے مکان پر کام کر رہا ہے اور آج بھی شاید وہیں ہے۔ اس آدمی نے اتنی مہربانی اور کی کہ ایک چھوٹا بچہ ہمارے ساتھ کر دیا جس نے دس منٹ میں ہمیں ایک زیرِ تعمیر مکان کے سامنے کھڑا کر دیا اور اس سے پہلے کہ ہم کسی سے اس مکان کے بارے میں تصدیق کرتے وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ مکان زیرِ تعمیر تھا اور اندر سے آتی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ مزدور کام کر رہے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر آواز دی۔

''کوئی ہے، ہمیں دعاجی بابا سے ملنا ہے۔''

ایک منٹ بعد اندر سے ایک دبلا اور چھوٹے قد کا آدمی نمودار ہوا، اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور اس نے صرف شلوار پہن رکھی تھی۔ گارے میں سنے ہاتھ بتا رہے تھے کہ وہ مزدور ہے۔ سیاہی مائل پکی رنگت اور جھاڑ جھنکاڑ کھڑے بال۔ نقوش جیسے حالات نے تباہ کر دیے تھے اور آنکھوں سے ایک طرح کا غصہ اور بے زاری جھلک رہی تھی۔ اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

''ہمیں دعاجی بابا سے ملنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہی شخص دعاجی بابا ہو گا اور جب شاہد صاحب نے مجھے یہ بات بتائی تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ایک برگزیدہ شخص تو در کنار ایک اچھا اور نارمل انسان بھی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے ناقابلِ یقین نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ دعاجی بابا ہے؟''

''ہاں تو کیا کوئی اور ہے؟'' وہ برے انداز میں بولا اور پھر کہا۔ ''جلدی مطلب کی بات کرو ٹھیکے دار میرا باپ نہیں ہے جو مجھے مفت کی دیہاڑی دے گا۔''

وہ جانتا تھا کہ ہم کس لیے وہاں آئے ہیں۔ شاہد صاحب نے پہلے دانیال حسن کی طرف اشارہ کیا اور بولے۔ ''ان کی بچی کا آپریشن ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے۔''

''اللہ کرے گا تیری بچی کی جان بچ جائے گی۔'' دعاجی بابا نے ایسے ہی کہا۔ اس نے نہ تو ہاتھ اٹھائے اور نہ دعا مانگنے سے پہلے وہ سب کیا جو لوگ عام طور سے دعا مانگنے سے پہلے کرتے ہیں۔ جیسے سر اوپر کرنا اور تاثرات میں نرمی اور عاجزی لانا۔ اس نے یوں دعا کی تھی جیسے جان چھڑا رہا ہو اور پھر سوالیہ نظروں سے شاہد صاحب کی طرف دیکھا۔ ''اور کچھ؟''

''یہ کمال صاحب ہیں ان کی نوکری خطرے میں ہے، ایک اعلیٰ حیثیت کا شخص ان کے پیچھے پڑ گیا ہے اور ان کو نوکری سے نکالنے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔''

''اللہ تیری نوکری بچا لے گا۔'' اس نے پھر اسی انداز میں کہا۔ ''بس یہی دعا کرانی تھی؟''

''ہاں یہی دعا کرانی تھی۔''

''بس تو جاؤ۔'' اس نے کہا اور دوبارہ مکان میں گھس گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کی دعا تھی اور ہم ان دو الفاظ کے لیے کوئی چالیس کلومیٹر کا سفر طے کر کے یہاں آئے تھے۔ میں نے شاہد صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے سر ہلا کر تصدیق کی۔

''کام ہو گیا ہے اب واپس چلنا ہے۔''

ہم واپس روانہ ہوئے۔ جب تک ہم یہاں تک نہیں آئے تھے اور دعاجی بابا سے نہیں ملے تھے تو میرے لیے یہ سفر بالکل عام سا تھا لیکن اب دعاجی بابا کو دیکھ کر یہ سفر خاص بن گیا تھا اور میں شدید قسم کے تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ممکن ہے دانیال حسن کا بھی یہی حال ہو۔ اب میں منتظر تھا کہ ہم واپسی کا سفر شروع کریں اور شاہد صاحب مجھے اس شخص کے

بارے میں بتائیں۔ واپس ہوٹل تک آنے میں آدھا وقت بھی نہیں لگا تھا۔ دو بج چکے تھے اوپر سے گرمی اور دھول میں پیدل سفر نے بھوک چمکا دی تھی۔ شاہد صاحب نے گاڑی سے ٹفن نکالا اور ہم ہوٹل میں آ گئے۔ ہوٹل کے مالک نے قطعی اعتراض نہیں کیا کہ ہم اس کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنا کھانا کھا رہے تھے۔ ہم نے صرف روٹی اور ٹھنڈا پانی اس سے لیا تھا۔ البتہ کھانے کے بعد اس نے بڑی شاندار قسم کی چائے پلائی تھی اور خود کو ٹپ کا مستحق ثابت کر دیا تھا۔ شاہد صاحب نے اسے بھاری بھرکم ٹپ دی۔ تین بجے ہم تازہ دم ہو کر واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ سچی بات ہے میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور بہتر محسوس کر رہا تھا۔ آتے وقت مجھے اپنی ملازمت کے حوالے سے جو پریشانی تھی جاتے وقت اس کا دسواں حصہ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ شاہد صاحب ڈرائیو کر رہے تھے، میں نے ان سے پوچھا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ ہمارے یہ مسائل حل ہو جائیں گے؟''

''میرا یقین چھوڑو' اللہ نے چاہا تو تم دونوں دیکھو گے۔''

دانیال بولے۔ ''یار شاہد سچ بتاؤں تو مجھے اس شخص اور اس کے دعا کرنے کے انداز پر بالکل یقین نہیں آرہا ہے۔ اس نے دعا کی ہے یا جان چھڑائی ہے۔''

''ہاں اس نے صرف منہ سے الفاظ نکالے تھے۔'' میں نے ان کی تائید کی۔ ''اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔''

''اس نے جان ہی چھڑائی ہے۔'' شاہد صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے دعا کرنے کا یہی انداز ہے اور اس کی اس طرح مانگی ہوئی کوئی دعا رد نہیں ہوتی ہے۔ تم لوگوں کو شاید اس پر یقین نہیں آرہا ہے۔ مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا لیکن چند دن بعد میں قائل ہو گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے یہ تو ہم چند دن میں دیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے کہا تھا اس کے بارے میں بتائیں گے۔''

''ہاں میں اس کے بارے میں بتاؤں گا جو میں نے اس سے اور اس کے بارے میں دوسروں سے سنا ہے۔ دعاجی بابا اصل میں لسبیلہ کا رہنے والا ہے اور اس کی مادری زبان سندھی ہے جیسا کہ تم نے اندازہ کیا ہو گا لیکن یہ بلوچوں کا علاقہ ہے اور یہاں زیادہ تر بلوچی اور اردو بولی جاتی ہے۔ دعاجی بابا نوجوانی کی عمر سے یہاں ہے۔ میں نے دو سال پہلے اس کے بارے میں ایک بلوچ واقف کار سے سنا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اس کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی ہے اور میں چاہوں تو آزما کر بھی دیکھ لوں لیکن شرط یہ ہے کہ مسئلہ اصلی ہونا چاہیے اور دعا کا متقاضی بھی ہونا چاہیے۔ یعنی اس سے کسی الل ٹپ دعا کے لیے نہیں کہہ سکتے۔ کسی مسئلے کا ہونا ضروری ہے اور پھر وہ مسئلہ آپ کے یا انسانی قابو سے باہر بھی ہو گیا ہو۔ میرا بھی ایسا ہی ایک مسئلہ تھا۔ میں نے بلوچ واقف کار سے کہا وہ مجھے اس کے پاس لے چلے۔ وہ مجھے دعاجی بابا کے پاس لے آیا اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ میں نے اس سے دعا کے لیے کہنے سے انکار کر دیا لیکن جب بلوچ واقف کار نے زیادہ ہی اصرار کیا تو میں نے اسے مسئلہ بتا کر

جنّات کی خوراک

مابعد الحیاتیات (ایکسوبیالوجی) کی رو سے ایسی مخلوقات ہو سکتی ہیں جو محض توانائی پر زندہ رہ سکیں۔ یعنی اشیائے غذائی کو سونگھ کر اس کی توانائی جذب کر لیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میرے نانا سید کرار حسن مرحوم کے بھائی سید ابرار حسن مرحوم کے مراسم ایک بزرگ جن سے تھے۔ سنا ہے کہ ایک مرتبہ نانا سید ابرار حسن مرحوم نے ان بزرگ جن سے درخواست کی کہ آپ میری دعوت قبول فرما لیں۔ بڑی ردّو قدح کے بعد انہوں نے ہامی بھر لی یعنی دعوت قبول کر لی۔ نانا سید ابرار حسن مرحوم نے ایک سوال کیا کہ آپ کھانے میں کیا چیز پسند فرمائیں گے؟ انہوں نے فرمایا جو کی روٹی، پنیر اور کافور۔ نانا مرحوم نے بڑے اہتمام کے ساتھ جو کی روٹی تیار کرائی اور پنیر اور کافور کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ دوسرے تیسرے روز ان بزرگ جن نے کھانے کے جو برتن واپس کیے تو نانا مرحوم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جو کی روٹیاں، کافور اور پنیر تینوں خاکستر بن کر رہ گئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا؟ کہا کہ ہم آپ کی طرح کھایا نہیں کرتے۔ صرف سونگھا کرتے ہیں اور سونگھ کر ہر شے کی غذائی طاقت جذب کر لیتے ہیں۔

از سید محمد تقی، سابق ایڈیٹر جنگ کراچی۔

دعا کے لیے کہہ دیا۔ اس نے اسی انداز میں کھڑے کھڑے دعا کی اور چلا گیا۔ یہ دعا کے بعد اس شخص کے پاس نہیں رکتا ہے جس کے لیے دعا کرتا ہے یا اگر اپنے گھر یا آس پاس کہیں ہو تو جس کے لیے دعا کرتا ہے اسے فوراً جانے کو کہتا ہے اور اگر کوئی رکنا چاہے تو اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اپنی دعا واپس بھی لے سکتا ہے۔''

''آپ نے کس سلسلے میں دعا کرائی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ وہ۔۔۔۔'' شاہد صاحب کھسیانے انداز میں ہنسے۔ ''وہ بس تھا ایک معاملہ میاں تم مت پوچھو اسی وجہ سے میں نے ان بلوچ واقف کار کا نام نہیں لیا۔ کچھ باتیں صیغہ راز میں رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔''

''جیسی آپ کی مرضی لیکن دعاجی بابا کے بارے میں تو کچھ راز میں نہیں رکھنا ہے؟''

''ارے نہیں میاں۔۔۔۔ یہ غریب مسکین آدمی ہے کھلی کتاب کی طرح بھلا اس کا کیا راز ہو سکتا ہے۔'' وہ بولے۔ ''بہرحال میں واپس آیا اور انتظار کرنے لگا اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب میرا مسئلہ بالکل اسی طرح حل ہو گیا جس طرح میں چاہتا تھا۔ لیکن میرا شک مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کے بعد کئی افراد کو لے جا کر دعاجی بابا سے ان کے لیے دعا کرائی اور ان سب کے جو مسائل تھے وہ اس کے دعا کرنے کے بعد حل ہو گئے تھے۔''

''اس کے بعد آپ کو اس پر یقین آ گیا۔''

''اس پر نہیں بلکہ اس بات پر یقین آ گیا کہ وہ جو دعا کرتا ہے وہ قبول ہوتی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو یہ حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ وہ کوئی بزرگ تو درکنار عام قسم کا مذہبی انسان بھی نہیں ہے، وہ نہ تو نماز پڑھتا ہے اور نہ روزے رکھتا ہے۔ مذہب کے بارے میں اس کا علم نہایت محدود ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس بارے میں وہ نہایت جاہل شخص ہے اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ کسی شخص کے کسی مسئلے کے بارے میں صرف چند الفاظ میں دعا کر لے تو اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ باقی اس کا موثر ہونا تم خود دیکھ لو گے۔'' وہ بولے۔ ''باقی اس کے بارے میں، میں نے معلوم کرایا ہے۔ یہ صرف بیس سال کا تھا جب اس بستی میں آیا تھا۔ دو سال بعد یہ شادی کر کے اپنی بیوی کو بھی یہیں لے آیا۔ اس کی ساری کمائی وہ مکان ہے جو تم نے دیکھا ہے۔ اس کے چھ بچے ہیں، چار لڑکے اور دو لڑکیاں، میرا اندازہ ہے کہ جو لڑکا اندر سے آیا تھا وہ اس کا تیسرا بڑا لڑکا ہے۔''

''یہ کیسا شخص ہے؟''

''ویسا ہی شخص ہے جیسا اس قسم کے آدمی کو ہونا چاہیے۔ مزدوری کا کام کرتا ہے اور معمولی درجے کا راج مستری بھی ہے۔ لڑنا جھگڑنا، گالی گفتار اور دوسروں کو دھوکا دینے میں بالکل عام آدمی کی طرح ہے۔ کئی ٹھیکیداروں کے ساتھ کام کر چکا ہے اور سب اس کی کام چوری سے تنگ ہیں کیونکہ سر پر کھڑے رہو تو ٹھیک کام کرتا ہے اور اگر اکیلا چھوڑ دو تو آرام کرتا ہے۔''

میں نے خدا کے برگزیدہ لوگوں کے بارے میں جو جانا تھا دعاجی بابا اس پر پورا نہیں اترتا تھا۔ ہمارے مذہب میں روحانی صلاحیتیں اخلاقیات میں ترقی کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتیں۔ یعنی کسی شخص میں اگر بزرگی کی کوئی علامت نظر آتی ہے تو لازمی طور پر اسے اخلاقی لحاظ سے دوسروں سے بہتر ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی بزرگی ایک ڈھونگ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن یہ شخص تو دکھاوے کے لیے بھی بزرگ نہیں تھا وہ جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود شاہد صاحب کا کہنا تھا کہ اس کی دوسروں کے لیے مانگی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔

''ٹھیک ہے یہ بات مان سکتے ہیں کہ اس کی دعا قبول ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورت میں اس کی اپنی حالت اتنی خراب کیوں ہے؟''

''یہ سوال میں نے بھی اس سے ایک ملاقات میں کیا تھا، پہلے تو اس نے جواب دینے سے انکار کر دیا لیکن جب میں نے زیادہ زور دیا تو اس نے بہت بے زاری سے کہا۔ وہ اپنے لیے دعا نہیں کر سکتا، اگر وہ اپنے یا بیوی بچوں کے لیے دعا کرتا ہے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس کے حالات ایسے ہیں۔ پھر اس نے ایک عجیب بات کی۔ یہ دعا والی صلاحیت اس کے لیے سزا ہے۔''

''آپ نے سزا کے بارے میں نہیں پوچھا؟''

''پوچھا تھا لیکن اس نے پھر میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ یہ آخری بار کی ملاقات کا ذکر ہے۔''

میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک شخص جو دوسروں کے لیے دعا مانگتا ہے تو قبول ہو جاتی ہے اور اپنے یا اپنے متعلقین

کے لیے دعا مانگتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ شاہد صاحب اس کے بارے میں جتنا جانتے تھے وہ انہوں نے راستے میں ہمیں بتا دیا تھا لیکن اس سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال پہلے تو میرا مسئلہ حل ہوتا تھا اس کے بعد ہی میں مزید دعاجی بابا کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ ہم شہر واپس پہنچے اور اگلے دن میں ذرا دیر سے دفتر آیا تو حافظ صاحب کا پیغام پہلے ہی میرا منتظر تھا۔ وہ کسی قدر خوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''میاں کمال مٹھائی کا بندوبست تو آج ہی کر لو پارٹی بعد میں لیں گے۔''

''میری الوداعی پارٹی تو آپ نے دینی ہے۔''

وہ ہنسے۔ ''میاں کیسی الوداعی پارٹی۔۔۔۔ وہ تو تم ہمیں دو گے چند سال بعد۔۔۔۔ تم بچ گئے ہو۔''

وہ تو میں ان کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ کوئی بات ہوئی ہے اور اب میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔ ''حافظ صاحب مٹھائی بھی آ جائے گی لیکن آپ خبر تو دیں۔''

''بھائی بات یہ ہے کہ کل اچانک ہی ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ میں اعلان ہوا کہ ہمارے محکمے کے سربراہ کو بدل دیا گیا ہے اور دوسری خبر جو اندر کی تھی اس کے مطابق ادیب صاحب کی کسی طاقت ور وزیر سے ٹھن گئی اور اس نے ان کا پرائم منسٹر ہاؤس میں داخلہ بند کرا دیا۔ تم جانتے ہو یہاں سب وہ بیٹھے ہیں جو ہوا کا رخ دیکھ کر چلتے ہیں۔ مجھے امید ہے انکوائری کرنے والی کمیٹی کا فیصلہ بھی بدل چکا ہو گا اور ایک دو دن میں اس کا فیصلہ بھی آ جائے گا۔''

جب حافظ صاحب یہ سب بتا رہے تھے تو میرے ذہن میں وہ سیاہ رُو اور عام سا شخص آ رہا تھا جس نے بالکل عام سے انداز میں کہا تھا ''اللہ تیری نوکری بچا لے گا۔''

اسے یہ بات کہے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ شام تک یہ بات سارے دفتر میں مشہور ہو گئی تھی کہ میں نے کوئی زبردست جیک لگایا ہے جس نے میری ملازمت بھی بچا لی اور ادیب صاحب کا بیڑا غرق کر دیا۔ گھر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے میں لوگوں کو یہی یقین دلاتا رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے پاس کوئی جیک ہوتا تو نوبت یہاں تک آتی ہی کیوں؟ لیکن لوگ اس قسم کی باتوں پر یقین کہاں کرتے ہیں۔ صرف شاہد صاحب کو معلوم تھا کہ اصل میں کس نے یہ کام کیا ہے؟ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''میاں چھوڑو اگر لوگ ایسا سمجھتے ہیں تو سمجھنے دو بلکہ اچھا ہے آئندہ کوئی تم سے پنگا لینے سے پہلے کئی بار سوچے گا۔''

واقعی اب دفتر کے ساتھی مجھ سے ذرا مختلف انداز میں پیش آتے تھے، حد یہ ہے کہ حافظ صاحب بھی محتاط انداز میں بات کرنے لگے تھے اور ان کے لہجے میں پہلے جیسی بے تکلفی نہیں رہی تھی۔ بعض اوقات تو میں سوچنے لگتا تھا کہ کیا واقعی یہ دعاجی بابا کی دعا کے سبب ہوا ہے یا میرا کوئی ایسا جیک ہے جس کے بارے میں مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے۔ بہرحال یہ دعاجی بابا کی دعا کی وجہ سے ہی تھا کیونکہ چند دن بعد دانیال صاحب کی بچی کا آپریشن ہوا اور وہ اس خطرناک آپریشن سے جانبر ہو گئی تھی۔ بلکہ آپریشن بھی سو فی صد کامیاب رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے دعاجی بابا سے ایک بار پھر ملنا چاہیے، ایک تو میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا دوسرے میں جاننا چاہتا تھا کہ اسے یہ چیز کس طرح ملی۔

اس کے بعد دفتری مصروفیات اور کچھ گھر کے معاملات اس طرح مجھے گھیرے رہے کہ میں سوچنے کے باوجود دعاجی بابا کی طرف جانے کا پروگرام نہیں بنا سکا تھا۔ ان ہی دنوں امی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور ان کو اسپتال میں داخل کرانا پڑا تھا۔ وہ دو ہفتے بعد صحت یاب ہو کر واپس آئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ پھر چھوٹی بہن کے رشتے کا معاملہ ہوا اور لڑکے والوں کو شادی کی جلدی تھی۔ امی بھی بیماری کے اس حملے سے ڈر گئی تھیں اور انہوں نے اپنے سامنے بیٹی کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ رشتہ ہوتے ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی اور جھٹ پٹ شادی بھی ہو گئی۔ شادی کے دنوں میں دفتر سے کچھ چھٹیاں لی تھیں اور ان کے ازالے کے لیے چھٹی کے دن بھی دفتر جاتا رہا تھا کیونکہ اپنا کام تو نمٹانا تھا۔

دعاجی بابا کا خیال ایک دوست زاہد کامران کی وجہ سے آیا۔ وہ کاروباری آدمی تھا لیکن ایک چکر میں پھنس کر اپنا کاروبار گنوا بیٹھا تھا اور اب بہت مشکل میں تھا، قرض خواہ گھر کے باہر موجود رہتے تھے اور بیوی بچوں کو کھلانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں اس سے ملا تو وہ بہت مایوس تھا کہ ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن کہیں سے کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے پانچ لاکھ روپے کی ضرورت تھی کہ قرض خواہوں کا منہ بند کر سکے اور اپنا کاروبار پھر سے شروع کر سکے۔ میں اس کی مدد کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو خود ایک ملازمت پیشہ آدمی تھا جس کی جمع پونجی ہمیشہ محدود ہوتی

ہے۔ پھر اسے تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے مجھے دعاجی بابا کا خیال آیا اور میں نے اس سے کہا۔ ”یار تمہارے مسئلے کا ایک حل ہوسکتا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تمہیں میرے ساتھ ایک شخص کے پاس چلنا ہوگا، وہ تمہارے لیے دعا کرے گا تو تمہارے مسائل حل ہو جائیں گے۔“

”تم جانتے ہو میں ان باتوں کا قائل نہیں ہوں۔“

”میرے دوست کیا میں قائل ہوں لیکن اس شخص کو میں دیکھ چکا ہوں اور اس سے دعا بھی کرا چکا ہوں۔ کرنے والا اللہ ہے لیکن اس کی دعا کے بعد میں اس مشکل سے بچ گیا جو آنے والی تھی۔“

زاہد کو میری ملازمت جانے والی بات معلوم تھی لیکن میں نے اسے دعاجی بابا کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اسے کیا میں نے بہت کم لوگوں کو اس بارے میں بتایا تھا۔ اب میں نے زاہد کو بتایا کہ میری نوکری کس طرح بچی تو وہ حیران ہوا تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔“

”مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ایک بار چلو اور اس سے دعا کرالو۔“

زاہد سوچ میں پڑ گیا تھا پھر دو دن بعد اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ ”یار میں چلنے کو تیار ہوں، کب چلنا ہے تمہارے بابا جی کے پاس۔“

”چھٹی کے دن ہی جاسکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم آنے والے جمعے کو تیار رہو۔“

میرے پاس بائیک تھی اور ہم اسی پر دعاجی بابا کی بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ میں کئی مہینے بعد جارہا تھا اس لیے میں اس کے گھر کا راستہ بھول گیا تھا اور ہم بڑی مشکل سے پوچھتے پاچھتے اس کے گھر پہنچے تھے۔ اس بار بائیک کی وجہ سے یہ آسانی ہوئی کہ پیدل دھکے نہیں کھانا پڑے تھے لیکن جب اس کے گھر پہنچے تو باہر موجود بچوں نے ایک بار پھر اطلاع دی۔ ”ابا گھر پہ نہیں ہے۔“

”تو کہاں ہے؟“ میں نے چھوٹے لڑکے سے پوچھا لیکن وہ وضاحت نہیں کر پایا۔ اس پر میں نے دروازہ بجایا اور اس بار لڑکے کے بجائے اندر سے ایک تقریباً نوجوان لڑکی باہر آئی۔ اس کی عمر شاید پندرہ یا سولہ برس تھی۔ اس نے آتے ہی کڑے تیوروں سے پوچھا۔

”کیا ہے؟“

”دعاجی بابا سے ملنا ہے۔“

”وہ یہاں نہیں ہے۔“ لڑکی نے رکھائی سے کہا اور اندر جانے لگی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔

”بچی تم یہ تو بتاسکتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟“

لڑکی رکی اور کچھ دیر سوچتی رہی جیسے فیصلہ کررہی ہو کہ بتائے یا نہ بتائے۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”ابا اسپتال میں ہے۔“

”کون سے اسپتال میں؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”ادھر شہر میں بڑا اسپتال ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”رکو میں پوچھ کر بتاتی ہوں۔“ وہ اندر چلی گئی۔ زاہد نے مسکرا کر کہا۔

”لو جن سے دعا کرانے آئے تھے وہ تو خود دعا کے محتاج نکلے۔“

”شاید اسے کسی اور کی دعا لگ جائے لیکن وہ خود اپنے لیے دعا نہیں کرسکتا۔“

”ہاں تم نے بتایا تھا، لیکن یہ کیا چکر ہے؟“

”سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی نہیں معلوم ہے۔ البتہ اس سے پوچھنے کا ارادہ تھا۔“

لڑکی کچھ دیر میں آئی اور اس نے کہا۔ ”ابا سول اسپتال میں۔“

”کس شعبے میں ہے؟“ میں نے پوچھا تو لڑکی سمجھی نہیں تھی اور دوبارہ پوچھنے کے لیے اندر جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔ ”تیرے ابا کو کیا ہوا ہے؟“

”وہ اوپر سے گر گیا تھا، کمر پر چوٹ آئی ہے۔“ لڑکی نے بتایا۔

کام بن گیا تھا، کمر پر چوٹ کا مطلب تھا کہ دعاجی بابا ہمیں آرتھو پیڈک یا نیورو وارڈ میں ملتا۔ زاہد مایوس تھا۔ اس نے واپسی کے سفر میں کہا۔ ”اتنی دور خواری کی۔۔۔۔ وہ تو میرے گھر کے پاس ہی موجود ہے۔“

زاہد کا گھر سول اسپتال کے ساتھ تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کرکے واپس پہنچے تو پہلے کچھ دیر زاہد کے گھر آرام کیا۔ ویسے بھی سول اسپتال میں ملاقات کا وقت چار سے چھ بجے تک ہوتا ہے۔ چار بجے سے کچھ پہلے ہم سول اسپتال پہنچ گئے اور دعاجی بابا ہمیں آرتھو پیڈک وارڈ میں مل گیا۔ وہ ایک بستر پر ساکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس ہر بستر پر موجود مریضوں سے ملنے والے آئے ہوئے تھے لیکن اس کے بستر

کے پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے اسے پکارا۔

”دعاجی بابا۔“

اس نے آنکھیں کھولیں اور چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے پہچان لیا۔ ”تم وہی ہے جو اس دن دعا کرانے آیا تھا۔ تمہارا کام ہوگیا ہوگا۔“

”ہاں میرا کام ہوگیا۔“ میں نے سر ہلایا اور اس کے بستر کے ساتھ موجود بینچ پر بیٹھ گیا۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”اوپر سے گر گیا تھا، کمر پر چوٹ لگی ہے، ڈاکٹر کہتا ہے شاید ٹھیک ہو جائے یا شاید ٹھیک نہ ہو۔“ اس کے لہجے میں بے بسی آگئی۔ ”ابھی اٹھ نہیں سکتا ہے۔“

اس کے کپڑے خراب ہورہے تھے اور اس کے پاس سے ہلکی سی بو آرہی تھی، وہ یہاں سرکاری اسپتال میں بے یارو مددگار پڑا تھا۔ ”یہاں تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے؟“

”نہیں ادھر کیا میرے ساتھ کبھی کوئی نہیں ہوتا ہے۔ یہ میری سزا ہے۔ میرے کو بددعا ہے۔“

مجھے تعجب ہوا، لوگوں کو دعا دینے والے اور ان کے کام آنے والے شخص کو کسی نے بددعا دے رکھی تھی اور اس بددعا کی وجہ سے آج وہ بے سہارا تھا۔ ”کس نے بددعا دی ہے؟“

”میری ماں نے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اسے بہت ستایا تھا، اس نے مرتے ہوئے بددعا دی کہ میں ہمیشہ پریشان اور مشکل میں رہوں۔“

دعاجی بابا پڑھا لکھا اور سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص نہیں تھا، اس کی باتیں بے ربط اور جملے نامکمل ہوتے تھے، اس وجہ سے اس کی بات سمجھنے میں مشکل آرہی تھی۔ میں اس سے سوال کرتا رہا اور وہ میرے سوالوں کا جواب دیتا رہا اور اس سے میں نے جو جانا وہ آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔

دعاجی بابا کا اصل نام قادر بخش ہے۔ اس کا تعلق لسبیلہ کے ایسے گھرانے سے ہے جو اس علاقے میں صدیوں سے عزت دار رہا ہے۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے اللہ والے کہلاتے تھے اور ان میں ہر دور میں ایک بزرگ رہا ہے جس کی ہر دعا قبول ہوتی تھی لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ دعا کسی دوسرے کے لیے ہو اور وہ ضرورت مند بھی ہو، اپنے خاندان کے کسی فرد کے لیے دعا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ انگریزوں کے دور میں اس خاندان کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی پاداش میں یہاں سے جبراً بے دخل کردیا گیا اور ان کی زمینیں چھین لی گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ خاندان منتشر ہوگیا اور اس کے بیشتر لوگ ہجرت کرکے افغانستان چلے گئے تھے۔ کچھ لوگ باقی رہے ان میں قادر بخش کا پردادا بھی تھا۔ قادر بخش اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی اور ان کے خاندان میں اس وقت دعا کرنے والی اس کی ماں تھی۔ اس کی ہر دعا قبول ہوتی تھی۔

اس خاندان کے صاحبِ دعا بزرگ یہ کرتے تھے کہ جب ان کا آخری وقت آتا تو وہ اپنے خاندان کے کسی ایک فرد کے لیے دعا کرتے تھے کہ خدا اس کی ہر دعا قبول کرے اور اس طرح وہ دعا دوسرے کو دے جاتے تھے۔ قادر بخش بچپن سے خودسر اور دنیادار لڑکا تھا۔ اس کا دل کھیل تماشوں میں زیادہ لگتا تھا پھر اسے صحبت ایسی ملی کہ وہ بگڑتا چلا گیا۔ اس کی ماں اس کے لیے پریشان تھی لیکن اپنی روایت کے مطابق وہ اس کی دنیا کی بہتری کے لیے دعا نہیں کرسکتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں قادر بخش چوری کرنے لگا تھا کیونکہ اس کا گھرانا بہت زیادہ غریب تھا۔ وہ بچپن سے آسائشوں کے لیے ترسا ہوا تھا اور اب اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط ہوئے تو وہ دنیا سے اپنا حصہ چھین کر لینے لگا۔

مگر ساتھ ہی اسے اپنے خاندان کی عزت کا بھی احساس تھا اس لیے جب ایک بار اس پر الزام آیا تو وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر اس بستی میں چلا آیا اور یہاں رہنے لگا لیکن یہاں نہ تو اس کے مجرم دوست تھے اور نہ ہی کوئی پشت پناہ تھا اس لیے وہ یہاں جرم کرتے ہوئے ڈرتا تھا اور اس نے محنت مزدوری شروع کردی۔ یہاں آنے کے بعد وہ ایک بار بھی گاؤں نہیں گیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد اسے گاؤں سے پیغام ملا کہ اس کی ماں بہت بیمار ہے اور اس سے ملنا چاہتی ہے۔ قادر بخش گاؤں پہنچا تو اس کی ماں آخری دموں پر تھی اس نے دو کام کیے۔ ایک تو اس نے اپنی بھانجی سے قادر بخش کی شادی کرادی، پھر اس نے قادر بخش کو سامنے بٹھا کر اس کے لیے یوں دعا کی۔

”اے اللہ میرے بیٹے قادر بخش کی ہر وہ دعا قبول کرنا جو یہ کسی دوسرے کے لیے کرے اور جب اس سے کوئی دعا کے لیے کہے تو یہ کبھی انکار نہ کرے۔ یہ اپنے لیے کوئی دعا نہ کرے اور اگر دعا کرے تو اسے نقصان ہو اور اگر یہ اپنی دعا کے بدلے کسی سے کچھ لے تو وہ اسے راس نہ آئے۔ اے اللہ یہ بہت دنیادار ہے اسے دنیا ملی تو یہ تجھے بھول جائے گا اس لیے اسے ہمیشہ مشکل اور پریشانی میں رکھنا، اسے کبھی کوئی آسانی نہ ملے۔“

قادر بخش کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ اسے

If you want to download monthly digests like shuaa,khwateen digest,rida,pakeeza,Kiran and imran series,novels,funny books,poetry books with direct links and resume capability without logging in. just visit www.paksociety.com for complaints and issues send mail at admin@paksociety.com or sms at 0336-5557121

معلوم تھا اس کی ماں کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ اس نے ماں سے التجا کرنا چاہی کہ وہ اس کے لیے ایسی دعا نہ مانگے لیکن اس کی ماں نے دعا مانگی پھر کلمہ شہادت پڑھا اور اسی وقت اس کا دم نکل گیا۔ قادر بخش دم بہ خود رہ گیا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا اس کی ماں مرنے سے پہلے اسے ایسی سزا دے جائے گی اور اب اسے ساری عمر یہ سزا بھگتنا تھی۔ ماں کو دفنا کر وہ بیوی کے ساتھ واپس اس بستی میں آ گیا۔ تب سے وہ یہیں تھا اور لوگوں کے لیے دعا کر رہا تھا لیکن اپنے لیے دعا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی حالت ہمیشہ خراب رہی۔ اس نے سکون اور خوشی کے لمحات بہت کم دیکھے۔ آخر میں اس نے بھیگے لہجے میں کہا۔ ''میں بہت تکلیف میں رہا ہوں لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے میری ماں نے کتنی تکلیف اٹھائی ہے میری وجہ سے۔ اس نے مجھے صحیح سزا دی۔''

''لیکن اس نے دعا کرنے کی صلاحیت تمہیں کیوں دی، وہ کسی اور کو بھی دے سکتی تھی۔''

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اور زاہد اس کے لیے دکھی ہو گئے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟''

میری اس بات پر وہ کانپ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''خدا کے واسطے نہیں۔۔۔۔ جب کسی نے دعا کے بدلے میرے لیے کچھ کیا تو مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اب میں کسی سے کچھ نہیں لیتا۔''

اس کی کہانی بہت عجیب تھی۔ ممکن ہے میں کسی اور سے سنتا تو کبھی یقین نہ کرتا لیکن وہ میرے سامنے تھا اور اس کی حالت بھی میرے سامنے تھی پھر میں اس سے دعا کا تجربہ کروا چکا تھا۔ میں نے زاہد کا بتایا کہ اسے کیا مسئلہ ہے تو اس نے اسی وقت اس کے لیے دعا کر دی اور پھر بولا۔ ''اب جاؤ اور جب تک دعا نہ کروانی ہو میرے پاس مت آنا۔''

میں اور زاہد واپس آ گئے۔ اس کے چند دن بعد زاہد کو حیرت انگیز طور پر اس کے باہر موجود چچا نے پانچ لاکھ روپے بھیج دیے حالانکہ اس نے ان سے مدد کا کہا بھی نہیں تھا۔ زاہد نے قرض خواہوں کی رقم چکائی اور اپنا کاروبار پھر سے شروع کر دیا۔ ایک سال کے اندر وہ چچا کی رقم بھی واپس کر چکا تھا۔ وہ بھی دعا جی بابا کا قائل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں دو بار دعا جی بابا کے پاس گیا وہ ابھی تک سول اسپتال میں داخل تھا۔ میں دوسری بار اپنے ایک جاننے والے کو لے کر گیا تو اس کی حالت خراب تھی۔ ریڑھ کی ہڈی پر ضرب سے اس کا جسم مفلوج ہو گیا تھا اور مستقل لیٹے رہنے سے پشت والے حصوں پر بیڈ سور بن گئے تھے۔

آخری بار میں ایسے ہی گیا تھا کیونکہ دعا نہیں کرانی تھی، میں بس اس سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ بھی اب مجھ سے مانوس ہو گیا تھا اور بہت ساری باتیں کر لیتا تھا۔ اس کی پشت کے زخم بگڑ کر اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ ہڈیوں تک چلے گئے تھے اور ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا تھا۔ سرکاری اسپتالوں میں مریض کا جو حال ہوتا ہے وہی اس کا ہوا تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ ہوش میں اور بہت تکلیف میں تھا۔

''قادر بخش کیسے ہو؟''

''آپ دیکھ رہے ہو۔'' اس نے کراہ کر کہا۔ ''خدا سے دعا کرو میری مشکل آسان کرے۔''

''قادر بخش تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''کاش کہ تم اجازت دو تو میں تمہیں کسی اچھے اسپتال لے جاؤں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا بس دعا کر سکتے ہو۔''

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کی تکلیف ایسی تھی کہ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا، اس لیے کچھ دیر بعد میں اٹھ گیا۔ میں نے اس سے آخری بات کی، وہ دعا کے بارے میں تھی۔ ''قادر بخش تمہاری ماں نے تمہاری دعا قبول ہونے کی دعا کی تھی کیا تم کسی کو یہ دعا دے کر جاؤ گے؟''

''نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میرے خاندان میں بس میری اولاد ہے اور میں اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں کسی کو دعا دے کر نہیں جاؤں گا۔''

یہ اس کے آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے۔ پھر میں دوبارہ نہیں گیا البتہ دو دن بعد اسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے مجھے کال کر کے قادر بخش کے انتقال کی خبر دی تھی۔ اسے میں نے قادر بخش کی لاعلمی میں اس کی دیکھ بھال کا کہہ رکھا تھا۔ وہی مجھے اس کی حالت سے باخبر کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ قادر بخش نے دعا کرنے کی صلاحیت آگے کسی کو دی یا نہیں۔ میں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی اور پھر رفتہ رفتہ قادر بخش اور اس کا معاملہ میرے ذہن سے نکلتا چلا گیا۔ پھر سرگزشت کے پُراسرار نمبر کے بارے میں پڑھا تو دل میں آئی یہ کہانی اس کی نذر کروں۔